

مجلۂ توحید اردو

نشریۂ سازمان تبلیغات اسلامی

جلد ۱، شمارہ ۱، جمادی الاولی سنہ ۱۴۰۴ھ تا رجب سنہ ۱۴۰۴ھ



اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

توحید

جلد ۱ شمارہ ۱ جمادی الاولی ۱۴۰۴ھ تا رجب ۱۴۰۴ھ م فروری ۱۹۸۴ء تا اپریل ۱۹۸۴ء

مقاصد

کلمۃ التوحید

و

توحید الکلمہ

قرآن وسنت وسیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی وعملی پہلوؤں کی تلاش۔

علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔

اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔

فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔

عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی فکری وسماجی انقلاب ونتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر وصاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلادیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۳ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۳۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی نبش فرصت
تہران ۔ اسلامی جمہوریہ ایران

توحید

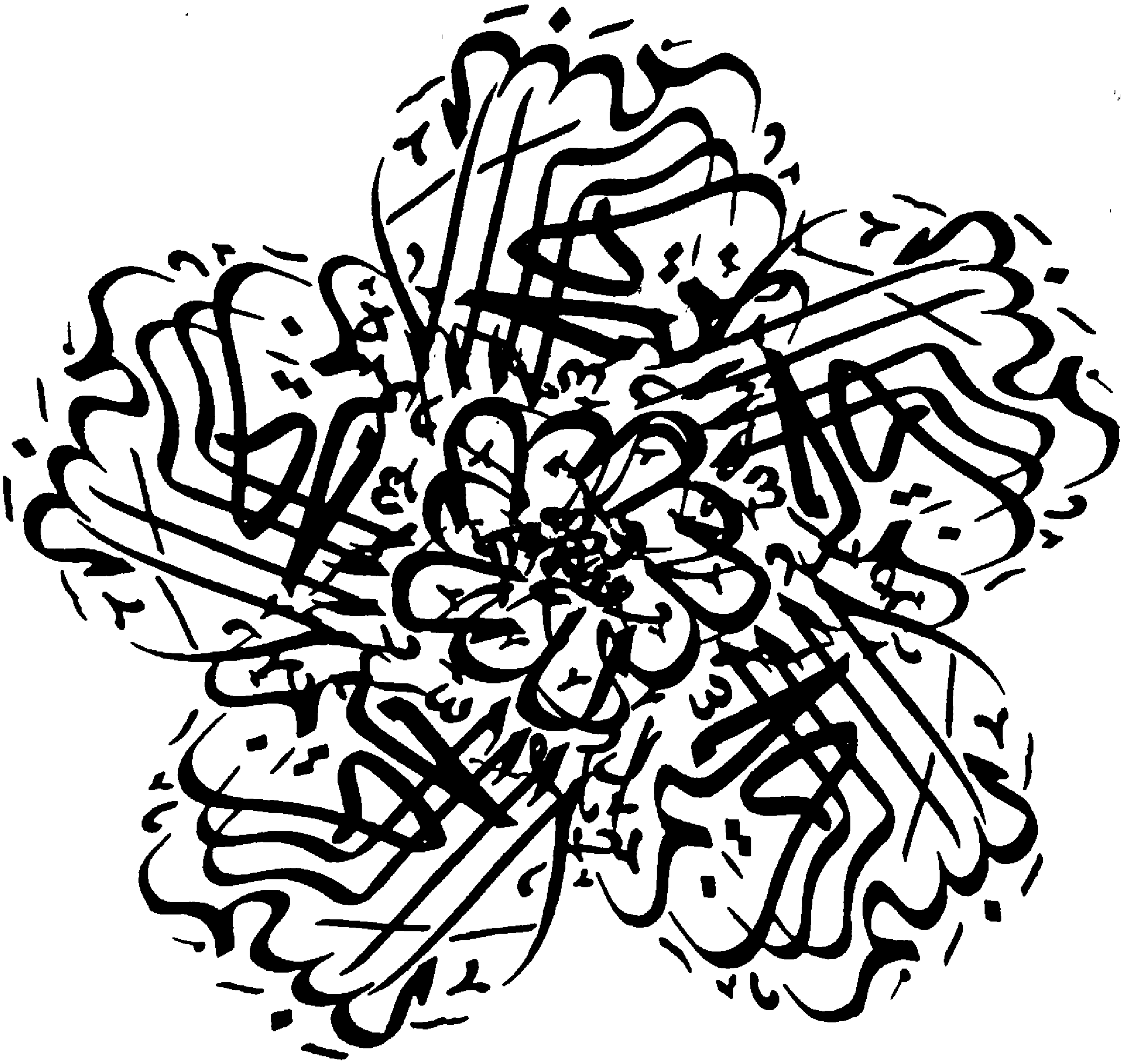
اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد ۱ شمارہ ۱

ترتیب

جمہوری اسلامی ایران
مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۲ - ۵۱ تہران
فون ۲۵ - ۸۲۵۰۲۲

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ تا رجب ۱۴۰۴ھ - فروری ۱۹۸۴ء تا اپریل ۱۹۸۴ء



توحید ۶

شذرہ

۱

مجلہ "توحید" آپ کے سامنے ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اپنی عزیز زبان اردو میں اسلام پر تحقیقاتی فکر و نظر پیش کرتے رہیں، فکر اسلامی کے رنگا رنگ گلدستے، تعلیمات قرآن کے روشن چراغ اور سنت رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاودانی نقوش، جو دانش کو فروغ اور بصیرتوں کو نور دیتے رہتے ہیں، اصحابؓ و اہل بیت کرام کی تاریخ کے جگمگاتے آئینہ خانے، جہاں ہر وقت چاندنی ہی چاندنی ہے۔ آپ کے روبرو رکھیں۔

مسلمان دانش وروں نے ایک زمانے میں یونان و ہند و پارس کے فلسفوں سے مقابلہ کیا اور ان کے رخ موڑ دیے، "دانش فرنگ" کے نام پر غریب عوام کو استعمار نے اپنے شکنجے میں جکڑنے کی سعی کی، جنسی ادب اور آوارگیٔ ذہن کا فلسفہ رائج کر کے اسلام کے خلاف سرد جنگ لڑی، مگر مسلمان لڑکھڑانے کے باوجود گرا نہیں، وہ سنبھلا، اس نے اپنے زندہ و قوت آفریں دین سے مدد لی اور "اللہ اکبر" کہہ کر دشمن پر جھپٹا اور دیکھتے دیکھتے برطانیہ اور اب "امریکہ" میدان سے منہ کی کھا کر میدان چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔

مغربی استعمار کے شکنجے میں قانون، نظم و نسق، فرہنگ و ثقافت، اقتصاد و صنعت، سائنس اور بین الاقوامی روابط نامی بے شمار زنجیریں تھیں، مسلمانوں نے تخت و تاج چھینا اور قانون و نظم و نسق نامی طلسمات توڑے مگر زنجیر کی بہت سی کڑیاں وہ چھوڑ گیا تھا، جنہیں بطور یادگار رہنے دیا گیا۔

وہ کڑیاں وفادار ہاتھوں کے ذریعے زنجیر بنیں اور آزاد ہونے والی قومیں اپنے طبل و نشان کے باوجود پرانے آقاؤں کے زیر سایہ عقلی توانائیاں وقف خدمت غیر کئے ہوئے ہیں۔

مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ اخلاق و آداب حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر دنیا میں کسی کے اخلاق و آداب، رہن سہن کے طور طریقے نہیں ہیں، حضورؐ نے سچ فرمایا ہے:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

امہات المومنینؓ کے جو صفات قرآن مجید میں بیان ہوئے اور سیدۂ عالمیہؑ کا جو طریق حیات تھا وہی انسانیت کے نصف بہتر کا زیور و جوہر ہے۔

افلاطون سے فرائڈ اور فرائڈ سے برٹینڈ رسل تک سب کے فلسفے سب کے افکار فنا ہو چکے اور زوال پذیر ہیں باقی رہنے والی کتابِ حکمت و آگہی قرآن کریم ہے اس آفتاب کی روشنی میں سب کے چراغ گل ہوں گے۔

سنت و سیرت، تعلیمات دین اور فکر و فن کے اسلامی اسلوب میں جو قوت ہے اسے پھیلانے کے لیے، اس عظیم فکری طاقت سے پروپگنڈے کا غبار چھانٹنے کے لیے، سامراج سے ہمدردی اور اس کی طرف رجعت پسندی کے رجحان کو روکنے کے لیے اہل دانش کو دو کام کرنا ہوں گے:

۱۔ اتحاد ملت کی سعی مگر اسلامی فکر و عمل کی بنیاد پر۔

کلمة التوحید وتوحید الکلمة

۲۔ اسلامی حکمت و ادب، قرآن و حدیث کے تعلیمات تحقیق کی گہرائی اور ادب کی دل کشی کے ساتھ، نئے فلسفوں کا فنی محاسبہ اور استعماری ثقافت کا انقلابی تعاقب۔

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ

مجلۂ اردو کے صفحات اس معرکے کے لیے وقف ہیں۔

۲

اردو، دنیا کے بہت سے ملکوں میں بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے، اردو جاننے والے ارد گرد کی بہت سی زبانیں جانتے ہیں۔ برطانیہ کی نوآبادی میں رہنے کے رشتے سے انگریزی میں اچھی خاصی دسترس بھی اردو بولنے والوں کو حاصل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کے ہر گوشے میں اسلام پر کام کی لہر دوڑ جائے، اگر نوجوان حضرت ہمت کریں تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ انگریزوں سے جنگ آزادی لڑنے والی قوم کی نسل ابھی زندہ ہے اسے معلوم ہے کہ برطانیے اور اب امریکہ و روس نے دنیا پر اس لیے پنجے جما رکھے ہیں کہ اقوام عالم کے ضمیر سے غیرت و خودداری چھین لیں۔ محرومین جہاں کے ذہنوں سے قوت پرواز جھپٹ کر، اپنے چبے ہوئے نوالوں سے خوراک اور اپنے پرانے اخلاق و افکار کے مصنوعی 'پر' دے کر انھیں یقین دلائیں کہ تم کچھ نہیں تھے اور تم کچھ نہیں ہو۔ لیکن علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا :: فرنگیوں کا یہ افسوں ہے، قم، باذن اللہ

شعور کو مرکزیت اور مرکز سے دور اکی و تابناکی بخشنا کوئی مشکل بات نہیں۔ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے کوئی الجھن الجھن نہیں رہتی، ذرا سی ہمت کریں، اسلام اور اسلامیات کا مطالعہ اپنا وتیرہ بنا لیا جائے مگر مشرق و مغرب کی تراوش قلم سے نہیں کہ ان دشمنان اسلام و انسانیت سے جو ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ آدمی کو ڈس چکے ہیں، جن کے قلم شہد میں زہر گھولنے کے عادی ہیں۔ آپ اپنے ارباب نظر کی تحریریں پڑھیں اور اگر آپ خود صاحب نظر ہیں تو افکار کی چھان پھٹک کریں، مگر اسلام اور قرآن کی روشنی میں۔ اس کے لیے

تھوڑی سی محنت درکار ہوگی اور اللہ نے وعدہ فرمایا ہے:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انھیں اپنی راہوں سے آشنا کرتے ہیں۔

قلم صاحبِ علم کی تلوار ہے، قلم ادیبوں کا صور ہے، قلم صاحبان فکر کی زبان گویا ہے۔ قلم پڑھے لکھے لوگوں کا تشخص قائم کرتا ہے۔ قلم آدم زاد کے شعور و لاشعور کی بیداری و مردگی کی خبر دیتا ہے۔ ہمارے یہاں لکھنے والوں کا قحط نہیں ہے۔ اسالیب بیان اور اصناف ادب کے ہر موڑ پر ہمارے جوان اور بوڑھے شمعیں روشن کر رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کچھ شیریں بیاں، عمیق الفکر اسلام کا مطالعہ، اسلام کا فلسفہ، اسلام کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیام و سیرت کے لیے بھی کچھ وقت نکالیں، محبت رسولؐ و آل رسولؐ اور مسلمان ہونے کی بنا پر یہ ان کی ذمہ داری ہی نہیں ان پر فرض ہے۔ اگر ہمارے دانشکدوں کے استاد، قانون اقتصادیات، معاشرتی فلسفے اور اپنے اپنے مضامین اختصاصی پر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے یہ مہم شروع کر دیں تو مسلمان غیروں کی دریوزہ گری کے بجائے وہ غیر ہمارے سامنے جھولیاں لے کر آتے دکھائی دیں۔ آخر ابن خلدون۔ بوعلی سینا۔ غزالی۔ زکریا رازی۔ جمال الدین افغانی۔ جیسے سینکڑوں مفکر و دانا و بینا ہم ہی میں سے تو تھے۔ بات جذبے اور شوق کی ہے۔ شوق بھی ہے اور جذبہ بھی، بس ذرا بسم اللہ کہنے اور قلم و قدم اٹھانے کی دیر ہے۔

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز
حدیث بے خبراں ہے "تو بازمانہ بساز"
زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز!

۳

الحمدللہ! وقت کم ہونے کے باوجود، محترم احباب اور بزرگوں نے آواز پر آواز دی۔ خطوں کے جواب آئے اور بعض حضرات نے جواب کے بجائے مضمون بھی عطا فرمائے۔ ہم ان کے ممنون ہیں اور ان کی ہمت و توفیق کے لیے دعاگو۔

خوشی ہے کہ انقلاب اسلامی کی مہم سر کرنے والے مسلمان علما و مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انقلاب اسلامی کو نافذ کرنے والے صاحبان دانش آج اسلامی قانون و فلسفے کو عملی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ جن اداروں میں کل تک اجنبی نظام نظم نسق، نظام تعلیم و تربیت چلتا تھا جن اداروں کی سربراہی صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو لندن، واشنگٹن، ماسکو کے دبستانوں کے ٹرینڈ ہوں۔ وہاں صاحبان عبا و عمامہ، ارباب مسجد و مدرسہ، عام انجینئر و اساتذہ۔ مگر مسلمان۔ برسرکار ہیں اور دنیا بھر کی نگاہوں میں خار۔ مگر صاحبان نظر کے سامنے

پھول اور مرد مسلم کا اعتبار ہیں۔ اس پرچے میں ان کے مضامین کے ترجمے بہت سے دوستوں کے لیے خاص توجہ کے مستحق ہوں گے اور ہم چاہیں گے کہ آپ بھی اسی آہنگ خود اعتمادی و خود آگاہی سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔ سب مقالوں میں قدر مشترک سنجیدگی اور گہرائی ہے۔ ہر لکھنے والے کا مقصد تعلیمات اسلام کو مختلف زاویوں سے سمجھنا اور سمجھانا ہے۔

فکر توانا سے نتائج کا استخراج اور اس کے مؤثر علمی و افادی پہلوؤں کا تعارف ہے۔
آج کی دنیا میں مسلمانوں کے سامنے آئے ہوئے مسائل پر قانونی و فلسفی و شماریاتی گفتگو اور حاصل شدہ فوائد کا بیان ہے۔

توافق حدیث کی ابتدا ہو رہی ہے، کچھ کام سابقین کر چکے ہیں، مگر اب پھر سے خلوص و محبت، اتحاد و ہم آہنگی کے ساتھ یہ کام ہونا چاہیے۔ خدا کرے دوسرے شمارے میں ہم اس سے بڑھ کر اور اس سے بہتر تعاون سے سرفراز ہوں۔

بہائیت و قادیانیت ہمارے معاشرے میں دو ناسور ہیں۔ ایران سے بہائیت کا اخراج اور پاکستان سے قادیانیت کے خلاف قانون کا فیصلہ اہل خبر کو معلوم ہو چکا ہے۔ مگر اسرائیلی فلسطین اور استعماری مراکز میں ان کے سینٹر جو خطرناک کام کر رہے ہیں اس کے لیے ہم سب کو مل کر کام کرنا چاہیے تاکہ دور و دراز دنیا کو ان کی سیاسی، علمی اور سماجی حیثیت معلوم ہو سکے۔ مشرق و مغرب کے سامراج کے پیدا کردہ یہ گروہ ان کے مفادات کی حفاظت و ترویج مقاصد کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام و اہل اسلام اور قرآن کریم کو نقصان پہنچانے کا عزم بالجزم کیے ہوئے آگے بڑھنے کی سعی پیہم کر رہے ہیں۔

مسلمان انگڑائی لے کر اٹھ چکے ہیں۔ ایک کامیاب انقلاب برپا کر کے ان کے ارادے جوان ہیں۔ اقبال کی صدا آرہی ہے۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

تفسیر

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

—مرتضیٰ حسین—

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ الذی انزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا والصلوٰۃ والسلام علی النبی الذی جاء بالقرآن داعیاً الی اللہ باذنہ وسراجا منیراً وعلی آلہ الہداۃ المعصومین ولاسیما علی الحجۃ المنتظر الذی جعلہ اللہ سلطاناً نصیرا:

قرآن مجید وہ انقلابی کتاب ہے، جو فکری، نفسیاتی، علمی وعملی زندگی میں صدیوں سے جان ڈال رہی ہے۔ کلام مجید نے جس طرح عرب وافریقہ کے عہد جہالت کو دور نور وافکار میں بدلا، اسی طرح سارے جہاں کے بتوں کو توڑ کر واحدیت معبود برحق کی طرف انسانوں کی نگاہوں کو موڑا۔ تعمیر ذات، تطہیر ضمیر، اصلاح معاشرہ، تکمیل انسانیت کبریٰ میں قرآن مجید ہی حرارت وروشنی وزندگی وتوانائی کا سرچشمہ ہے۔ قرآن حکیم کا وہ معجزہ جو آج سب نے دیکھا، وہ انقلاب اسلامی ایران ہے۔ وہ انقلاب جس کے داعی کہتے تھے "ما شاہ نمی خواہیم قرآن می خواہیم" — شاہ نہیں قرآن — دنیا کی تمام طاغوتی طاقتیں طوفان برق وباراں اور سیلاب بم برہم بن کر چار سال سے اس قرآنی معجزہ کے مٹانے میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں مگر خدا کا وعدہ پورا ہو رہا ہے۔

علم وعقل، فکر وعمل، ترقی و تسخیر کائنات اور احترام ہر فرد بشر کا داعی و منادی قرآن اپنے پیغام بردو مفسر حضرت خاتم الانبیا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و تعلیم کے ساتھ آواز دے رہا ہے؛

إقرأ باسم ربك الذى خلق *
خلق الانسان من علق * إقرأ
وربك الاكرم الذى علم بالقلم
علم الانسان ما لم يعلم *

اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔
انسان کو لوتھڑے سے انسان بنایا۔
پڑھو اور تمہارا رب بہت مکرّم ہے۔
وہ جس نے قلم کے ذریعے علم دیا۔
انسان کو وہ علم دیا جس سے وہ ناواقف تھا۔

- تحریک علم کے لیے، دعوت تفکر و تدبّر فی القرآن کے لیے۔
- دعوت اتحاد و توجہ الی اللہ، حصول منزل تقوی کے لیے۔
- قرآن و سنّت سے دائمی تعلق کو مزید مستحکم رکھنے کے لئے۔
- وصیت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کی خاطر یہ مختصر تفسیر شروع کی جارہی ہے۔

انی تارك فيكم الثقلين: كتاب الله وعترتی اهل بيتی
ما ان تمسكتم بهما لن تضلّوا بعدی حتی يردا علیّ الحوض.

اسی بنیاد پر قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا مختصر بیان،
اختصار اور سادگی کے ساتھ حاضر ہے۔
انقلاب ذات، تعمیر معاشرہ اور فکری ارتقا
اور عقیدۂ توحید و وحدت کلمہ کے لئے ایک پیش کش ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين ۝ الرحمن الرحيم ۝
مالك يوم الدين ۝ اياك نعبد واياك
نستعين ۝ اهدنا الصراط المستقيم ۝
صراط الذين انعمت عليهم غير
المغضوب عليهم ولا الضالين ۝

ترجمہ :

اللہ کے نام سے ، بڑا مہربان بے حد رحم کرنے والا(۱) ہر طرح کی حمد اس اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے(۲) بڑا مہربان ، بے حد رحم والا ہے(۳) مالک ہے روز جزا کا (۴) اللہ ، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں(۵) تو ہمیں صراط مستقیم (سیدھی راہ) پر ثابت قدم رکھ(۶) ان لوگوں کا راستہ جن لوگوں پر تو نے نعمت نازل کی ۔ ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہے اور ...(۷)

سورۃ : آیات کا وہ مجموعہ جو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع اور چند آیات پر تمام ہو سورۂ براءت کے علاوہ بسم اللہ ہر سورہ کا جز ہے۔

کچھ سورتیں مکی ہیں کچھ مدنی۔ مکی : کا مطلب یہ ہے کہ آیات مکۂ مکرمہ یا اس کے قریب اتریں۔ اسی طرح مدنی۔ بعض مکی سورتوں میں مدنی اور مدنی سورتوں میں مکی آیتیں بھی موجود ہیں۔ جن کی طرف سورے کے نام و عنوان میں اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

رکوع :۔ آیات کے اس مجموعے کو کہا جاتا ہے جو بہت قریب اور باہم مربوط مطالب پر مشتمل ہوتا ہے۔

آیت : وہ کلام جو اشارۂ ذی سے حسب مصلحت فقرہ بند ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ ۔ اسم ذات ہے۔ "اللہ" کے معنی ہیں وہ ذات جو کمال کے تمام صفات اور جلال وجمال کے تمام عقلی و وجودی معانی سے عبارت ہے ۔ اللہ ۔ اسم اعظم ہے ۔ اللہ ۔ کا ترجمہ دوسری زبانوں میں اور اس کی تشریح طویل تقریروں میں ممکن نہیں ۔ قرآن کا آغاز اور وحی کا سرنامہ اللہ کا نام ہے۔

رحمٰن ورحیم اللہ کے نام سے ابتدا کرنا ۔ توجہ الی اللہ کا تقاضا کرتا ہے ۔ توجہ الی اللہ کے لئے معرفت خدا، احساس خداوندی و بندگی ضروری ہے ۔ اللہ، کمال وجلال وجمال ہے اور معبود لاشریک ہے۔ ہم، سراپا زوال ونقص وکوتاہی اور بندۂ گنہگار ہیں اس لئے ۔ اس کا نام کیسے لیں ؟ اس کے حضور میں کیوں کر جائیں ؟ آخر بندے کا خدا سے ربط کیسے ہو ؟ سب کا جواب ہے ۔ رحمٰن ورحیم ۔ چونکہ وہ رحمٰن ورحیم ہے اس لئے اس کا نام لے کر قدم اٹھا رہے ہیں، کام کر رہے ہیں ۔ اس کی مہربانی ضرور سہارا دیتی ہے ۔ اس کا رحم یقیناً پردہ پوشی کرتا ہے ۔ اس انداز سے ہر ابتدا ذہن میں پاکیزگی اور نظر کو یکسوئی عطا کرتی ہے ۔ تعلیم وتربیت کا اہم ترین مرحلہ یہ ہے کہ بسم اللہ سے ہر کام شروع کیا جائے ۔

۔ الحمد للہ

ارادہ وعمل کا پہلا قدم نام خدا سے آگے بڑھا ہے تو زندگی وتوانائی، معرفت معبود و فراوانی انعامات کا خیال کر کے اللہ کی حمد کرنا چاہیئے ۔ آخر نیند سے آنکھ کھلنے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے میں کیا فرق ہے ؟ اس نے دوبارہ قوت بخشی ہے جب ہی تو فکر کو زندگی ملی، یہ اس کا رحم ہے کہ بندے کو حاکمیت ومحکومیت کے درمیان رکھا، وہ رحمٰن ہے اس لئے ہم زندگی کے باریک ونازک مراحل سے گذرے ہیں، ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ معاف کرتا ہے وہ رحیم کہ آئندہ بھی ہماری لغزشوں سے درگذر فرمائے گا ۔ عجیب اہتمام ہے کہ الوہیت کی صفت رحمٰن ورحیم بتائی اور حضرت ختمی مرتبت کی صفت بھی " رحمۃ للعالمین " بیان کی کہ بندۂ گنہگار رحمتوں سے مایوس نہ ہو

یہ سورت دو مرتبہ نازل ہوئی ۔ یہ سورت نماز پنجگانہ کی پہلی دو رکعتوں میں دو مرتبہ ضرور پڑھی جاتی ہے ۔ اس سورت میں جس طرح کلمۂ واسم "اللہ" دو مرتبہ آیا ہے ۔ اسی طرح "رحمٰن" دو مرتبہ اور "رحیم" دو مرتبہ آیا ہے ۔ قرآن مجید نے بندگی کو حوصلہ دیا اور اسلام نے اللہ کی طرف توجہ کے لئے صفت رحمٰن ورحیم کو بنیاد بتایا ہے ۔ اور کلام اللہ کا اعجاز سمجھ میں آیا ۔

رَبّ العالمین—

(یہ ترکیب قرآن مجید میں تقریباً بیالیس مرتبہ استعمال ہوئی ہے)

اللہ کی حمد بے پایاں، وہ جہانوں کا رب ہے۔ بے شمار جہان، لاتعداد کرے، ہر کرے کا محور الگ، دائرہ الگ، مرکز ثقل الگ اور اس کی دنیا جدا، ہر دنیا کا خالق اور ہر جہان کی مخلوقات کے احتیاجات پورے کرنے والا، وجود و لوازم زندگی، استحکام و نظام کے مالک و سربراہ روزی رساں، مہربانی و رحم کرنے والے رب کی حمد۔ زبان کو ادب اور فکر و نظر کو مرکز بخشتی ہے۔ اس حمد گذاری سے تزکیۂ نفس و طہارت ضمیر کا عمل شروع ہوتا ہے۔ حمد کا مرتبہ شکر سے بلند ہے، حمد اقرار ربوبیت کا اظہار ہے اور ربوبیتِ عالمین کا اعتقاد عظیم ترین مالک سے تعلق اور غیر اللہ سے لاتعلقی کی حس کو بیدار کرتا ہے۔ یہی لا الٰہ الا اللہ کا مطلب اور یہی مرد مومن کا اوّل و آخر ہے۔ چونکہ اللہ اور ربوبیت عالمین۔ انتہائی عظمت و جلالت و قدرت کے الفاظ و مفاہیم ہیں۔ اس لئے رحمن و رحیم کے صفات سے یاد کرنا بندگی کو ملتجیانہ پہلو اور فکر و نظر کو تدریجی ترقی کی راہ پر ڈالنا مقصود ہے۔

—مالک یوم الدین

یہاں سے فکری ترقی اور تعلیم کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ کہ جب نامعلوم جہانوں کا وجود مان چکے پھر ان کائناتوں کا رب، پرورش کرنے والے اللہ پر عقیدہ استوار کر کے تمام اقسام حمد اس کے حضور پیش کر چکے۔ تو اب غیب کی بات، مستقبل پر یقین اور جزا و سزا کا اعتقاد رکھنے اور اس اعتقاد کے برملا اظہار کی باری ہے۔ قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو " مالکِ یوم حساب "۔ جزا اور عوض کے دن اور اس دن کے مالک کو یاد رکھنے، پکارنے کی تعلیم دیتا اور ہدایتِ ابدی کی راہ دکھاتا ہے۔

اب تک اللہ اور بندے، بندے اور عمل، عمل اور جزا کی بات تھی۔ پورے کلام الٰہی میں انہیں موضوعات کو پھیلا کر قرآن اور سمیٹ کر سورۂ فاتحہ کا نام دیا گیا ہے۔

—ایاک نعبد

ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اس عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرتے نہ کبھی کسی اور کی عبادت کریں گے۔ اس موقع پر بندہ خدا کے روبرو ہے۔ تربیت و تزکیۂ نفس کا یہ درجہ قربت و حضور اور ایمان و ایقان کا درجہ ہے، یہاں سے تقوے کے ہر لحظ بڑھنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں "انا للہ و انا الیہ راجعون" کے راز ہائے سربستہ کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ یہاں

توحید

سے منزلِ تحقیق کی شاہراہ ملتی ہے اور مومن قدم بڑھاتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ جب بندگی فقط اس کی ہے تو غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی چھوڑ دے۔ جو بے طلب دیتا ہے اسی سے مانگو کہ عزتِ نفس اور تقویٰ یہی ہے۔

ایاک نستعین

امانت و امداد تجھ ہی سے طلب کرتے ہیں، تیرے سوا کوئی بے نیاز ہے ہی نہیں تو نیازمندوں سے مدد مانگنا آدابِ بندگی و ادبِ خداوندی کے خلاف ہے۔ انسان کا انسان سے ڈرنا، انسان کا انسان سے دبنا، ایمان کا نقص ہے۔ جب اس کے بندے ہو لیے تو طاغوت کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور اپنے جیسوں سے آنکھ جھکانا کیا؟ اللہ کی عبادت کرو، ہر معاملے میں اللہ کا نام لو اسی پر بھروسہ رکھو، اسی کی مدد فتح مندی ہے۔ ہر قدم پر ثبات اور پیش رفت کا دھیان رکھو، غیر سے ڈرو کہ اسی کمیں گاہ میں شیطان ہے، اکیلے رہو۔

اهدنا الصراط المستقیم

ہم اسلام و ایمان اور تیری معرفت و اطاعت کی راہ پر چل رہے ہیں اسی راہ پر کھڑے ہیں، اب آگے جو بڑھیں تو استقامت کے ساتھ پیش روی کی توفیق بھی دیتے رہنا۔ ہر قدم نازک ہے، کہاں سے فطرتِ خام رخ موڑ دے؟ کہاں سے انسان ارادہ بدل دے، کہاں سے غرور راستہ کھوٹا کر دے، کہاں سے خود نمائی راہ کج کر دے، کسے معلوم۔ قرآن نے ضابطہ دیا ہے کہ تقویٰ، اصلاح و فلاح کو پیش نظر رکھو اور خدا کی بندگی خدا کی نصرت پر یقین رکھ کر ہر گام اس سے توفیق راست روی طلب کرتے رہو، ہر لمحہ استقامت کی کوشش جاری رکھو۔؟

صراط الّذين انعمت عليهم

جس صراطِ مستقیم کی ہدایت طلبی میں تسلسل اور جس سیدھے راستے پر استقامت کا درس ہے وہ فقط اپنی فکر و نظر، اپنی اسمت و جہت نہ ہو کہ عرفان حاصل کر لیا (بگمان خود، اور رسول و امام سے رشتہ توڑ لیا) متقی بن گئے تو راستہ کی خود دریافت کرنے لگو اور کہو کہ خدا نے براہ راست ہماری ہدایت کی ہے اسی کی مدد سے صراطِ مستقیم پر چلتے رہیں۔

الذين انعمت عليهم

انبیا و مرسلین، ائمہ و اولیا، صالحین و شہدا کا راستہ، زندۂ جاوید افراد کا راستہ،

منزل پر پہنچے ہوئے حبیب خدا حضرات کا راستہ، جنھیں اللہ نے نعمت رضا، نعمت نبوت، نعمت رسالت، نعمت امامت، نعمت شہادت دی ان کا راستہ ہی صراط مستقیم، ان کی یاد عبادت کا جزو ان کا تذکرہ حسنہ انکو پسند اور وہی عبادت کے خلوص اور مدطلبی کے معیار بتلانے والے ہیں۔

غير المغضوب عليهم ولا الضالين

نعمتوں سے سربلند اور انعامات سے سرفراز لوگوں کا تذکرہ تربیت بالمثال اور سمعی وبصری ذرائع تعلیم کا نہایت اعلیٰ انداز تھا۔ مثبت نمود اور محبوب افراد کی تمثیل کے بعد، سو بھیس بدلنے والی عقل کو بد طینت، بد فطرت اور گمراہ کن رہروں سے بچنے کی بات، طاغوت کی قیادت میں آنے سے بچاؤ کی تدبیر، غضب خدا کے نشانوں اور عذاب کے مستحق لوگوں اور ان کی راہوں سے دور رہنے کی تعلیم دی ہے۔ واضح طور پر اللہ کے پسندیدہ بندوں (حزب اللہ) کا راستہ اور ہے اور یہودیوں، نصرانیوں، بت پرستوں، مشرکوں کا راستہ طاغوت اور مادی طاقت پرستوں کا راستہ۔ صراط مستقیم کی ضد ہے۔ اللہ والے اس راستے کو نظر بھر کبھی نہیں دیکھتے۔
آغاز درس یہ ہے کہ ابتدا نام خدا سے کرو اور انجام کار میں یہ دیکھو کہ کہیں تمہارا ڈانڈا اعدا کے دشمن اور گمراہ لوگوں کی راہ سے تو نہیں ملا۔ اگر محاسبۂ ذات وضمیر میں، اگر راہ و منزل میں تم حقیقت آشنا رہے ہو تو کہو۔

الحمدلله رب العالمين

آخری آیتوں پر ذرا سا غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مؤمن و مؤمنہ سے اللہ کی حضوری، صراط مستقیم (جو قرآن کا ایک نام اور محمد و آل محمدؐ کا راستہ ہے) پر استقامت کے مضبوط ارادہ کا عہد لیا گیا ہے اور گمراہ و معذب افراد سے بچنے کو اصول قرار دیا گیا ہے۔ پہلی بات کا نتیجہ خدا کا وعدہ ہے کہ

«ان هذا القرآن يهدى للتى هى أقوم» (الاسراء: ۹)

اور دوسری بات تقویٰ کی اساس ہے۔
مجموعی طور پر یہ سورہ کم از کم ایمان کامل اور تقوے کا دستور ہے۔ تمام اقسام حمد و شکر کا اللہ کی ذات کے لئے مختص سمجھنا، یہ عقیدہ کہ سب نعمتیں وہی عطا کرتا ہے۔ دنیا و آخرت میں اسی کو مالک و مختار جاننا۔ خلوص و عاجزی کو اپنانا۔ ذاتی نمود و نمائش سے بچنا۔ ہر کام میں اسی

سے مدد چاہنا اور اسی پر توکل کرنا، ہر لمحہ ہدایت مانگنا، ہر قدم استواری چاہنا۔ اچھے کو اچھا، برے کو برا کہنا (حسن و قبح عقلی) اچھوں سے دوستی اور معصوموں کی پیروی۔ بروں سے بچنا اور ان سے علیحدگی ـــ کا مطالبہ ہے۔

جب بھی اسے پڑھیے، سمجھیے کہ آپ خدا سے عہد کی تجدید کر رہے ہیں۔ اس سے تقوے کی حس بیدار ہوگی اور احساس تقویٰ قوی ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ:

اللہ کے نام سے آغاز جو دنیا میں بے حد رحم کرنے والا اور آخرت میں بے حساب رحم کرنے والا ہے۔ الٓمٓ (۱) (قرآن) وہ (عظیم) کتاب ہے جس میں شک و شبہ ہے ہی نہیں۔ پرہیزگاروں کی رہنما ہے۔ (۲) جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں۔ (۳) اور وہ لوگ جو (اے رسولؐ) آپ پر نازل شدہ اور آپ سے پہلے نازل کی گئی (وحی و تعلیم) پر ایمان لائے اور آخرت کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ (۴) یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (۵)

تفسیر:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ الٓـمٓ ۔ رحمٰن و رحیم کے معنے بہت وسیع ہیں، ہم ترجمہ میں اشارہ کرتے جائیں گے ۔ ان میں سے ایک معنے وہ ہیں جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے بتائے جس کا خلاصہ ہے کہ رحمٰن، یعنی سب پر رحم کرنے والا اور رحیم یعنی مومنین پر رحم کرنے والا۔

الٓـمٓ (آل عمران مدنی کے علاوہ چار مکی سورتوں، العنکبوت، الروم، لقمان، السجدہ کا آغاز بھی الٓـمٓ سے ہوا ہے۔) حروف سادہ ہیں، ان کا جواب لاؤ، مشکلات میں ٹھہر کر غور کرو ۔ رمز و اشارات ہیں ان سے غافل نہ ہو تا جنھیں اللہ نے علم کتاب دیا ہے ۔ قرآن قول و فعل رسول و آل رسول علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے بغیر کما حقہ سمجھنا مشکل ہے اور اس سے نتائج حاصل کرنا مناسب نہیں ۔

ذلك الکتاب...

ذالك دور کے لئے اشارہ ہے، یہاں بلندی کتاب کا اظہار ہوتا ہے ۔ جب خدا کو مان لیا، رسول کو پہچان لیا تو اس کتاب میں شبہے کی گنجائش کہاں رہتی ہے ۔ اللہ کا کلام رسول کا معجزہ قیامت تک کا دستور ہے نہ کل کسی دانشمند کو اس کے معجزے میں شک تھا نہ آج کے دانشور اس کی عظمت کا انکار کرتے ہیں، مسلمانوں کا خیر سرمایہ افتخار ہے ہی ۔

ھدیً للمتقین...

قرآن کا موضوع ۔ ہدایت ۔ ہے ۔ لیکن اس ہدایت کے پہلے مستحق، متقی لوگ ہیں۔ گذشتہ سورت میں یہ متقی ہدایت طلب کر چکے ۔ قرآن یہاں انہیں اطمینان دلاتا ہے ۔ ہدایت ۔ وسیع الذیل مفہوم ہے، جن میں سے ایک مفہوم ہے ۔ وسائل سعادت کا مہیا ہونا ۔ متقی ۔ شعور و وجدان میں غیب سے وہ رابطہ رکھنے والا جو ایمان کے کمال اور تقرب باری تعالیٰ کی وجہ سے ہمہ تن حضور و شہود کے عالم میں رہتا ہے ۔ تقویٰ : بندگی و ربوبیت کے عرفان کا نتیجہ ۔ کرامت کی اساس یہی تقویٰ ہے جو لوگ توحید کو مان کر، عرفان الٰہی حاصل کر کے، نفس کو پاک اور کردار کو نکھار چکے، خوف خدا سے سرشار، خوف طاغوت سے آزاد ہیں، قرآن ان کا دستگیر ہے ۔ اس کی ہدایت کے دروازے ان کے لئے کھلے ہیں ۔

الّذین یؤمنون بالغیب...

متقی کون ہیں ؟ متقی کی پہچان کیا ہے ؟ قرآن کی لفظوں میں متقی وہ ہیں جن کے اعتقاد و یقین میں "غیب" برحق ہو — آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ خمینی نے فرمایا :

"انکار مجہول — جو نہ معلوم ہو اس کا انکار — کفر کی ایک قسم ہے (اگرچہ اسے کفر شرعی نہیں کہا جائے گا) انسان کی اکثر پریشانیوں کا سبب ہی یہ ہے کہ وہ کسی واقعیت کا ادراک نہیں کر سکتا تو فوراً انکار و سرکشی کر بیٹھتا ہے۔ اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس درجے پر نہیں پہنچ سکا جہاں اولیاء اللہ پہنچ چکے ہیں۔ یہ انکار کفر ہے۔" (تفسیر سورۂ حمد، چوتھی تقریر)

غیب سے مراد ماجاء بہ النبیؐ (جن باتوں کی آنحضرتؐ نے اطلاع و تعلیم دی، قرآن و کتب سابقہ) حشر و نشر، رجعت و وجود حجت اسی ضمن میں ہے۔

سورۃ الانبیا میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں ارشاد ہے ؛

ولقد اٰتینا موسیٰ وھٰرون الفرقان وضیاءً وذکراً للمتقین الّذین یخشون ربھم بالغیب وھم عن الساعۃ مشفقون

اور ہم نے موسیٰؑ و ہارون کو فرقان اور متقین کے لئے روشنی عطا کی تھی۔ وہ لوگ اپنے بے دیکھے رب سے ڈرتے اور قیامت کے آنے سے خائف رہتے ہیں

جناب موسیٰ و ہارون اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو وحی کے ذریعے ہدایت بشر کا منصب سونپا گیا۔ لیکن پیغام رسالت کا فہم و ادراک نازک کام تھا۔ ہر شخص کو آزادیِ فہم و تعبیر کا حق مل جاتا تو نظام الٰہی تحریف و انحراف کی بدولت تباہ ہو جاتا۔

قرآن پر غور کیجیے سعادت ہے۔ مگر قرآن کا دوسرا ساتھی رسول و امام معصوم ہے۔

و یقیمون الصلٰوۃ...

قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے سرفراز لوگ ایمان بالغیب کے عقیدہ اور نماز قائم کرنے کے عمل — اور

ومما رزقنا ھم یُنفقون...

اللہ نے انہیں جو کچھ دیا ہے اسے راہ خدا میں صرف کرنے سے پہچانے جاتے ہیں۔ علم و ایمان ہو یا تجربہ و عرفان، مال و دولت ہو یا فکر و قوت بندۂ مومن کی صفت اور مسلمان کا طور طریقہ

یہی ہے کہ وہ جو کچھ محنت سے حاصل کرتا، قوت بازو سے کماتا ہے دوسروں کو دیتا اور سب کو شریک بناتا ہے وہ ناجائز زر اندوزی کا بھی حامی نہیں۔ دراصل اسلام کا نظام زر مستقل فلسفہ ہے اور مشرقی و مغربی فلسفوں سے الگ ہے۔

یہ بات انتہائی توجہ طلب ہے کہ متقی کی عام پہچان یہ ہے کہ وہ نماز پڑھتا ہو اور انفاق کرتا ہو۔ متقی کی پہلی شناخت نماز ہے اور دوسری انفاق، نماز بھی خدا و رسول کے حکم کے مطابق ہونا چاہیے اور انفاق بھی شریعت کی صواب دید سے ہم آہنگ ہو۔ بعض حضرات اپنی پسند سے خیرات کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں انہیں دھیان رکھنا چاہیئے کہ ان کی خیرات مطابق شرع پیغمبر ہے بھی؟ یہاں سے متقی و غیر متقی کے راستے جدا ہوتے ہیں۔

والذین یؤمنون بما انزل

متقی وہ لوگ ہیں۔ قرآن سے فائدہ اٹھانے کا حق انھیں ہے جو آنحضرت سے پہلے نازل ہونے والے صحف و کتب انبیاء پر ایمان اور قیامت پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ جزا و سزا، رضا و غضب کا دن نہ مانا تو ایمان کیسا اور تقوی کہاں کا۔

أولئك على هدىً من ربهم...

یہ لوگ قرآن عظیم کے مفاہیم و تشریع کو ماننے اور کردار و عقیدہ میں شعور کی گہرائیوں سے نبوتوں کے نظام کو تسلیم کرتے ہیں لہٰذا متقی ہیں اور چونکہ متقی ہیں لہٰذا یہ ہدایت پر ہیں اور کامیاب ہیں۔ ان کی کامیابی بندگان ہوا و ہوس اور غلامان لذت و شکم جیسی نہیں۔ ان کی کامیابی رضا خدا سعادت و نجات کی سند حاصل کرنے والوں کی کامیابی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ

اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ

عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ترجمہ:

یقیناً جو لوگ انکار کر چکے (کافر بن چکے) ان کے لئے یکساں ہے خواہ آپ انھیں ڈرائیں (دھمکائیں) یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے (۶) اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دئے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ (۷)

انّ الذین کفروا سواءٌ علیہم...

مومنین و متقین کے مقابلے میں کچھ نفسیاتی مریض، کچھ بات نہ ماننے کے عادی افراد بھی ہیں، ان کے تذکرے سے پسندیدہ و ناپسندیدہ کردار آمنے سامنے رکھنے سے تیسرے آدمی کو فیصلہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ منکرین غیب و نظام دین جو اپنی نظر و عقل ہی کو معیار حق و باطل سمجھتے ہیں، جو اللہ کو اس لئے نہیں مانتے کہ اسے دیکھا نہیں، وہ رسول کا انکار کرتے ہیں کہ ان کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ یہ لوگ دراصل ضد دین و اہل ایمان ہیں۔ انھیں رحمت کا پیام اور سرزنش کا اثر ہو ہی نہیں سکتا۔

ختم اللہ علی قلوبہم وعلی سمعہم...

ان کے شعور و سماعت جو حق کا ادراک اور پیام حق سننے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکے تو بطور سزا اللہ نے انھیں بند کر دیا۔ ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے کہ دلائل و مشاہدات سے فیض نہیں اٹھا سکتے، ان کی توفیق روک دی، چونکہ ظاہر و باطن افکار دین کے دشمن ہیں لہذا سخت ترین عذاب کے سوا انھیں کیا ملے گا۔

قلب: قرآن و حدیث میں نفس کی قوت مدرکہ کا نام ہے۔ مطالعۂ قرآن مجید کے اس لمحہ ذرا ٹھہرنا ضروری ہے کہ اس آئینے میں دو کردار نظر آتے ہیں۔ یقینی طور پر قرآن سے ہدایت پانے والا متقی ۔ یقینی طور پر قرآن مجید کے فیض سے محروم ۔ کافر۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ:

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔(۸)۔ وہ دھوکا دیتے ہیں اللہ اور مومنوں کو، حالانکہ وہ در اصل اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور ان کو شعور ہی نہیں (۹) ان کے دلوں میں مرض تھا، اللہ نے مرض اور بڑھا دیا اور ان کے لئے بہت تکلیف دہ عذاب ہے اس بنا پر کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔(۱۰)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں (۱۱) ہوشیار رہنا، یہی لوگ فسادی ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں۔(۱۲)۔ اور جب ان سے کہا گیا، جس طرح سب لوگ ایمان لا چکے تم بھی ایمان لے آؤ۔ تو انھوں نے جواب دیا، کیا ہم اسی طرح یقین کریں جیسے بے وقوف لوگوں نے یقین کرلیا۔ ہوشیار، یہی لوگ کچی عقل والے ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں (۱۳)

ومن الناس من يقول آمنا...

متقین نقطۂ عروج پر اور کافرین نقطۂ پستی پر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک انتہائی خطرناک گروہ ہے، سازشی، بزعم خود غلط، دوسروں کو گمراہ اور دنیا میں فساد کرتے والے۔ منافقین، ان خطرناک افراد کے عادات و نفسیات کا بیان ہے تاکہ اس پس منظر میں خوش کردار و عالی ظرفی کی حس ابھرے۔

یہ مدعی ہیں کہ اللہ کو مانتے اور قیامت کو برحق جانتے ہیں۔ لیکن یہ مومن نہیں ہیں۔ وہ

اپنے عیّار ہونے پر ناز کرتے ہوئے کہتے ہیں

یخادعون اللہ...

ہم مومن ہیں، اس طرح وہ اللہ، رسول اور مومنوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں — اللہ کو دھوکا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منافقت برتنا ہے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جس کے دل میں چور ہو وہ کسی کو فریب دینے کے بجائے خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے۔ ظاہر و باطن کا فرق آدمی کو کہیں کا بھی نہیں رکھتا۔

فی قلوبهم مرض...

ان کا شعور و لاشعور مریض ہے وہ نفس کی قوت ادراک کمزور کر چکے ہیں تو اللہ نے اس کی سزا یہ دی کہ ان کے مرض کو بڑھا دیا کہ شاید مسیحا کے پاس جائیں اس دکھ سے آنکھیں کھلیں، ورنہ خدا اور رسول کو جھٹلانے کا عذاب بہت دردناک ہے جو ان کے مقدر ہو چکا ہے۔

واذا قیل لهم لا تفسدوا...

اسلام، فساد کا دشمن ہے، اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتا وہ فساد پیشہ منافقوں کو فساد سے روکتا ہے۔ فرد اور معاشرے کے فساد کی اصلاح پیغمبر کا اہم ترین کام تھا جسے روکنے کے لئے منافقین پیش پیش رہے آج بھی قرآن، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے حکم کے مطابق امر بمعروف و نہی عن المنکر کی بات سن کر لوگ فساد کی راہیں سوچتے ہیں اور خود مصلح بن کر ہدایت کے بجائے گمراہی پھیلاتے ہیں۔ قرآن ان لوگوں کے بارے میں خبردار کرتا اور اس قسم کے افراد کو مفسد بتاتا ہے۔ ان لوگوں کے شعور مر چکے، دل زنگ آلود ہو گئے، سوچ سمجھ سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

واذا قیل لهم آمنوا...

دین کے بارے میں ایک گروہ کا رویہ اور اس کی فکری افتاد یہ ہے کہ انھیں اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تو جواب دیتے ہیں، کیا خوب! ہم بے وقوف لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ کہاں ہم صاحب عقل و خرد، سائنس و نفسیات، اقتصاد و سماجیات کے ماہر، کہاں یہ دو رکعت کے امام! اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ " الا انهم هم السفهاء ولکن لا یعلمون۔۔ ارے ان کی بات کا برا نہ مانو یہ لوگ لاعلم ہونے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں درحقیقت یہ خود ہی حواس باختہ ہیں۔ کیونکہ دین و عقل

دونوں ساتھ ہیں، اسلام علم وعقل کو فروغ دینے آیا ہے یہ لوگ آئین و اخلاق قرآن کے بجائے ہوس رانی ونفس پرستی چاہتے ہیں جو عقل کے بجائے حیوان کا راستہ ہے۔

پہلا گروہ شورش پسند تھا اور آج بھی ہے۔ دوسرا گروہ اپنے مفروضہ علم پر بھروسہ رکھکر حکمت قرآن وفلسفہ اسلام جاننے والوں کو اپنی سطح سے کمتر جانتا ہے۔ قرآن نے پہلے گروہ کو "لایشعرون" اور دوسرے طبقے کو "لایعلمون" کہا ہے۔ اسلام کی اساس عقل وتقوی ہے اس لئے معاشرے کے ان طبقات سے اہل ایمان کو باخبر رہنا چاہئے۔ ہر تیز رو یا ہر مدعی کے پیچھے چلنے سے بچو۔ دیکھو اہل کون ہے اور ترجمان کتاب وسنت کون ہے۔ خواہ آج ہو یا کل۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۞ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۞

ترجمہ:

اور جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لا بھی چکے اس کے بعد جب اپنے شیطانوں کے ساتھ نجی ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ ہم تو ان کو بناتے ہیں (۱۴) اللہ، ان کو بناتا ہے اور ان کو ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مارتے رہیں۔ (۱۵) یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی۔ پھر ان کی تجارت ہی نے فائدہ نہ دیا اور یہ لوگ ہدایت حاصل کرنے والے تھے بھی نہیں۔ (۱۶)

واذا لقوا الّذین آمنوا قالوا آمنا...

یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کا حال بتا رہے ہیں۔ یہودیوں کی شرارتیں، مشرکین کا طریق کار، سازشی گروہوں کی مخالفت اور اس پس منظر میں آنحضرت ص کی استقامت،

آپ کے ساتھیوں کی دلیری اور اللہ کی نصرت کا تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے اور ہماری رہنمائی کے لئے آج بھی قرآن مجید موجود ہے اور ہمیں ہر موڑ پر روشنیاں بہم پہنچاتا ہے۔ معاشرے میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو مسلمانوں سے ملتا ہے تو انھیں اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلاتا ہے اور جب اپنے لیڈروں اور شرپسند رہنماؤں سے ملتا تو ان سے کہتا ہے، ارے ہم تو ان کا مذاق اڑانے ان کے یہاں آتے جاتے ہیں، ہم تمہارے ہی ساتھ تھے اور اسی طرح تمہارے وفادار رہیں گے۔ یہ سازشی، یہ جاسوس جس طرح کل تھے آج بھی مسلم ممالک، مسلم معاشرے اور مسلم قوموں میں فساد کا سبب ہیں۔

اللہ یستہزیء بھم...

ان لوگوں کے دو رنگے پن کا علاج یہ ہے کہ مومن اپنے اندر استحکام پیدا کریں، اللہ نے انھیں ڈھیل دی ہے کہ وہ اپنی شرارتیں اور شورشیں کر کے عریاں ہو جائیں، اللہ ان کے مذاق کا جواب دے گا۔ سورہ المطففین میں ہے "فالیوم الذین آمنوا من الکفار یضحکون" آج قیامت کے دن مومن کفار کا مذاق اڑائیں گے، یہ لوگ جنت میں ہوں گے اور وہ گروہ جہنم میں...

أولئك الذين اشتروا الضلالة...

جان بوجھ کر بات نہ سننے والے کس قدر بدنصیب ہیں، یہ ساز باز کرنے والے کیسے حواس باختہ ہیں کہ اسلام (شریعت و اصول اسلام) کے بدلے گمراہی و بے دینی کا سودا کرتے ہیں۔ یہ کاروبار اصل سرمایہ کو ہاتھ سے دینے اور ہدایت سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونے کا سبب ہوا۔ ہدایت ، اللہ اس کے رسولؐ اور جانشینان معصوم پیغمبر کی فرماں برداری تھی انہوں نے ان کی راہ چھوڑ کر یہود و نصاریٰ اور دشمنان اسلام کی راہ اختیار کی، اب یہ اسلامی افکار و کردار کہاں سے پیدا کریں۔ ہو سکے تو آج توبہ کریں اور قرآن کی راہ پر آجائیں۔ آج ساری راہیں فلاح و کامرانی کی کھل سکتی ہیں۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ

الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ

وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ

لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَ

رَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ
حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا
أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ
إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ:

(الف) ان کی مثال اس (بے رہنما مسافر) آدمی کی ہے جس نے (لق ودق بیابان میں) آگ جلائی اور جب آگ نے ہر طرف اجالا کیا تو اللہ نے اس (شخص کے ساتھیوں) کی روشنی ختم کردی اور سب کو ایسی تاریکیوں میں ڈال دیا کہ کچھ دیکھتے ہی نہیں۔(۱۷)۔ بہرے گونگے اندھے ہوچکے اب (کفروانکار) سے پلٹ نہیں سکتے۔(۱۸)

(ب) یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے بارش، جس میں اندھیرے ہی اندھیرے میں گرج کے ساتھ بجلی چمکے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں، حالانکہ اللہ نے انھیں گھیرے میں لے لیا ہو۔(۱۹)۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کی روشنی چھین لے۔ جب بھی انھیں روشنی نظر آتی ہے وہ چلنا شروع کردیتے ہیں اور جب اندھیرا چھاجاتا ہے تو رک جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کی سماعت وبصارت کھودیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔(۲۰)

مثلهم كمثل الذي استوقد ناراً...

ہدایت دے کر گمراہی لینے والوں کی ذھنی اور عملی حیرت کو دو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ یہ لوگ حق کی راہ و منزل چھوڑ کر بیابانوں میں سراسیمہ نکل کر روشنی تلاش کرتے ہیں کبھی عقلوں کے الاؤ جلاتے ہیں، کبھی دوسروں کے آسرے ذراسی چمک کو راستے پہچاننے میں مددگار سمجھ کر ادھر ادھر دوڑتے ہیں، لیکن الاؤ بجھ کر آنکھوں کو بے کار اور راستے کو بے نشان کردیتے ہیں اور یہ حیران رہ جاتے ہیں۔

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ خدا کسی کو یوں نہیں چھوڑتا جیسے مخلوق کو مخلوق اور آدمی کو آدمی چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ کا چھوڑنا یہ ہے کہ جب انسان، اسباب و توفیقات سے منہ موڑ لیتا ہے کفر و ضلالت و جہالت میں رہنے پر اصرار کرتا ہے تو اللہ اپنے توفیقات و الطاف کے دروازے بند کر دیتا ہے، یہ نہیں کہ اس کے اختیار کم کر کے اسے مجبور بنا دیتا ہے بلکہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ یوں وہ بنا

صمٌّ بكمٌ عميٌ...

اسلام کو پس پشت ڈالنے اور اللہ سے مقابلہ کرنے والوں کے حواس بے کار ہو چکے، اب یہ بولتے ہیں تو بے سلیقہ، سنتے ہیں تو بے فائدہ، دیکھتے ہیں تو بے نتیجہ۔ یہ لوگ سر تا سر پتھر بن چکے، اللہ نے نور اتارا، رسول نے منزل دکھائی، ائمہ نے رہبری کی حق پر استقامت کی دعوت دیتے رہے مگر انہوں نے لبیک کہنے، بات سننے کی قسم کھا رکھی تھی، آنکھوں پر پردے ڈال لیے تھے نتیجہ آخر کار وہاں جا پہنچے جہاں سے پلٹ کر آ نہیں سکتے۔

أو كصيبٍ من السماءِ...
يكاد البرق يخطف أبصارهم...

کافروں، منافقوں اور حق کی بات نہ ماننے والوں کی یہ دوسری مثال ہے کہ اندھیرے راستے پر بارش کا سامنا ہوا۔ کالے بادل میں گرج کے ساتھ کوندا لپکا تو خطرہ ہوا کہ اب کان اور آنکھ پر ستے مگر کریں کیا، بجلی چمکی تو دوڑے، اندھیرا ہوا تو ٹھہر گئے۔ یہ لوگ اللہ کی گرفت میں آ چکے۔

اس مقام پر قرآن کی زبان، تمثیل کا بیان اور نتائج کی توضیح کا انداز کسی دوسری زبان میں منتقل ہونا ناممکن ہے اور یہی قرآن کا معجزہ ہے۔

تقابلی مطالعہ جناب شیخ محمود قانصوہ

شیعہ سنّی کتب میں مشترک روایات

اسلام کے بنیادی ماخذ دو ہیں، کتاب اور سنت۔ کتاب کے بارے میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں، وحی ہے، منضبط ہے، محفوظ ہے، تحریف وتغیر وتبدل سے پاک ہے۔ سنت بھی مسلمانوں کے نزدیک سند ہے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی قول وفعل یقینی طور سے معلوم ہو جائے تو کوئی مسلمان اس سے سرتابی نہیں کر سکتا۔

کتاب کا نام قرآن مجید اور سنت کی ایک تعبیر حدیث سے کی جاتی ہے۔ ہر تحریر وتقریر کے سننے والے ایک اور یکساں ہی مطلب نہیں سمجھتے، چند سامعین سے مطلب پوچھئے تو الفاظ ومعانی میں فرق ملے گا قانون کی ہر عبارت سے وکیل کئی کئی معنے نکالتے ہیں۔ اسی طرح قرآن وحدیث کے جاننے والوں کی تعبیریں بھی جدا جدا ہیں، نقطہ اول سے بات شروع کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام ہم تک دو راستوں سے پہنچا۔ اہل بیت یعنی فاطمہؑ وعلیؑ واولاد علیؑ کے واسطے سے۔ اور صحابہ وتابعین وتبع تابعین کے ذریعے۔

اہل بیتؑ سے حدیث وتفسیر حاصل کرنے والے شیعہ کہلائے اور دوسرے راستے سے فیض یاب ہونے والے اہل سنت والجماعت۔ اسلام کے یہی دو دبستان ہیں اور ان ہی کے پاس دستاویزات واسناد ہیں۔ دونوں دبستانوں میں متعدد قسم کے اختلافات بھی ہیں اور اکابر علماء نیز اہل دانش وبینش نے ان کے تقابلی مطالعے بجزئیاتی تحقیقات پر کام بھی کیا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں صرف توجہ دہانی کے لیے عرض ہے:

علامہ طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں، علامہ طوسیؒ نے کتاب الخلاف اور علامہ حلیؒ نے القواعد اور دوسرے علما نے اپنے تالیفات میں فقہ وحدیث کے شیعہ سنی اختلافات کو جمع کیا ہے۔ ضرورت ہے اسلام کے غلبہ اور مسلمانوں کے اتحاد کی خاطر ایک مرتبہ پھر دونوں دبستانوں کے مختلف الجہات مطالعہ پر کام کیا جائے تاکہ اختلاف کے دروازے بند ہو سکیں اور اتحاد کی شاہراہ مل جائے۔

جناب الشیخ محمود قانصوہ نے "نماز جمعہ" کے عنوان پر ایک مطالعہ شروع کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سنی شیعہ کتب حدیث میں مشترک احادیث موجود ہیں۔ اگر ان میں اختلاف ہے تو بہت معمولی، کہیں لفظوں میں اور کہیں معنوں میں۔ غیر اختلافی روایات بھی بکثرت ہیں، اخلاق کے عنوان سے ہوں یا احکام کے ضمن میں۔ یہ باتیں دلیل ہیں کہ شیعہ وسنی میں اختلاف مباحث اسی طرح ہے جیسے علماء وافاضل کے فہم عبارت اور جمع مسائل میں ہوا کرتا ہے۔

جناب شیخ محمود قانصوہ نے اہمیت "صلاۃ الجمعہ" کے پیش نظر پہلے اسی موضوع پر احادیث جمع کی ہیں ہم ان کی ترتیب و تشریح مع ترجمہ ناظرین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

فضائل روز جمعہ پر احادیث

اہل بیتؑ سے روایات

١ ـ عن النبي (ص) قال: الجمعة سيد الأيام واعظمها عندالله عزوجل وهو اعظم عندالله من يوم الفطر ويوم الأضحى. فيه خمس خصال: خلق الله فيه آدم واهبط الله فيه آدم الى الارض وفيه توفى الله آدم وفيه ساعة لايسأل الله فيها أحد شيئاً إلا اعطاه مالم يسأل محرماً. وما من ملك مقرب ولاسماء ولا أرض ولا رياح ولاجبال ولاشجر إلا وهو مشفق من يوم الجمعة أن تقوم القيامة فيه[1].

١۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ سید ایام اور اللہ کے نزدیک ہفتے کا سب سے زیادہ عظمت والا اور خدا کے نزدیک یوم فطر و یوم قربان سے بھی زیادہ باعظمت دن ہے۔ اس دن کو پانچ خصوصیتیں حاصل ہیں: (الف) اس دن اللہ نے آدم علیہ السلام کو خلق فرمایا (ب) اس دن اللہ نے آدمؑ کو زمین پر اترنے کا حکم دیا (ج) اس دن اللہ نے آدمؑ کو وفات دی (د) جمعہ کے دن میں ایسی گھڑی آتی ہے کہ اس میں جو دعا بھی (جائز دعا) مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔ (ھ) جمعہ کے دن آسمان، زمین، ہوا، پہاڑ، درخت اور مقرب فرشتے سب ڈرتے ہیں کہ قیامت نہ آجائے۔

(متن کے حاشیے میں حدیث کی سندیں ملاحظہ ہوں)

٢ ـ محمد بن علي بن الحسين باسناده عن داود بن سرحان عن أبي عبدالله (ع) في قول الله عزوجل «وشاهد ومشهود» قال: الشاهد، يوم الجمعة[2].

٢۔ محمد بن علی بن حسین نے اپنی سند سے داؤد بن سرحان سے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے قول خدا "وشاہد و مشہود" کے بارے میں فرمایا: شاہد سے مراد "جمعہ" ہے۔

٣ ـ محمد بن يعقوب عن محمد بن علي بن محبوب عن محمد بن عيسى عن محمد بن الحصين عن محمد بن الفضيل عن عبدالرحمن بن زيد عن أبي عبدالله عن ابيه عن جده عليهم السلام قال: جاء اعرابي الى النبي (ص) يقال له قليب فقال يا رسول الله إني تهيأت الى الحج كذا وكذ امرة فما قدر لي. فقال (ص) يا قليب عليك بالجمعة فإنها حج المساكين[3].

٣۔ محمد بن یعقوب نے محمد بن علی بن محبوب سے انہوں نے محمد بن عیسیٰ، انہوں نے محمد بن حصین، انہوں نے محمد بن فضیل، انہوں نے عبدالرحمن بن زید، انہوں نے ابو عبداللہ، انہوں نے اپنے والد، انہوں نے اپنے آباء علیہم السلام سے روایت کی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قلیب نامی شخص حاضر ہوا، اور کہنے لگا: یا رسول اللہ میں نے حج کی بڑی تیاری کی مگر مجھے حج نصیب نہ ہوا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: قلیب! تم جمعہ کی پابندی کرو

وہ غریبوں کا حج ہے۔

٤ ــ وعن نوادر الراوندي باسناده عن موسى بن جعفر عن آبائه(ع) قال رسول الله(ص): التهجير الى الجمعة حج فقراء امتي. وارسل الراوندي حديثاً عن النبي(ص): الجمعة حج المساكين[٤].

۴۔ نوادر الراوندی میں مصنف نے اپنی سند کے ذریعہ امام موسیٰ بن جعفرؑ سے انہوں نے اپنے آبا کرام سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

میری امت کے غربا کا حج یہ ہے کہ جمعے کے دن دھوپ کے وقت نماز کے لیے جائیں۔

راوندی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مرسل حدیث نقل کی ہے:

جمعہ غربا کا حج ہے۔

٥ ــ محمد بن يعقوب، عن احمد بن محمد، عن حماد بن عيسى، عن الحسين بن المختار عن أبي بصير قال: سمعت اباجعفر(ع) يقول: ما طلعت الشمس بيوم افضل من يوم الجمعة[٥]

ومثله عن محمد بن محمد المفيد في المقنعة عن الباقر عليه السلام، نفس الحديث

۵۔ محمد بن یعقوب نے احمد بن محمد سے، انہوں نے حماد بن عیسیٰ سے انہوں نے حسین بن مختار سے انہوں نے ابوبصیر سے روایت کی: میں نے ابوجعفر علیہ السلام کو کہتے سنا: جمعے سے اچھے دن پر سورج نکلا ہی نہیں۔

المقنعہ میں محمد بن محمد المفید نے امام محمد باقر علیہ السلام سے بعینہٖ یہی حدیث نقل کی ہے۔

٦ ــ عن محمد بن يحيى، عن الحسين بن سعيد، عن ابراهيم بن أبي البلاد، عن بعض اصحابه عن أبي جعفر(ع) و ابي عبدالله(ع) قال: ما طلعت الشمس بيوم افضل من يوم الجمعة وإن كلام الطيرفيه إذا لقي بعضها بعضاً سلام سلام يوم صالح[٦].

۶۔ ..... ایک شخص نے ابوجعفر و ابوعبداللہ علیہما السلام سے روایت کی کہ امام نے فرمایا: روز جمعہ سے بہتر کسی دن پر سورج طالع نہیں ہوا، اس دن جب طائر آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں۔ "سلام، سلام روزِ صالح"

٧ ــ احمد بن محمد عن الحسين عن النضر بن سويد عن عبدالله بن سنان عن أبي عبدالله(ع) قال: كان رسول الله يستحب اذا دخل و إذا خرج في الشتاء أن يكون ذلك في ليلة الجمعة. وقال ابو عبدالله(ع) إن الله اختار من كل شيء فاختار من الأيام يوم الجمعة[٧]

۷۔ ..... حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موسم سرما میں آنے جانے کے لیے شب جمعہ کو پسند فرماتے تھے۔

اور ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے ہر چیز سے کسی فرد کو منتخب فرمایا ہے۔ دنوں میں سے روز جمعہ کو چنا ہے۔

٨ ــ عن درر اللئالي عن رسول الله أنه قال: خير يوم طلعت فيه الشمس يوم الجمعة... الحديث نفس الصفحة ونقله ايضاً عن الشيخ ابي الفتوح[٨].

۸۔ درر اللئالی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: سب سے اچھا دن جس میں سورج نکلتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے۔

(یہ حدیث شیخ ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں بھی لکھی ہے)

۹ ــ وعن الحسن بن علي بن محمد العطار عن محمد بن احمد بن مصعب عن احمد بن محمد بن اسحاق الآملي عن احمد بن محمد بن غالب عن دينار عن أنس عن النبي (ص) قال: إن ليلة الجمعة ويوم الجمعة أربع وعشرون ساعة لله عزوجل في كل ساعة ست مائة الف عتيق من النار ۹

۹۔ ...... دینار کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن رات یعنی اللہ کے چوبیس گھنٹے ہیں۔ اور ہر ساعت میں چھ لاکھ بندے جہنم سے آزاد ہوتے ہیں۔

۱۰ ــ مجمع البيان: عن النبي (ص): ان لله تعالى في كل يوم جمعة ستمأة الف عتيق من النار كلهم قد استوجبوا النار ۱۰

۱۰۔ ...... تفسیر مجمع البیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ہر جمعہ کو چھ لاکھ ایسے افراد جہنم سے خدا آزاد کرتا ہے جن میں سے ہر ایک پر دوزخ کی سزا لازمی ہو چکی ہے۔

۱۱ ــ عن النبي (ص): أنه كره الصلاة نصف النهار إلا يوم الجمعة وقال: إن جهنم تسجر كل يوم إلا يوم الجمعة ۱۱

۱۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عین دوپہر میں نماز جمعہ کے علاوہ ہر نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھا ہے۔ اور فرمایا: جہنم کی آگ روز بھڑکتی ہے، جمعہ کے علاوہ۔

۱۲ ــ المحاسن، عن ابيه عن الحسن بن يوسف عن المفضل بن صالح عن محمد بن علي (ع) قال: ليلة الجمعة ليلة غراء يومها يوم ازهر وليس على الارض يوم تغرب فيه الشمس اكثر معتقاً فيه من النار يوم الجمعة ۱۲

۱۲۔ مؤلف کتاب المحاسن نے اپنی سند سے روایت میں کہا ہے کہ امام محمد بن علی علیہما السلام نے فرمایا: جمعہ کی رات اور جمعہ کا دن، دوسری راتوں اور دوسرے دنوں سے زیادہ نورانی ہوتا ہے۔

اہل سنت کے روایات

۱ ــ اخبرنا ابوسعيد بن أبي عمرو أنبأنا ابو عبدالله محمد بن عبدالله الصفار ثنا احمد بن محمد البرقي القاضي ثنا ابومعمر ثنا عبد الوارث عن الحسين عن يحيى اخبرني ابوسلمة أنه سمع اباهريرة يقول: خير يوم طلعت فيه الشمس يوم الجمعة.. الحديث ۱۳

۱۔ ابوسعید بن ابوعمرو نے خبر دی، ان سے ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ صفار نے، ان سے احمد بن محمد برقی قاضی نے، ان سے ابومعمر نے ان سے عبدالوارث، ان سے حسین ان سے یحییٰ ان سے ابوسلمہ نے کہا، ابوہریرہ کہتے ہیں: سب سے بہتر وہ دن جس میں سورج نکلتا ہے۔ جمعہ کا دن ہے......

(حدیث کے اسناد اس کے علاوہ بھی ہیں)

۲ ــ وفي شعب الايمان للبيهقي: افضل الايام عندالله يوم الجمعة .

و روى ابن ماجة قال حدثنا ابوبكر بن أبي شيبة ثنا الحسين بن علي عن عبدالرحمن بن يزيد بن حابر عن أبي الاشعث الصنعاني عن شداد بن اوس قال: قال رسول الله (ص): إن من افضل ايامكم يوم الجمعة... الحديث) .

و في صحيح ابن حبان عن أبي هريرة: لا تطلع الشمس ولا تغرب على يوم افضل من يوم الجمعة. ورواه مجمع الزوائد وقال رجاله رجال الصحيح [14]

۲۔ بیہقی، شعب الایمان: خدا کے حضور، دنوں میں بہترین دن جمعہ ہے۔
ابن ماجہ نے روایت کی ہے، ابوبکر بن شیبہ نے حسین بن علی سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے انہوں نے اشعث صنعانی سے، انہوں نے شداد بن اوس سے سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا:
تمہارے دنوں میں افضل دن جمعہ ہے.....
صحیح ابن حبان میں ابوہریرہ سے مروی ہے:
جمعہ سے بہتر دن پر نہ سورج نکلتا ہے نہ ڈوبتا ہے۔
مجمع الزوائد میں بھی یہ روایت ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔

۳ ــ اخبرنا ابوالحسين علي بن محمد بن عبدالله بن بشران العدل ببغداد انبأ اسماعيل بن محمد الصفار ثنا ابوقلابة ثنا عمرو بن مرزوق أنبأ شعبة عن يونس بن عبيد عن عمار مولى بني هاشم عن أبي هريرة رضي الله عنه (وشاهد ومشهود) قال: الشاهد يوم الجمعة والمشهود يوم عرفة [15]

۳۔........ عمار مولی بنی ہاشم نے ابوہریرہ سے "وشاہد ومشہود" کے بارے میں سنا: شاہد روز جمعہ اور مشہود روز عرفہ ہے۔

٤ ــ وعن عطاء بن يسار: (شاهد يوم الجمعة ومشهود يوم عرفة) [16]

۴۔ عطاء بن یسار:
شاہد سے مراد جمعہ کا دن اور مشہود سے مراد عرفہ کا دن ہے۔

٥ ــ الجمعة حج المساكين [17]

۵۔ جمعہ مساکین کا حج ہے۔

٦ ــ الجمعة حج الفقراء [18]

۶۔ جمعہ فقرا کا حج ہے۔

٧ ــ وفي كنز العمال: إن لكم في كل جمعة حجة وعمرة فالحجة التهجير للجمعة [19] الحديث.

۷۔ کنز العمال: ہر جمعہ کو تمہارے لیے حج وعمرہ دونوں ہیں۔ حج، جمعہ کی دوپہر کو نماز کے لیے گھر سے جانا ہے....

٨ ــ ليلة الجمعة ويوم الجمعة اربع وعشرون ساعة لله تعالى في كل ساعة ست مائة الف عتيق من النار كلهم قد استوجبوا النار [20]

۸۔ جمعہ کے دن رات میں چوبیس گھنٹے اللہ کے ہیں اور ہر ساعت چھ لاکھ مستحق جہنم، دوزخ سے اللہ آزاد کرتا ہے۔

۹ ــ إن يوم الجمعة وليلة الجمعة اربع وعشرون ساعة ليس منها ساعة إلا ولله فيها ستمائة الف عتيق من النار كلهم قد استوجبوا النار.[۲۱]

۹۔ جمعہ کے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی ساعت ایسی نہیں جس میں اللہ چھ لاکھ مستحقین جہنم کو آتش دوزخ سے آزاد نہ کرتا ہو۔

۱۰ ــ ليس من يوم الجمعة إلا ولله عتقاء من النار ستمائة الف ونيف الى عشرين الفاً كلهم قد استوجبوا النار.[۲۲]

۱۰۔ جمعہ کا کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ کی طرف سے چھ لاکھ سے بڑھ کر بیس لاکھ مستحقین جہنم، آتش دوزخ سے آزاد نہ ہوتے ہوں۔

۱۱ ــ حدثنا محمد بن عيسى ثنا حسان بن ابراهيم عن ليث عن مجاهد عن ابي الخليل عن أبي قتاد عن النبي (ص) أنه كره الصلاة نصف النهار إلا يوم الجمعة وقال: إن جهنم تُسجّر إلا يوم الجمعة.[۲۳]

۱۱۔ . . . . ابوقتادہ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ سے سنا: آپؐ عین دوپہر میں نماز پڑھنا پسند نہ فرماتے تھے۔ جمعہ کا دن مستثنیٰ تھا۔

۱۲ ــ إن الله يسعر جهنم كل يوم في نصف النهار ويخبيها يوم الجمعة.[۲۴]

۱۲۔ اللہ روزانہ عین دوپہر کو جہنم کی آگ بھڑکاتا ہے۔ مگر جمعہ کے دن آگ ٹھنڈی کر دیتا ہے۔

۱۳ ــ حدثنا عبدالله حدثني ابي ثنا ابوعامر عبدالملك بن عمرو قال ثنا زهير يعني ابن محمد عن عبدالله بن محمد بن عقيل عن عبدالرحمن بن يزيد الانصاري عن أبي لبابة البديري ابن عبدالمنذر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: سيد الايام يوم الجمعة واعظمها عنده واعظم عندالله عزوجل من يوم الفطر ويوم الأضحى وفيه خمس خلال: خلق الله فيه آدم وأهبط الله فيه آدم الى الارض وفيه توفى الله آدم وفيه ساعة لايسأل العبد فيها شيئاً إلا آتاه الله تبارك وتعالى اياه مالم يسأل حراماً وفيه تقوم الساعة. مامن ملك مقرب ولاسماء ولا أرض ولا رياح ولاجبال ولا بحر إلاهن يشفقن من يوم الجمعة.[۲۲]

ونقله كشف الاستار باسناده عن سعد بن عبادة بزيادة أن تقوم فيه الساعة[۲۵]

۱۳۔ . . . . ابولبابہ البدیری ابن عبدالمنذر نے روایت کی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ سید الایام اور بارگاہ خدا میں عید فطر و عید قرباں سے زیادہ باعظمت ہے۔ اس دن کے پانچ خصوصیات ہیں۔ اس دن اللہ نے آدم کو خلق فرمایا، اس دن اللہ نے آدم کو زمین پر اتارا، اس دن اللہ نے آدم کو وفات دی، اس دن ایک ساعت ایسی ہے کہ اس میں بندہ اللہ سے جو بھی مانگے، اللہ تبارک و تعالیٰ دیتا ہے۔ بس یہ ہے کہ حرام چیز کے بارے میں سوال نہ ہو۔ جمعہ ہی کو قیامت برپا ہوگی۔ تمام مقرب فرشتے، آسمان اور زمین، ہوائیں اور پہاڑ اور سمندر، جمعہ کے دن سے سب ڈرتے ہیں۔

مؤلف کشف الاستار نے اپنی سند روایت کے ساتھ، سعد بن عبادہ سے یہی حدیث اس اضافے ـــ

نقل کی ہے۔ "اسی دن قیامت ہوگی۔"

جمعہ کے دن عمل کا وزن بڑھ جاتا ہے

روایات اہل بیت

١ ـ الصدوق بإسناده عن هشام بن الحكم عن أبي عبدالله الصادق(ع) في الرجل يريد أن يعمل شيئاً من الخير مثل الصدقة والصوم ونحوها قال: يستحب أن يكون ذلك يوم الجمعة فإن العمل يوم الجمعة يضاعف [٢٦]

١۔ ابو جعفر صدوق نے اپنا سلسلۂ روایت ہشام بن الحکم تک بیان کر کے امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان لکھا ہے: یہ کام بروز جمعہ ہونا چاہیے، کیونکہ جمعہ کے دن عمل کا وزن بڑھ جاتا ہے۔

٢ ـ عن محمد بن موسى بن المتوكل عن السعدآبادي عن احمد بن محمد البرقي عن ابيه عن احمد بن النضر عمرو بن شمر، عن جابر، عن أبي جعفر الباقر(ع) قال: الخير والشر يضاعف في يوم الجمعة [٢٧]

٢۔ محمد بن موسی بن متوکل نے سعد آبادی سے، انہوں نے احمد بن محمد البرقی سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے احمد بن نضر، انہوں نے

..... جابر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی امام نے فرمایا: روز جمعہ اچھائی اور برائی کا وزن بڑھ جاتا ہے۔

٣ ـ احمد بن ابي عبدالله البرقي (في المحاسن) عن ابن فضال عن العلاء بن رزين عن محمد بن مسلم عن ابي جعفر الباقر(ع) قال: إن الصدقة يوم الجمعة تضاعف. وكان ابوجعفر(ع) يتصدق بدينار [٢٨]

٣۔ احمد بن ابی عبداللہ برقی نے (محاسن میں) ابن فضال سے انہوں نے علاء بن رزین سے انہوں نے محمد بن مسلم سے انہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا... حضرت فرماتے تھے: جمعہ کے دن صدقہ کا وزن بڑھ جاتا ہے۔

اور امام محمد باقر علیہ السلام دینار صدقے میں دیا کرتے تھے۔

٤ ـ وعن عبدالله بن محمد عن عمرو بن شمر عن جابر قال كان علي(ع) يقول:... في حديث... واعلموا أن الخير والبر يضاعفان يوم الجمعة [٢٩].

٤۔ عبداللہ بن محمد نے عمرو بن شمر سے، انہوں نے جابر سے روایت کی۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے تھے:

.... جمعہ کے روز خیر و شر کا وزن بڑھ جاتا ہے۔

اہل سنت کے روایات:

١ ـ تضاعف الحسنات يوم الجمعة .

ورواه في مجمع الزوائد عن ابي هريرة نقله عن الطبراني في الأوسط. [٣٠]

۱۔ جمعہ کے دن حسنات کا وزن بڑھ جاتا ہے۔
مجمع الزوائد میں ابوہریرہ سے یہ روایت ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں نقل کی ہے۔

جمعہ کے دن درود

روایات اہل بیت[ع]:

۱ ـ ثواب الاعمال: عن ابیه عن سعد عن أحمد بن أبي عبدالله عن ابیه عن احمد بن أبي المنذر عن الحسن بن علي عن محمد بن الفضيل عن أبي الحسن الرضا(ع) قال: قال رسول الله (ص) من صلى عليّ يوم الجمعة مائة صلاة قضى الله له ستين حاجة (منها للدنيا) ثلاثون حاجة للدنيا و ثلاثون حاجة للآخرة [۳۱]

۱۔ ثواب الاعمال میں بسند امام ابوالحسن الرضا علیہ السلام سے روایت ہے حضرت نے فرمایا:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، جو شخص جمعہ کے دن مجھ پر سو مرتبہ درود بھیجے اللہ اس کی ساٹھ تمنائیں پوری کرے گا، تیس دنیا سے متعلق، تیس آخرت کے بارے میں۔

۲ ـ وعن علي بن محمد ومحمد بن الحسن عن سهل بن زياد عن جعفر بن محمد الاشعري عن ابن القداح عن أبي عبدالله (ع) قال: قال رسول الله (ص): اكثروا من الصلاة عليّ في الليلة الغراء واليوم الأزهر ليلة الجمعة ويوم الجمعة فسئل الى كم الكثير. قال: الى مائة ومازادت فهو افضل [۳۲]

۲۔ . . . . ابن قداح نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے: حضرت نے فرمایا:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:
شب و روز روشن میں مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجا کرو۔ شب و روز جمعہ۔ پوچھا گیا۔ کس قدر زیادہ؟ فرمایا، سو یا اس سے زیادہ مرتبہ۔ افضل یہی ہے۔

۳ ـ وعن النبي (ص) قال: اكثروا من الصلاة عليّ في كل جمعة فمن كان اكثركم صلاة عليّ كان اقربكم مني منزلة. ومن صلى عليّ يوم الجمعة مائة مرة جاء يوم القيامة وعلى وجهه نور ومن صلى عليّ في يوم الجمعة الغامرة لم يمت حتى يرى مقعده في الجنة [۳۰] ـ والأحاديث في الباب كثيرة فراجع البحار و غيره. [۳۳]

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے۔ حضرت نے فرمایا:
ہر جمعہ کو مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود پڑھا کرو۔ جو شخص مجھ پر کثرت سے درود بھیجے گا وہ درجہ میں میرے زیادہ قریب ہوگا۔ جو شخص جمعہ کے دن مجھ پر سو مرتبہ درود بھیجے گا وہ قیامت کے دن نورانی چہرے کے ساتھ آئے گا۔ اور جو شخص جمعہ غامرہ (رحمت سے گھرے ہوئے) میں صلوٰۃ بھیجے گا وہ جنت میں اپنی منزل دیکھے بغیر نہیں مرے گا۔ بحار وغیرہ میں اس موضوع پر بہت سی حدیثیں ہیں۔

اہل سنت کے روایات:

١ ـ اخبرنا ابوسهل احمدبن محمدبن ابراهيم المهراني انبأ محمدبن جعفر السختياني ثنا ابوخليفة ثنا عبدالرحمن بن سلام انبأ ابراهيم بن طهمان عن أبي اسحاق عن أنس قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اكثروا الصلاة عليّ يوم الجمعة وليلة الجمعة فمن صلّى عليّ صلاة صلى الله عليه عشراً [٣٤]

ا۔ ابوسہل احمد بن محمد بن ابراہیم مہرانی نے محمد بن جعفر سختیانی سے انہوں نے ابوخلیفہ سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن سلام سے، انہوں نے ابراہیم بن طہمان سے، انہوں نے ابو اسحاق سے، انہوں نے انس سے روایت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

شب و روز جمعہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجا کرو۔ اس دن ایک صلوٰۃ پڑھنے والے کو اللہ دس رحمتوں سے نوازتا ہے۔

٢ ـ اخبرنا ابو عبدالله الحافظ وابوسعيد ابن ابي عمرو قالا ثنا ابوالعباس محمدبن يعقوب أنبأ ابوجعفر احمدبن عبدالحميد الحارثي ثنا الحسين بن علي الجعفي عن عبدالرحمن بن يزيد بن جابر عن ابي الاشعث الصنعاني عن اوس بن اوس قال، قال رسول الله(ص): افضل ايامكم يوم الجمعة فيه خلق آدم وفيه قبض وفيه النفخة وفيه الصعقة فاكثروا عليّ من الصلاة فيه فإن صلاتكم معروضة... الحديث [٣٥]

٢۔ . . . . رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تمہارے دنوں میں سب سے افضل جمعہ ہے، اس دن آدمؑ خلق ہوئے اسی روز انہوں نے انتقال کیا۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا اس دن کڑک ہوگی، اس دن مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجا کرو کیونکہ تمہاری صلوٰۃ میرے سامنے پیش ہوتی ہے۔ . . . . الی آخرہ

٣ ـ وعن خالدبن معدان عن رسول الله(ص) قال: اكثروا الصلاة عليّ في كل يوم جمعة فإنه صلاة امتي تعرض عليّ في كل جمعة [٣٦]

٣۔ خالد بن معدان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث نقل کی ہے حضرت نے فرمایا:

ہر جمعہ کو مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجا کرو کیونکہ میری امت کے درود ہر جمعہ کو میرے حضور میں پیش کئے جاتے ہیں۔

٤ ـ وعن صفوان بن سليم أن رسول الله(ص) قال: إذا كان يوم الجمعة وليلة الجمعة فاكثروا الصلاة عليّ» [٣٧]

٤۔ صفوان بن سلیم کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

روز جمعہ و شب جمعہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجا کرو۔

آداب جمعہ۔ روز کفارہ

روایات اہل بیت:

١ ـ عن محمد بن يحيى عن محمد بن الحسين عن موسى بن سعدان عن عبدالله بن سنان عن ابي عبدالله الصادق(ع) قال: من أخذ شاربه وقلّم اظفاره وغسل رأسه بالخطمي يوم الجمعة كان كمن اعتق نسمة[٣٨]

۱۔ ..... عبداللہ بن سنان نے حضرت ابو عبداللہ صادق علیہ السلام سے روایت کی حضرت نے فرمایا۔

جس نے جمعہ کے دن لبیں کتریں اور، ناخن تراشے (خط بنایا) سر خطمی سے دھویا، اس کا مرتبہ یہ ہے جیسے کسی نے ایک غلام آزاد کیا ہو۔

(شیخ طوسی نے اپنی سند سے یہی حدیث محمد بن یحییٰ کی زبانی نقل کی ہے)

٢ ـ وعن علي بن ابراهيم عن أبيه عن ابن أبي عمير عن محمد بن طلحة قال: قال ابو عبدالله(ع): تقليم الأظفار وقص الشارب وغسل الرأس بالخطمي كل جمعة ينفي الفقر و يزيد في الرزق[٣٩]

۲۔ ..... محمد بن طلحہ نے روایت کی ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: ہر جمعہ کو ناخن تراشنا، لبیں کترنا اور خطمی سے سر دھونا، فقر سے دوری اور روزی میں وسعت کا سبب ہے۔

٣ ـ وعن علي بن ابراهيم عن ابيه عن اسماعيل بن عبدالخالق عن محمد بن طلحة نحوه في ثواب الأعمال عن أبيه عن علي بن ابراهيم عن أبيه عن الحسين بن يزيد عن السكوني عن أبي عبدالله عن أبيه عن آبائه عليهم السلام قال: قال رسول الله (ص): من قلّم اظفاره يوم الجمعة أخرج الله من أنامله الداء وأدخل فيه الدواء[٤٠]

۳۔ علی بن ابراہیم نے اپنے والد، انہوں نے اسماعیل بن عبدالخالق سے انہوں نے محمد بن طلحہ سے اسی طرح کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

ثواب الاعمال میں مؤلف نے اپنی سند سے حضرت ابی عبداللہ اور انہوں نے اپنے آبا کرام علیہم السلام سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص جمعہ کے دن ناخن تراشتا ہے خدا اس کی انگلیوں سے مرض نکالتا اور دوا داخل کرتا ہے۔

٤ ـ وفي المستدرك عن الجعفريات باسناده قال رسول الله (ص): ليتطيب احدكم يوم الجمعة: ولو من قارورة امرأته[٤١]

۴۔ مستدرک میں جعفریات کے مؤلف کی سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

جمعہ کے دن خوشبو ضرور لگایا کرو، خواہ وہ اپنی اہلیہ کی شیشی ہی سے کیوں نہ لگاؤ۔

٥ ـ في الخصال حدثنا أبي (رض) قال حدثنا محمد بن يحيى العطار عن محمد بن احمد عن معاوية ابن حكيم عن معمر بن خلاد عن أبي الحسن الرضا(ع) قال: لاينبغي للرجل أن يدع الطيب في كل يوم فإن لم يقدر عليه فيوم و يوم لافإن لم يقدر ففي كل جمعة ولا يدع ذلك[٤٢]

۵۔ خصال میں صدوق نے اپنے اسناد کے ساتھ حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرت نے فرمایا، آدمی کو روزانہ عطر لگانا چاہیے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایک دن بیچ کر کے یہ بھی ممکن نہ ہو تو جمعہ

جمعہ مگر اسے نہ چھوڑے۔

٦ ـ عن عدة من أصحابنا عن أحمد بن أبي عبدالله عن محمد بن موسى بن الفرات عن علي بن مطر عن السكن الخزاز قال: سمعت أبا عبدالله(ع) يقول: حق على كل محتلم في كل جمعة أخذ شاربه وأظفاره ومس شيء من الطيب وكان رسول الله(ص) إذا كان يوم الجمعة ولم يكن عنده طيب دعا ببعض خمر نسائه فبلها في الماء ثم وضعها على وجهه [١٣].

و رواه الصدوق في (الخصال) عن أبيه وعن محمد بن يحيى عن محمد بن أحمد عن أحمد بن أبي عبدالله مثله الى قوله: ومس شيء من الطيب.

٦۔ .... سکن خزاز کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا: ہر جمعہ کے روز محتلم پر فرض ہے کہ لبیں کترے، ناخن تراشے (خط بنائے) خوشبو لگائے۔ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ جمعہ کے دن اگر عطر نہ ہوتا تھا تو کسی اہلیہ کی خوشبودار چادر منگا کر پانی میں ڈال دیتے پھر اس خوشبودار پانی سے روئے انور دھوتے تھے۔

اس حدیث کو صدوق نے الخصال میں اپنے والد کی سند سے نقل فرمایا ہے۔ مگر وہاں "خوشبو لگائے" .... کے بعد کا ٹکڑا نہیں ہے۔

٧ ـ محمد بن يعقوب عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد عن معمر بن خلاد عن أبي الحسن(ع) قال: لاينبغي للرجل أن يدع الطيب في كل يوم فإن لم يقدر عليه فيوم و يوم فإنه لم يقدر ففي كل جمعة ولايدع[١].

ورواه الصدوق مرسلاً. وعيون الأخبار باسناد آخر الى معمر بن خلاد عن الرضا (ع) ايضاً مثله ورواه في الخصال عن ابيه بنفس السند المتقدم مثله.[٢٢]

٧۔ .... معمر بن خلاد نے حضرت امام ابوالحسن علیہ السلام سے روایت کی ہے حضرت نے فرمایا: آدمی کو ہر روز خوشبو لگانا چاہیے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایک دن بیچ کر کے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو جمعہ جمعہ۔ مگر اسے نہ چھوڑے۔

صدوق نے یہ حدیث ایک مرتبہ مرسل نقل کی ہے اور عیون الاخبار میں نئی سند کے ذریعے امام رضاؑ سے اور الخصال میں یہی سند اپنے والد کے ذریعے نقل کی ہے۔

اہل سنت کے روایات:

١ ـ عبدالرزاق عن معمر عمن سمع أنساً يقول: إن النبي(ص) قال: إن الجمعة إلى الجمعة كفارة والصلوات الخمس كفارات لمابينهن ما اجتنبت الكبائر. قال: فقال رجل: يا نبي الله اتكفر الجمعة الى الجمعة قال: نعم و زيادة ثلاثة أيام[٥]؟

١۔ عبدالرزاق نے معمر سے انہوں نے اپنے شیوخ سے انس کی زبانی کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے: ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک مدت کفارہ ہے۔ اور نماز پنجگانہ درمیانی زمانے کا کفارہ ہیں۔ کتنے ہی گناہان کبیرہ ہوں، راوی نے کہا، کسی شخص نے پوچھا: نبی اللہؐ. جمعہ سے جمعہ تک کفارہ

ہے؟ فرمایا: ہاں، اور تین دن کا اضافہ ہے۔

٢ ــ عبدالرزاق عن ابن عيينة عن أبي اسحاق قال سمعته يحدث عن الحارث عن علي قال: الناس في الجمعة ثلاث: رجل شهدها بسكون ووقار وانصات وذلك الذي يغفر الله ما بين الجمعتين قال: حسبته قال وزيادة ثلاثة ايام قال: وشاهد شهدها بلغو فذلك حظه منها ورجل صلى بعد خروج الإمام بسنة إن شاء اعطاه وان شاء منع [٢٦]

٢۔ عبدالرزاق نے ابن عینیہ سے انہوں نے ابو اسحاق سے حدیث کا بیان سنا کہ وہ حارث سے نقل کر رہے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کے دن تین طرح کے آدمی سامنے آتے ہیں: وہ شخص جو سکون و وقار و خاموشی کے ساتھ نماز جمعہ پڑھتا ہے۔ اس شخص کے دو جمعوں کے درمیانی گناہ اللہ بخش دے گا، راوی نے کہا، میرا خیال ہے حضرت نے مزید تین دن بھی فرمائے۔ فرمایا: ایک وہ آدمی جو جمعہ میں حاضر ہو اگر خطبے میں باتیں کرتا رہا، اب اس کا جو بھی مقدر ہو، ایک آدمی وہ ہے جو امام کے چلے جانے کے بعد سنت ادا کرتا ہے، اس کے بارے میں اللہ کی مرضی ہے وہ چاہے تو کرم فرمائے نہ چاہے تو محروم رکھے۔

٣ ــ عبدالرزاق عن ابن عيينة عن ابن عجلان عن سعيد ابن أبي سعيد عن عبدالله بن وديعة الحرزي عن ابي ذر قال: وسمعت عبدالوهاب عن أبي ذئب عن أبي ذر قال: من اغتسل يوم الجمعة فأحسن غسله ولبس من صالح ثيابه ومس ما كتب الله من طيب أهله او دهنه ثم راح الى الجمعة فلم يفرق بين اثنين غفر له مابين الجمعتين وزيادة ثلاثة أيام [٢٧]

٣۔ . . . . ابو ذئب نے ابو ذر سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا:

حضرت نے فرمایا۔

جس نے جمعہ کے دن اچھی طرح غسل کیا، اچھے کپڑے پہنے اور اللہ نے جو بھی عطا کیا ہے۔ اپنے گھر والوں کا عطر یا تیل استعمال کیا، پھر جمعہ کے لیے گیا اور دونوں میں فرق نہ کیا، اللہ اس کے دو جمعوں کے درمیانی گناہ اور مزید تین دن کے گناہ بخش دے گا۔

٤ ــ من اغتسل يوم الجمعة ثم أتى الجمعة فصلى ماقدر له ثم أنصت حتى يفرغ الإمام من خطبته ثم يصلي معه غفر له مابينه وبين الجمعة الأخرى وفضل ثلاثة أيام.
وقد روي مثل ذلك عن سلمان وابي سعيد واوس بن اوس [٢٨]

٤۔ جو شخص جمعہ کو غسل کر کے نماز جمعہ میں جائے اور جس حد تک نماز پڑھ سکتا ہے پڑھے پھر امام کے خطبے میں آخر خطبہ تک خاموش رہے، پھر جماعت میں شریک ہو، اللہ اس جمعے سے دوسرے جمعہ تک کے گناہ معاف فرماتا اور تین دن مزید اس میں شریک کرتا ہے۔ (یعنی دس دن کے گناہ بخشتا ہے)
اسی قسم کے الفاظ سلمان، ابو سعید اور اوس بن اوس نے بھی نقل کیے ہیں)

٥ ــ اخبرنا ابوبكر بن الحسن وابوزكريا بن أبي اسحاق قالا ثنا ابوالعباس محمد بن يعقوب هو الاصم ثنا بحر بن نصر قال قرىء على ابن وهب اخبرك حياة بن شريح عن بكر بن عمر عن بكير بن عبدالله بن الاشج عن نافع أن عبدالله بن عمر كان يقلم اظفاره ويقص شاربه في كل جمعة وروينا عن ابي جعفر مرسلاً قال: كان رسول الله (ص) يستحب أن يأخذ من شاربه واظفاره يوم الجمعة [٢٩]

۵۔ .... نافع کی روایت ہے: عبداللہ بن عمر ہر جمعہ کو اپنے ناخن تراشتے اور لبوں کو کترتے تھے
اور ہم نے ابو جعفرؑ سے روایت مرسلہ بیان کی ہے:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن لب کتروانا اور ناخن ترشوانا پسند کرتے تھے۔

٦ ـ اخبرنا ابو بكر احمد بن اسحاق الفقيه انبأ علي بن عبدالعزيز ثنا الحجاج بن المنهال ثنا حماد ابن سمة عن محمد بن اسحاق عن محمد بن ابراهيم عن ابي هريرة وابي سعيد أن رسول الله (ص) قال: من غسل يوم الجمعة واستاك ولبس احسن ثيابه وتطيب بطيب إن وجده ثم جاء ولم يتخط الناس فصلى ماشاء الله أن يصلي فإذا خرج الامام سكت فذلك كفارة الى الجمعة الاخرى.٥

٦۔ ..... ابوہریرہ اور ابوسعید سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص روز جمعہ مسواک کرتا اور نہاتا، اچھے کپڑے پہنتا، اور عطر لگاتا ہے۔ اگر دستیاب ہو۔ اس کے بعد (سکون و وقار سے) لوگوں کو پامال کیے بغیر جمعہ میں جاتا ہے، وہاں جس قدر ہو سکتا ہے نماز پڑھتا ہے۔ امام کے جانے کے بعد وہ خاموش رہتا ہے۔ اس کا یہ عمل دوسرے جمعہ تک اس کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

٧ ـ عن أبي هريرة: من اغتسل يوم الجمعة واستاك ومس من طيب إن كان عنده ولبس من احسن ثيابه... حتى يقول: كانت كفارة لما بينها وبين الجمعة التي قبلها. قال (الراوي): وكان ابوهريرة يقول: ثلاثة أيام زيادة ان الله جعل الحسنة بعشر امثالها.٦

٧۔ ابوہریرہ سے روایت ہے: جو شخص جمعہ کے دن مسواک کرتا، نہاتا اور اگر عطر ہے تو اس سے معطر ہوتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے ...... یہ عمل اس جمعہ سے آئندہ جمعہ تک کے لیے کفارہ ہوتا ہے۔
راوی کے بقول ابوہریرہ کہتے تھے: چونکہ خدا نے حسنہ کا ثواب دس گنا رکھا ہے لہذا اس میں بھی جمعہ کے سات دنوں پر تین دنوں کا اضافہ ہے۔

حاشیے

۱۔ وسائل الشیعہ ج ۳ ص ٦٧۔ ونقل فی ہامشہ عن عدۃ الداعی ص ۲۸۔ والخصال ج ۱ ص ۱۵۲ ومصباح المتہجد ص ۱۹٦۔ ونقلہ مستدرک الوسائل ج ۱ ص ۴۱۸ عن ابی الفتوح فی تفسیرہ عن سعد بن عبادہ۔ والبحار ج ۸۹ ص ۲٦٧۔

۲۔ الوسائل ج ۳ ص ٦۵ وفی ہامشہ نقلہ عن الفقیہ ج ۱ ص ۱۳۸ ومصباح المتہجد ص ۱۹٦ فقال: والمطبوع باضافہ والمشہود یوم عرفہ۔

۳۔ الوسائل ج ۳ ص ۵ وفی ہامشہ عن التہذیب ج ۱ ص ۳۲۱ وارسل الشہید فی رسالۃ الجمعہ عن النبیؐ الجمعہ حج المساکین کمافی البحار ج ۸۹ ص ۲۱۲ ونقلہ فی المستدرک ج ۱ ص ۴۱۸ عن تفسیر ابی الفتوح۔

۴۔ البحار ج ۸۹ ص ۱۹۷ و ۱۹۹ و ۲۵۵ عن نوادر الراوندی وعن دعائم الاسلام۔

۵۔ الوسائل ج ۳ باب وجوب تعظیم یوم الجمعه حدیث ۲۔ الفروع ج ۳ ص ۴۱۳ وعن التهذیب ج ۱ ص ۲۴۵ نقله البحار ج ۸۹ ص ۲۸۴۔

۶۔ الوسائل ج ۳ ا باب المتقدم حدیث ۲۳ وعن المقنعه ص ۲۵ ونقل فی البحار عن المقنعه ج ۸۹ ص ۲۸۶

۷۔ الوسائل ج ۳ ا باب المتقدم حدیث ۸۰۔ وفی هامشه عن الفروع ج ۱ ص ۱۱۵۔ والتهذیب ج ۱ ص ۲۴۶ وفی البحار ج ۸۹ ص ۲۷۳ عن عدة الداعی۔

۸۔ الکافی ج ۳ ص ۴۱۳ ومستدرک الوسائل ج ۱ ص ۴۱۸۔

۹۔ مستدرک الوسائل ج ۱ ص ۴۱۸ ونقله ایضاً عن الشیخ ابی الفتوح۔

۱۰۔ الوسائل ج ۳ ص ۶۶۔ الخصال ج ۲ ص ۳۰۰۔ ومستدرک الوسائل ج ۱ ص ۴۱۸ عن الراوندی بزیادة والبحار ج ۸۹ ص ۲۶۸ من دون ذکر الآملی۔

۱۱۔ بحار الانوار ج ۸۹ ص ۲۸۴ عن مجمع البیان۔

۱۲۔ البحار ج ۸۹ ص ۲۱۳۔

۱۳۔ البحار ج ۸۹ ص ۲۷۱ عن المحاسن۔

۱۴۔ البحار ج ۸۹ ص ۲۸۴ عن مجمع البیان۔

۱۵۔ سنن البیهقی ج ۳ ص ۲۵۱ و ۲۵۰ ومثله فی کنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۶۶) نقله فی هامشه عن احمد ومسلم والترمذی عن ابی هریره۔ ومثله فی الأم ج ۱ ص ۱۸۵۔ والترمذی ج ۲ ص ۳۵۹ و ۳۶۲ وابی داؤد ج ۱ ص ۲۷۴ ومنحة المعبود ج ۱ ص ۱۳۹ المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۷۸ و ۲۷۹ والمنتقی ج ۲ ص ۱۳ وفی مفتاح کنوز السنه نقله عن مسلم وابوداؤد والنسائی وابن ماجه واحمد ومن احب فلیراجع ص ۱۱۶ ومسلم ج ۲ ص ۶۔

۱۶۔ کنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۴۹) عن البیهقی فی شعب الایمان عن ابی هریره۔

۱۷۔ ابن ماجه ج ۱ ص ۳۴۵۔ وکنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۵۳) عن البیهقی فی شعب الایمان عن ابی هریره۔

۱۸۔ کنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۹۳) عن ابن حبان وفی مصابیح السنة للبغوی هذا المعنی فی حدیث ج ۱ ص ۶۸۔

۱۹۔ ج ۲ ص ۱۶۴۔

۲۰۔ سنن البیهقی ج ۳ ص ۱۷۰ وکنز العمال ج ۷ ص ۵۰۷ مثله بتغییر فی اوله وآخره ومثله عن مصابیح السنة للبغوی ج ۱ ص ۶۸۔

۲۱۔ کذا فی الام للشافعی وهو فی البیهقی ج ۳ ص ۱۷۰ باسناد آخر عن عبدالله بن رافع عن ابی هریره۔

۲۲۔ کنز العمال ج ۷ ص ۵۰۱ عن ابن زنجویه فی ترغیبه والقضاعی۔

۲۳۔ کنز العمال ج ۷ ص ۵۰۱ عن القضاعی وابن عساکر۔

۲۴۔ کنز العمال ج ۷ ص ۵۲۲۔

۲۵۔ کنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۶۰)

۲۶۔ کنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۹۶) ومجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۶۵۔

۲۷۔ کنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۹۸)

۲۸۔ سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۲۸۴

۲۹۔ کنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۵۲)

۳۰۔ مسند احمد ج ۳ ص ۴۳۰ وراجع الام للشافعی بتغییر یسیر ج ۱ ص ۱۸۵ وکنز العمال ج ۷ حدیث (۳۳۵۴) و (۳۳۷۷) و (۳۳۸۶) و (۳۳۹۲) عن الشافعی واحمد والبخاری فی تاریخہ عن سعد بن عبادہ وابی لبابہ وسنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۳۴۴۔

۳۱۔ کشف الاستار ج ۱ ص ۲۹۴ والمنتقی ج ۱ ص ۱۴ ونقلہ عن احمد وابن ماجہ۔

۳۲۔ الوسائل ج ۳ ص ۶۶ وفی ہامشہ عن الفقیہ ج ۱ ص ۱۲۸۔ الخصال ج ۲ ص ۳۱ بسند آخر وراجع البحار ج ۸۹ ص ۳۴۷۔

۳۳۔ الوسائل ج ۳ ص ۶۶ عن ثواب الاعمال والبحار ج ۸۹ ص ۲۸۳ ومستدرک الوسائل ج ۱ ص ۴۱۸۔

۳۴۔ الوسائل ج ۳ ص ۹۰۰۔ المحاسن ص ۵۹ ونقلہ فی البحار ج ۸۹ ص ۳۴۹۔

۳۵۔ الوسائل ج ۳ ص ۶۹ والمحاسن للبرقی ص ۵۸۔

۳۶۔ کنز العمال ج ۷ حدیث ۳۳۸۹ عن الطیالسی، عن ابی ہریرہ۔

۳۷۔ الوسائل ج ۱، ونقلہ عن ثواب الاعمال ص ۸۵ ونقلہ البحار ج ۸۹ ص ۳۵۱

۳۸۔ الوسائل ج ۳ ص ۲، فروع الکافی ج ۳ ص ۴۲۸ والبحار ج ۸۹ ص ۲۱۲ نقلہ عن رسالۃ الشہید الثانی فی الجمعہ۔

۳۹۔ البحار ج ۸۹ ص ۳۲۸۔

۴۰۔ سنن البیہقی ج ۳ ص ۲۴۹ وبہذا المعنی عن ابی ہریرہ فی مجمع الزوائد ج ۲ ص ۱۶۸ ونقلہ عن الاوسط الطبرانی۔

۴۱۔ سنن البیہقی ج ۳ ص ۲۴۸ والنسائی ج ۳ ص ۹۱ وسنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۷۵ ومثلہ فی المستدرک للحاکم ج ۱ ص ۲۷۸ وسنن الدارمی ج ۱ ص ۳۶۹ والمنتقی ج ۲ ص ۱۶ وسنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۳۴۵ وقد ذکرناہ فی باب فضل الجمعہ۔

۴۲۔ المنتقی ج ۱ ص ۱۷ ونقلہ عن سنن سعید وقال ہو مرسل۔

۴۳۔ المنتقی ج ۲ ص ۱۷ ونقلہ عن الشافعی فی المسند وقال ہو مرسل۔

۴۴۔ الوسائل ج ۳ ص ۷۴۔ الفروع ج ۲ ص ۲۲۰۔ التہذیب ج ۱ ص ۳۲۱۔

۴۵۔ الوسائل ج ۳ ص ۷۴۔ الفروع ج ۲ ص ۲۱۷ وج ۱ ص ۱۱۶۔

۴۶۔ الوسائل ج ۳ ص ۴۹ ثواب الاعمال ص ۱۴ الخصال ج ۲ ص ۳۰۔ نقلہ فی البحار ج ۸۹ ص ۳۴۵ باسناد آخر وبزیادۃ فی آخرہ وعن نوادر الراوندی باسناد آخر عن موسی بن جعفر ج ۸۹ ص ۳۶۱ وفی الخصال عین الحدیث باسناد آخر ج ۲ ص ۳۹۱ وبمعناہ فی مستدرک الوسائل ج ۱ ص ۴۱۴ عن الجعفریات وعن کتاب العروس بزیادہ فی آخرہ۔

۴۷۔ مستدرک الوسائل ج ا ص ۴۱۴۔

۴۸۔ الخصال ج ۲ ص ۳۹۲۔

۴۹۔ الوسائل ج ۳ ص ۵۴ وفی ہامشہ عن الفروع ج ۲ ص ۲۲۲۔ الخصال ج ۲ ص ۳۰ نقلہ فی الہامش و فی
الخصال لم یذکر عن رسول اللہ ج ۲ ص ۳۹۲ وراجع البحار ج ۸۹ ص ۳۶۵ و ۳۴۶۔

۵۰۔ الوسائل ج ۳ ص ۵۴ ونقلہ عن الفروع ج ۲ ص ۲۲۲ والفقیہ ج ا ص ۱۳۹ اما عیون الاخبار ففی ص ۱۵۵
والخصال فی ج ۲ ص ۳۰۔

۵۱۔ مصنف عبد الرزاق ج ۳ ص ۲۶۷۔

جناب مفتی سید طیب آغا جزائری (قم)

حدیث کا ایک تقابلی مطالعہ

مذہب امامیہ (اثنا عشری) چار اصلوں (بنیادوں) پر استوار ہے:-

۱۔ قرآن ۲۔ سنت ۳۔ اجماع ۴۔ عقل

قرآن (کثیر موارد میں) بغیر سنت کے مجمل ہے، اس بنا پر قرآن کی تفسیر کے لیے حدیث ناگزیر ہے۔ مثال کے طور پر قرآن نے صرف اتنا کہا کہ ـــ " اقیموا الصلوٰۃ " نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں بتلایا، اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ـــ " صلوا کما رائیتمونی اُصلّی " یوں نماز پڑھو جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھو، اس لیے نماز کے احکام جاننے کے لیے تنہا قرآن کافی نہیں بلکہ سنت رسولؐ کی ضرورت ہے، یہی حال روزہ، حج اور دیگر احکام کا ہے، عامۃ الناس کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی طرف سے قرآن کی کوئی تفسیر کریں کیونکہ یہ متفقہ حدیث ہے کہ ـــ جس نے من گھڑت تفسیر قرآن کی اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لہٰذا فہم معانی قرآن غیر ظاہر کا انحصار سنت رسولؐ پر ہے۔

سنت رسولؐ کو جاننے کے لیے دو راستے ہیں (۱) اہلبیت طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین (۲) اصحاب۔ ان دونوں راستوں میں سے اہلبیتؑ کا راستہ یقیناً بہتر ہے۔ کیونکہ قاعدۂ عقلی ہے ـــ اھل البیت ادریٰ بما فی البیت (گھر کی باتیں گھر والے بہتر جانتے ہیں)، پھر یہ حدیث بھی متفق علیہ اور متواتر ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

> معاشر الناس انا تارث فیکم ثقلین اولھما کتاب اللہ ـــ واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی، اذکرکم اللہ فی اھل بیتی، اذکرکم اللہ فی اھل بیتی۔
>
> لوگو! میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت، میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے بارے میں خدا کو پیش نظر رکھنا یہ جملہ حضرت نے تین مرتبہ فرمایا)۔ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۲۶ ط لکھنؤ۔

یہی وجہ ہے کہ مذہب امامیہ میں اقوال ائمۂ طاہرینؑ کو بھی وہی درجہ حاصل ہے جو اقوال رسولؐ کو کیونکہ وہ بوجہ عصمت اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں کہتے ان کے تمام اقوال و اعمال مستند بہ سنت رسولؐ ہیں، جس طرح سنت رسول مستند بہ قرآن ہے۔

اجماع ـــ سے مراد وہ اجماع ہے جس کا استناد (دخولی یا کشفی حیثیت سے) معصوم سے ہو۔ اس لیے اس کی بازگشت بھی سنت کی طرف ہے۔

عقل صرف اس وقت حاکم ہے جبکہ اس کا فیصلہ بالکل واضح اور یقینی ہو جیسے "قبح ظلم و حسن عدل" ایسے احکام کو "مستقلات عقلیہ" کہتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ عقل کے قطعی فیصلے خود ہی بہت کم ہیں، دوسرے اگر ہے بھی تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی حدیث بھی موجود ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ۔ کل ما حکم بہ العقل حکم بہ الشرع۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ان چاروں اصلوں میں "سنت" اصل اصول ہے جس پر تمام احکام کا دارومدار، اور پوری شریعت محمدی کا انحصار ہے۔ اس کے بغیر نہ تو قرآنی رموز حل ہو سکتے ہیں، اور نہ اجماع و عقل سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر۔

مذہب امامیہ، بلکہ تمام مذاہب اسلامی میں "سنت رسولؐ" کو وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم انسانی میں ریڑھ کی ہڈی کو۔

سنت رسولؐ کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) قول رسولؐ (۲) فعل رسولؐ (۳) تقریر رسولؐ

اور تینوں کی حکایت کو "حدیث" کہتے ہیں۔

حدیث امامیہ کا تفوق

احادیث مذہب امامیہ کو دوسرے مکاتب فکر کی احادیث پر جو فوقیت حاصل ہے اس سے کوئی صاحب عقل و ادراک انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ حدیث کی صحت کے لیے دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں (۱) سند (۲) متن پہلی کو روایت اور دوسری کو درایت کہتے ہیں۔ یہ دونوں امور حدیث کو اعتبار کا درجہ دینے میں بڑے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ مثلاً

ایک حدیث میں سنداً علیٰ ہے، حدیث کے مصدر (حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اتصال ہے، راوی وہ ہے جو سفر حضر بلکہ قبل بعثت سے رسول اللہؐ کے ساتھ رہا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ایک وہ حدیث ہے جس کا راوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے سو سال کے بعد پیدا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ پہلی حدیث قابل عمل ہو گی۔

اسی طرح ایک حدیث وہ ہے جس کا متن (الفاظ) قرین عقل ہے، کسی قاعدۂ عقل سے ٹکراؤ نہیں ہوتا، اور دوسری حدیث ایسی ہے جو عقل قطعی کے لئے قابل قبول نہیں، تو یہاں بھی پہلی ہی حدیث کو اختیار کیا جائے گا۔ (مزید توضیح آگے آئے گی)

حدیث امامیہ کا تفوق سندی حیثیت سے

حدیث امامیہ سندی حیثیت سے اس لیے فائق ہے کہ اس کی تدوین حدیث غیر امامی کی تدوین سے کم از کم سو سال قبل عمل میں آئی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے سو سال بعد تک کتب امامیہ

کے علاوہ کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا سب کچھ سینہ بہ سینہ چلا آرہا تھا۔ اب اس سو سال کے عرصہ میں اس "علم سینہ" پر کیا گذری خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حافظ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تدریب الراوی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حدیث کی تدوین پہلی صدی ہجری کے آخر میں، عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے عمل میں آئی۔ کیونکہ صحیح بخاری (ابواب العلم) میں ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو خط لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کی حدیثوں پر نظر کرو اور ان کو لکھ لو کیونکہ مجھ کو علم کے مٹ جانے اور علماء کے فوت ہو جانے کا خوف ہے، ایسا ہی کچھ ابو نعیم نے بھی تاریخ اصفہان میں لکھا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنی مملکت کے اطراف میں لوگوں کو لکھا کہ رسول اللہ کے احادیث کو تلاش کر کے جمع کر لو" (تاسیس الشیعہ ص ۲۷۸)

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۱۰ صفر ۹۹ھ میں تخت پر بیٹھے ۔۔۔ اور ۶ رجب ۱۰۱ھ میں ان کا انتقال ہوگیا یعنی کل ۲ سال ۵ ماہ انہوں نے حکومت کی، اتنے قلیل عرصہ میں کیسے ممکن ہے کہ تدوین حدیث کا اتنا بڑا کام وہ بھی اس زمانے میں (جبکہ آج کل جیسے وسائل موجود نہ تھے) انجام پا گیا ہو، پھر حافظ جلال الدین یا کسی دوسرے شخص نے اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی کہ یہ واقعہ ابتدائے خلافت عمر بن عبدالعزیز کا ہے یا آخری زمانہ کا اگر آخری زمانے میں اس فرمان کے صدور کو فرض کیا جائے تو یہ دوسری صدی کی ابتدا کا واقعہ ہوگا نہ کہ پہلی صدی کا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ فرمان تو دیا تھا مگر اس پر عمل نہ ہو سکا، اگر ان کے زمانہ میں تدوین حدیث عمل میں آئی ہوتی تو دوسرے معتبر علمائے اسلام اپنی کتابوں میں اس بات کی صراحت نہ کرتے کہ دوسری صدی کے آخر میں حدیث کی تدوین عمل میں آئی، جیسا کہ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"انقراض دولت بنی امیہ اور ابتدائے دولت بنی عباس کے زمانہ میں (۱۳۲ھ سے بنی عباس کی حکومت شروع ہوئی) تدوین حدیث کا کام شروع ہوا، پھر اس کے بعد ایام ہارون رشید (۱۷۰ھ) میں اس میں اضافہ ہوا۔ اور حدیث کی کتابیں لکھی جانے لگیں اور حافظان حدیث کا علم سینہ کم ہونے لگا، کیونکہ جب کتابوں کی تدوین ہوئی تو ان پر اعتماد کیا جانے لگا" اس سے قبل تمام صحابہ اور تابعین کا علم سینوں میں محفوظ تھا اور وہی (سینے) علم کا خزانہ سمجھے جاتے تھے۔" (تاسیس الشیعہ ص ۲۷۹)

علامہ ذہبی کا علم تاریخ و حدیث میں وہ پایہ ہے کہ کسی دوسرے کا ان پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اگر پہلی صدی کے آخر میں تدوین حدیث عمل میں آئی ہوتی تو وہ کم از کم ایک قول ہی کی حیثیت سے اس کا ذکر ضرور کرتے، ان کا سیوطی کے قول کو نظر انداز کر دینا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یا تو یہ بات درست نہیں ہے، یا صرف فرمان عمر بن عبدالعزیز تک صحیح ہے۔ جس کی تعمیل نہ ہو سکی۔

شیخ الاسلام، علامہ طیبی اور دیگر علمانے علم حدیث مدوّن کرنے والوں کی جو جغرافیائی تقسیم کی ہے
ں سے بھی "تدوین حدیث" کے زمانہ پر روشنی پڑتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے احادیث و اخبار
و جمع کرنے والے یہ لوگ ہیں:

مکہ میں	ابن جریح
مدینہ میں	مالک
بصرہ میں	ربیع بن فصیح
کوفہ میں	سفیان ثوری
شام میں	اوزاعی
واسط میں	ھیثم
یمن میں	معمّر
رے میں	جریر بن عبد الحمید
خراسان میں	ابن مبارک

یہ تمام افراد ایک ہی زمانے (۱۵۰ھ سے ۲۰۰ھ) میں گذرے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ ان میں سے اسبق کون ہے (اس کے بعد شیخ الاسلام لکھتے ہیں کہ) بعض ائمہ کی رائے یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کے تمام احادیث کو دوسری صدی ہجری کے آخر میں جمع کیا گیا۔ (تاسیس الشیعہ ص ۲۷۸)

بہر کیف مذکورہ بالا بیانات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں "تدوین حدیث" کا زمانہ دوسری صدی ہجری کے اواخر کی بات ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ کی وفات سے ۱۳۰ سال تک (یا کم از کم ۱۰۰ سال تک) "حدیث" نام کی کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اس کے بدلہ لوگوں کے سینوں میں چھپے ہوئے "خزانوں" ہی سے کام لیا جاتا تھا۔

مذہب امامیہ میں سب سے پہلے حدیث کو جمع کرنے والے

(۱) اگر کوئی یہ سوال کرے کہ احادیث رسولؐ کو سب سے پہلے کس نے جمع کیا اور کس نے اس کو کتابی صورت دی؟ تو اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہوگا کہ "اس نے جمع کیا جس کو رسول اللہؐ نے اپنے علم کا دروازہ کہا" یعنی باب مدینۂ علم نبی، امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السّلام!

شیخ ابو العباس نجاشی اپنی کتاب رجال میں تحریر فرماتے ہیں:

"عذافر صیرفی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حکم بن عیینہ کے ہمراہ امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، حکم نے آپ سے کچھ سوال کیا جس پر دونوں میں اختلاف رائے ہوا، اس وقت حضرت نے اپنے فرزند سے فرمایا: بیٹا اٹھ! اور "کتاب علی" نکال کر لا،

یہ سنکر آپ کے صاحبزادے ایک بڑی کتاب لے کر آئے جو لپٹی ہوئی تھی، حضرت نے اس کو کھولا اور متنازع مسئلہ کو اس میں سے برآمد کیا اس کے بعد فرمایا کہ دیکھو یہ علیؑ ابن ابی طالب کی تحریر ہے جس کو رسول اللہؐ نے لکھوایا ہے، پھر آپ حکم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ اے ابو محمد! تم اور سلمہ اور مقداد، دائیں بائیں جس راستہ پر چاہے، چلے جاؤ، لیکن یاد رکھو کہ ان لوگوں سے زیادہ مضبوط علم نہ پاؤ گے جن کے گھر میں جبریل آیا کرتے تھے۔" (تاسیس الشیعہ ص ۲۷۹)

اس کتاب حضرت علی علیہ السلام کا اعتراف "دبے لفظوں" میں صحیح بخاری نے بھی کیا ہے:

عن ابی جحیفہ قال قلت لعلیؓ هل عندکم کتاب ؟ قال لا الا کتاب الله ، أو فهم اعطیه رجل مسلم ، او ما فی هذه الصحیفة قال قلت وما فی هذه الصحیفة ؟ قال العقل ، وفکاك الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر۔ (جلد ۱ ص ۳۶)

ابو جحیفہ کہتے ہیں کہ میں نے علی (علیہ السلام) سے پوچھا: کیا آپ لوگوں (اہلبیت) کے پاس کوئی کتاب ہے؟ انہوں نے کہا نہیں سوائے اللہ کی کتاب کے، اور اس فہم کے جو مرد مسلمان کو دی گئی ہے، یا جو کچھ اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے پوچھا اس صحیفہ میں کیا ہے؟ فرمایا اس میں دیت اور اسیر کی آزادی کے احکام ہیں اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ نہیں قتل کیا جا سکتا۔ (صحیح بخاری ۱/۳۶)

میں نے "دبے لفظوں" کا کلمہ اس لیے کہا کہ بخاری نے اس کتاب کو صحیفہ کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور وہ بھی ایسا کہ جس میں صرف دو تین مسئلے مذکور ہوں۔ صحیفہ تو ایک چھوٹا سا کاغذ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر خدا بھلا کرے علامہ ابن حجر عسقلانی شارح صحیح بخاری کا کہ انہوں نے اس ابہام کو "کتاب" کہہ کر دور کر دیا، چنانچہ موصوف نے اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے: فاخرج کتابا من قراب سیفه (پس حضرت علی علیہ السلام نے اپنی تلوار کی نیام سے ایک کتاب نکالی)

(۲) حضرت علی علیہ السلام کے بعد حدیث و آثار کی تالیف میں "سلمان فارسی" کا درجہ ہے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد "کتاب حدیث جاثلیق رومی" تالیف کی جس کا ذکر شیخ ابو جعفر طوسی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب فہرست مصنفین شیعہ میں کیا ہے۔

(۳) سلمان فارسیؓ کے بعد "ابوذر غفاریؓ" ہیں۔ جنہوں نے "کتاب خطبۃ النبی" تالیف کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہونے والے حوادث کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کو بھی شیخ الطائفہ نے فہرست میں ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے یہاں پر یہ سوال ہو کہ ان دونوں جلیل القدر صحابیوں کا "مذہب شیعہ" سے کیا تعلق ہے، جو

ن کے فعل کو مذہب شیعہ کا کارنامہ قرار دیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں ہم صرف علامہ سجستانی کی رائے تحریر کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب "الزینہ" جلد سوم میں درج کی ہے۔

ابو حاتم سھل بن محمد بن عثمان سجستانی بصری نحوی (۲۴۵ھ) اکابر علماء قدماء میں ان کا شمار ہوتا ہے تمام طبقات مسلمین میں ان کا احترام ہے، موصوف نے یہ کتاب (الزینہ) "الفاظ متداولہ درمیان اہل علم" کے موضوع پر لکھی ہے، اس کتاب میں وہ لفظ "شیعہ" کی تشریح میں یوں رقمطراز ہیں:

"اسلام میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم کے زمانہ میں سب سے پہلے جو نام ظاہر ہوا وہ نام "شیعہ" ہے، سب سے پہلے یہ چار صحابیوں کا لقب تھا: سلمان، ابوذر غفاریؓ مقداد بنؓ اسود، عمارؓ یاسر، صفین کی جنگ ہونے تک صرف ان چاروں کا لقب "شیعہ" تھا۔ جب جنگ صفین برپا ہوئی تو اس لقب (شیعہ) نے تمام دوستان علیؑ بن ابی طالب میں شیوع پیدا کر لیا۔" (تاسیس الشیعہ ص ۲۸۰)

(۴) حضرت علی علیہ السلام، سلمان فارسی، ابوذر غفاری کے بعد تدوین حدیث کے سلسلہ میں چوتھے نمبر پر "ابورافع" ہیں۔ ان کے متعلق "الکنی والالقاب" میں ہے:

"ابورافع قبطی، ان کے نام میں اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ ان کا نام "ابراہیم" تھا، اور "اسلم" بھی کہا گیا ہے، یہ عباسؓ عم النبیؐ کے غلام تھے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا۔ جب ابورافع نے رسولؐ اللہ کی خدمت میں آکر عباس کے اسلام لانے کی خوشخبری سنائی تو آپ نے ان کو آزاد کر دیا، یہ رسول اللہ کے ساتھ (سوائے جنگ بدر کے) تمام غزوؤں میں شریک رہے، اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے ملازم رکاب رہے، یہ حضرت علیؑ کے بہترین شیعوں میں سے تھے اور ان کے ساتھ تمام جنگوں میں شریک رہے، آپ کی خلافت کے زمانہ میں کوفہ میں آپ کے بیت المال کے امین تھے، اور آپ کے دونوں بیٹے عبیداللہ اور علی، امیرالمومنینؑ کے کاتب تھے، ابورافع نے کتاب لکھی جس کا نام ہے "کتاب السنن والاحکام والقضایا"۔ (الکنی والالقاب ۱/۷۶)

بعض محققین نے ابورافع کو حضرت علیؑ کے بعد اور سلمان فارسی سے قبل کا درجہ دیا ہے۔
ابورافع کے بعد طبقۂ اولیٰ میں جن لوگوں کا نام آتا ہے وہ یہ حضرات ہیں:

عبیداللہ بن ابی رافع، علی بن ابی رافع، اصبغ بن نباتہ، سلیم بن قیس، میثم تمار، حارث بن عبداللہ اعور ہمدانی، ربیعہ بن سمیع، محمد بن قیس بجلی، یعلی بن مرۃ، یہ سب طبقۂ اولیٰ کے شیعہ مصنفین اور حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے اصحاب خاص ہیں جنہوں نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے اور بیش بہا حدیثیں اپنی کتابوں میں جمع کی ہیں حضرت علی علیہ السلام کی شہادت ۴۰ھ میں ہوئی۔ اس بنا پر یہ تمام

مصنفین اس سے پہلے کے تھے۔ ان حضرات کے علاوہ بھی دیگر شیعہ مصنفین ہیں جو ان کے ہم عصر تھے۔ طوالت کے خیال سے ان کو نظر انداز کیا گیا۔ اس طرح تقریباً بیس کتابیں ۴۰ھ سے پہلے تالیف کی جا چکی تھیں۔

طبقۂ اولیٰ کے بعد طبقۂ ثانیہ (امام زین العابدین علیہ السلام کا دور) پھر ثالثہ (امام محمد باقر علیہ السلام کا زمانہ) پھر طبقۂ رابعہ ہے، جو امام جعفر صادق علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب سلطنت بنی امیہ کا اختتام اور دولت بنی عباس کی داغ بیل پڑ رہی تھی اور ایک قول کی بنا پر حدیث غیر شیعہ کی تدوین شروع ہوئی تھی اور امام جعفر صادق علیہ السلام کو موقع ملا کہ مذہب شیعہ کی ترویج کریں۔ چنانچہ شیعہ علم حدیث اس دور میں اپنے عروج کو پہنچا۔ چار ہزار راویوں نے بیک وقت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے، اور چار سو کتابیں علم حدیث کی لکھی گئیں، جن کو "اصول اربع مأة" کہا جاتا ہے (یہ ۱۴۲ھ کی بات ہے) نتیجہ حسب ذیل ہے:-

۱۔ تدوین حدیث شیعہ کی بنیاد، وصی رسول، باب مدینۂ علم نبی، حضرت علی علیہ السلام نے (خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں) ڈالی جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے عصر (۱۳۲ھ) میں اپنے عروج کو پہنچی۔

۲۔ جس عصر میں حدیث شیعہ عروج کو پہنچی (یعنی ۱۳۲ھ کا زمانہ) اسی عصر میں یا اس کے بعد (یعنی ۱۵۰ھ) میں حدیث غیر شیعہ کی تدوین شروع ہوئی۔

تدوین حدیث غیر شیعہ کے تأخر کا سبب

ممکن ہے ناظرین کو تعجب ہو کہ دونوں حدیثوں میں اتنے زیادہ تقدم و تأخر کی کیا وجہ ہے۔ جب کہ دوسرے مکتب خیال کو حکومتہائے وقت کی حمایت بھی حاصل تھی اور اس کے لیے ہر دور میں تدوین کے امکانات میسر تھے اس کے برخلاف مذہب شیعہ تقریباً ہر دور میں مشکلات سے دوچار تھا لہٰذا نتیجہ برعکس ہونا چاہیئے تھا! اس تعجب کو دور کرنے کے لیے ہم عثمان بن صلاح الدین شافعی کا ارشاد پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو — وهو هذا:-

"حدیث کے لکھنے کے متعلق صدر اول میں اختلاف واقع ہوا، کچھ لوگوں نے حدیث اور علم کی کتابت کو ناپسند کیا اور حکم دیا کہ اس کو سینہ کے اندر محفوظ کیا جائے، اور کچھ لوگوں نے اس کی اجازت دی، جن لوگوں نے ناپسند کیا ان میں عمر بن خطاب، عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت تھے۔ کیونکہ ابو سعید خدری کے ذریعہ ہم تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے فرمایا "لا تكتبوا عني شيئاً الا القرآن" سوائے قرآن کے میری کسی چیز کو نہ لکھو، "ومن كتب عني شيئاً غير القرآن فليمحه" اور جس نے سوائے قرآن کے میری کوئی بات لکھی ہو وہ اس کو مٹا دے، اس حدیث کی صحیح مسلم نے بھی روایت کی ہے، اور جن لوگوں نے اس (کتابت علم) کو جائز قرار دیا وہ علیؑ اور ان کے بیٹے حسنؑ اور انس ہیں۔"

(مقدمۂ ابن صلاح ص ۲۹۶)

تعجب کی بات یہ ہے کہ "لا تكتبوا الخ" کی حدیث حضرت علیؑ و امام حسنؑ جیسے گھر والوں کو نہ معلوم ہو سکی

حالانکہ حضرت علیؑ باب مدینہ علم ہیں اور امام حسن علیہ السلام نے علیؑ و نبیؐ کی گود میں پرورش پائی ہے، پھر اسی کتاب "مقدمۂ ابن صلاح" میں ایسی متعدد حدیثیں موجود ہیں جو حدیث "لا تکتبوا" کی رد کرتی ہیں جیسے "قیدوا العلم بالکتابة" علم کو کتابت کے ذریعہ قید کر لو (ص ۲۹۹)۔ یا یہ حدیث کہ جس میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ میں آپ سے جو سنوں اس کو لکھ لیا کروں؟ حضرت نے فرمایا "ہاں" میں نے کہا کہ "فی الغضب والرضا؟ قال: نعم فانی لا اقول الاحقا" آپ کے غضب و رضا دونوں حالتوں میں لکھ لوں؟ فرمایا ہاں، کیونکہ میں ہر حالت میں حق ہی کہتا ہوں۔ (ص ۲۹۷)

اس سے معلوم ہوا کہ کتابت حدیث سے روکنے والی حدیث صحیح نہیں معلوم ہوتی ورنہ خود حضرت عمر اس سے استدلال کرتے حالانکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا! جیسا کہ سنن دارمی اور مستدرک حاکم وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے:

عن عروة "ان عمر بن الخطاب اراد ان یکتب السنن فاستفتیٰ اصحاب رسول اللہ فی ذالک، فاشاروا علیہ أن یکتبها فطفق عمر یستخیر اللہ فیها شهراً ثم اصبح یوماً وقد عزم اللہ له فقال انی کنت ارید ان اکتب السنن وانی ذکرت قوماً کانوا قبلکم کتبوا کتابا فاکبوا علیها وترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشیء ابداً۔

(ترجمہ) عروہ کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب نے ارادہ کیا کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی) سنتیں لکھی جائیں چنانچہ اس کے بارے میں اصحاب رسولؐ اللہ کی رائے لی، تو سب نے کہا کہ اس کو لکھ لینا چاہیئے۔ لیکن عمر ایک مہینہ تک اللہ سے استخارہ کرتے رہے۔ پھر انہوں نے ایک روز اس طرح صبح کی کہ اللہ نے ان کو عزم دے دیا۔ پس انہوں نے کہا کہ میں نے سنت کو لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن مجھ کو خیال آیا کہ پچھلی امت نے کتاب لکھی پھر اس پر انہوں نے اپنی پوری توجہ مبذول کر دی اور کتاب خدا کو ترک کر دیا، میں خدا کی قسم! کتاب خدا میں کسی چیز کو ملنے نہ دوں گا۔
(سنن دارمی ۱/۱۲۵، مستدرک حاکم ۱/۱۰۴ بحوالہ الغدیر ۶/۲۹۷)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عمر کی منفرد رائے تھی جس میں کوئی صحابی ان سے متفق نہ تھا اور انہی کی رائے پر سو برس سے زیادہ کے عرصہ تک عمل ہوتا رہا، اس کے بعد لوگوں کو احساس ہوا کہ حدیث کو لکھ لینا چاہیئے (یعنی حضرت علی علیہ السلام ٹھیک کہتے تھے۔)

حدیث امامیہ کا تفوق متنی حیثیت سے

یہ ایک طویل الذیل موضوع ہے جس کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے، لہٰذا ان صفحات میں ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے مذہب امامیہ کی (چار کتابوں کافی و من لایحضر و تہذیب و استبصار میں سے) پہلی کتاب

"کافی" تالیف محمد بن یعقوب کلینی علیہ الرحمہ (م ۳۲۹ھ) کا ذکر کرتے ہیں۔

یہ کتاب یوں تو کئی امتیازات کی حامل ہے جو اس کے مقابلہ کی دوسری کتابوں میں ناپید ہیں لیکن ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے محور کلام سے خارج ہیں۔ ہم کو یہاں پر کتاب کافی کے خصوصیات بیان کرنا نہیں ہیں اس لیے یہاں ہم کافی کے صرف دو امتیاز بیان کریں گے۔ جن سے ہمارے مقصد "حدیث امامیہ کی متنی حیثیت" پر روشنی پڑتی ہے، اور وہ دو امتیاز یہ ہیں:

۱۔ جامعیت متون ۲۔ متانت متون

۱۔ کافی کے متون کی جامعیت

اس جلیل القدر کتاب کے احادیث کو اس کے مولف (کلینیؒ) نے ۲۰ سال کی طویل مدت میں، بغیر کسی حکومت وقت کی مدد لیے، شہر بہ شہر اور دیار بہ دیار پھر کے اکٹھا کیا ہے۔ اس لیے اس کے احادیث کی تعداد ۱۶۱۹۹ ہے، جبکہ بقول ابن تیمیہ کے صحیحین (بخاری و مسلم) کے احادیث سات ہزار اور کسور (کچھ) ہیں۔ (منہاج السنۃ ۴/۵۹) بلکہ کافی کے احادیث کی تعداد تمام صحاح ستہ کی حدیثوں سے زائد ہے، کیونکہ مکررات کو حذف کر کے احادیث صحاح کی تعداد ۶ ہزار ہے۔

کافی کے اس کثرت احادیث کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ احادیث الٰہیات کے تمام مسائل، اور زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہیں، اور اس طرح رسالت حضرت ختمی مرتبت کی شان سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔ کیونکہ آپ ہی کی رسالت کے لیے خدا نے فرمایا۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔ لہٰذا آپ کی سنت ہر نہج سے کامل ہونا چاہیے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جہاں حکم شریعت مجہول ہو اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کو اپنی "قیاس آرائیوں" سے کام لینا پڑے۔

کافی کے متون احادیث کی متانت۔

متون کی متانت سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ احادیث، عقل قطعی کے فیصلوں کے مناسب اور واقع کے مطابق ہیں۔ اس مطلب کو ہم چند مثالوں سے واضح کریں گے، لیکن بہتر ہے کہ پہلے کافی کے عناوین کی ایک مختصر فہرست پیش کر دی جائے جس پر طائرانہ نظر کرنے سے اہل فکر و نظر کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ احادیث کس متانت و جلالت کی حامل ہیں۔

کتاب کافی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ اصول کافی ۲۔ فروع کافی (تیسرا حصہ روضہ کافی بھی ہے جس کے متعلق بعض علماء نے شبہ کیا ہے کہ وہ کلینی کا ہے کہ نہیں۔ اس لیے ہم نے اس کو نظر انداز کیا) اصول کافی کا تعلق عقائد سے ہے، فروع کافی احکام دین پر مشتمل ہے (یہ بنیادی تقسیم صحاح ستہ میں نہیں ہے) یہ دونوں حصے بہت سی کتابوں پر مشتمل ہیں جیسے کتاب عقل و جہل۔ کتاب فضل علم الخ۔ پھر ہر کتاب متعدد ابواب پر مشتمل ہے جیسے باب فرض العلم، باب صفۃ العلم وغیرہ۔ چونکہ اختصار ملحوظ ہے اس لیے ہم صرف کافی کی کتابوں کی فہرست پیش

کرتے ہیں، اصول کافی کی کتابیں:

"کتاب عقل وجہل۔ کتاب فضل علم۔ کتاب توحید۔ کتاب حجت خدا۔ کتاب ایمان وکفر۔ کتاب دعا کتاب فضل قرآن۔ کتاب العشرۃ"

فروع کافی کی کتابیں:

کتاب طہارت۔ کتاب صلوٰۃ۔ کتاب زکوٰۃ۔ کتاب صوم۔ کتاب حج۔ کتاب زیارت۔ کتاب جہاد کتاب معیشت (تجارت)۔ کتاب خمس۔ کتاب نکاح۔ کتاب عقیقہ۔ کتاب طلاق۔ کتاب عتق۔ کتاب صید کتاب اطعمہ۔ کتاب اشربہ۔ کتاب زی وتجمل۔ کتاب وصایا۔ کتاب میراث۔ کتاب حدود۔ کتاب دیات کتاب شہادت۔ کتاب قضا۔ کتاب ایمان ونذر۔

ان کتابوں میں سے ہر کتاب متعدد ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کے ذیل میں بیسیوں احادیث ائمہ طاہرین علیہم السلام سے لی گئی ہیں جو انہوں نے سینہ بہ سینہ اپنے آباء طاہرین کے ذریعہ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت علیؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے نقل کی ہیں۔ ان کتابوں میں کتاب توحید بہت اہم ہے جو ۳۵ ابواب پر مشتمل ہے، باب اول حدوث عالم واثبات صانع کے بیان میں ہے اور اس میں ۱۹ احادیث اور مناظرے مذکور ہیں۔

اب آیئے دوسرے مکتب فکر کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی کتاب "صحیح بخاری" (تالیف ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری جعفی ۲۵۶ھ) پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔ اس کتاب کے متعلق بربنائے نقل محمد بن یوسف فربری، اس کے مؤلف نے فرمایا ہے کہ: میں نے اپنی اس کتاب صحیح میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی ہے کہ جس کے لکھنے سے پہلے میں نے غسل کر کے ۲ رکعت نماز نہ ادا کی ہو، یہ کتاب میں نے ۱۶ برس میں لکھی ہے اور اس کی حدیثوں کو ۶ لاکھ حدیثوں میں سے منتخب کیا ہے اور ان حدیثوں کو میں اپنے اور اللہ کے درمیان حجت قرار دیتا ہوں (الکنی والالقاب ۲/۶۵) یہی الفاظ اس کتاب کے ٹائیٹل پر بھی لکھے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کتاب کیسی ہوگی؟ لہٰذا اس کتاب کی بھی ایک مختصر فہرست اور اس کے بعد چند مثالوں کو ذکر کر کے ہم اس مقالہ کا خاتمہ کرتے ہیں، ناظرین خود تقابل کر لیں گے۔ ہم اپنی کوئی رائے پیش نہیں کریں گے۔

صحیح بخاری کی فہرست عناوین

باب ابتداء وحی۔ کتاب ایمان۔ کتاب علم۔ کتاب وضو۔ کتاب صلوٰۃ۔ کتاب زکوٰۃ۔ (اس کو باب زکوٰۃ لکھا ہے) کتاب خمس (اس کو بھی باب لکھا ہے) کتاب حج۔ کتاب صوم۔ کتاب بیع۔ کتاب وکالت۔ کتاب مساقات۔ کتاب استقراض۔ کتاب لقطہ۔ کتاب مظالم۔ کتاب رہن۔ کتاب ہبہ۔ کتاب صلح۔ کتاب شروط کتاب وصایا۔ کتاب جہاد۔ کتاب بدء الخلق۔ کتاب مغازی۔ کتاب تفسیر القرآن۔ کتاب نکاح۔ کتاب طلاق کتاب نفقات۔ کتاب اطعمہ۔ کتاب عقیقہ۔ کتاب ذبائح۔ کتاب اضاحی۔ کتاب اشربہ۔ کتاب مرضیٰ۔ کتاب

ب۔کتاب لباس۔کتاب ادب۔کتاب استیذان۔کتاب دعوات۔کتاب رقاق۔کتاب قدر۔کتاب
ان ونذور۔کتاب فرائض (میراث) کتاب حدود۔کتاب محاربین۔کتاب دیات۔کتاب استتابۃ المرتدین
اب اکراہ۔کتاب حیل۔کتاب فتن۔کتاب احکام۔کتاب تمنی۔کتاب توحید۔ (انتہی)

اس فہرست میں حسب ذیل امور جالب توجہ ہیں:۔

۱۔ "کتاب توحید" تو ہے، لیکن توحید (خدا کے ثبوت) پر ایک دلیل بھی بیان نہیں کی گئی ہے۔ جب کہ کافی میں زبردست دلیلیں موجود ہیں۔

۲۔ توحید کا بیان سب سے اخیر میں ہے، جبکہ کافی میں شروع میں کیونکہ تمام اعمال توحید ہی سے شروع ہوتے ہیں۔

۳۔ عقل کی کوئی بحث نہیں ہے، جبکہ کافی کتاب عقل سے شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ توحید بغیر عقل کے سمجھ میں نہیں آسکتی۔

۴۔ عقاید کے متعلق نہ ہونے کے برابر احادیث ہیں۔ جبکہ اصول کافی پوری کی پوری عقاید پر مشتمل ہے۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نظام اسلام کیسے چلے گا؟ اس کے متعلق کوئی باب نہیں ہے، جبکہ کافی میں "کتاب حجت" ایسی بیسیوں حدیثوں پر مشتمل ہے جس میں اس عظیم مشکل کا حل موجود ہے اور رسالت کے بعد امامت کی شان بتائی گئی ہے۔

آخر کلام میں ہم دونوں کتابوں (کافی) و (بخاری) کی کتاب توحید سے چند حدیثیں بطور نمونہ پیش کر کے فیصلہ اہل نظر پر چھوڑتے ہیں۔ پہلے بخاری کی حدیثیں ملاحظہ ہوں:

پہلی حدیث

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قال، لایزال یلقیٰ فیہا وتقول ھل من مزید حتیٰ یضع فیہا رب العالمین قدمہ فینزوی بعضہا الی بعض ثم تقول قد قد بعزتک وکرمک۔ (جلد ۸ ص ۱۶۸)

(ترجمہ) نبی صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم سے روایت ہے کہ جہنم میں لوگ یکے بعد دیگرے ڈالے جائیں گے اور وہ کہے گی کیا اور زیادہ (میری خوراک) ہے؟ یہاں تک کہ پروردگار عالم اس کے اندر اپنا پیر ڈال دے گا۔ پس اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی طرف سکڑ جائے گا پھر وہ کہے گی بس کافی ہے! تیری عزت اور کرم کی قسم!

(دوسری حدیث)

عن ابی ھریرۃ ان الناس قالوا یا رسول اللہ ھل نریٰ ربنا یوم القیامۃ؟
فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل تضارون فی القمر لیلۃ البدر؟
قالوا لا یا رسول اللہ قال فھل تضارون فی الشمس لیس دونہا سحاب؟

قالوالایارسول اللہ قال فانکم ترونہ کذلک، یجمع اللہ الناس یوم القیامۃ فیقول من کان یعبد شیئا فیتبعہ فیتبع من کان یعبد الشمس الشمس ویتبع من کان یعبد القمر القمر ویتبع من کان یعبد الطواغیت الطواغیت وتبقی ھذہ الامۃ فیھا شافعوھا فیاتیھم اللہ فیقول انا ربکم فیقولون ھذا مکاننا حتی یاتینا ربنا فاذا جاء نا عرفناہ، فیاتیھم اللہ فی صورتہ التی یعرفون فیقول انا ربکم فیقولون انت ربنا فیتبعونہ ۔ (جلد ۸ ص ۱۷۹)

(ترجمہ) ابوہریرہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے کہا کہ یارسول اللہ! کیا قیامت کے روز ہم اپنے پروردگار کو دیکھ سکیں گے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم نے فرمایا کہ چاند جس رات میں بدر کامل ہوتا ہے کیا اس کو دیکھنا تمہارے لیے مشکل ہے ۔ ؟ لوگوں نے کہا نہیں، پھر حضرت نے فرمایا کہ سورج جب ابر سے باہر ہو اس پر نظر کرنا تمہارے لیے مشکل ہے ؟ لوگوں نے کہا نہیں یارسول اللہ، حضرت نے فرمایا تم اسی طرح اپنے رب کو دیکھو گے، قیامت کے دن اللہ تمام بندوں کو اکٹھا کرے گا اور فرمائے گا کہ جو شخص جس کی عبادت کرتا تھا اسی کا اتباع کرے، پس جو سورج کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے جائے گا، جو چاند کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے جائے گا۔ جو طاغوتوں کی عبادت کرتا تھا وہ ان کے پیچھے جائے گا۔ یہ امت باقی رہ جائے گی اس میں اس کے شفاعت کنندہ ہوں گے۔ پس ان کے پاس اللہ آئے گا اور کہے گا کہ میں تمہارا رب ہوں، اس پر وہ لوگ کہیں گے کہ ہم اسی جگہ ٹھیرے رہیں گے یہاں تک کہ ہمارا رب ہمارے پاس آئے، جب وہ آئے گا ہم اس کو پہچان لیں گے، پھر اللہ اپنی اس صورت میں آئے گا جس کو وہ لوگ پہچان لیں گے اور اللہ کہے گا کہ میں تمہارا رب ہوں، تب وہ لوگ کہیں گے کہ تو ہمارا رب ہے، پس اس کے پیچھے چلے جائیں گے ۔ (۸/۱۷۹)

(تیسری حدیث)

دوسری حدیث کے ایک صفحہ کے بعد حسب ذیل حدیث بھی ملاحظہ ہو، جو بظاہر مذکورہ حدیث کا تتمہ معلوم ہوتی ہے۔

قال فیاتیھم الجبار فی صورۃ غیر صورتہ التی رأوہ فیھا اول مرۃ، فیقول انا ربکم، فیقولون أنت ربنا، فلا یکلمہ الا الانبیاء، فیقول ھل بینکم

وبينه آية تعرفونه ؟ فيقولون" الساق" فيكشف عن ساقه فيسجد له كل مؤمن ويبقى من كان يسجد لله رياء وسمعة فيذهب كيما يسجد فيعود ظهره طبقا واحدا۔ (جلد ۸ ص ۱۸۲)

(ترجمہ) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ پس خدائے جباران کے پاس اس صورت میں آئے گا جو اس کی اس صورت سے مختلف ہوگی۔ جس کو انہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا' پس اللہ فرمائے گا کہ میں تمہارا رب ہوں' تو لوگ کہیں گے تو ہمارا رب ہے' پھر بجز انبیاء کے کوئی اس سے بات نہ کرے گا' پھر (خدا) ان لوگوں سے کہے گا کہ اس (خدا) کے درمیان اور تمہارے درمیان کوئی ایسی نشانی ہے جس کے ذریعہ تم اس (اللہ) کو پہچان سکو ؟ تو وہ لوگ جواب دیں گے (وہ نشانی) پنڈلی ہے' تب اللہ اپنی پنڈلی کھولے گا' پس ہر مومن اس کے سامنے سجدہ میں گر جائے گا' بس وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جو (دنیا میں) ریا سے سجدہ کرتے تھے' یہ لوگ بھی سجدہ کرنے کی کوشش کریں گے لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکیں گے کیونکہ ان کی پشت سخت ہو کر' ایک طبق (کی طرح) ہو جائے گی۔

(صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۸۲ کتاب توحید)

یہاں پر ہم ان ہی تین حدیثوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ اس کتاب میں ایسی متعدد حدیثیں ہیں جو جسم و رویت باری تعالیٰ پر بالصراحت دلالت کرتی ہیں۔

اب اس کے بعد چند حدیثیں اصول کافی کی کتاب توحید سے بھی ملاحظہ ہوں جو ائمہ طاہرینؑ سے مروی ہیں' سابقاً ہم بیان کر چکے ہیں کہ اہل بیت طاہرینؑ کے احادیث کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیثوں کو ہے کیونکہ ان کا علم سینہ بہ سینہ علم رسولؐ سے متصل ہے' لہٰذا ان کا ارشاد رسول اللہؐ کا ارشاد ہے جس طرح رسول اللہؐ کا ارشاد خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے

(پہلی حدیث)

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے سامنے جب ایک شخص نے خدا کے جسم کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:

ان الله لا يشبهه شي' اى فحش اوخناء اعظم من قول من يصف خالق الاشياء بجسم او صورة او بخلقة او بحديد او اعضاء تعالى الله عن ذلك علوا كبيرا۔ (جلد ۱ ص ۱۹۱)

اس سے بڑھ کر اور کونسا فحش یا ناسزا بات ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص خالق اشیاءؐ کی جسم یا صورت کے ساتھ توصیف کرے یا یہ کہے کہ وہ کسی مخلوق کی طرح کا ہے'

یا اس کی تحدید کرے، یا اس کے اعضاء و جوارح بیان کرے، خدا کی ذات ان باتوں سے بہت بلند ہے۔ (اصول کافی ۱/۱۹۱)

(دوسری حدیث)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک ایسے شخص کے بارے میں جو خدا کے جسم کا قائل تھا فرمایا:

ویحہ اما علم أن الجسم محدود، متناہ، والصورۃ محدودۃ متناھیۃ فاذا احتمل الحد احتمل الزیادۃ والنقصان واذا احتمل الزیادۃ والنقصان کان مخلوقا، قال قلت فما اقول؟ قال لاجسم ولاصورۃ وھو مجسم الاجسام ومصور الصور لم یتجزو لم یتناہ ولم یتزاید ولم یتناقص لوکان کما یقولون لم یکن بین الخالق والمخلوق فرق ولا بین المنشئ والمنشأ لکن ھو المنشئ، فرق (بینہ و) بین من جسمہ وصورہ وأنشأہ، اذکان لایشبھہ شئ ولا یشبہ ھو شیئاً۔

(جلد ۱ ص ۱۹۳)

(ترجمہ) اس شخص پر افسوس ہے، کیا اس کو نہیں معلوم کہ جسم محدود و متناہی ہوتا ہے، صورت بھی محدود و متناہی ہوتی ہے، پس اگر (اللہ کے لیے) حد بندی کا امکان ہوگا تو (اس کے لیے) زیادتی اور کمی کا بھی امکان ہوگا، اور جب زیادتی اور کمی کا امکان ہوگا تو پھر وہ مخلوق ہو جائے گا، راوی نے کہا پس میں کیا کہوں؟ فرمایا یوں کہو کہ اللہ نہ جسم ہے، نہ صورت ہے، بلکہ وہ تمام اجسام اور صورتوں کا جسم اور صورت بنانے والا ہے، نہ تو اس کا تجزیہ ممکن ہے، اور نہ وہ متناہی ہو سکتا ہے نہ اس میں زیادتی روا ہے نہ کمی، اگر وہ ایسا ہی ہو جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو پھر خالق و مخلوق میں، اور پیدا کرنے والے اور پیدا ہونے والے میں فرق نہیں باقی رہتا، لیکن وہ پیدا کرنے والا ہے، فرق ہے اس (پیدا کرنے والے) کے درمیان اور اس کے درمیان جس کو اس نے مجسم کیا ہے، اس کی صورت بنائی ہے اور پیدا کیا ہے کیونکہ کوئی چیز اس کی مشابہ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ کسی چیز کے مشابہ ہو سکتا ہے۔

(اصول کافی ۱/۱۹۳)

(تیسری حدیث)

حضرت امام رضا علیہ السلام کے سامنے جب ایک شخص نے اس بات کا اظہار کیا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج خدا کو دیکھا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

فمن المبلّغ عن الله الی الثقلین من الانس والجن "لا تدرکه الابصار
ولا یحیطون به علما، ولیس کمثله شیء" ألیس محمد صلی الله علیه و
آله؟ قال بلی، قال کیف یجیء رجل الی الخلق جمیعا فیخبرهم أنه
جاء من الله وانه یدعوهم الی الله بامر الله فیقول "لا تدرکه الابصار
ولا یحیطون به علما ولیس کمثله شیء" ثم یقول انا رأیته بعینی
وأحطت به علما وهو علی صورة البشر؟ اما تستحون..... الحدیث

(جلد ا ص ۶۹)

(ترجمہ) وہ کون شخص ہے جس نے اللہ کی طرف سے جن وانس کو یہ خبر دی کہ
"نگاہیں اس کو (اللہ کو) نہیں دیکھ سکتیں، اور کسی کا علم اس کا احاطہ نہیں
کر سکتا، اور کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہو سکتی" کیا یہ خبریں دینے والے حضرت
محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں وہی ہیں، حضرت
نے فرمایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اللہ کی طرف سے تمام مخلوقات کی طرف
مبعوث ہو اور ان کو اللہ کی طرف، اللہ کے حکم سے بلائے اور یہ بتلائے کہ اس کو کوئی
نظر نہیں دیکھ سکتی، اور کوئی شخص اس کو اپنے دائرۂ علم میں نہیں لا سکتا،
اور کوئی چیز اس کی مثل نہیں بن سکتی۔ پھر اس کے بعد یہ کہے کہ "میں نے خود اپنی
آنکھ سے اس کو دیکھا ہے، اپنے علم سے اس کا احاطہ کیا ہے اور وہ بشر کی شکل
کا ہے" (رسول اللہ کی جانب ایسی باتیں منسوب کرتے ہوئے) تم کو شرم نہیں
معلوم ہوتی؟ الی آخر الحدیث۔ (اصول کافی ۱/۶۹)

(چوتھی حدیث)

ایک روز حضرت علی علیہ السلام منبر کوفہ پر خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص "ذِعلِب" نامی کھڑا ہوا
اور اس نے کہا:

یا امیر المومنین هل رأیت ربك؟ قال ویلك یا ذعلب ما کنت
اعبد ربا لم أره فقال یا امیر المومنین کیف رأیته؟ قال یا ذعلب
لم تره العیون بمشاهدة الابصار ولکن رأته القلوب بحقائق الایمان۔

الحدیث (جلد ا ص ۲۴۵)

یا امیر المومنین! کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا وائے ہو تجھ
پر اے ذعلب! میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی جس کو دیکھ نہ لیا ہو، ذعلب

نے کہا کہ آپ نے خدا کو کس طرح دیکھا ؟ فرمایا اے ذعلب آنکھوں نے اس کو اپنی بینائی کے ذریعہ نہیں دیکھا ہے لیکن دلوں نے اس کو حقیقت ایمانی کے ذریعہ دیکھا ہے (اصول کافی ۱/۲۴۵)

مصادر

۱۔ الصحیح : مسلم نیشاپوری طبع لکھنو

۲۔ تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام، حسن صدر بیروت

۳۔ تذکرۃ الحفاظ للذھبی مصر

۴۔ رجال النجاشی بمبئی

۵۔ الصحیح اسماعیل بخاری

۶۔ الکنی والالقاب شیخ عباس قمی ایران

۷۔ الغدیر عبدالحسین امینی نجف

۸۔ اصول الکافی محمد بن یعقوب کلینی، تہران ایران

جناب شیخ یوسف صانعی

اسلامی قوانین کے امتیازات

تلك حدود الله فلا تعتدوها ومن يتعدّ حدود الله فاولئك هم الظالمون[1]۔

قانون انسان کی ایک ضرورت ہے یعنی اس کے بے شعور غرائز و میلانات کو کنٹرول کرنے کے لئے کچھ اصول و قوانین کا وجود ناگزیر ہے، خواہ وہ دینی و شرعی احکام ہوں یا سماجی و معاشرتی اصول و قوانین لہٰذا یہ تصور کہ انسان، خدا و رسول، دین اور مذہب سے منہ موڑ کر ہر قسم کے اصول و قوانین کی پابندی سے نجات پائے گا اور اسے من مانی کرنے کی آزادی مل جائے گی، خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ سماجی قوانین، تخلیق اور حفظان صحت کے اصول اخلاقی اور نفسیاتی اقدار بہرکیف اس کی آزادی پر پہرے بٹھائے رہیں گی۔

انسان صرف خدا کو تسلیم نہ کرکے چوری اور قتل جیسے جرائم کا ارتکاب کرنے میں آزاد نہیں ہوسکتا سماجی قوانین اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈالیں گے اور جرائم کا انسداد کریں گے۔

معلوم ہوا کہ ہر معاشرہ کے لئے قانون کا وجود ضروری ہے۔ یہ قانون خود ساختہ ہو یا دین کا پیش کردہ اس کے جواب میں خوش قسمتی سے اسلامی قوانین کچھ ایسے امتیازات کے حامل ہیں جن سے دوسرے قوانین محروم ہیں، انہیں امتیازات کی وجہ سے اسے برتری حاصل ہے۔

(۱)

اسلام کی بنیاد سہولت و آسانی پر استوار ہے اس کے قوانین میں کسی قسم کی مشقت و صعوبت و "حرج" کا وجود نہیں، اس دعویٰ کو کئی دلیلوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اس قانون کی کتاب (قرآن)، کا آغاز "رحمٰن و رحیم" سے ہوا ہے، سورہ علق کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ "رحمٰن و رحیم" ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔ کیونکہ قوانین کا زحمت و مشقت کا باعث ہونا "رحمانیت و رحیمیت" کے منافی ہے بلکہ حضرت علیؑ سے روایت بھی ہے کہ خداوند عالم کی رحیمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے دین میں نرمی برتی ہے اور اسے سہولت و آسانی پر استوار کیا ہے[2]۔

قرآن مجید کے ہر سورے کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوا ہے، شیعہ عقائد کے مطابق بسم اللہ

سورہ کا جزء ہے اور ہر سورہ کے ساتھ اس کا نزول ہوا ہے، ایسا نہیں ہے کہ خود پیغمبر اکرمؐ نے خدا کے نام سے شروع کرنے کے لئے تبرکاً اس کا اضافہ کردیا ہو، جیسا کہ بعض مسلمان فرقوں کا خیال ہے۔

۲۔ ان قوانین کے لانے والے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو عالمین کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے۔

وما ارسلناك إلّا رحمة للعالمين[۳]

ان قوانین کا لانے والا مومنوں کے لئے رؤف ورحیم ہے۔

اگر قانون الٰہی زحمت ومشقت کا باعث ہوتا تو پھر کیسے ممکن تھا کہ اس قانون کے لانے والے کو قرآن میں ان دو صفتوں سے یاد کیا جاتا اور خود اس قانون کو وضع کرنے والا یعنی خدا اپنے پیغمبر کو ان اوصاف سے نوازتا؟

۳۔ ایسے بہت سے آیات وروایات موجود ہیں جو دین خدا کے سہل وآسان ہونے پر دلالت کرتے ہیں:

وما جعل عليكم فى الدّين من حرج[۵]

خداوند عالم نے دین میں کوئی ایسی چیز قرار نہیں دی جو تمہارے لئے مشقت آفرین ہو:

يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر[۶]

خداوند عالم تمہارے لئے آسانی وسہولت کا خواہاں ہے تم سے کسی قسم کی زحمت ومشقت کا طالب نہیں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرماتے ہیں:

بُعثت بالحنيفية السمحة[۷]

میں سہل وآسان ومکرم دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔

اگر آپ اسلامی قوانین کا جائزہ لیں تو آپ کو ہر مقام پر سہولت وآسانی نظر آئے گی۔ گویا یہ قوانین محض انسانوں کی سہولت وآسانی کی خاطر وضع کئے گئے ہیں۔ مثلاً یہی قانون کہ اضطرار واکراہ کی صورت میں انسان شرعی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہے۔

سرورِ کائنات کا ارشاد ہے:

رُفع عن امتى تسعة الخطأ والنسيان، وما اكرهوا عليه وما لا يعلمون وما لا يطيقون وما اضطروا اليه والحسد والطيرة والتفكر فى الوسوسة فى الخلق مالم ينطق بشفة[۸]

اس حدیث میں حضرت رسول اکرمؐ نے ان مقامات کو بیان فرمایا ہے جہاں امت شرعی

ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوجاتی ہے۔ان میں سے ایک مقام اضطرار ومجبوری بھی ہے ، اگر کسی شخص کو فعل حرام یا ترک واجب کے لئے ڈرا دھمکا کر مجبور کردیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے آخرت میں مواخذہ نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ دنیا میں بھی ہر قسم کی سزاؤں سے معاف ہے ، اگر کسی شخص کو قتل وضرب کی دھمکی دے کر شراب پینے پر مجبور کردیا جائے تو وہ اسلامی نقطہ نظر سے سزا سے معاف ہے اور اس پر کسی قسم کی حد جاری نہیں کی جائے گی۔

اسی طرح اگر انسان کسی حکم سے ناواقف اور اس پر حجت تمام نہ ہوئی ہو تو اس کو معاف کردیا جائے گا۔

علماء اسلام نے علم اصول فقہ میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے ، خود قرآن مجید میں بھی بعض اضطراری مقامات کا ذکر ہوا ہے جیسے مردار گوشت کھانے کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے :

فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه[9]

جو شخص مردار کھانے پر مجبور ہوجائے تو اس پر کسی قسم کا گناہ نہ ہوگا بشرطیکہ اس کی جانب رغبت نہ رکھتا ہو اور ضرورت سے زیادہ بھی نہ کھائے۔

حرج اور اضطرار کا مطلب :

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ حرج و اضطرار سے کیا مراد ہے ؟ اس سے مراد وہی زحمت ومشقت ہے جسے عوام زحمت ومشقت تصور کرتے ہیں اور معمولاً قابل برداشت نہیں ہوتی ضرورت وحرج کے تحقق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان کو موت کا خطرہ ہو (اس کی تفصیل ، وضو و روزہ ونماز کے ابواب توضیح المسائل میں بھی موجود ہے)۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ راوی امام سے سوال کرتا ہے کہ اگر میرا ناخن ٹوٹ گیا ہو اور انگلی پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو وضو کس طرح بجالاؤں ؟ حضرت اس کے جواب میں فرماتے ہیں :

یعرف هذا وأشباهه من کتاب الله عزوجل قال الله تعالیٰ «ما جعل علیکم فی الدّین من حرج»[10]

اس قسم کے مسئلوں کا جواب قرآن مجید سے سمجھا جاسکتا ہے ، خداوند عالم کا ارشاد ہے :

اللہ نے اپنے دین میں کسی ایسی چیز کو قرار نہیں دیا ہے جو تم لوگوں کے لئے زحمت ومشقت وحرج کا باعث ہو۔

علاوہ بریں قرآن وسنت کے الفاظ انہی عام فہم معانی میں استعمال ہوئے ہیں

جو عوام کے درمیان رائج ہیں۔

«وما أرسلنا من رسول إلآبلسان قومه ليبيّن لهم»

ہم نے کسی رسول کو کسی قوم کے درمیان نہیں بھیجا مگر اسی قوم کی زبان میں تاکہ انہیں احکام الٰہی سے آگاہ کرے۔

اب یہ کلیہ واضح ہوگیا ہوگا کہ "الضرورات تبیح المحظورات" اور "الضرورات تتقدر بقدرہا" ان دو فقہی اصولوں میں ضرورت سے مراد عقلی ضرورت نہیں ہے کہ انسان ارتکاب حرام اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو، یا موت کو گلے لگائے یا فعل حرام کا مرتکب ہو، بلکہ اس سے مراد ضرورت عرفی ہے جو عام انسان سمجھتا ہے۔

اگر ہم قرآن مجید میں وضع قوانین اور اس کے انداز بیان کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خداوند عالم نے کس قدر سہولت و آسانی کو مدنظر رکھا ہے۔ قرآن مجید میں جس وقت دشمنوں سے جنگ و قتال اور اس کے وجوب کا تذکرہ ہوتا ہے تو اسے ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے:

كتب عليكم القتال وهو كره لكم وعسىٰ ان تكرهوا شيئاً وهو خيرلكم، وعسىٰ ان تحبوا شيئاً وهو شر لكم والله يعلم وانتم لا تعلمون [11]

اسلام دشمنوں کے خلاف جہاد واجب ہے۔ چاہے بادی النظر میں تمہیں ناگوار ہی کیوں نہ ہو بہت سی ایسی چیزیں ہیں جنہیں تم پسند نہیں کرتے مگر وہ تمہارے حق میں مفید ہیں اور بہت سی چیزوں کو تم پسند کرتے ہو لیکن وہ تمہارے لئے نقصان دہ اور مضر ہیں، کیونکہ اللہ اس سے واقف ہے اور تم بے خبر ہو۔

جب قرآن مجید کسی حکم کو اس انداز اور لہجے میں بیان کرے گا تو انسان اپنی جہالت و نادانی سے باخبر ہو جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر مجاہدوں کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے خدا کی مرضی کے بغیر انسان کو ایک سانس لینے کا بھی اختیار نہیں۔

«وما كان لنفس ان تموت الا باذن الله كتاباً مؤجلاً» [12]

اذن الٰہی کے بغیر اور وقت معین، سے پہلے کسی شخص کو موت نہیں آسکتی۔ لہذا نہ میدان جنگ موت کا باعث ہے اور نہ گھر میں بیٹھے رہنے سے موت سے چھٹکارا ملے گا۔

اينما تكونوا يدرككم الموت ولو كنتم في بروج مشيدة

جہاں بھی رہو موت تمہیں اپنی گرفت میں لے لے گی، چاہے فلک بوس و مستحکم قلعوں ہی میں رہو۔

قرآن مجید انسانوں کو سعادت دنیوی و اخروی اور مرضی الٰہی کے حصول کا وعدہ دیتا ہے

جنگ وشہادت کا دلدادہ بنا دیتا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ خود میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں بلکہ اپنے دوستوں اور اعزہ واقارب کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله امواتا بل احیاء عند ربهم یرزقون[13]

راہ خدا میں قتل ہوجانے والوں کے سلسلہ میں یہ خیال نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس رزق حاصل کررہے ہیں اور دوسروں کو بشارت دیتے ہیں کہ یہاں کسی قسم کے خوف وپریشانی، حزن وملال کا گذر نہیں۔ لہذا تم بھی یہیں آجاؤ۔ شہادت سے وہ اتنا زیادہ محظوظ ہوتے ہیں کہ انکی صرف ایک ہی آرزو ہوتی ہے کہ کسی طرح زندہ ہوکر دوبارہ شہادت پر فائز ہوں۔

غزوہ احد میں حضرت عبد اللہ انصاری شہید ہوچکے تو ان کے فرزند حضرت جابر رسول اعظم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے جابر سے فرمایا کہ خداوند عالم نے پس پردہ سے تمہارے باپ سے گفتگو کی اور کہا تمہارے دل میں کوئی تمنا ہو تو بیان کرو، انھوں نے عرض کیا کہ خدایا! میری آرزو ہے کہ میں دنیا میں واپس جاکر دوبارہ لذت شہادت حاصل کروں۔ خطاب ہوا کہ تمہاری یہ خواہش قانون خلقت کے منافی اور ناقابل قبول ہے، کوئی اور خواہش بیان کرو، انھوں نے عرض کیا بار الہا! میرے اعزہ واقارب کو میرے حالات سے آگاہ فرمادے۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت نازل ہوگئی۔

(۲)

اسلامی قوانین کا ایک دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس کے تمام قوانین بندوں کے مصالح ومفاسد نفع ونقصان کے تابع ہیں، اسلام میں قانون سازی کا عمل انسانوں کے بے شعور غرائز ومیلانات کی بنیاد پر استوار نہیں ہے بلکہ اس کا دارومدار بندوں کی سعادت وخوشبختی پر ہے۔ انسانی غرائز وخواہشات عقل کے کنٹرول کے باوجود اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں قانون سازی کا معیار قرار دیا جاسکے، کیونکہ خود عقل بھی تمام جہات کے ادراک سے عاجز ہے۔

«وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً»

یہ وہی مشہور ومعروف نظریہ ہے جو مذہب عدلیہ سے منسوب ہے کہ اسلامی قوانین بلا حساب وکتاب وضع نہیں ہوئے بلکہ وہ مصالح ومفاسد کے تابع ہیں۔ اس کے تمام قوانین میں اس اصول کی رعایت کی گئی ہے، خواہ وہ عبادی احکام ہوں یا اخلاقی ضوابط، اقتصادی قوانین ہوں یا جہادی وجنگی منصوبے سر سے پیر تک نظافت وطہارت سے نظام حکومت تک جملہ قوانین میں یہ اصول

کارفرما نظر آتا ہے، کیونکہ ان تمام قوانین کا واضع حکیم و مصلحت اندیش خدا ہے اور نہ صرف یہ کہ اس سے لغو و بے مقصد عمل صادر نہیں ہوتا بلکہ اس سے اس قسم کے اعمال کا صدور محال ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ حکیم خدا کسی عمل کو حرام یا حلال قرار دے مثلاً جھوٹ کو حرام سچ کو حلال قرار دے اور اس میں کوئی علت نہ ہو۔ اسے لغو و عبث کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا اور خدا وند عالم لغو و عبث اعمال سے منزہ ہے۔ عقلی ہدایات و براہن کے علاوہ قرآن و سنت، آیات و روایات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ قرآن مجید ہر پاک و طیّب اور اچھی چیز کے حلال اور ہر خبیث و ناپاک چیز کے حرام ہونے کا اعلان کرتا ہے:

۱ ۔ یامرهم بالمعروف و ینهاهم عن المنكر ویحل لهم الطیّبات ویحرم علیهم الخبائث و یضع عنهم اصرهم والاغلال الق كانت علیهم [۱۵]

اس آیت میں پیغمبر اسلامؐ کے اوصاف اور لائحہ عمل کے تذکرے کے ضمن میں آپؐ کی ایک ممتاز صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ آپ نے تمام پاک و طیّب چیزوں کو جائز و حلال اور تمام ناپاک و خبیث اشیا کو حرام و ناجائز قرار دیا ہے۔

اس عمل کی اہمیت و قدر و منزلت کو ان امور سے سمجھا جا سکتا ہے جو اس کے ہمراہ بیان ہوئے ہیں:

اوّل ۔ اچھی چیزوں کا حکم اور انہیں معاشرہ میں رواج دینا، بری چیز سے روک کر سماج کی برائیوں سے تطہیر

دوّم ۔ ظلم و استبداد، استحصال و استعمار، جہالت و گمراہی، فقر و غربت اختلاف و تفرقہ کی زنجیروں کو توڑ کر نعمت آزادی سے مالا مال کرنا۔

«یضع عنهم اصرهم والاغلال الق كانت علیهم»

چنانچہ پیغمبر اسلام کی رسالت کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ انقلاب اور ہر چیز میں انقلاب چاہے وہ تہذیب و تمدن ہو یا اقتصاد و معیشت اصول ہو یا فروع، جنگ ہو یا سیاست۔

۲۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اس انقلاب کا استحکام و بقاء۔

۳۔ نیک اور صالح افراد کے ہاتھوں حکومت کی تشکیل، کیونکہ ان دونوں واجبات کا لازمہ حکومت و اقتدار اختیار ہے۔

«والذین ان مكناهم فی الارض اقاموا الصلوٰة وآتوا الزكوة وامروا بالمعروف»

خدا کے کچھ ایسے محبوب بندے ہیں کہ جب اقتدار ان کے ہاتھوں میں آتا ہے تو وہ نمازیں قائم کر

ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر بجا لاتے ہیں۔
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک دوسری ذمہ داری اچھی چیزوں کی حلیت اور بری چیزوں کی حرمت بیان کرنا ہے۔ ویحل لھم الطیبات ضمیر جمع کے ساتھ لام (لھم) کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ مصلحتیں پیش نظر ہیں۔ کیونکہ "لام" منفعت و فائدے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور منفعت عمومی ہے سب کیلئے مفید ہے، اس لئے کہ "لام" ضمیر غائب جمع کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

۲ ـــ قل من حرم زينة الله التى اخرج لعباده والطيبات من الرزق، قل هى للذين آمنوا فى الحياة الدنيا خالصة يوم القيامة كذلك نفصل الايات لقوم يعلمون، قل انما حرّم ربى الفواحش ماظهرمنها وما بطن والاثم والبغى بغير الحق[۱۶]

اے پیغمبر! جو لوگ دین کے نام پر خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے بہرہ وری سے منع اور اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ کس نے ان زینتوں اور پاک و پاکیزہ روزی کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ تمام چیزیں مومنوں کے لئے ہیں اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ خاص و بہتر چیزیں انہیں نصیب ہوں گی۔ ہم اہل دانش و خرد کے لئے اپنی آیتوں کو اسی طرح سے بیان کرتے ہیں۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ پروردگار نے صرف ظاہری و باطنی بدکرداریوں، برائیوں، گناہوں، ظلم اور ناانصافیوں کو حرام قرار دیا ہے۔

اے پیغمبر! یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے ہمارے لئے کن کن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔ کہہ دیجئے کہ تمام پاک و پاکیزہ و طیب چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں۔

٤ ـــ يا ايها الذين آمنوا انفقوا من طيّبات ما كسبتم[۱۸]

مومنوں کو خطاب کر کے یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اس مال سے انفاق نہ کرو جو ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، دھوکا دہی، عوام کو نقصان پہونچا کر یا محرّمات کی خرید و فروخت کے ذریعہ ہاتھ آیا ہو، بلکہ انفاق، جائز اور حلال کمائی سے ہونا چاہئے۔ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ اس آیت میں اقتصاد و معیشت کے حلال و جائز ہونے کا معیار صرف "طیب" ہونا قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ طیب اور حلیت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ حلال وہی چیز ہوگی جو طیب ہوگی۔
اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جیسے:

وانزلنا علیکم المنّ وَالسّلوٰی کلوا من طیّبات ما رزقنا کم[19]

اس کے علاوہ سورۂ انفال کی آیت ۲۶، سورہ طٰہٰ کی آیت ۸۰ و ۸۱، سورۂ مومنون کی آیت ۵۱، سورۂ غافر کی آیت ۶۴، سورۂ جاثیہ کی آیت ۱۶ اور اسی طرح سورۂ اسراء کی آیت ۷۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

«ولقد کرّمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاً»

بے شک ہم نے بنی آدم کو فضیلت وکرامت عطا کی اور خشکی وتری کی سیر کرائی اور انہیں پاک وطیب چیزوں سے روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت عطا کی ہے۔

گویا قرآن مجید نے معنوی برتری، اور دنیا میں علمی وظاہری سیر وحرکت کے شانہ بشانہ پاک وطیب چیزوں سے روزی حاصل کرنے کو کرامت و بزرگواری کا معیار قرار دیا ہے۔

اس نکتہ کی جانب توجہ بھی ضروری ہے کہ یہ دونوں کلمات (طیب وخبیث، ہمیشہ بطور مطلق استعمال ہوئے ہیں، یعنی انہیں صرف کسی ایک پہلو سے نہیں دیکھا گیا ہے بلکہ ان کی تمام جہات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ نفع ونقصان، طہارت ونجاست — لہٰذا جو چیزیں حلال ہیں انمیں کسی قسم کا ضرر نہیں، نہ جسم کے لئے نہ روح کے لئے نہ معاشرہ کے لئے، نہ تہذیب وتمدن کے لئے، نہ اقتصاد ومعیشت کے لئے، نہ زندگی دنیا کے لئے اور نہ حیات آخرت کے لئے۔ اور اس کے برعکس حرام چیزیں اور ان کے نقصانات ہیں آیات کے سلسلہ کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے چند احادیث پیش کی جا رہی ہیں۔ پیغمبر اسلام ارشاد فرماتے ہیں:

یا عباد اللہ انتم کالمرضیٰ ورب العالمین کالطبیب، فصلاح المرضیٰ فیما یعلمہ الطبیب، و یدبرہ، لافیما یشتھیہ المریض و یصرحہ، الا فسلموا لِلّٰہِ امرہ تکونوا من الفائزین[20]

بندگان خدا! تم مثل مریض ہو اور خدا مانند طبیب، مریض کی بھلائی ان ہی چیزوں میں ہے جسے طبیب تجویز کرتا ہے۔ مریض کی پسند کا دخل نہیں ہوتا امر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دو، کامیاب وکامران ہو جاؤ گے۔

حدیث دنیاوی اور اسلامی قانون سازی کے فرق کو اجاگر کرتی ہے: کیونکہ اسلامی قوانین

کی بنیاد مصلحت اندیشی ہے اور دنیاوی قوانین کی اساس عوام کے خواہشات و میلانات کی اندھی تقلید ہے، چاہے وہ خواہشات انہی عوام کے لئے ضرر رساں ہی کیوں نہ ہو۔

محمد بن سنان نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں خط بھیج کر دریافت کیا کہ بعض مسلمانوں کا یہ گمان ہے کہ خداوند عالم نے مصالح و مفاسد کو مدنظر رکھے بغیر بلا حساب و کتاب قوانین وضع کئے ہیں کسی علت و سبب کے بغیر بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیدیا اور ہم صرف اس کی بندگی کی خاطر تعبداً ان قوانین کی اطاعت کرتے ہیں ورنہ وہ ہمارے لئے بے سود ہیں۔ حضرتؑ نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

من قال: ذلك فقد ضلّ ضلالاً بعيداً

جو شخص اس طرح کے خیالات رکھتا ہو وہ بہت ہی زیادہ گمراہی میں مبتلا ہے، اتنی عمیق گمراہی جس سے جلدی چھٹکارا ممکن نہیں۔

ووجدنا المحرّم من الاشياء لا حاجة للعباد اليه ووجدناه مفسداً داعيا الى الفناءِ والهلاك[2]

جب ہم نے محرمات کا جائزہ لیا تو ان سب کو فرد و معاشرہ کی بدبختی و نابودی و ہلاکت کا باعث پایا۔ یہ ایسے گناہ ہیں جو تباہی و بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

یہ امام رضا علیہ السلام کا نظریہ ہے وہ امامؑ جس کا دل و دماغ مرکز علوم ہے۔ یہ اس شخص کا فیصلہ ہے جو خاندان وحی کا فرد ہے۔ یہ اس معصوم کی رائے ہے جس کے قریب خطا و لغزش کا گذر نہیں، یہ معصوم امام کا فیصلہ ہے۔

مفضل بن عمر سے روایت ہے:

قال قلت لأبي عبدالله عليه السلام:

لِمَ حرم الله الخمر والميتة والدم ولحم الخنزير؟ قال ان الله تبارك وتعالىٰ لَمْ يحرم ذلك على عباده واحل لهم ماسواه رغبة منه فيما حرّم عليهم ولا زهداً فيما حلّ لهم ولكنه خلق الخلق فعلم ما يقوم به ابدانهم وما يصلحهم فاحلّه لهم واباحه تفضّلاً عليهم لمصلحتهم وعلم ما يضرهم فنهاهم عنه وحرّمه عليهم.

مفضل امامؑ سے سوال کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے شراب، مردار، خون اور سؤر کے گوشت کو کیوں حرام قرار دیا ہے، اس کا کیا فلسفہ ہے؟ حضرتؑ جواب فرماتے ہیں

توحید ۱۸

کہ خداوند عالم نے کسی چیز کو اپنی رغبت و عدم رغبت خواہش و ناپسندیدگی کی بناء پر حلال و حرام نہیں کیا ہے (کیونکہ وہ مافوق دنیا و مادّہ ہے، وہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز سے بے نیاز ہے، وہ غنی بالذات ہے) بلکہ خداوند عالم نے خود انسانوں کی مصلحت کے پیش نظر حلال و حرام قرار دیا ہے، جو چیزیں ان کے بدن کی نشوونما کے لئے مفید و مصلحت تھی اسے حلال قرار دیدیا اور جو چیزیں ضرر رساں و نقصان دہ تھیں انھیں حرام قرار دے کر ان سے اجتناب کا حکم دیا۔

روایات میں ہے کہ خون کے حرام ہونے کا ایک سبب "قساوت قلب" ہے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے کہ خون پینے والا انسان خود اپنے بیٹے کو قتل کر ڈالے یا بیٹا ماں باپ کا خون کردے۔ مردار کی حرمت کے اسباب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے جسم کمزور پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام نے درندوں کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے، ذہن میں آتا ہے کہ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ درندوں کے گوشت سے انسان میں حیوانیت و درندگی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ غذا انسان کی جبلتوں پر اثر انداز ہوتی ہے، یا خود قرآن مجید جوے اور شراب وغیرہ کی حرمت بیان کرتے وقت ان کے مفاسد کا ذکر کرکے انسان کو انکی حرمت کی جانب متوجہ کرتا ہے:

انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰة فهل انتم منتهون[22]

شیطان شراب و جوے کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی و عداوت ڈالنا چاہتا ہے اور ان ہی اعمال کے ذریعہ تمہیں نماز اور یاد خدا سے غافل کردے گا۔ پس کیا تم ان چیزوں سے اجتناب کرو گے، کیا تم ان لوگوں کے جرگے میں شامل ہو گے جنہوں نے ان چیزوں سے دوری اختیار کی ہے۔

۱۔ بقرہ ۔ ۲۲۹ ۲۔ تفسیر صافی ص۵ ج۱ ۔ الرحیم ۳ ۔ الانبیاء ۔ ۱۰۷ ۴ ۔ التوبہ ۔ ۱۲۸ ۵۔ ج ۸ ۶ بقرہ ۔ ۱۸۵ ۷ ۔ نہج الفصاحۃ ص۲۱۹ ۸ ۔ خصال شیخ صدوق ص۲۱۶ ۹ ۔ بقرہ ۱۷۳ ۱۰ ۔ وسائل الشیعہ ۱۱ ۔ بقرہ ۲۱۶ ۱۲ ۔ آل عمران ۱۴۵ ۱۳ ۔ نساء ۷۸ ۱۴ ۔ آل عمران ۔ ۱۶۹ ۱۵ ۔ اعراف ۔ ۱۵۷ ۱۶ اعراف ۱۷ ۔ مائدہ ۔ ۴ ۱۸ ۔ بقرہ ۲۶۷ ۱۹ بقرہ ۔ ۵۷ ۲۰ مجموعہ ورّام جلد ۲ ۔ ص۲۳۶ ۲۱ ۔ بحار الانوار ۲۲ مائدہ ۔ ۹۲

جناب سید حسین موسوی تبریزی

اسلام کا قانون سزا

ترجمہ : جناب خادم حسین

یہ بات سب جانتے ہیں کہ سامراج نے اپنی خیانت آمیز سازشوں کے سہارے زیردست و محکوم ممالک کو عموماً اور اسلامی ملکوں میں خصوصاً مسلمانوں کو ان کی تاریخ و تہذیب، قرآنی تعلیمات اور اسلامی احکام و قوانین سے دور رکھنے کی سعی پیہم جاری رکھی اور اس کے ساتھ انہیں مغربی تہذیب و افکار، بدکاریوں، آوارگیوں اور بداخلاقیوں میں مبتلا کرنے کے لئے ہمت افزا ماحول دیا۔

ایران بھی اس منصوبے میں شامل تھا، مدتوں ایرانی مسلمان شیعہ اور سنی دونوں قرآن اور اسلام سے دور رکھے گئے، رضاخان اور اس کے بیٹے نے مغرب زدگی، آوارگی اور بداخلاقی کا پرچار کیا، رہن سہن لباس، خوراک، منشیات کا استعمال، شراب نوشی کی فراوانی عام کرنے کے لئے مختلف وسائل استعمال کیے۔ اخبارات، رسائل اور سینما ہر طرف جنسی رجحانات کو شہ دے رہے تھے اور انتہائی زہریلا پروپیگنڈہ عوام کو گمراہ کررہا تھا۔ لوگ قرآن و تعلیمات اسلام سے دور ہونے سے زیادہ متنفر ہو رہے تھے۔ محترم علماء، طلاب مدارس کی ایک تعداد، کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ لوگوں کے پاس نہ اسلامی کتابیں تھیں اور نہ ان سے دلچسپی۔ تعلیمی اداروں میں عربی کی تدریس برائے نام تھی یا سرے سے اس کا وجود ہی نہ تھا۔ حضرت آیت اللہ خمینی نے بار بار فرمایا:

> "پہلوی حکمران کی سب سے بڑی تباہ کاری یہ تھی کہ اس نے تہذیب و ثقافت کو بگاڑ کر ذہن خالی کردیا۔"

بڑی خوشی کی بات ہے کہ انقلاب اسلامی نے اس غلط رویّہ کو بڑی جلدی بدلنے میں مؤثر کردار انجام دیا۔ معاشرے کے تمام پہلوؤں میں اسلامی ثقافت کو غلبہ بخشا اور چار پانچ سال کے اندر اندر قوم کے مختلف طبقات اور ذمہ دار افراد کے لئے شاندار اقدامات کیے، اب قوم کے محترم نوجوان قرآنی تہذیب اور اسلامی ثقافت و قوانین کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اپنی گم گشتہ طاقت کو پوری توجہ سے حاصل کرنے کی فکر میں قانون اساسی کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کررہے ہیں۔ عربی سیکھ رہے ہیں اور انسانی اقدار اور قوتوں کو بنانے سنوارنے میں مصروف ہیں۔ مستقبل کی امیدوں کے بارآور ہونے میں درسگاہوں کا سب سے بڑا حصہ ہوگا۔ ابلاغ عامہ کے

ذرائع، ریڈیو، ٹیلیویژن بڑی کارکردگی دکھاسکتے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ان اداروں نے مثبت کام شروع کردیے ہیں، امید ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت عام کرنے کے لئے یہ ادارے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے اور کام کریں گے۔

اندرونی اور بیرونی رخنہ اندازیوں اور زبردستی تھوپی گئی جنگ کی اصلی غرض و غایت بھی یہی تھی کہ انقلاب کو مذکورہ بالا مقاصد سے روکا جائے اور قوم کی اس جدّوجہد میں رکاوٹ ڈالی جائے کہ وہ اسلامی ثقافت کو فروغ دے۔ اور ضمنی طور پر بے خبری، فتنہ پردازی اور بداخلاقی کے ساتھ فتنہ و فساد پیدا کرکے من مانے مقاصد حاصل کریں۔

ہمارے معاشرتی تشخص کے اعتبار سے اسلامی اور حیاتی مسائل میں اہم ترین مسئلہ اسلام میں سزا کے قوانین کا ہے۔ انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ یہی مسئلہ دوسرے اسلامی مسائل کے مقابلے میں عوام کیلئے سب سے زیادہ انجان مسئلہ ہے میں نے ارادہ کیا ہے کہ خدا کی مدد سے آیات قرآنی، سنّت و حدیث اور فقہاء اسلام کے ارشادات و فتاویٰ کی روشنی میں قانون سزا کو سادہ الفاظ میں قلم بند کروں، تاکہ ہر شخص اس کا مطالعہ کرسکے۔ میں کوشش کروں گا کہ آیات و احادیث اور مشہور مجتہدین کے فتوؤں کو نقل کرتے ہوئے امام امت حضرت آیت اللہ خمینی مدظلہ العالی کا فتویٰ ان کے خصوصی نقطۂ نظر کے ساتھ قاری کے سامنے لاؤں تاکہ مرجع تقلید کا فتویٰ یاد رکھا جاسکے۔

باغی

تعریف: قانون اسلام میں حدود کا پہلا مجرم باغی ہے۔ باغی اور بغاوت پر بحث سے پہلے ہم اس کے معانی سمجھتے چلیں۔

لغت میں ـ باغی ـ کا مادّہ "بغی" ہے ـ معنی: ظلم ـ جور ـ وہ چیز طلب کرنا یا حاصل کرنا جس پر طلب گار کا حق نہ ہو۔

شیعہ فقہا کی اصطلاح میں: باغی ـ وہ شخص یا گروہ یا مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو شرائط عدالت رکھنے والے قائد یا حکمران کے خلاف بغاوت کرے۔

باغی و بغاوت کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد: سورۃ الحجرآیہ ۹:

«وان طائفتانِ من المؤمنينَ اقتتلوا فأصلِحوا بينهما فإنْ بغَتْ إحداهما على الأخرىٰ فقاتِلوا التي تبغي حتىٰ تفيءَ إلى أمرِ الله فإن فاءتْ فأصلحوا بينهما بالعدلِ وأقسطوا إنّ الله يُحبُّ المقسِطين».

(الحجرات: آية ۹)

یعنی: اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کریں تو ان دونوں میں صلح کرادو ـــ پھر اگر

توحید پھیا

بعد اگر ایک دوسرے کے خلاف بغاوت کردے ۔ تو جس نے بغاوت کی ہو اس سے تم جنگ کرو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے ۔ پھر انصاف سے دونوں میں اصلاح کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ عادل اشخاص کو دوست رکھتا ہے ۔

سورۃ الحجرات کا آغاز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عوام کے نامناسب رویئے کے تذکرے اور انہیں حضور سے گستاخی سے روکنے اور راہ اعتدال سمجھانے، اطاعت پیغمبر کی دعوت دینے سے ہوا ہے۔

چھٹی ساتویں آیت کے ربط و سیاق و سباق کے مطابق اس آیت میں مومنوں سے خطاب ہے۔ کہ اگر یہ دیکھو کہ مومنوں کے دو گروہ جنگ وجدال میں مصروف ہیں تو :

(الف) پہلی منزل تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے دونوں کے درمیان اصلاح احوال کی کوشش کرو، صلاح کار کی دعوت دو۔ امن قائم کرو۔

(ب) اگر دونوں صلح و امن کی بات نہ مانیں، زور آزمائی اور تجاوز کو جاری رکھیں تو پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ تم (مومنین) ظالم گروہ سے جنگ کرو اور جنگ اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ باغی حکم خدا کے سامنے ہتھیار نہ ڈال دے اور مومنوں کے اصلاح حال (امن) کو تسلیم نہ کرے۔

(ج) اگر حکم خدا کے سامنے گردن جھکا دیں اور اطاعت خدا اختیار کریں تو عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرو اور دونوں گروہوں میں اصلاح کا عمل انجام دو ۔ قرآن مجید کی یہ تشریح اپنی جگہ جامع اور بہت سے احکام کا سرچشمہ ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے جلیل المرتبہ مجتہد شیخ ابو جعفر طوسی رضوان اللہ علیہ نے "النہایہ" میں لکھا ہے :

«کل من خرج علیٰ امام عادل ونکث بیعته وخالفه فی احکامه، فهو باغ، وجاز للامام قتاله ومجاهدته ویجب علیٰ من یستنهضه الامام فی قتالهم النهوض معه ولا یسوغ له التأخر عن ذلك»

یعنی : جو کوئی عادل امام کے خلاف خروج کرتا اور بیعت توڑتا اور احکام میں مخالفت کرتا ہے اسے باغی قرار دیا جائے گا۔

الف : امام کے لئے اس باغی سے قتال وجہاد جائز ہے۔

ب : امام، باغی کے خلاف جن لوگوں کو مقابلہ کرنے کو بلائے ان پر اس باغی سے جنگ واجب ہے۔

ج : حکم امام کے سلسلے میں التوا نہیں کیا جا سکتا۔
آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ علامہ حلی اپنی کتاب "تذکرۃ الفقہا" میں فرماتے ہیں :

«قتال اهل البغي واجب بالنص والاجماع»

مرحوم فاضل جواد کاظمی اپنی کتاب "مسالک الافہام" میں (جو آیات الاحکام کی تفسیر ہے) فرماتے ہیں :

«وفى الآية دلالة علىٰ وجوب قتال الفئة الباغية وهى عندنا الطائفة الخارجة عن طاعة الامام المعصوم لشبهة عرضت لهم»

آیۂ شریفہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ باغی گروہ سے جنگ کرنا واجب ہے اور باغی وہ ہے جو کسی اشتباہ کی وجہ سے امام کی اطاعت چھوڑ دے اور اسلامی حکومت کے قوانین کو تسلیم نہ کرے۔

مرحوم نجم الدین محقق نے ابتداء شرائع الاسلام میں، شہید اوّل نے لمعہ و شہید ثانی نے شرح لمعہ میں، صاحب جواہر نے جواہر الکلام میں، ان کے علاوہ سب فقہا نے اس سے ملتی جلتی عبارتیں لکھی ہیں۔ شیعہ فقہا کے درمیان ایسا کوئی فقیہ ہماری نظر میں نہیں ہے جس نے مذکورۂ بالا قانون کی مخالفت کی ہو، بلکہ زیادہ تر فقہا نے دعوائے اجماع بھی کیا ہے۔ لہٰذا مذکورۂ بالا اقوال پر ہی اکتفا کرکے باغی سے متعلق قوانین اور امیر المومنین علیہ السلام کے زمانۂ حکومت میں اس اصطلاح کی تاریخی حیثیت کے متعلق کچھ باتیں عرض کرتا ہوں۔

قوانین

پہلا مسئلہ : اس گروہ کا خروج جو امام کی مخالفت اختیار کرتا ہے، دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔
الف : یا امام کی نسبت اسے کوئی شبہ یا اشکال نظر آتا ہے جس کی بنا پر وہ امام کو عادل نہیں سمجھتا۔
ب : یا عادل کی حیثیت سے مانتا تو ہے لیکن عمل کے نقطۂ نظر سے اسے تردد اور شبہ و اشکال ہوتا ہے،
جیسے خوارج جو امیر المومنین علیہ السلام کو محض ثالثی قبول کرنے کی وجہ سے کافر (نعوذ باللہ) مانتے تھے اور آجکل کے دھوکے اور فریب کے شکار نوجوانوں کی طرح جو منافقین کے گروہ سے وابستہ رہنے کے نتیجہ میں اپنے منافق آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسلامی حکومت کو رجعت پسند یا بقول اپنے، بورژوائی اور

استبدادی کہتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں شبہوں نے جنم لیا ہے۔

فقہی اعتبار سے یہ لوگ باغی قرار پاتے ہیں اور باغی کے قوانین کا ان پر اطلاق ہوتا ہے۔ البتہ ابتدا میں امام یا نائب امام کو چاہیے کہ پہلے ان لوگوں کے شبہات کا جواب دے اور انہیں مطمئن کرے اگر سب کچھ ماننے کے بعد بھی وہ عادل امام اور اسلامی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائیں تو امام پر واجب ہے کہ ان لوگوں کے خلاف جنگ اور جہاد کا فتویٰ صادر کرے اور مومنین پر ایسے لوگوں سے مقابلہ کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر اس گروہ کی خلاف ورزی شبہ اور اشکال کی بنا پر ہونے کے بجائے حکومت پر قبضہ اور ظلم و فساد پھیلانے یا محض امام عادل کی مخالفت اور ذاتی دشمنی پر مبنی ہو۔ جیسا کہ معاویہ اور عمرو عاص (ان کے پیروکار نہیں)، یا رجوی اور بنی صدر یا دیگر دوسرے گروہ جو بگمان غالب اپنے غلط اندیش ہونے کے بارے میں بہتر جاننے کے باوجود حکومت اسلامی کی مخالفت پر کمربستہ ہیں، ان کے بارے میں لفظ باغی کا اطلاق نہیں ہوگا بلکہ یہ "محارب" ہیں اور محارب کے قوانین کے تحت ان کا فیصلہ ہوگا یا ان سے جنگ کی جائے گی۔ اس مسئلہ پر بعض فقہا (جیسے صاحب جواہر)، نے اختلاف کیا ہے، ان کی نظر میں اگر دوسری حالت میں سے ہونے کے باوجود کوئی بھی فرد یا گروہ شبہے اور اشکال کا شکار نہ ہو جب بھی اس پر باغی کا اطلاق ہوگا اور اس پر باغی کے قوانین لاگو ہوں گے۔

دوسرا مسئلہ: بڑے فقہا میں سے کچھ حضرات جیسے علامۂ حلی نے تذکرۃ الفقہا اور شہید اوّل نے لمعہ اور شہید ثانی نے اس کی شرح میں فرمایا ہے کہ باغی اس گروہ یا فرد کو کہا جاتا ہے جو معصوم امام کے خلاف خروج کرے لیکن بہت سے فقہا کی نظر میں اگر مسلمانوں کے امام عادل کے خلاف خروج ہو، جب بھی اسے باغی کہیں گے اور باغی کے قوانین کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ امام اور سربراہ کے معصوم ہونے یا نہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔ بلکہ اگر مسلمانوں کی سربراہی اور قیادت کسی عادل اور جامع الشرائط فرد کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کی ذمہ داری بھی وہ قبول کرلے تو سب مسلمانوں پر اس کی حمایت واجب اور یہ بھی لازم ہے کہ وہ بیعت امام کو ختم نہ کریں، کیونکہ امام عادل کی اطاعت سے سرتابی اور اس کی حکومت کی مخالفت کرنا بغاوت اور گناہ عظیم بھی ہے۔

ہماری نظر میں دوسرا قول مندرجۂ ذیل دلائل کی بنیاد پر زیادہ مناسب اور قریب صحیح ہے۔

قرآن: سورۂ حجرات کی نویں آیۃ "وان طائفتان من المومنین..." دلالت کرتی ہے، کہ مسلمانوں کے دو گروہوں، دو اداروں یا دو قوموں یا کسی دوسرے گروہ کے درمیان لڑائی ہو اور ان میں سے ایک گروہ عادل اور نیک اور دوسرا گروہ ظالم اور غیر صالح ہو، تو پہلے ان دونوں کو صلح کی دعوت دے کر صورت احوال کو سدھارا جائے اور اگر اس کے باوجود غیر صالح گروہ، صالح گروہ پر حملہ جاری رکھتا ہے اور اسلامی تحریک کی مخالفت پر کمربستہ رہتا ہے تو اس کا مقابلہ کرنا چاہئے، مقابلہ اتنا شدید ہونا چاہیے کہ وہ

حق پر مبنی اسلامی قوانین و مسلمات پر عمل درآمد کرنے لگے ورنہ تباہ و برباد ہونے کے لئے تیار رہے اور آیت مذکورہ سے نتائج حاصل کرتے ہوئے قیادت اور رہنمائی امام عادل اور معصوم کے ذمّے ہو یا عادل امام جامع الشرائط ولی فقیہ کے ذمّے ہو، ہمیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ آیت صاف صاف سربراہ اور قانون کی نشان دہی کرتی ہے۔

حدیث: مذکورہ بالا مسئلہ کے سلسلے میں بہت سی روایات ہیں

۱۔ تہذیب جلد ۶، ص۱۴۴۔ حدیث ۲۶۶

«عن حفص بن غياث قال: سألته عن طائفتين احداهما باغية والاخرىٰ عادلة فهزمت العادلة الباغية فقال: ليس لأهل العدل أن يتبعوا مدبراً ولا يقتلوا أسيراً ولا يجيزوا علىٰ جريح وهذا اذا لم يبق من اهل البغي احد ولم يكن لهم فئة يرجعون اليها فاذا كانت لهم فئة يرجعون اليها فإن اسيرهم يقتل ومدبرهم يُتَّبَعُ وجريحهم يجاز عليه»

یعنی: امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں آپ کے صحابی حفص بن غیاث فرماتے ہیں: میں نے امامؑ سے ایسے دو گروہوں کے بارے میں پوچھا جن کے درمیان کشیدگی تھی اور ان میں سے ایک گروہ نیک اور دوسرا بد اور باغی تھا، عادل گروہ نے باغی گروہ پر غلبہ حاصل کرلیا ـــ امام علیہ السلام نے فرمایا: اگر کسی گروہ کا سردار مرجائے اور اس کی جمعیت منتشر ہو جائے تو اس گروہ کے فراریوں کا پیچھا نہ کرنا چاہئے اور بچے ہوئے زخمیوں کو بھی قتل نہ کیا جائے۔ لیکن اگر گروہ کا کافر سرغنہ موجود ہو اور فرار شدہ افراد اس سے وابستہ رہتے ہوئے اپنے جرائم سے باز نہ آئیں، اس صورت میں فراریوں کا سختی سے پیچھا کرنا چاہیے اور ان کے بچے ہوئے افراد یا زخمیوں کو بھی قتل کردینا چاہیے۔

اس روایت میں امام کے معصوم ہونے کی کوئی قید یا شرط نہیں ملتی، اگر ذکر ہے تو صرف حاکم عادل اور باغی گروہ اور ان کے درمیان جنگ کا۔

اگرچہ سند کے اعتبار سے یہ روایت ضعیف ہے، لیکن تمام عالم اسلام کے بلند پایہ فقہانے تقریباً اس روایت پر عمل کرکے اپنے فتوے صادر کیے ہیں، فقہا کی اصطلاح کے مطابق کسی روایت پر علماء اور فقہا کا عمل کرنا اس روایت کے قوی ہونے کی دلیل ہے، اس اصول کے مطابق اس روایت میں بھی کوئی شک

وشبہ باقی نہیں رہتا۔

۲۔ تہذیب جلد ۶، ص۱۴۴، حدیث ۲۴۹

«عن السکونی عن جعفر عن ابیه عن آبائه علیهم السلام، قال لمّا فرغ امیرالمؤمنین علیه السلام من اهل النهروان، قال: لایقاتلهم بعدی اِلامن هم اولیٰ بالحق منه»

یعنی، سکونی امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد ماجد اور ان کے والد ماجد نے اپنے دادا سے سنا کہ جب حضرت علی علیہ السلام نہروانیوں کی جنگ سے فارغ ہوئے تو انہوں نے فرمایا: ہمارے بعد ایسے افراد سے (جو قبلے کی طرف نماز پڑھتے ہوں اور مسلمان ہوں) وہی شخص جنگ کرسکتا ہے جو اپنے حریف کے مقابلے میں بہتر اوصاف و امتیازات رکھتا ہو۔ یعنی وہ گروہ جو عادل ہو اور اسلامی حکومت کے اصول و قوانین سے آگاہ رہتے ہوئے اسلامی تحریک کو مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لئے توسیع بخشے اور اسلام و قرآن کے قوانین کا نفاذ کرنے نیز اسلامی مسائل کے ساتھ ساتھ زمانے کے حالات سے آگاہ ہو اور حکومت قائم کرنا چاہے تو عوام اس حکومت کے قیام میں بھرپور مدد دیں اور اگر ایسے گروہ کی مخالفت میں کوئی نالائق (نہروانیوں کی طرح) گروہ تیار ہوجائے اور معاویہ و عمرو عاص جیسے افراد ان کی پشت پناہی اس حد تک کریں کہ وہ مضبوط ہوجائیں تو ان کا مقابلہ کرنا چاہیے البتہ پہلے راہ حق پر آنے کی دعوت دی جائے۔ اگر نہ مانیں تو جنگ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اس طرح کی صلاحیت پہلے گروہ میں نہ پائی جاتی ہو اور دوسرا گروہ محض اس گروہ کی عدم صلاحیت پر خروج کرے تو اس کو خروج کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ اور اس صورت میں اس سے مقابلے کا حق نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ اپنے عمل میں حق بجانب ہے۔

۳۔ تہذیب جلد ۶، ص۱۴۵۔ حدیث ۲۵۰

«عبدالرحمن بن الحجاج قال: سمعت ابا عبدالله علیه السلام یقول کان فی قتال علی علیه السلام علیٰ اهل القبلة برکة ولولم یقاتلهم علیٌ علیه السلام لم یدر احد بعده کیف یسیر فیهم»

یعنی؛ عبد الرحمٰن بن الحجاج کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق کی زبانی سنا وہ فرما رہے تھے: کہ حضرت علی علیہ السلام کی اہل قبلہ (نماز پڑھنے والے مسلمانوں) سے

جنگ کی بدولت ایک برکت حاصل ہوئی، اس لئے کہ اگر حضرت ان سے جنگ کرتے تو آج یہ مسئلہ تشنہ رہ جاتا اور قانونی خلا بن جاتا کہ تمازگندار باغیوں کے سلسلے میں قانونی نکات کیا ہیں؟ خاص طور سے اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں اس طرح کی جنگ نہیں ہوئی تھی جس میں مسلمان فریق مخالف ہوتے۔

جنگ جمل پہلی جنگ تھی جس میں ایک طرف امام معصوم اور ان کے مسلمان ساتھی، دوسری طرف حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر دس ہزار آدمیوں کے ساتھ تھے، حضرت علی علیہ السلام نے بطور اتمام حجت دعوت حق دی اور اس کے بعد جنگ کا آغاز دشمن پر جوابی حملے سے کیا۔ طلحہ اور زبیر نیز دیگر سرداروں کے قتل کے نتیجہ میں لشکر تتر بتر ہوگیا اور امیر المومنین علیہ السلام نے حضرت عائشہ کو مدینہ روانہ کر دیا۔

ترتیب حدیث اور طریق عمل امیر المومنین علیہ السلام میں صاف مطابقت نظر آتی ہے۔ ہم اس روایت سے یہ بھی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے قول میں صراحت شامل تھی، کہ علی علیہ السلام نے جو رویہ اختیار کیا وہ آئندہ آنے والی مسلمان نسلوں کے لئے بطور سند یاد رکھنا چاہیے اور اسی کے مطابق انہیں عمل کرنا چاہیے، اب یہ سوچیے کہ اگر یہ جنگ واقع نہ ہوتی تو آج کیا معلوم ہوتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

۴۔ تہذیب جلد ۶، ص ۱۴۵۔ حدیث ۲۵۲

سکونی امام جعفر صادق علیہ السلام کے قول کو نقل کرتے ہیں: حضرت نے اپنے والد بزرگوار امام محمد باقر علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا تھا کہ: جب حضرت علی علیہ السلام سے "محدودیہ" سے جنگ کے بارے میں سوال کیا گیا تو امام نے فرمایا:

«إن خرجوا على امام عادل او جماعة فقاتلوهم وان خرجوا على امام جائر فلا تقاتلوهم فان لهم في ذلك مقالا»

یعنی: اگر کسی عادل امام یا مسلمانوں کے گروہ کے خلاف کوئی گروہ آواز مخالفت بلند کرے تو اس سے مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر مخالفت کسی ظالم حکمران یا گروہ کی کی جائے تو اس مخالف گروہ سے مقابلہ نہ کرنا چاہیے، اس لئے کہ اس کی مخالفت حق بجانب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ ظلم اور ظالم کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے اور یہ بذات خود اسلامی فرائض میں سب سے بڑا فریضہ ہے۔

یہ روایت گذشتہ روایات سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ ایک اساسی اور کلی قاعدہ و قانون وضع

رتی ہے، یعنی ہر وہ گروہ جو کسی عادل امام یا گروہ کی مخالفت اختیار کرتا ہے، اس سے مقابلہ اور جنگ کرنا چاہیے
وراس کی سرگرمیوں کو بہرحال روکنا چاہیے۔
اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کا مشہور وصیت نامہ جس میں انہوں نے فرمایا ہے :

«کونا للظالم خصماً وللمظلوم عوناً»

ہمیشہ ظالم افراد کے لئے دشمن، اور مظلوم افراد کے لئے مددگار بننے کی کوشش کرو۔

اس کے علاوہ اور روایات ہیں جو اس مسئلہ کے حل میں مدد دیتی ہیں۔ لیکن تمام روایات کو نقل کرنے سے مضمون کافی طویل ہو جائے گا، احادیث کے علاوہ قرآن اور اسلامی عقائد کی روشنی میں عقلی دلائل بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، کہ معاشرے میں ایک نظام ہونا چاہیے اور معاشرے کی تنظیم و تنسیق اس لائق فرد کے ذمے ہونا چاہیے جو اسلامی حکومت کو قرآن اور اسلامی تعلیمات کی مدد سے چلا سکے۔ حکومت اسلامی اور اس کے استقرار و استحکام میں، کوئی قید نہیں ہے کہ ائمہ معصومین ؑ کے زمانے میں ہی ہونا چاہیے بلکہ اسلامی حکومت ہر جگہ اور ہر زمانے میں قائم اور مستحکم ہونا چاہیے اور یہ کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کی راہ میں رخنہ ڈالنے والے گروہ یا گروہوں کو حق کے سامنے جھکنے پر مجبور نہ کر دیا جائے لہٰذا ان سے جنگ کرنا پڑے گی تاکہ وہ سر تسلیم خم کریں۔ ہر زمانے میں حق و باطل ایک دوسرے کے سامنے آتے رہے ہیں، یہ بھی ہوا ہے کہ فریقین مسلمان تھے، لیکن ایک گروہ عادل ہو اور دوسرا باغی ــ قرآن و احادیث سے یہی ثابت ہے کہ باغی سے اس وقت تک جنگ کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ وہ ختم نہ ہو جائے اور یا سر تسلیم خم نہ کرے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :

«وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة»

ان سے اس وقت تک لڑو جب تک فتنہ تمام نہ ہو جائے۔

یہ آیت خاص طور سے اہل کفر کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کا اطلاق فتنہ اور فساد کی تمام قسموں پر ہو سکتا ہے، اسی بنا پر مرحوم شیخ طوسیؒ نے اپنی کتاب " النهاية " اور دوسری کتب میں، مرحوم محقق حلیؒ نے " شرائع "، شہید ثانیؒ نے " مسالک "، علامہ حلیؒ نے " قواعد " مرحوم محقق کرکی نے " جامع المقاصد "، شیخ حسنؒ نے کتاب " الجواہر " مرحوم مقدس اردبیلیؒ نے " آیات الاحکام " اور فاضل جواد کاظمی نے " مسالک الافہام " میں اور بعض مقامات پر اجماع کا بھی دعویٰ ہے کہ گروہ باطل پر لفظ باغی صادق آنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گروہ حق کی قیادت معصوم ؑ کے ہاتھوں میں ہو بلکہ امام عادل اور جامع الشرائط سے جنگ، امام معصوم سے جنگ کے برابر ہے۔

مسئلہ کافی روشن اور واضح ہے۔ اس سلسلے میں مزید گفتگو کرنا ضروری نہیں، قارئین کرام حسب ضرورت مذکورہ کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ: فقہا (رضوان اللہ علیہم) میں سے کچھ حضرات نے باغیوں سے جنگ کی شرائط کے سلسلے میں فرمایا ہے کہ: باغی گروہ وہ ہے جو سرد و گرم قسم کے ہتھیار سے لیس ہو کر امام عادل یا اس کے گروہ یا کسی دوسرے صالح اور عادل گروہ سے اعلان جنگ کرے۔ اس کے علاوہ قانون بغاوت کسی اور گروہ پر لاگو نہیں ہوتا۔

لیکن گذشتہ روایات اور آیۂ شریفہ یا آیندہ آنے والے روایات کے پیش نظر کسی بھی گروہ کی صف آرائی اور ہتھیار سے لیس ہونا کوئی محکم دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ہر وہ شخص یا گروہ جو اپنے عمل میں امام عادل کی کسی طرح کی مخالفت بغاوت اور اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے، اس سے جنگ کرنا چاہیے تاکہ وہ حق کے سامنے سر جھکائے اور اسلام و اسلامی قوانین و احکام کا احترام کرے۔ مثال کے طور پر کسی شخص سے اسلامی ٹیکس (خمس و زکوٰۃ) کا مطالبہ امام عادل یا حکومت اسلامی کا سربراہ کرے اور وہ شخص ادائیگی سے انکار کردے، تو ایسے شخص سے جنگ واجب ہے۔ لہٰذا مرحوم شیخ طوسی رضوان اللہ علیہ "نہایہ"، میں فرماتے ہیں:

«کل من خرج علیٰ امام عادل ونکث بیعته وخالفه، فی احکامه فهو باغ»

جو کوئی امام عادل کی بیعت نہیں کرتا اور اس کے احکام و قوانین سے سرتابی کرتا ہے، وہ باغی ہے۔

روایات میں یہ تصریح موجود ہے کہ جو شخص زکوٰۃ دینے سے انکار کرے وہ کافر ہے اور اس سے جنگ کی جاسکتی ہے، فقہا نے استنباط کیا ہے کہ یہاں مراد حکومت کے مطالبے کے باوجود ادائیگی نہ کرے تو اس سے جنگ کرنا چاہیے اور اس کو قتل کرنے میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ "باغی" کا اطلاق ہر اس گروہ یا جماعت پر ہوسکتا ہے جو عادل حکومت کی خلاف ورزی کرے اور خاص طور سے اگر یہ اقدام امام عادل کی حکومت کو کمزور بنانے اور اس کا تختہ الٹنے کے لئے یہ کوشش خواہ صف آرائی اور مقابلہ کے طور پر ہو۔ جس طرح سے صدام کے زرخرید غلاموں نے ایرانی عوام کے حقوق پر حملہ کر کے انجام دی ہے، یا اسلامی حکومت کے خلاف خفیہ جنگ کے طور پر ہو۔ جس طرح سے مجاہدین خلق جیسی تنظیموں نے اسلامی حکومت کو کمزور بنانے کی تدبیریں کی تھیں۔ اس صورت میں جب باغی اور محارب ایک ہی گروہ سے وابستہ ہوں اور ان میں سے کچھ عادل اور صالح افراد کو ہتھیاروں سے ڈرائیں دھمکائیں اور غارتگری پھیلائیں اور کچھ افراد انہیں مالی، جانی اور مادّی امداد فراہم کر کے منظم کرنے کی کوشش کریں تو دونوں پر باغی کے قوانین جاری ہوں گے۔

البتہ باغی گروہ کی جانب سے جنگ شروع کرنے کا اعلان ضروری ہے، اور جب تک باغی گروہ کی طرف سے جنگ کا اعلان نہ ہو، اس وقت تک صالح مسلمانوں کی طرف سے جنگ کی شروعات نہ کی جائے، باغی گروہ کے اعلان جنگ کے بعد ہی امام پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ پہلے انہیں سمجھائے بجھائے، ان کی غلط فہمیاں دور کرے، پھر اگر بات مان لیں اور حق قبول کرلیں تو نہ صرف یہ کہ ان سے جنگ نہ کی جائے بلکہ ان کے ساتھ صلح و برادری کا سلوک کرنا چاہیے اور اگر بات ماننے سے انکار اور اسلامی حکومت کے خلاف پیکار جاری رکھیں تو امام بھی جنگ کا اعلان کرسکتا ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان سے مقابلہ کریں تاہم نہا بادیینِ خلق نے جب تک مسلح کاروائی کا اعلان نہیں کیا، اس وقت تک حکومت اسلامی کی عدالتوں میں ان کے ساتھ باغی اور محارب جیسا سلوک نہیں کیا گیا تھا لیکن ۱۸ جون ۱۹۸۱ء کے بعد جب ان کے سیاسی اور فوجی اعلامیہ نمبر ۲۵ کا اعلان ہوا اور ۳۰ جون کو یہ لوگ مسلح ہوکر سڑکوں پر نکل آئے اور ہمارے تقریباً تیس بھائیوں کو شہید اور بہت سے دوستوں کو زخمی کر چکے۔ اس وقت سے یہ لوگ باغی اور محارب کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ انقلاب اسلامی کی عدالت اعلیٰ کے نوٹس اور دس نکاتی اعلامیہ کے پیش نظر جو اس حادثے سے پہلے صادر ہوچکا تھا، اس میں اور امام امت کے ارشادات میں اس گروہ کے انحرافات کے بارے میں بارہا اشارہ ہوچکا تھا۔ انہیں اصلاح احوال کی طرف توجہ دلائی گئی۔ قرآن کریم، سنت رسول ؐ اور امیر المومنین ؑ کے مقدس طریقوں کے مطابق ان کے ساتھ رویہ بھی اختیار کیا گیا۔ یہی وجہ تھی، جو یہ اعلان و بیان جاری ہوا کہ جو لوگ ہتھیاروں سے لیس ہوکر سڑکوں پر لوگوں کو تنگ کریں گے۔ وہ اسلامی احکام کے مطابق سزائے موت کے مستحق قرار پائیں گے۔

چوتھا مسئلہ: مذکورہ روایات خاص طور سے حفص بن غیاث کی روایت (حدیث ۲۴۶۔ جلد ۶ تہذیب) سے یہ بات واضح ہوگئی کہ باغی کے ساتھ کس قسم کی جنگ ہونا چاہیے۔ اسی روایت کی بنا پر عالم اسلام کے بڑے بڑے فقہا خاص طور سے شیعہ علماء دین نے اپنے فتوے صادر کیے ہیں اور باغی گروہ کو قانون کے لحاظ سے دو صورتوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔

۱۔ جب تک باغی گروہ کی مرکزی قیادت اور رہنمائی مکمل طور سے ختم نہیں ہوتی اور منتشر لوگوں کو اسلامی حکومت کے خلاف جمع کرنے اور اسلحہ و ساز و سامان مہیا کرنے میں کوشاں رہتی ہے۔ اس وقت تک فرار شدہ افراد کا پیچھا کرنا چاہیے اور زخمیوں نیز گرفتار افراد کو قتل کرنے کا بھی حق ہے۔

۲۔ اگر باغی گروہ کی قیادت اور مرکزی حیثیت ختم ہوجائے یا قائد گرفتار ہوجائے تو فرار کی حالت میں ان لوگوں کا پیچھا اور گرفتار شدہ افراد کو قتل نہیں کرنا چاہیے

اور زخمیوں کو قتل کرنے کے بجائے علاج معالجے کی آسانیاں مہیّا کرنا چاہیے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے باغیوں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا، جنگ صفین میں جب تک معاویہ اور اس کے ساتھی زندہ رہے اور لوگوں کو شام کے علاقے میں اسلام کے خلاف متحد اور یکجا کرتے رہے۔ اس وقت تک فرار شدہ افراد اور زخمیوں کو قتل کیا جاتا رہا اور ان کی مرہم پٹی کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ لیکن جنگ جمل کے دوران جب باغی گروہ کے سردار طلحہ اور زبیر قتل کر دیے گئے اور حضرت عائشہ گرفتار ہو گئیں تو فرار ہونے والے افراد کا پیچھا نہیں کیا گیا اور جنگی اسیروں کے ساتھ نہ صرف اچھا سلوک کیا گیا بلکہ انہیں اسلامی احکام و قوانین کے مطابق تعلیم و تربیت دے کر آزاد کر دیا اور حضرت عائشہ کو بھی کچھ خواتین کے ساتھ باعزت مدینہ روانہ کر دیا گیا۔

وسایل الشیعہ جلد ۱۱، صفحہ ۵۶۔ حدیث ۴۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے دو طرح کے سلوک کرنے کے سلسلے میں جو سوال یحییٰ بن اکثم نے امام ہادی علیہ السلام سے کیا تھا، اس کے جواب میں امام نے فرمایا تھا:

«وأمّا قولك ان علياً عليه السلام قتل اهل صفين مقبلين ومدبرين واجاز علىٰ جريحهم، وانه يوم الجمل لم يتبع مُوَلّياً ولم يجز على جريح، ومن القىٰ سلاحه آمنه ومن دخل داره فأنّ اهل الجمل قتل امامهم ولم يكن لهم فئة يرجعون اليها وانّما رجع القوم الىٰ منازلهم غير محاربين ولامخالفين ولا منابذين ورضوا بالكف عنهم فكان الحكم فيهم وضع السيف عنهم والكف عن اذاهم، اذ لم يطلبوا عليه اعواناً، واهل صفين كانوا يرجعون الى فئة مستعدة وامام يجمع لهم السلاح والدروع والرّماح والسيوف ويسنى لهم العطاء ويهيئ لهم الانزال ويعود مريضهم ويجبّر كسيرهم ويداوى جريحهم ويحمل راجلهم ويكسو حاسرهم ويردهم فيرجعون الىٰ محاربتهم وقتالهم فلم يساوِبين الفريقين فى الحكم لما عرف من الحكم من قتال اهل التوحيد»

آپ کے سوال کے بارے میں کہ حضرت علی علیہ السلام نے جنگ صفین میں حملہ آوروں کو مارا، بھاگنے والوں کا تعاقب کیا، زخمیوں کو بھی قتل فرمایا ؟ جبکہ جنگ جمل میں فرار ہونے والے اشخاص کا پیچھا نہیں کیا اور زخمیوں کو قتل

نہیں کیا اور جو لوگ اپنے ہتھیار ڈالکر اپنے گھروں کو واپس چلے گئے یا جنگ سے کنارہ کش ہو گئے، ان کو امان دی ؟ ان دو رویوں کا سبب یہ ہے کہ قائدین جنگ جمل کے قتل ہوتے ہی ان کی مرکزی قیادت ختم ہو گئی اور کوئی ایسا مرکز نہیں رہا جو ان کی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ بحال کرسکے اور پھر سے جنگ کے لئے تیار کرے۔ قیادت ختم ہونے کے بعد تمام افراد جنگ سے دست بردار ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، انہوں نے مکمل جنگ بندی قبول کر لی۔ اس صورت حال میں اسلامی قانون کے مطابق نہ ان کا تعاقب کیا جاسکتا تھا نہ ان کے زخمیوں کے ساتھ وہ سلوک ہوسکتا تھا جو دوبارہ جنگ کے لئے تیار اشخاص سے کیا جاسکتا ہے۔ بخلاف اہل صفین کے وہاں قیادت موجود رہی، بھاگنے والے اسی قیادت کی پناہ میں جاتے وہی بھاگنے والوں کی حفاظت اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی تھی، ان کے جذبات کو دوبارہ ابھارتی اور باغیانہ عزائم کو پروان چڑھا کر ہتھیار بند کرتی تھی۔ لوگ مالی امداد اور دنیاوی فوائد سے خوش ہو کر نئے جذبات کے ساتھ دوبارہ میدان جنگ میں پہنچ جاتے تھے۔ اسی نکتے کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام نے اہل صفین و اہل جمل کے درمیان فرق برتا۔ اسلامی نقطہ نظر اور حکم کے مطابق ایسے لوگوں سے جو ظاہری طور پر مسلمان لیکن باغی ہوں۔ جنگ کا طریقہ کار یہی ہے۔ اس بارے میں وسائل الشیعہ۔ باب ۲۴، صفحہ ۵۵۔ جلد ۱۱، نیز دیگر ابواب میں احادیث دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی مقدس شرع نے ان لوگوں کے ساتھ (جو باعتبار روایات اہل توحید یا اہل قبلہ کہلاتے ہیں) اتنے سخت برتاؤ کا فیصلہ کیوں کیا ؟ یہاں تک کہ زخمیوں اور اسیروں کو بھی قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا جاسکتا ؟ اور حضرت علی علیہ السلام جیسے عظیم شخص نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا ؟ اس سوال کے جواب میں ابتداً اسلامی حکومت اور مسلمانوں کے عادل امام کی معاشرہ میں حیثیت و اختیارات کے بارے میں توضیح لازم و ضروری ہے۔

اسلام میں حکومت بذات خود کوئی مقصد نہیں بلکہ انسانیت کے تکامل اور اسکی قویٰ کو ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچاتے اور ہر طرح کے انحراف، اختلاط اور گراوٹ سے بچانے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور اسکو امت اور ملت کے افراد کے درمیان عادلانہ طور پر تقسیم کرنے اور

ں کی فکری وعملی سطح کو بلند کرنے نیز انکو اللہ تعالیٰ اور کمال مطلق کی جانب متوجہ کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔

«ولقد بعثنا فی کل أمّة رسولا أن اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت»
(سورۂ نحل آیة ۳۶)
«وجعلناهم ائمة يهدون بأمرنا» (سورۂ انبیاء ــ آیہ ۷۳)
«الله ولی الذین آمنوا یخرجهم من الظلمات الیٰ النور» (سورۂ بقرة
ــ آیة ۲۵۷)
«یأمرهم بالمعروف و ینهاهم عن المنکر»
«و یضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم» (سورۂ اعراف
ــ آیة ۱۵۷)

انبیاء و مرسلین و اولیاء کی غرض۔ ان کا منصب ان کا کام کیا ہے؟ آسمانی کتابوں کا نزول کیوں ہوا؟ قرآن مجید کے آیات میں جابجا تفصیلات و توضیحات موجود ہیں ان تفاصیل میں ہمارے مسائل پر بھی روشنی ملتی ہے۔ نیز یہ کہ معاشرے میں رہبری اور قیادت اس شخص کے ذمے ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کے عظیم تعلیمات کو عملی جامہ پہنا سکے اور اس میں چند اہم اور نمایاں صفات و امتیازات ہونا چاہیے۔ ان شرائط و اوصاف پر غور کرنے اور ائمہ اہل بیت ؑ کی تعلیمات کے مطابق مرجعیت کے شرائط پر غور کرنے سے دونوں کی یکسانیت ثابت ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر ہم ائمہ علیہم السلام کے کچھ روایات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔
شیخ مفید رحمۃ اللہ نے "الارشاد" میں امام حسین علیہ السلام کے اس خط کو نقل کیا ہے جو حضرت مسلم ؑ کے ہاتھ کوفیوں کے نام بھیجا تھا خط کے آخر میں ہے:

«ولعمری ما الامام الاّ العامل بالکتاب القائم بالقسط الدائن بدین الحق الحابس نفسه علیٰ ذات الله ــ»

یعنی: اپنی جان کی قسم، امت مسلمہ کی رہبری اور امامت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا مگر وہ شخص جس میں مندرجہ ذیل شرائط پائی جاتی ہوں۔

۱۔ دوسرے کو دعوت دینے سے پہلے وہ خود قرآن کریم کے احکام پر عمل کرے اور اسلامی واجبات کو ترک نہ کرے۔
۲۔ سماجی مساوات اور مسلمانوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے میں کوشاں ،

ظلم وستم اور ظالم وجابر کے خلاف ہر حالت میں جنگ و جہاد کرے۔

۳۔ خود کو حق کا مرہون منت سمجھے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور سوائے حق طلبی کے کسی کے لئے کوشش نہ کرے۔

۴۔ اپنی تمام قدرت اور طاقت نیز امکانات کو اللہ تعالیٰ کے مقدس اہداف کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وقف کردے اور انہی مقاصد کی ترقی کے سوا کسی دوسری چیز کے لئے فکرمند نہ رہے۔

دوسری روایت: مرحوم طبرسی اپنی کتاب "احتجاج" میں نقل کرتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا:

«وأمّا من كان من الفقهاء صائناً لنفسه، حافظاً لدينه، مطيعاً لامر مولاه ومخالفاً لهواه فللعوام ان يقلّدوه»

جو فقیہ یا عالم دین اسلام کے تحفظ اور بقا کے لئے کوشاں اور اپنے نفس کو تمام نفسانی رذائل سے (اقتدار پرستی، شہوت، ہوا و ہوس، حسد، دشمنی اور شیطانی اعمال) پاک و پاکیزہ رکھے۔ احکام خدا پر عمل کرے۔ نفسانی خواہشات کے خلاف اقدامات کرے تو غیر مجتہد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے دینی مسائل خواہ وہ سیاسی، اقتصادی، عبادی، سماجی، فوجی اور ثقافتی ہی کیوں نہ ہوں سب کے بارے میں اسی فقیہ کی تقلید کریں اور اسی کی طرف رجوع کریں۔ احادیث و آیات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ جو شخص مسلمان قوم اور اسلامی معاشرے کی قیادت سنبھالے اسے خدمت اسلام میں فنا اور معاشرے کی فلاح و بہبود اور اسلامی احکام کی پیروی و ترویج کے سوا اور کوئی کوشش نہیں کرنا چاہیئے، مرجع اسلام و رہبر امت، اسلام و قرآن کریم کے سوا کوئی اور بات نہیں کرتا، دشمنان اسلام کے سوا کسی سے دشمنی یا بغض نہیں رکھتا، خدائے واحد القہار کے علاوہ کسی کو برتر نہیں سمجھتا، غرض کہ وہ اپنے تمام اعمال میں خود کو خدائے عالم و قادر و متعال کے سامنے جوابدہ اور مسلمانوں کے سامنے خدمت گذار تسلیم کرتا ہے۔ وہ حکومت کو اپنی ایک عظیم ذمہ داری اور بہت بھاری اور نازک عہدہ مانتا ہے۔

ان اوصاف و خصوصیات کے قائد و رہبر و حاکم اسلامی کی مخالفت واضح طور پر راہ خدا

میں رخنہ اندازی اور عناد سے جنگ کے برابر ہے خواہ وہ مخالف بظاہر مسلمان اور اسلام و خدا پر یقین رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو۔

چونکہ قائد کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ارشاد، تبلیغ اور اتمام حجت کے ذریعے بیدار رکھے۔ (حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں)

"تعلیمکم کیلا تجهلوا" میرا فرض ہے کہ آپ لوگوں کی تعلیم جاری رکھوں تاکہ آپ لوگ جاہل نہ رہیں

قائد پر فرض ہے کہ کھرے کھوٹے کو الگ الگ کردے۔ خالص افراد سے کھوٹے کو علیحدہ کرے اور اس کے باوجود اگر لوگ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کریں اور اسلامی تحریک اور مسلمانوں کی راہ میں روڑے بچھائیں تو قائد کو اپنی ذمہ داری کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ جس کی تائید ہر ذی شعور انسانی عقل بھی کرتی ہے، کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں انہیں راستے سے ہٹا کر اپنی راہ چلتے رہنا چاہیئے، اس لئے کہ رکنا حرام اور جہاد فی سبیل اللہ جاری رکھنا، نیز اسلام کی ترقی کے لئے ہجرت کرنا واجب ہے، بالکل اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے جنگ صفین کے دوران فرمایا تھا۔

معاویہ کی جانب سے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈے اپنے شباب پر تھے، کہ حضرت علی علیہ السلام محض اقتدار اور ریاست کے لئے جانیں لے دے رہے ہیں۔ ادھر ایک خطرناک واقعہ یہ ہوا کہ عمار یاسر کو معاویہ والوں نے شہید کر دیا اور مسلمانوں کو یاد تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے عمار کے بارے میں فرمایا ہے۔

«یا عمار تقتلك الفئة الباغية»

اے عمار تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔

تو معاویہ کے باغی گروہ کے ذریعے عمار یاسر کے قتل اور شہید ہونے کے بعد، ان لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت یہ بات معاویہ کی شکست کا باعث بن سکتی ہے۔ لہذا انہوں نے رسول اللہ ص کی بات کا اثر کم کرنے کی غرض سے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حضرت علیؑ نے اپنے اقتدار اور ریاست کی وجہ سے عمار کو جنگ پر مجبور کیا جس کے نتیجہ میں وہ شہید ہوئے۔ لہذا علیؑ قاتل ہیں۔ جس طرح سے پہلوی حکومت میں ساواک کا ایک پروپیگنڈا یہ تھا کہ امام (خمینی) عوام کو کنوار رہے ہیں اور آجکل بھی منافقین یا ان کے ہمارے ساتھی لیبرل جماعت سے وابستہ افراد یا سیاست کے پرانے بھیڑیے اس بات کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ جمہوری اسلامی ایران کی غلط سیاست نے ہی جنگ کو ہم پر لادا ہے اور تمام خرابیوں اور تباہ کاریوں کو جنم دیا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے انقلاب دشمن گروہوں، معاویہ اور اس کے گمراہ ساتھیوں کے وسیع

پروپیگنڈے کے جواب میں ایک خطبہ دیا تھا جو نہج البلاغہ کا ۱۳۱ واں خطبہ ہے۔

«اللّهم انك تعلم أنه لم يكن الذى كان منّا منافسة فى سلطان ولا التماس شيءٍ من فضول الحطام ولكن لنردّ المعالم من دينك ونظهر الاصلاح فى بلادك فيأمن المظلومون من عبادك وتقام المعطلة من حدودك ، آللّهم انّى اوّل من اناب وسمع واجاب، لم يسبقنى اِلاّ رسول الله صلىٰ الله عليه وآله بالصلاة»

یعنی: پروردگارا تو ہی بہتر جانتا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ کسی رتبے، مقام، اقتدار اور مال و دولت حاصل کرنے کی غرض سے نہیں، بلکہ صرف اسلامی تعلیمات اور قرآن کریم کے احکام کو زندہ کرنے، ملک میں اصلاح کے لئے ہے تاکہ تیرے نیک بندوں کو ظلم و ستم سے نجات مل سکے اور فراموش شدہ روایت کا نئے سرے سے اجرا ہو سکے۔ پروردگارا! میں پہلا شخص ہوں، میں نے تیری طرف رخ کیا۔ دعوت سنی اور لبیک کہی۔ نماز میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ کے علاوہ مجھ سے پہلے کسی کا نام نہیں لیا جا سکتا۔

اس کے بعد امیر المومنین علیہ السلام ملت اسلامیہ میں رہبری اور قیادت کے کچھ اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہو کہ اگر یہ اوصاف رہبری میں موجود نہ ہوں تو ملت اسلامیہ کو کس قسم کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

«وقد علمتم انه لا ينبغى آن يكون الوالى على الفروج والدماء والمغانم والاحكام وامامة المسلمين البخيل فتكون فى اموالهم نهمته ولا الجاهل فيضلّهم بجهله ولا الجافى فيقطعهم بجفائه ولا الخائف للدول فيتخذ قوماً دون قوم ولا المرتشى فى الحكم فيذهب بالحقوق و يقف بهادون المقاطع ولا المعطّل للسنّة فيهلك الامة»

فرماتے ہیں؛ مسلمانوں کی رہبری اور قیادت خاص طور سے اس فرد کے لئے (جو مسلمانوں کی جان، عزت، مال و دولت و آبرو کا محافظ ہو) یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اس میں مندرجہ ذیل صفات رذیلہ پائی جاتی ہوں۔

ا۔ بخیل: مسلمانوں کا قائد یا سربراہ اگر بخیل ہوگا تو مسلمانوں کے بیت المال کی ساری دولت حرص و طمع کے نتیجہ میں سب اپنے لیے ہڑپنے کی کوشش کرے گا۔

۱۔ جاہل: اپنی جہالت کی بنا پر امت کو گمراہی و ضلالت کی طرف لے جائے گا۔
۲۔ ظالم: اپنے ظلم کی وجہ سے لوگوں سے دور اور لوگوں کو اپنے آپ اور دوسروں سے علیحدہ کر دے گا۔
۴۔ ڈرپوک: دوسری حکومتوں کے خوف سے کسی نہ کسی حکومت سے وابستہ ہونے کی فکر میں رہے گا اور نہ شرقی نہ غربی ۔ سیدھی راہ سے منحرف ہو جائے گا۔
۵۔ رشوت خور: رشوت لے کر لوگوں کے جائز حقوق کو پامال کرے گا۔ اس کے علاوہ الٰہی اور اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ نہ کر سکے گا۔
۶۔ بے فکر: وہ شخص جو احکام الٰہی کے نفاذ میں تساہل اور بے توجہی برتتا ہے وہ شخص درحقیقت احکام اور سنت الٰہی کو معطل اور امت کو ہلاکت و تباہی کے حوالے کرتا ہے۔

اس خطبہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلامؑ معاویہ اور اس کے ساتھیوں و نیز خوارج اور دوسرے گروہ جو انکی حکومت کے خلاف بغاوت پر تیار تھے) سے کیوں لڑے اور حضرت کا ان سے رویّہ کیا تھا؟ اور حضرت نے ان کے مطالبات کے بعد زمام حکومت کیوں نہ پیش کر دی؟ وجہ یہ تھی کہ اس مسئلہ کا تعلق ان کی اپنی ذات سے نہیں تھا، جو کچھ تھا وہ محض اسلام اور اسلامی احکام و قوانین کے تحفظ و نفاذ اور ملت کو نجات دلانے کے لئے تھا۔ ملت کی ضمیر کو اس کی ذمہ داری سمجھانے کا کام تھا۔ لہٰذا جس وقت ایک گروہ نے تیسرے خلیفہ (حضرت عثمان) کی بیعت کر لی تو حضرت علی علیہ السلام کے بعض دوستوں نے آکر ان کے سکوت پر اعتراضات کیے، جن کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

«لقد علمتم انی احق الناس بهامن غیری، ووالله لأسلمن ماسلمت امور المسلمین، ولم یکن فیها جورٌ اِلاّ علیَّ خاصة، التماساً لاجر ذٰلك وفضله، وزهداً فیما تنافستموه من زخرفه وزبرجه» «خطبه ۳ فیض الاسلام»

آپ لوگ جانتے ہیں، میں خلافت اور امت کی رہبری کے لئے دوسرے اشخاص سے کہیں زیادہ صلاحیت رکھتا ہوں لیکن خدا کی قسم جب تک مسلمانوں کے امور منظم اور درست ہیں، اسلامی قدروں کو ٹھیس پہنچانے کی غرض سے کوئی فتنہ اور فساد برپا نہیں ہوتا اور جب تک کوئی دوسرا مسلمان شخص مظلوم قرار نہیں پاتا اس وقت تک جنگ نہیں کرونگا۔ مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر صبر و

سکوت میرے لئے باعث اجر و ثواب ہوگا اور سکوت کی دوسری وجہ اس دنیاوی جاہ و مال سے بے رغبتی ہے جس کے تم مشتاق اور خواہاں ہو۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے پیرو حضرت کو حکومت کے لئے زیادہ لائق سمجھتے تھے۔ پھر بھی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی خاطر جنگ اور مخالفانہ تقریر سے بھی پہلو تہی کرتے ہیں۔ لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کے منافع کو خطرے میں دیکھیں اور احکام الٰہی کو معطل پائیں اور مسلمانوں کے حقوق ضایع ہوتے ہوئے محسوس کریں، اس وقت ان پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ایسی حکومت کے لئے (جس کے ذریعہ احکام الٰہی جاری ہو سکیں اور مسلمانوں کے حقوق رفتہ واپس لیے جا سکیں) تحریک چلائیں اور جو شخص یا گروہ اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرے، اس کا سختی سے نوٹس لیں تاکہ اسلامی تحریکیں پنپ سکیں اور ملت اسلامیہ گمراہی اور مظلومی سے نجات پائے۔

یہ بات واضح ہے کہ اس طرح کی حکومت کے خلاف بغاوت اسلام سے جنگ کے برابر ہے اور فقہا میں سے کچھ حضرات (جیسے صاحب جواہر) کے فتووں کے مطابق جو اس عمل کا مرتکب ہو وہ کافر ہے اور اس سے مقابلہ کرنا واجب واجبات اور مقابلہ نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ مرحوم محقق اپنی کتاب شرایع میں فرماتے ہیں:

«وكيف كان فلا خلاف بين المسلمين، فضلاً عن المؤمنين فى انه يجب قتال من خرج علىٰ امام عادل والتأخر عنه كبيرة والفرار من حربهم كالفرار من حرب المشركين»

مؤمنین تو مؤمنین، مسلمانوں میں بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص عادل امام کے خلاف بغاوت کرے اس سے جنگ واجب اور ترک جنگ گناہ کبیرہ ہے اور ایسے شخص سے مقابلہ نہ کرنا اور راہ فرار اختیار کرنا، مشرکین سے جنگ نہ لڑنے اور بھاگنے کے برابر ہے۔

تقریباً شیعہ اور اہل سنت کے تمام بڑے بڑے فقہاء نے اس مسئلہ سے متعلق اپنے اس قسم کے فتوے صادر کیے ہیں اور اب حدیثیں ملاحظہ ہوں:

«محمد بن عمر بن على عليه السلام، عن ابيه عن جده انّ النبى (ص) قال له: يا على ان الله تعالى قد كتب علىٰ المؤمنين الجهاد فى الفتنة من بعدى كما كتب عليهم الجهاد مع المشركين معى، فقلت:

يا رسول الله وما الفتنة التي كتب علينا فيها الجهاد؟ قال: فتنة قوم يشهدون أن لا اله الا الله وانّي رسول الله وهم مخالفون لسنّتي وطاعنون في ديني ــ فقلت: فعلام نقاتلهم يا رسول الله وهم يشهدون انّ لا اله الاّ الله وانّك رسول الله، فقال: علىٰ احداثهم في دينهم وفراقهم لأمري واستحلالهم دماء عترتي.

«وسايل الشيعه جلد ۱۱، صفحه ۶۱ ــ حديث ۲ باب ۲۶»

حضرت علی علیہ السلام کے پوتے محمد بن عمر اپنے جد امجد امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کو اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علیؑ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے زمانے اور ہماری موجودگی میں مشرکوں کے خلاف جہاد مومنین پر واجب قرار دیا تھا، اسی طرح ہمارے بعد میں اُن لوگوں سے فتنہ و فساد کے موقعہ پر جہاد کرنا واجب اور ضروری ہے۔ میں نے سوال کیا یا رسول اللہؐ وہ کون سا اور کس قسم کا فتنہ اور فساد ہے جس میں ہم پر جہاد واجب ہے؟ انہوں نے فرمایا: وہ اس گروہ کا فتنہ ہے جو ظاہری طور پر لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہؐ کہتے ہیں اور توحید، حقیقی اسلام اور ختم رسالت کا دم بھرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ ہماری سنّت اور طریقۂ کار کے مخالف ہیں اور ہمارے دین پر نکتہ چینی کرتے ہیں (یا دین سے غیر متعلق چیزوں کو دین کے نام سے بتلاتے ہیں اور دین سے بے تعلق چیزوں اور ضد دین اشیاء کو خلط ملط کرکے خود ساختہ نظریات قائم کرتے ہیں یا ظاہری طور سے اسلام اور قرآن کی باتیں کرتے ہیں اور حقیقت میں حقیقی اسلام کو رجعت پسندی قرار دیتے ہیں اور نفاق انگیز و ملحدانہ خیالات و افکار کو حقیقی اسلام کی شکل میں پیش کرتے ہیں) جس طرح بنی صدر نے کچھ عرصہ پہلے پیرس میں یہ اعلان کیا تھا کہ ڈیموکریٹک جمہوریہ اسلامیہ ایران میں صرف اسلام ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ اسلام اور انقلاب مخالف جماعتیں بھی حکومت کی تشکیل میں حصہ لے رہی ہیں اور جس اسلام کے قائل اسلامی انقلاب کے رہنما یا حکومت ہے، ہم اس کے قائل نہیں ہیں۔

رسول اللہؐ کا فرمان ایسے لوگوں پر صادق آتا ہے کہ ظاہری طور سے کلمہ تو پڑھتے ہیں لیکن پس پشت اسلام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

اس مسئلہ کو مزید واضح و مستحکم بنانے اور ممکنہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے حضرت

علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا، یا رسول اللہؐ جو لوگ کلمہ پڑھتے ہیں اور آپکی رسالت کی تائید بھی کرتے ہیں، ان سے جنگ کیوں اور کس لیے لڑی جائے؟ انہوں نے فرمایا، اس لئے کہ ان لوگوں نے غیر دینی امور کو دین میں شامل کر دیا اور اسلامی حکومت نیز ہماری ولایت سے خروج اختیار کیا اور یہ لوگ اہل بیت کا خون بہانے کو حلال سمجھتے ہیں۔

انتہائی توجہ طلب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس حد تک وضاحت کی اور اس حق بات اور روایت کی مطابقت ہمارے حقیقی اسلام کے محارب دعویداروں کے ساتھ کتنی دلچسپ ہے جو آیت اللہ زاہد و مجاہد، شہید محراب مدنی۔ آیت اللہ شہید دستغیب۔ آیت اللہ مطہری اور آیت اللہ بہشتی وغیرہ کو قتل کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں اور ان عزیزوں کے پاک خون کو بہانا نہ صرف حلال اور جائز بلکہ عبادت جانتے ہیں۔

دوسری حدیث، ابن شہر آشوب اپنی کتاب "مناقب" میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت نقل کرتے ہیں، اس میں ان افراد کا ذکر ہے جو حضرت علی علیہ السلام سے لڑ رہے تھے۔ حضرتؑ نے فرمایا:

«أما انّهم اعظم جرماً ممن حارب رسول الله (ص) قيل له، وكيف ذلك يا ابن رسول الله؟ قال اولئك كانوا اهل جاهلية وهؤلاء قرّاؤ القرآن وعرفوا اهل الفضل فاتوا ما أتوا بعد البصيرة»

«مستدرک الوسائل ــ صفحه ٢٥٤ ــ جلد ٢، باب ٢٤»

جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام سے جنگ مول لی۔ ان کا جرم ان لوگوں سے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف، جنگ لڑی کہیں زیادہ سنگین ہے۔ سوال کیا گیا کیوں؟ انہوں نے فرمایا، اس لیے کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جنگ لڑتے تھے وہ جاہل تھے جبکہ یہ لوگ قرآن پڑھے ہوئے اور اہل فضل و فضیلت سے واقف ہیں۔ یعنی حضرت علی علیہ السلام اور ان کے اہل بیت اطہارؑ کے مقام زہد، علم، مجاہدت، شہامت اور شائستگی کے بارے میں جانتے ہوئے جنگ پر تیار ہوئے، لہذا بعض روایات کے مطابق ایسے لوگوں سے جنگ کی فضیلت اور ثواب کافروں سے لڑنے سے کہیں زیادہ ہے۔

ہم مذکورہ روایات پر اکتفا کرتے ہیں، جنکا ذکر وسائل الشیعہ، تہذیب، مستدرک الوسائل

نیز دیگر کتابوں میں بھی ملتا ہے ۔ ہم امیدوار ہیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے وہ بہن، بھائی جو نادانی اور غفلت کی بنا پر شیطان کے پھندے میں پھنس گئے اور اسلام و مسلمین نیز امام عادل کے مقابل میں دنیا اور آخرت کے لحاظ سے باغی کا مصداق بن گئے ۔ وہ جلد از جلد تجدید نظر اور مزید غور و فکر کر کے حق کو پہچان لیں گے اور باطل کے ہاتھ سے دامن چھڑا کر عظیم ملت اسلامیہ کی صفوں میں مل جائیں گے ۔ ہم انہیں اپنے سے جدا نہیں مانتے بلکہ انہیں گلے سے لگاتے اور اپنا بھائی، بہن تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجبوری کے تحت خرابکاروں کے شکار بنے ہیں ۔ اسی کے مطابق ایک روایت حضرت علی علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے کہ :

«ولم یکن ینسب احداً من اهل حربه الی الشرك ولا الیٰ النفاق ولکنه کان یقول: هم اخواننا بغوا علینا»

«وسایل الشیعه جلد ۱۱ ــ صفحه ۶۲ ــ حدیث ۱۰، باب ۲۶»

یعنی : حضرت علی علیہ السلام نے جن لوگوں سے جنگ فرمائی، انہیں مشرک یا منافق کے نام سے نہیں پکارا، بلکہ فرمایا تو یوں : یہ ہمارے بھائی ہیں جو نادانی اور انحراف کی بنا پر ہمارے خلاف بغاوت کر بیٹھے اور ہم پر ظلم کرنے لگے ۔

مصادر

قرآن مجید		قواعد الاحکام	علامہ حلی
نہج البلاغہ	تالیف سید رضی	شرایع الاسلام	محقق، نجم الدین حلی
النہایہ	شیخ الطائفہ	جواہر الکلام فی شرایع الاسلام	شیخ حسن
تہذیب الاحکام	شیخ ابو جعفر الطوسی	جامع المقاصد	محقق کرکی ۔
شرح لمعہ	شہید ثانی زین الدین	مسالک الافہام (آیات الاحکام)	فاضل جواد کاظمی
لمعہ	شہید اول محمد مکی	آیات الاحکام	مقدس اردبیلی
مسالک	شہید ثانی	وسائل الشیعہ الی	
تذکرۃ الفقہا	علامہ حلی، حسن بن یوسف	تحصیل احکام الشریعہ	علامہ حر عاملی

اقتصادیات

اسلامی انقلاب، کتاب وسنت کے ان جلیل القدر علماء کے ہاتھوں رونما ہوا جو شروع سے شرع کی حفاظت، ترویج اور اسے عملی صورت دینے کے ذمہ دار تھے، حدیث و فقہ کے ان ماہرین نے ایران میں اسلامی حکومت کے قیام کی سعادت حاصل کی۔ ملک کے جمہور نے اپنے محبوب و منفرد رہنما آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ خمینی مدظلہ العالی کی قیادت میں ملک کو اسلامی فکر اور قانون کے مطابق چلانے کی حمایت کی۔ اس لئے انہیں مؤسس و بنیاد گذار "جمہوری اسلامی ایران" کا شرف حاصل ہوا۔ اسلامی انقلاب — نہ مشرق نہ مغرب — کے اصول پر کاربند ہے۔ اس کا نصب العین ہے۔ اسلامی جمہوری اسلامی — جمہور اسلام چاہتے ہیں اور اسلام جمہور نے نہیں بنایا۔ اللہ نے اس کے اصول و آئین و قوانین بنائے۔ سنت نے اس کے تفاصیل بتلائے۔ اس لئے فقہ و شریعت اسلام کے مطابق ہر کام انجام پانا چاہیے۔

آیت اللہ سید محمد حسین بہشتی رحمۃ اللہ اس فکر کو عملی انداز میں عملی صورت دینے والے قائدین کی صف اول کے مفکر، مجاہد اور عالم تھے۔ ان کا علم دوست و دشمن سے کلمہ پڑھوا چکا ہے، ان کی فکر عوام قبول کرتے تھے۔ ان کے جہاد نے اپنے عظیم قائد کے بازو مضبوط کیے، ان کے اقدامات راہ خدا میں روشن چراغ ہیں، دشمنوں نے ان کی عوام دوستی، کامیابی اور بڑائی سے ڈر کر انھیں شہید کر دیا۔ اللہ نے انھیں حیات جاودان بخشی۔

زیر نظر بحث آیت اللہ بہشتی رضوان اللہ علیہ کے لکچرز پر مبنی ہے جس کا سلسلہ وہ تمام نہ کر سکے — اقتصاد — جدید اقتصادی فلسفہ، جدید اقتصادی نظام، جدید اقتصادی تقاضے، جدید اقتصادی حل — اسلام کا اقتصادی نظام۔ اسلامی اقتصاد کے عملی نفاذ میں مشکلات و فوائد۔

ظاہر ہے کہ "اقتصادیات" فلسفہ اور تکنیک سے مرکب علم ہے چونکہ اس کا تعلق مادّے کی تولید، وجود اور استعمال سے ہے، اس کا مدار — زر — دولت — نتائج محنت اور پیداوار و قیمت ہے، اس لیے اس کا سمجھنا سمجھانا پھر عمل میں لانا آسان نہیں ہے۔ لہذا ممکن ہے ہمارے قاری شروع شروع میں عبارت و مضمون سے لطف اندوز نہ ہوں لیکن فاضل مفکر نے بات اتنے آسان پیرائے میں کی ہے کہ آپ جس قدر آگے بڑھتے جائیں گے فکر کے دروازے اتنے ہی کھلتے جائیں گے اور اسلام کا زاویۂ تعلیم و عمل بجائے خود روشن سے روشن تر ہوتا جائے گا۔

شہید ڈاکٹر بہشتی

مالکیت اسلامی نقطہ نظر سے

تعریف مالکیت

مالکیت وہ رابطہ ہے جو فرد یا گروپ اور کسی چیز کے درمیان سماجی، اعتباری اور قرار دادی[1] طور پر قائم ہوتا ہے اور مالک کو اپنی ملکیت کے استعمال و تصرف کا حق نیز دوسروں کو اس کے تصرف سے روکنے کا جواز پیدا کرتا ہے۔

یہ حق اور جواز اضافی ہوتا ہے جو مختلف سماجی نظاموں میں بدلتا رہتا ہے۔ مالکیت ایک واقعیت ہے اور واقعیتیں دو طرح کی ہوتی ہیں

۱۔ مادی و جسمی عینیت (وجود خارجی)

۲۔ اعتباری و ذہنی عینیت (وجود ذہنی)

مادی و جسمی عینیت، ان واقعیات سے عبارت ہے جو اپنے وجود میں کسی مدرک کے ادراک کی محتاج نہ ہوں جیسے درخت، دریا، پہاڑ، ان کا وجود کسی ذہن و صاحب ذہن کے وجود پر موقوف نہیں۔ ان کا وجود مستقل ہے، خواہ دنیا میں کسی انسان و حیوان، ملک و فرشتہ اور کسی صاحب ادراک و شعور و آگہی کا وجود ہو یا نہ ہو۔

اعتباری واقعیت، ان واقعیات سے عبارت ہے جو اپنے وجود میں کسی مدرک کے ادراک کی محتاج ہوں اور ان کا وجود کسی اعتبار کرنے والے، یا اعتبار کرنے والوں کے وجود پر موقوف ہو۔

تمام سماجی واقعیات اعتباری واقعیات کے زمرے میں ہیں۔ مالکیت بھی ایک سماجی حقیقت ہے، اس کا شمار بھی اعتباری واقعیات میں ہوتا ہے[2]۔

---

[1] قرار دادی کو "باہمی مفاہمت" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ آقای بہشتی رحمہ نے اسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے، اس لئے ہم نے اس کو برقرار رکھا۔ تفصیلات و توضیحات آگے آ رہے ہیں۔

[2] شہید بہشتی رحمہ جسمی و اعتباری واقعیات کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ احکام تکلیفی یعنی واجب، حرام، مستحب، مکروہ، مباح بھی اعتباری واقعیات ہیں۔ یعنی اگر دنیا میں کسی مدرک کا وجود نہ ہو تو وجوب و حرمت کا بھی تحقق نہ ہوگا۔

اسی طرح احکام وضعی جو احکام تکلیفی سے منتزع ہو کر کچھ دوسرے احکام تکلیفی کے لئے موضوع قرار پاتے ہیں، ان کا شمار بھی اعتباری واقعیات میں ہوتا ہے۔

مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب فلاں شخص کی ملکیت ہے تو یہ اس وقت صحیح ہوگا جب ایک سماجی اعتبار موجود ہو اور اس وقت یہ دوسرے حکم تکلیفی کے لئے موضوع بن جائے گا کہ فلاں شخص کی اجازت کے بغیر اس کتاب کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔

مالکیت، وہ اعتباری واقعیت ہے جو سماجی زندگی کے دوران پیش آتی ہے، اگر دنیا میں صرف ایک اکیلا انسان ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ اسکو یہ خیال بھی نہ ہوتا کہ میں کسی چیز کا مالک ہوں۔ جب انسان دوسروں کے ساتھ مل کر زندگی گذارتا ہے تو ان کے درمیان کچھ معاہدے وجود میں آتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ دو افراد یا گروپ سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک دوسرے سے باقاعدہ معاہدہ کریں بلکہ بعض اوقات یہ معاہدے خود بخود انجام پا جاتے ہیں۔

پس مالکیت اس اعتباری، سماجی اور قرار دادی رابطہ کا نام ہے جو مالک اور ملکیت کے مابین ہوتا ہے۔

مالک ایک فرد بھی ہو سکتا ہے اور ایک گروپ بھی، مثال کے طور پر ایک کتاب جو اس وقت کسی ایک فرد کی ملکیت ہے، اس شخص اور کتاب کے درمیان ایک رابطہ موجود ہے لیکن اس کی موت کے بعد یہی رابطہ اجتماعی رابطے میں بدل جائے گا، یعنی وہ چیز جو صرف ایک فرد کی ملکیت تھی اب ایک گروپ یعنی اس کے ماں باپ بیوی بچوں کی ملکیت ہو جائے گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ کوئی چیز مل کر خریدیں۔ اسی طرح کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو معاشرہ اور قوم کی ملکیت ہیں۔ (مالک اور ملکیت کے مابین) یہ رابطہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ مالک کو اپنی ملکیت میں مختلف قسم کے تصرف اور دوسروں کو اس کے تصرف سے روک دینے کا حق حاصل ہے اور اس حق کا استعمال جائز ہے۔

البتہ یہ حق اور جواز اضافی ہے اور ہر معاشرے میں ہر موقع پر یکساں نہیں، بعض نظاموں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان مالک تو ضرور ہے لیکن اس کے تصرف کا حق محدود ہے، وہ دوسروں کو اپنی ملکیت میں عمل دخل سے بھی صرف ایک خاص حد تک روک سکتا ہے، البتہ مالکیت کی پہلی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ہمراہ تصرف مطلق کو لاتی ہے لیکن مختلف نظاموں میں اس حق کے لئے کچھ حدود بھی معین کی گئی ہیں۔

مال اور ملک کی تعریف

ملک اس چیز کو کہتے ہیں جس کا انسان مالک ہو، ملک بمعنیٰ مملوک ہے اور مال اس شئے سے عبارت ہے جو انسان کے لئے براہ راست یا بالواسطہ قدر مصرف رکھتی ہو۔

قدر مصرف کی تعریف

ہر وہ کام یا چیز جو انسان کے لئے مفید ہو، یعنی براہ راست یا بالواسطہ انسان کی کسی خواہش و ضرورت کو پورا کرے وہ اس کے لئے قدر مصرف کی حامل (یعنی صرف کرنے کے قابل) ہوتی ہے۔[۲]

قدر مصرف کو ان وسیع معانی کے ہمراہ جو علم اقتصاد میں بیان ہوتے ہیں سمجھنا ضروری ہے اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہماری فقہی کتابوں میں قدر مصرف اور مال کے باہمی رابطہ کا ذکر ہوا ہے، گو ان میں لفظ "قدر مصرف" کا ذکر نہیں لیکن اس کا مفہوم موجود ہے۔ کتاب شرح لمعہ میں شرائط بیع (خرید و فروخت ہونے والی چیز) کے بارے میں ہے کہ:

یشترط کون المبیع مما یملک، ای یقبل الملک شرعاً، فلا یصح بیع الحر وما لا نفع فیہ غالباً کالحشرات ...[4]

آپ نے دیکھا، یہاں اس چیز کا ذکر ہے جس سے عموماً کوئی منفعت نہیں ہوتی۔

اسی طرح شیخ انصاری رحمۃ اللہ علیہ، جو تجزیہ و تحلیل کی صلاحیت اور فقہی افکار کی صحت کے لحاظ سے گذشتہ صدی کی ممتاز ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں، موصوف نے اس بحث کو اپنی کتاب مکاسب میں اور بھی زیادہ گہرائیوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

القول فی شرائط العوضین: یشترط فی کل منھما کونہ متمولاً لان البیع لغۃً مبادلۃ مال بمال وقد احترزوا بھذا الشرط عما لا ینتفع بہ منفعۃ مقصودۃ للعقلاء ومحللۃ فی الشرع لان الاول لیس بمال عرفاً کالخنافس والدیدان والنمل فانہ یصح سلب المصرف لھا ونفی الفائدۃ عنھا والثانی لیس بمال شرعاً کالخمر والخنزیر[5] ...

اگر آج کی اقتصادی تحریروں میں اقتصاد کے بنیادی مسائل کے ذیل میں قدر مصرف کی منفعت کا تذکرہ نظر آتا ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کوئی نئی ایجاد نہیں بلکہ یہ ایک عمومی و عرفی تصور ہے جسے ہمارے فقہاء نے بھی اپنی فقہی کتابوں میں اقتصادی مباحث میں ذکر کیا ہے۔ گو ان کتابوں میں بحث کا انداز جداگانہ ہے۔ لیکن خود یہ فکر اور نظریہ موجود ہے۔[6]

۳۔ جیسے گیہوں۔ سیب۔ گوشت۔ دودھ۔ کھال۔ روئی۔ اون۔ پھول، یہ تمام چیزیں قابل صرف ہیں، صرف مراد محض "کھانا" ہی ہے بلکہ یہاں پر اس کے معانی بہت وسیع ہیں۔ چنانچہ پھولوں کا گلدستہ خوبصورت پینگ، استاد کی محنت، ڈاکٹر کی خدمت، حجام کا کام، پھیری لگانے والے کی عرق ریزی اور اصولوں پر ہر قسم کی خدمت ہمارے لئے قدر معرف رکھتی ہے۔

۴۔ شرح لمعہ، فروخت ہونے والی چیز کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ وہ شرعاً قابل ملکیت ہو، لہذا آزاد انسان اور ان چیزوں کا فروخت کرنا جائز نہیں جس میں غالباً کوئی منفعت نہ ہو جیسے کیڑے مکوڑے (حشرات الارض)

۵۔ ایک اور باریک نکتہ جسے شیخ اپنے ماقبل فقہا سے نقل کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں۔ یہ سوال ہے کہ ملک و مال کے درمیان کونسی نسبت پائی جاتی ہے۔ عام خاص مطلق ہے یا عام خاص من وجہ، متساوی ہے یا متباین؟ آپ کا استنباط یہ ہے کہ یہ دونوں عام خاص من وجہ ہیں۔ اس بحث میں بھی کچھ باریک نکات ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔

ہم نے آغاز بحث میں ملک اور مال کے مسئلہ کو اس لئے چھیڑا ہے کہ آئندہ گفتگو میں اس کی ضرورت پیش آئے گی اور جدید اقتصادیات میں قدرِ مصرف اور مال کے رابطہ کی وضاحت بھی ہوگی۔

خدا کی مالکیت اور اس کے اسباب

یہ فطری اور عقلی بات ہے کہ ہر موجد اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے تصرف کا حقدار ہوتا ہے چنانچہ اس فطری وعقلی دلیل کی روشنی میں خداوند عالم پوری کائنات کا مالک ہے کیونکہ وہی کائنات کا خالق ہے۔ دوسری لفظوں میں پوری کائنات پر خدا کی مالکیت تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے۔

قالوا اتخذ اللہ ولداً سبحانہ، ھو الغنی، لہ ما فی السمٰوات وما فی الارض ان عندکم من سلطان بھذا اتقولون علی اللہ مالا تعلمون[6]

قرآن مجید میں "لہ" اور "للہ" کی تعبیر کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔ لیکن اس آیت کے انتخاب کا سبب اس سے پہلی والی آیت ہے قالوا اتخذ اللہ ولداً کا مطلب یہ ہے کہ گویا اس کے پاس پہلے سے کچھ بھی نہیں اور اب حاصل کرنا چاہ رہا ہے، چنانچہ اس کا جواب یوں دتیا ہے کہ "ھو الغنی" یعنی وہ ہر چیز کا مالک ہے اور "ہر چیز" کی وضاحت کے لئے ارشاد ہوتا ہے "لہ ما فی السمٰوت وما فی الارض"[7]

یہ آیت کائنات پر خداوند عالم کی مالکیت کو اسی سماجی معنی میں بیان کر رہی ہے جو ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ کائنات پر مالکیت خدا کے اعتبار کے اسباب حقیقی ہیں لیکن خود یہ مالکیت اعتباری ہے یعنی جب تک انسان اور یہ مالکیتی رابطہ جو اصولی طور پر انسانوں کی سماجی زندگی میں وجود میں آتا ہے متحقق نہ ہو جائے، ذہن میں مالکیت خدا کا تصور نہیں آتا[8]

البتہ آسمان وزمین پر خداوند عالم کی مالکیت کا اثبات کسی دلیل وبرھان کا محتاج نہیں، اس کی مالکیت کے اسباب قرار دادی نہیں بلکہ حقیقی و واقعی امور ہیں، لہذا یہ فطری بات ہے کہ اگر کوئی شخص خدا پر ایمان

۶۔ لوگوں نے کہا کہ خداوند عالم نے بھی بیٹا بنالیا ہے، وہ تمام نقائص سے پاک وپاکیزہ ہے۔ وہ غنی وبے نیاز ہے، زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور جو کچھ تم کہتے ہو اس کی کوئی دلیل بھی تمہارے پاس نہیں۔ کیا تم خدا پر بے جانے بوجھے یوں ہی جھوٹ بولا کرتے ہو۔

۷۔ قرآن مجید میں اس کے علاوہ اور بھی آیتیں ہیں جو خداوند عالم کی مالکیت پر دلالت کرتی ہیں۔

۸۔ جس طرح خداوند عالم متکلم ہے۔ لیکن جب تک کسی سامنے کا وجود نہ ہو (خواہ وہ سامنے انسان وملک ہو یا زمین وآسمان)، یہ صفت وجود پذیر نہ ہوگی۔

رکھتا اور اسکو زمین و آسمان کا خالق سمجھتا ہے تو اسے کائینات کا مالک تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کرے گا۔ تمام اختیارات اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اسے ہر شے کے تصرف کا حق حاصل ہے۔[9]

خلاصہ یہ کہ خداوند عالم کی مالکیت کا سبب اسکی خلاقیت و ایجادیت ہے اس کے سوا کسی اور سبب کی ضرورت نہیں ہے۔

مالکیت خدا کے حدود

کائینات پر مالکیت خدا کی کوئی حد نہیں۔ چونکہ ہر چیز کے وجود کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے۔ لہذا وہ بطور مطلق پوری کائینات کا مالک ہے۔ اس کے لئے کسی حدود سرحد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کی مالکیت ـــ اسباب اور حدود

مختلف سماجی نظاموں میں انسان اور بعض اشیاء کے درمیان مالکیت کا اعتبار موجود ہے۔ ہر نظام نے اشیاء پر فرد یا معاشرہ کی مالکیت کو تسلیم کیا ہے۔[10]

اسباب

۱۔ پیداداری اور تخلیقی کام: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہے اور تقاضائے فطرت ہے کہ ہر موجد اپنی ایجاد کی ہوئی چیزوں کے تصرف کا حق رکھتا ہے اور اسے اس چیز کا مالک تسلیم کیا جائے۔ لہذا جب انسان اپنے تخلیقی اور پیداواری کام کے ذریعہ کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے تو اسے خود بخود اس شئے کے تصرف کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور اسے اس چیز کا مالک تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

پہلی مثال: اگر آپ کپڑے بنانا چاہیں تو صرف روئی کے کھیت پر جا کر تیار نہیں کر سکتے۔ وہاں سے آپ صرف کپاس لا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسے صاف کرنا اور قابل صنعت بنانے کے لئے کاتنے والے بننے والے، پھر کاٹنے اور سینے والے کی ضرورتیں پیش آئیں گی۔ ان میں سے ہر ایک تخلیقی کام انجام دیتا ہے۔ یعنی اس روئی میں کچھ ایسی چیزوں کو ایجاد کرتا ہے جس کی وجہ سے ایک جدید قدر مصرف رونما ہوتی ہے جو پہلے نہ تھی۔

دوسری مثال: جب آپ کتابیں خریدنے کے لئے کسی دوکان پر تشریف لے جاتے ہیں اور اسے اپنے گھر یا مدرسہ

۹۔ بید ۱۶ الامر

۱۰۔ خود مارکسی نظام کے تحت چلنے والے ملک روس میں بھی افراد روئی کپڑا مکان گاڑی اور ایک باغیچہ کے مالک ہیں اور اگر کسی دن مکمل طور پر مارکسزم کا نفاذ ہو گیا پھر بھی معاشرہ کی مالکیت باقی رہے گی۔

لانا چاہتے ہیں تو دو کا ندار سے رسّی کا ایک ٹکڑا حاصل کر کے کتابوں کو باندھتے ہیں تاکہ آپ کے ہاتھوں سے زمین پر گر کر خراب نہ ہوں۔ اب اگر رسّی کے بجائے تھوڑی سی روئی آپ کے حوالے کی جائے تو اس روئی میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس سے کتابوں کا بنڈل باندھا جا سکے، یعنی روئی میں یہ قدرِ مصرف مفقود ہے۔

وہ کون شخص ہے جو روئی میں اس قدرِ مصرف کو ایجاد کرتا ہے کہ وہ ایک مضبوط رسّی کی شکل اختیار کر لیتی ہے؟ یہ کاتنے والے کی ذات ہے جو روئی میں اس نئی قدرِ مصرف کو ایجاد کرتا ہے۔

تیسری مثال : اگر کوئی شخص اسی تاگے کو آپ کے حوالے کر دے جو بنڈل باندھنے کے لئے بہت مفید ہے تو کیا یہ تاگا آپ کے لئے لباس بن جائے گا؟ قطعاً نہیں بلکہ اس کے لئے جولاہے کی ضرورت ہے جو اس میں ایک نئی قدرِ مصرف ایجاد کرے اور وہ روئی کپڑے کی شکل اختیار کر لے اور پھر اس کو پہننے کے قابل بنانے کے لئے، درزی کی ضرورت ہوگی جو اسمیں ایک تیسری قدرِ مصرف تخلیق کرے گا۔

پس اگر خالقیت، اعتبار مالکیت کے لئے فطری سبب ہے، تو جس شخص میں یہ صفت موجود ہوگی اسے (اپنی خالقیت کی حد میں) مالکیت کا بھی حق حاصل ہوگا۔

البتہ ہر کام اور محنت باعث مالکیت نہیں بلکہ صرف وہ کام مالکیت کا سبب ہوگا جو تخلیقی اور پیداواری ہو۔

پہلی مثال : اگر آپ کسی کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو ایک عمل ضرور انجام پاتا ہے لیکن کیا یہ عمل سبب مالکیت بھی بن جائے گا؟ گو اس وقت ایک مادّہ پر محنت ہوئی ہے۔ لیکن یہ محنت سبب مالکیت نہیں بن سکتی ہاں اگر کسی شخص کو کاغذ کے انہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی ضرورت ہو تو بڑے کاغذ کو چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کا یہی عمل ایک نئی قدرِ مصرف کی ایجاد کا باعث ہوگا اور اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اس کام کے مالک اور اجرت کے مستحق ہیں۔

دوسری مثال : آپ مٹی سے اینٹ بناتے ہیں اور اینٹوں کو سیمنٹ اور گارے سے جوڑ کر ایک کمرہ بنا لیتے ہیں۔ یہ ایک تخلیقی کام ہے کیونکہ آپ نے ایک نئی قدرِ مصرف ایجاد کی ہے جس کا پہلے وجود نہ تھا، آپ نے انسان کی ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سکونت کے قابل ایک گھر تعمیر کر دیا۔

تیسری مثال : آپ ایک نیا مکان تعمیر کرنے کی غرض سے پرانے گھر کو منہدم کر دیتے ہیں کیونکہ اس گھر کو گرائے بغیر نئے مکان کی تعمیر ممکن نہ تھی۔ آپ کا یہ عمل ایک نئی قدرِ مصرف کو جنم دیتا ہے۔ لیکن اگر پرانے گھر کی تخریب کا مقصد نئے گھر کی تعمیر نہ ہو تو کیا کوئی شخص آپ کو اس گھر کے گرانے کی اجرت دے گا؟ نہ صرف یہ کہ آپ اجرت سے محروم رہیں گے بلکہ آپ کو اس تخریبی عمل کی سزا بھی مل سکتی ہے۔

پیداواری کاموں سے حاصل ہونے والی مالکیت کے حدود

انسان کے پیداواری اور تخلیقی کاموں سے حاصل ہونے والی مالکیت محدود ہے، کیوں کہ انسان ہر پیداواری عمل میں کائنات میں موجود ایسے خام مواد استعمال کرتا ہے جن کی تخلیق اور پیداوار میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور قدرتی ذخائر کو کام میں لائے بغیر پیداوار ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ ایک گلوکار کی گلوکاری بھی صرف اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جب وہ ہوا سے فائدہ حاصل کرے۔

ابھی میں نے اینٹ اور مکان کی مثال دی تھی، آپ پانی اور مٹی کو کام میں لاکر اینٹ تیار کرتے ہیں لیکن خود یہ پانی اور مٹی آپ کی پیدا کردہ نہیں بلکہ آپ نے اس میں صرف ایک شکل پیدا کردی ہے جس کا وجود پہلے نہ تھا۔ لہٰذا ان اینٹوں پر آپ کی مالکیت سو فیصد نہیں ہوسکتی بلکہ صرف اینٹ سازی کی حد تک محدود ہوگی جو آپ کا اپنا عمل ہے اور جب آپ ان اینٹوں کو گارے سے جوڑ کر مکان تعمیر کریں گے تو آپ اس مکان کے مالک ہوں گے۔ لیکن اس مکان اور اینٹوں میں پائی جانے والی مٹی چونکہ آپ کی پیدا کردہ نہیں ہے لہٰذا وہ آپ کی ملکیت بھی نہ ہوگی۔[11]

بنابریں تخلیقی اور پیداواری کاموں سے حاصل ہونے والی مالکیت کا دائرہ تخلیق و تولید کے عمل میں محدود ہے۔

اس بحث کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اینٹیں اور مکان بنانے والا انسان اپنی بنائی ہوئی اینٹوں اور مکان میں پائی جانے والی قدر مصرف کا مالک ہے یا نہیں؟

اس سوال سے کچھ اور سوال بھی ابھرتے ہیں:

۱۔ آپ اینٹ اور مکان کی تعمیر کرتے وقت اپنے بدن میں طاقت و قوت پیدا کرنے کے لئے کچھ خداداد نعمتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر آپ کو کھانا نہ ملتا، بھوک سے بے حال ایک گوشے میں پڑے ہوتے اور کام کرنے کی سکت نہ ہوتی تو کیا پھر بھی آپ مکان اور اینٹ تیار کرسکتے تھے؟

۲۔ کسان خدا کی زمین میں ایک من گیہوں بوتا ہے، چند مہینوں کے بعد ہی ایک من گیہوں دس من بن جاتا ہے، یہ دس من گیہوں جو اس کسان نے پیدا کیا ہے، اس کا مالک کون ہے؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اس دس من گندم کا مالک کسان ہے چاہے وہ زمین غصبی ہی کیوں نہ ہو[12] لیکن سوچنا یہ ہے کہ کیا حقیقتاً یہ دس من گندم اسی کسان کی ملکیت ہے؟ اگر بارش نہ ہوتی، اگر سو

۱۱۔ یہ ساری بحث فطری اصولوں کی بنیاد پر ہو رہی ہے، اب رہی یہ بحث کہ اسلام کی نظر میں مالکیت کا کیا تصور ہے تو اس ک
بعد میں آئے گا۔

۱۲۔ الزرع للزارع ولو کان غاصبا

نہ ہوتا، اگر وہ مختلف عناصر اور مواد جو ہوا سے حاصل ہوتے ہیں (اور ایک دانہ کو دس دانے بناتے ہیں) نہ ہوتے تو کیا یہ کسان دس من گندم حاصل کر سکتا تھا؟ لہٰذا ماننا ہوگا کہ زمین، بارش، سورج، کاربن، ہوا، بیج، پیداواری آلات اور دوسری بہت سی چیزیں اس گیہوں کی پیداوار میں شریک ہیں۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو یہ کسان ایک من گیہوں سے دس من گیہوں حاصل نہ کر سکتا۔

۳۔ وہ پہلا آدم زاد جس نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا اور ابھی اسے کھیتی باڑی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ کیا اس کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ ایک من گیہوں بو کر دس من حاصل کیا جا سکتا ہے؟ اگر اس کسان کو تاریخ و معاشرہ سے یہ تجربہ حاصل نہ ہوتا تو کیا وہ عمل انجام دے سکتا تھا؟ لہٰذا اس پیداوار میں سماجی تجربہ کا بھی ایک حصہ مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۴۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ تخریب کار عناصر کھیتوں میں آگ لگا کر یا کسی اور ذریعہ سے فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کھیتوں کی حفاظت کے لئے پہرے دار نہ ہوتے اور انتظامیہ کسانوں کو تحفظ فراہم نہ کرتی تو کیا یہ کسان دس من گیہوں پیدا کر سکتا تھا؟ لہٰذا اس پیداوار میں کچھ سماجی اسباب و علل کے کردار کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔

بہرحال اجمالی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ پیداواری اور تخلیقی کام ایک حد تک اعتبار مالکیت کا سبب بن سکتا ہے، لیکن یہ اس حد سے کم ہے جس کا تصور پہلے ذہن میں آتا تھا۔

سوشلسٹ طرز فکر اس میدان میں کچھ اور آگے بڑھ گئی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اصولی طور پر کسی انسان کا تخلیقی اور پیداواری کام خود اسکی مالکیت کا سبب نہیں بن سکتا بلکہ وہ سماج کی مالکیت کا باعث ہوتا ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ زمین، پانی، ہوا، بارش یہ تمام چیزیں معاشرہ کی ملکیت ہیں اور خود فرد جو کام دیتا ہے اس کا تجربہ بھی اس نے سماج سے حاصل کیا ہے، اس کے لئے تحفظ و امنیت بھی معاشرہ نے فراہم کیا ہے۔ لہٰذا فرد جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ معاشرہ کی ملکیت ہے، کیونکہ درحقیقت یہ فرد کی پیداوار نہیں بلکہ یہ معاشرہ ہے جو فرد کی صورت میں تخلیق کر رہا ہے۔

یہ سوشلزم کا ایک بنیادی اصول ہے، لیکن درحقیقت یہ نظریہ انتہا پسندانہ اور خیالی نظریہ ہے، ہر فرد کا اپنا مخصوص کردار ہوتا ہے جس کا انکار ناممکن ہے، چاہے وہ کردار کتنا ہی معمولی ہو کیونکہ :

اولاً۔ وہ پہلا انسان جس نے کھیتی باڑی اور پیداوار میں اضافہ کا طریقہ دریافت اور اپنے مشاہدہ کو تجربہ میں تبدیل کیا، اس کی تخلیق کا تعلق خود اسی کی ذات سے ہے، کیونکہ معاشرہ تخلیقی صلاحیتوں کا حامل نہیں ہو سکتا معاشرہ صرف فرد کو پیداواری آلات فراہم کر سکتا ہے اور یہ کہنا کہ پورا معاشرہ تخلیقی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے مذاق کے سوا اور کچھ بھی نہیں، تخلیق اور پیداوار کا تعلق غالباً ایک فرد یا چند افراد سے ہوتا ہے جو مل جل کر کام کرتے ہیں، ہر انسان موجد و خلاق نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو ان سب کے ایجادات و تخلیق ایک جیسی نہیں ہوتی

تخلیق اور پیداوار میں فرد کا اپنا ایک مخصوص حصہ ہونا مسلّم ہے۔

ثانیاً، کیا تمام انسان تخلیقی صلاحیتوں پیداواری آلات اور میراث میں ملنے والے تجربوں کو ایک طرح سے کام میں لاتے ہیں؟ دنیا میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو سست، کاہل اور کام چور ہوتے ہیں اگر ان کے لئے تمام وسائل و امکانات فراہم کر دیے جائیں پھر بھی وہ دوسروں کے دست نگر اور پکے پکائے کھانے کے امیدوار ہوں گے اور ان کے برعکس کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو تخلیق اور پیداوار کے لئے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں جن وسائل و امکانات کا مذکورہ سطروں میں تذکرہ ہوا ہے ان سے تمام افراد بشر ایک جیسا فائدہ نہیں اٹھاتے ہر فرد ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ان امتیازات کا بھی اس فرد سے تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق طبعی اور سماجی اسباب و علل سے ہے (جیسے بچپنے میں بدن کو مناسب غذا کی فراہمی اور صحیح تعلیم و تربیت) اس وقت ہمارا سوال یہ ہوگا کہ اگر تمام طبعی و سماجی اسباب و علل کو مختلف انسانوں کے لئے یکساں بنا دیا جائے تو کیا تمام انسان ایک جیسے ہو سکیں گے، یا یہ فرق اور تفاوت انسان کی سرشت میں داخل ہے؟[13]

ابتدائی ایام میں انسانوں کے درمیان امتیاز اور فرق کس طرح رونما ہوا؟

ہمارے نزدیک یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انسان ایک فرد کی حیثیت سے اپنا فردی تشخص رکھتا ہے گو یہ تشخص مکمل طور پر سماج سے جدا نہیں، لیکن پھر بھی ہر فرد کسی حد تک ایک مخصوص تشخص کا مالک ہوتا ہے۔[14]

۱۳۔ یہ بات ٹریننگ، حفظان صحت اور غذائی عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے کہی گئی ہے۔

۱۴۔ انسان کے بارے میں تین نظریے پائے جاتے ہیں:
الف ۔ اصلیت فرد (انڈیویجل ازم ([illegible]) یا مکمل انفرادیت) ۔ اس نظریہ کا مقصد ہے کہ فرد مکمل طور پر مستقل اور معاشرے سے جدا ہے۔
ب ۔ اصلیت معاشرہ (فلسفی سوشلزم) اس نظریہ کے مطابق، واقعیت عینی انسانوں کا مجموعہ ہے اور اصولی طور پر فرد کی کوئی حقیقت نہیں۔ فرد ایک فرضی امر ہے۔ ہر انسان ایک کل کا جزء ہے اور جو چیز حقیقت رکھتی ہے وہ کل ہے۔
ج ۔ فرد اور معاشرہ کی مخلوط اصلیت ۔ اس نظریہ کی رو سے نہ انسان بطور کامل معاشرہ سے جدا اور مستقل ہے اور سو فیصد معاشرے میں گم ہے، کسی حد تک فرد معاشرہ کا تابع ہے اور معاشرہ بھی فرد کا تابع ہے۔ طبعی و سماجی ماحول انسان کی تعمیر کرتا ہے اور انسان بھی طبعی و سماجی ماحول کو بناتا ہے۔ یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کے ذکر کا یہ مقام نہیں۔

شہید مرتضیٰ مطہری

اصالتِ روح

ترجمہ : جناب خادم حسین

بہت سے موضوعات کی خوش نصیبی یہ ہے کہ علما اور دانشوروں کی محفلوں میں زیرِ بحث آتے ہیں مگر عوام اسے چھوتے بھی نہیں۔ دنیا کے زیرِ بحث موضوعات میں کچھ ایسے دلکش وخوش نصیب موضوع ہیں جو اہل دانش وبینش کی محفلوں میں بار پاتے اور عالموں کے لبوں تک آتے ہیں۔ کچھ موضوع اس درجے تک نہیں پہنچتے وہ ہرکس وناکس کے لئے نقل محفل ہوتے اور ہر شخص اس پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی شکل وصورت بگڑ جاتی ہے اور محققین کیلئے نہ صرف دشواری بلکہ لغزش فکر کا باعث ہوتے ہیں۔

"روح و بدن" اسی طرح "خدا اور کائنات"، ان موضوعات میں ہیں جن کے بارے میں ہر شخص نے اپنے طور پر کوئی نہ کوئی نظریہ قائم کر رکھا ہے۔ البتہ اس عمل کے کچھ نہ کچھ وجوہات ہیں اور ان کا سبب محض اتفاق اور خوش نصیبی ہی نہیں ہے۔

فطری طور پر انسان سب سے پہلا سوال کرتا ہے۔ میں کون ہوں؟ جس دنیا میں ہوں وہ کیا ہے؟ نتیجتاً ہر ایک اپنے لئے ایک تسلی بخش جواب ڈھونڈھ لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کائنات اور اپنی ذات کے بارے میں ایک خاص تصوّر کا حامل ہوتا ہے۔

روح اور بدن ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں ہر ایک نے بچپن میں اپنی ماں، دائی اور دادی۔ اس کے بعد واعظ اور شاعر کی زبان سے کچھ نہ کچھ ضرور سنا ہے، اس لحاظ سے اس کا ذہن پہلے ہی سے تیار رہتا اور کسی نہ کسی حد تک خاص نظریہ کی طرف رجحان بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ اسی بنا پر ممکن ہے کچھ لوگ مذکورہ عنوان کو دیکھتے ہی اس پر بات کو سننے کے لئے تیار ہو جائیں کہ:

○— روح وہ نامرئی مخلوق ہے جو کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر بدن کے پردے میں مخفی ہے۔ یا اپنے چہرے پر بدن کا نقلی چہرا لگائے ہوئے ہے۔

یا اس سے بھی زیادہ گئی گذری بات یہ ہے کہ:

o۔ روح وہ جن یا دیو ہے جو بدن کے محسوس حصے سے دکھائی دیتا ہے۔

o۔ بدن ظاہری اور عاریتی پردے کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور روح کی نامرئی انگلیاں ہیں جو اس ظاہری پردے کے پیچھے کام کرتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن لوگوں نے شعر و شاعری کی زبان سے روح کے بارے میں کچھ سنا ہو، ان کے ذہن فوراً یہ سننے کے لئے آمادہ ہو جائیں کہ:

o۔ روح ایک ملکوتی پرندہ ہے، جس کے لئے چند وجوہ کی بنا پر بدن کا وقتی قفس تیار کیا گیا ہے۔

o۔ وہ سدرہ نشین شاہباز ہے جو خلافِ طبع بدن کے ایک گوشہ میں سکونت اختیار کرتا ہے۔

o۔ وہ بادشاہ ہے جس نے قصر بدن کو اپنے شاہی قصر کے لئے منتخب کیا ہے اور کبھی کبھی اپنے سے زیادہ اسے مزین و آراستہ کرنے میں مصروف رہتا ہے۔

ہماری مراد شعر و شاعری کی زبان پر تنقید نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی زبان اور ہو بھی کیا سکتی ہے، شعر و شاعری یا وعظ و خطابت کی زبان علم و فلسفے کی زبان سے مماثلت نہیں رکھ سکتی، کیوں کہ ان کے مقاصد علم و فلسفہ کے مقاصد سے مختلف ہیں۔ ہر فن کی اس فن سے مخصوص ایک چابی ہوتی ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ وہ چابی صرف اسی تالے کے لئے قابل استعمال ہوتی ہے، جس کے لیے بنائی گئی ہو۔

ہیں ایسے افراد بھی ملتے ہیں جن کی شخصیت مرکب ہوتی ہے۔ یعنی وہ بیک وقت شاعر بھی ہوتے ہیں اور فلسفی بھی۔ ان کی بات کا انداز یکساں نہیں ہوتا کیونکہ خود فلسفہ و شاعری کے انداز جدا جدا ہیں۔

مثال کے طور پر دیکھئے روح اور بدن اور ان کے باہمی تعلق کے بارے میں ابو علی سینا کی فلسفی کتابوں "الشفا" اور "الاشارات و التنبیهات" کی زبان اور اسی موضوع پر ان کے قصیدۂ عینیہ کی زبان تقابل کی نظر سے ملاحظہ کیجئے۔

مطلع:

هبطت اليك من المحل الارفع   ورقاء ذات تعزز و تمنع

مقصد یہ ہے کہ علم و فلسفہ کی زبان اور شعر یا وعظ و خطابت کی زبان میں امتیاز ملحوظ

رکھنا چاہیے تاکہ منکر افراد اور مادیت پسند لوگوں کی طرح غلطیوں کے شکار اور بد دلی میں مبتلا نہ ہوں۔

درحقیقت فلاسفہ کے افکار و نظریات میں بھی کبھی کبھی وہ جھلک دکھائی دیتی ہے جو کم و بیش شعر و شاعری کے پیرائے اور زبان سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ جیسے افلاطون سے منسوب مشہور نظریہ، جس میں وہ کہتا ہے ، روح ایک قدیم جوہر ہے، جو بدن سے پہلے موجود ہے، جب بدن کا ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے اس وقت یہ اپنے مرتبہ سے اتر کر (تنزل) بدن سے (تعلق) ملحق ہوتی ہے۔

سو فی صدی یہ نظریہ "دوئی" کا نظریہ ہے، اس لئے کہ روح اور بدن کو ایک دوسرے سے علیحدہ دو جوہر اور ان کے باہمی تعلق کو عرضی و اعتباری مانتا ہے۔ جیسے طائر کا گھونسلے اور سوار کا سواری سے تعلق اور کوئی جوہری یا طبیعی تعلق جو ان دونوں کے درمیان ذاتی وحدت و پیوند کی نشاندہی کرتا ہو اسے نہیں مانتا۔

لیکن یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ کچھ دن گذرنے نہیں پائے تھے کہ خود افلاطون کے شاگرد ارسطو نے اس نظریہ کو باطل کر دیا اور سب نے اس کی تائید کی ارسطو یہ سمجھا کہ افلاطون اور اس کے سابقین کی زیادہ تر توجہ روح اور بدن کے معاملات میں نظریۂ "دوئی" پر مبنی ہے، اور ان لوگوں نے روح اور بدن کے باہمی تعلق اور وحدت کے بارے میں زیادہ غور نہیں کیا ہے۔ ارسطو اس نتیجہ پر پہنچا کہ روح اور بدن کے باہمی تعلق کو طائر کا گھونسلے یا سوار کا سواری جیسا تعلق نہیں مانا جا سکتا، بلکہ ان دونوں کا تعلق اس سے کہیں گہرا ہے۔ ارسطو نے روح اور بدن کے تعلق کو صورت و مادہ کے تعلق کے مانند اس فرق کے ساتھ جانا ہے کہ چوں کہ قوۂ عاقلہ مجرد ہے لہٰذا وہ مادے کا جزء نہیں بلکہ مادے کے ساتھ ہے۔ اس بحث کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ارسطو کے فلسفے میں روح کے قدیم اور بالفعل جوہر ہونے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ روح قدیم نہیں بلکہ حادث اور ابتدا میں محض استعداد و قوۃ ہے اور کسی طرح کا قبلی علم اسے حاصل نہیں، وہ اپنی تمام معلومات و اطلاعات کو اسی کائنات میں قوۃ سے فعل میں لاتی ہے، جزئی اختلاف کے ساتھ ابن سینا کے فلسفے میں بھی انہیں معنوں کی جھلک ملتی ہے، وہ دوئی، علیحدگی اور بیگانگی جو افلاطون کے فلسفے میں موجود تھی، ارسطو اور ابن سینا کے فلسفے میں نسبتاً کافی حد تک کم ہو گئی اور اس موضوع کی اساس ارسطو کے مشہور نظریۂ مادہ و صورت اور کون و فساد پر مبنی قرار پائی۔ اگرچہ اس نظریہ میں کچھ خاص امتیازات کی اصلی وجہ یہ دوئی کی جگہ روح اور بدن کے درمیان حقیقی تعلق اور وحدت کا قائل ہے اور یہ ایک اہم بات بھی ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے اہم اشکالات اور ابہامات سے بھی خالی نہ تھا۔ اشکالات مادہ اور صورت نیز کون اور فساد کے طبیعی تعلق کی کیفیت کے

بارے میں ہیں، جن کا بیان مناسب موقعہ پر ہونا چاہیے۔ اس صورت حال میں ضروری تھا کہ علم و فلسفے کے میدان میں قدم اٹھائے جائیں تاکہ اس معمہ کا حل ممکن ہو سکے یا کم سے کم اس موضوع کو معقول اور قابل قبول بنایا جا سکے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ قدم کہاں سے اٹھائے گئے۔

یورپ میں فکری اور علمی تحولات کے مقدمات فراہم ہوئے اور مکمل طور سے انقلاب آگیا انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ تر و خشک کی تمیز نہیں کرتا۔ گذشتہ اعتقادات و مبانی بے اساس ہو گئے، انقلابیوں نے تمام اشیاء کے لئے نئے منصوبے تیار کیے یہاں تک کہ روح اور بدن کے مسئلہ میں بھی نئے نظریات قائم ہوئے۔ فرانس کے مشہور فلسفی "دیکارت" نے روح اور بدن کی دوئی سے متعلق ایک خاص نظریہ پیش کیا، جس پر کچھ دن بعد رد و قبول کی بحث شروع ہوئی پھر نظریے کی تراش خراش اور اصلاح کی طرف توجہ کی گئی۔

دیکارت نے فکری ارتقا کی منزلیں طے کرنے کے دوران خود کو تین حقیقتوں کے ماننے پر مجبور پایا، خدا، نفس اور جسم۔ اس نے اس لحاظ سے کہ نفس، فکر و شعور رکھتا ہے اور بُعد (جہت) نہیں رکھتا۔ جسم بُعد رکھتا ہے اور فکر و شعور سے خالی ہے۔ اس طرح دیکارت نے نفس و بدن کو دو چیزیں جانا۔

دیکارت کے نظریے پر جو معقول اعتراض ہوا (سب سے پہلے خود یورپی افراد نے کیا) وہ یہ تھا کہ اس نے صرف دوئی اور روح و بدن کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بارے میں بیان کیا اور اُس تعلق کے بارے میں جو روح اور بدن کے درمیان موجود ہے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا دو مختلف چیزیں ہیں تو ایک دوسرے سے ملیں کیسی؟ روح اور بدن کے بارے میں قابل ذکر سب سے اہم مسئلہ اس تعلق کا ہے جو ایک لحاظ سے بدن اور روح یا روحی خواص کے درمیان موجود ہوتا ہے۔

درحقیقت، دیکارت کا نظریہ ایک طرح سے افلاطون کے نظریے کی طرف بازگشت ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوبارہ طائر اور گھونسلے کی یاد دلائی جا رہی ہے۔ کیونکہ دیکارت فطری اور ذاتی تصورات کا قائل ہے اور کہیں کہیں پر شروع سے ہی اس نے نفس کو موجود مانا ہے، اس لحاظ سے اس کا نظریہ افلاطون کے نظریہ سے قریب ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ روح اور بدن کے باہمی تعلق کے بارے میں اس کا بیان اتنا ہی مختصر ہے جتنا کہ نظریۂ افلاطون کا بیان مختصر تھا۔

یہ رجعت پسندی بہت ہی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ روح اور بدن کا ایک دوسرے سے تعلق کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جسے چھپایا جانا ضروری ہو اور محض ان دونوں کی جدائی کے اسباب

دو وجوہ پر اکتفا کی جائے۔ لہٰذا دیکارت کے بعد دانشوروں نے ان دونوں کے مابین تعلق کو جاننے کی کوشش شروع کی، جو شخص تاریخ فلسفۂ عصر جدید سے پوری طرح باخبر ہے، وہ جانتا ہے کہ روح اور بدن کے تعلق کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لئے نئے فلاسفر نے کتنی کوشش کی ہے اور کتنے مکاتب فکر اور مختلف نظریات نے جنم لیا اور کس حد تک افراط و تفریط میں آگے بڑھ چکے ہیں، کچھ لوگوں نے نفسیاتی ظواہر کو ترکیبات مادہ کی معمولی خاصیت جانا اور ہر طرح کی دوئی (روح اور بدن کے درمیان) ہونے کے انکاری ہو گئے، دوسرے گروہ نے جسم اور مادہ کو بے بنیاد اور روح کے لیے محض نمائش جانا۔ اس طرح سے انہوں نے اپنے خیال میں روح اور بدن کی جدائی اور دوئی کو ختم کیا، ایک ایسا گروہ بھی ہے جس نے تھک کر اس بحث کو انسان کی قدرت ہی سے خارج قرار دیدیا۔

اگرچہ روحی اور جسمی امور اور ان کے باہمی تعلق کے بارے میں دور حاضر کے دانشور اور فلسفی کسی مفید نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے، لیکن ان کی بے انتہا کوشش نے سائنس کے تمام شعبوں، خاص طور سے حیاتیات، فیزیالوجی اور نفسیات میں بہت اچھے اچھے فوائد و نتائج اہل علم کے حوالے کیے کبھی بھی ان مضامین پر کام کرنے والے محقق روح اور بدن نیز ان دونوں کے درمیان تعلق کے بارے میں اپنی تحقیقات کے نتائج حاصل کرنے کے سلسلے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن ان تحقیقات نے اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے راہ ہموار کردی اور ہم انشاءاللہ ان نکات کی طرف اشارہ کریں گے۔

ابتدا میں ہم نے ارسطو اور ابن سینا کے نظریہ کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا تھا کہ اس نظریہ میں روح اور بدن کی وحدت اور تعلق کی طرف توجہ مبذول ہوئی اور افلاطون کا نظریۂ دوئی رفتہ رفتہ فراموشی کے سپرد ہو گیا۔

اب یہ غور کرنا ہے کہ ابن سینا کے بعد آنے والے مسلمان فلسفیوں کے نزدیک اس مسئلے نے کیا صورت اختیار کی؟

ابن سینا کے زمانے کے بعد مسلم فلاسفہ نے براہ راست اس مسئلہ پر تحقیقی کام انجام نہیں دیا، لیکن فلسفے کا سب سے عام اور اساسی اور مقدم مسئلہ یعنی فلسفۂ وجود میں ترقی اور تحول کے اعتبار سے ایک عظیم انقلاب آیا، جس نے ایک طرح سے زیادہ تر فلسفی مسائل خاص طور سے روح اور بدن کے مسئلہ وحدت اور دوئی کو متاثر کیا۔

اس مقالے میں اشاروں پر اکتفا کرتے ہوئے محض اتنا کہا جا سکتا ہے کہ "صدرالمتألہین"

نے حرکت جوہری اور ملاصدرا کے "وجود" میں عظیم تبدیلی لانے والے منکرین و فلاسفہ کے گروہ میں قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔ صدرالمتألہین ملاصدرا نے اپنے وضع کردہ نئے، مستحکم اور اعلیٰ اصول سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کائنات کی ظاہری اور محسوس ہونے والی حرکات کے علاوہ ایک گہری، جوہری اور نامرئی حرکت ایسی بھی موجود ہے جو اس کائنات پر حکم فرما ہے اور وہی موجود ظاہری حرکتوں کی بنیاد ہے۔ اگر کسی صورت اور مادہ کو فرض کرنا ہو تو اس طریق کے علاوہ فرض نہیں کرنا چاہیے۔ مختلف اجسام کی تخلیق اور تشکیل قانون کون و فساد پر نہیں، بلکہ قانون حرکت پر مبنی ہے۔ اسی طرح نفس اور روح دونوں قانون حرکت کا نتیجہ ہیں۔ نفس کی تشکیل کا نقطۂ آغاز جسمانی مادہ ہے اور مادے میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے اندر اس موجود کی پرورش کرے جو ماوراء الطبیعہ کے برابر ہو، دراصل طبیعت اور ماوراء الطبیعہ کے درمیان کسی قسم کی دیوار نہیں ہے اور کوئی مادی موجود ترقی و تکامل کی راہ طے کرتے ہوئے غیر مادی موجود میں بدل جائے کوئی قباحت نہیں ہے۔ نفس کے نقطۂ تشکیل اور اس کے تعلق کے بارے میں افلاطون نیز ارسطو کا خیال کسی بھی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ مادہ و حیات اور روح و جسم کے تعلق کی نوعیت اس تعلق سے کہیں زیادہ طبیعی اور جوہری ہے۔ کسی شئی کے شدید و کامل درجہ کی ضعیف اور کمتر درجہ کے تعلق کی نوعیت کے مانند ہے۔ دوسرے الفاظ میں، روح و بدن کا ایک دوسرے تعلق کسی ایک بعد کا دوسرے ابعاد سے تعلق کی طرح ہے، یعنی مادہ اپنے تحول و تکامل کی راہ طے کرنے کے دوران تین جسمانی ابعاد (جسے ہم ابعاد ثلاثۂ مکانی بھی کہتے ہیں) نیز اپنی ذاتی اور جوہری حرکت (بعد زمانی) کے علاوہ ایک نئی جہت میں منبسط ہوتا ہے۔ یہ نئی جہت ان چار مکانی و زمانی جہات و ابعاد کے علاوہ ایک مستقل بالذات جہت ہے۔ البتہ اس جہت کو ہماری طرف سے بعد نام دینے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بھی کمیت و مقدار رکھنے والی چیزوں کی طرح ذہنی تجزیہ کے قابل ہے، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ مادہ اس نئی جہت کو اختیار کرتا ہے جس میں اس کی خاصیت مادہ مکمل طور سے ختم ہو جاتی ہے۔

یہ باتیں بطور مقدمہ اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ اس سے پہلے کہ روح اور بدن کے تعلق کا صحیح تصور پیدا ہو اس بارے میں کہ، آیا روح اصلی شے ہے یا نہیں؟ اور آیا خاصیت "اجزاء مادہ کی ترکیب" ہے کہ نہیں؟ پر بحث کرنا فضول ہے۔ لیکن اس موضوع کی وضاحت کے بعد ہم اسے آگے یوں بڑھا سکتے ہیں کہ آیا روح کی خصوصیات حالت انفراد و ترکیب مادہ کی

خصوصیات کے مانند ہیں اور خاصیات روح کیا مادی عناصر کی ترکیب و امتزاج کا نتیجہ ہیں یا جسمانی مادہ جب تک مادی اور جسمانی حد میں رہتا ہے اس وقت تک اس طرح کے اثر و خواص سے خالی ہوتا ہے اور یہ خواص مادے میں اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب وہ اپنے جوہر و ذات میں تکامل کے مرحلے طے کر کے ذاتی درجہ کا مالک ہوتا ہے اور اسی درجہ کی بنا پر غیر مادی اور غیر جسمانی محسوب ہوتا ہے اور روح کے اثر و خصوصیات کا اس درجہ سے تعلق واقعیت و وجود ہے؟ یا کچھ اور؟۔

اس منزل پر پہنچنے کے بعد اس بحث کو انسانی روح اور اس کے ظواہر پر معمول کے مطابق منحصر کرنا ضروری نہیں، ہم اسے نچلے درجے سے شروع کر کے زندگی کے تمام آثار و ظواہر میں پھیلا دے سکتے ہیں۔

فکری اور حیاتی آثار کے درمیان اگر کسی فرق کے قائل ہو سکتے ہیں تو وہ صرف تجرد اور عدم تجرد کی بنا پر جو فی الحال مورد بحث نہیں، فی الحال زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ:

"روح مادہ کی خاصیت و اثر نہیں، بلکہ وہ جوہری کمال ہے جو مادے میں ظاہر ہو کر مادے سے کہیں زیادہ اور متنوع آثار کی تشکیل کرتی ہے"

یقیناً یہ خصوصیت صرف انسان و حیوان ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ ہر ذی حیات میں ہوتی ہے۔

حیات اور زندگی کی حقیقت کچھ بھی سہی، اس کی ماہیت و کنہ کا ادراک ہمارے لئے خواہ ممکن ہو یا نہ ہو۔ یہ بات قطعی اور ناقابل تردید ہے کہ وہ ذی حیات موجودات جنھیں ہم حیوان و نباتات کے نام سے جانتے ہیں، ان میں ایک قسم کی فعالیت ہوتی ہے جو دوسری بے جان اور مردہ اشیاء میں نہیں ہوتی۔

اس گروہ کے موجودات میں "ذاتی تحفظ" کی خاصیت پائی جاتی ہے اور وہ خود کو ماحول کے اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں، یعنی (جاندار) ذی روح موجودات جس ماحول میں رہتے ہیں اس کی مناسبت سے اپنے داخلی انتظامات و قویٰ کو اس طرح تیار رکھتے ہیں کہ اس فضا میں جدوجہد کر کے اپنی بقا کو محفوظ رکھ کر اس سے مستفید ہو سکیں۔

جاندار موجود میں "ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونے" کی خاصیت ہوتی ہے، جو داخلی فعالیت پر مبنی ہے، بے جان چیزوں کو یہ خاصیت ہرگز میسر نہیں ہوتی، اگر کوئی بے جان چیز ایسی فضا یا ایسے ماحول میں قرار پائے جو اس کی تباہی کا باعث ہو، تو وہ اپنی بقا کو محفوظ رکھنے

کے لئے کسی قسم کی کوشش نہیں کرتی۔

جاندار موجود میں "عادت" کی خصوصیت پائی جاتی ہے، مثلاً اگر کوئی جاندار نامساعد ماحول اور ناموافق فضا کا شکار ہوتا ہے تو شروع میں اسے سخت ناگوار گذرتا ہے اور وہ بہت بے چین ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اسی فضا کا عادی ہو جاتا ہے اور اس میں امن و امان محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ امن و امان اپنی داخلی فعالیت اور خاصیتِ انطباق کے نتیجہ میں پیدا کرتا ہے اگر کوئی پودا، یا جانور کا بدن، یہاں تک کہ جسم کا کوئی بھی عضو اس ناہموار ماحول (و فضا) میں آجائے، جو اس کی حیات و بقا کے لئے باعث نقص و خطر ہو، تو رفتہ رفتہ وہ اپنے تئیں اتنا تیار و مستعد بنالیتا ہے کہ اس ماحول میں رہتے ہوئے ممکن خطرے سے نپٹ سکے۔ انسان کا ہاتھ اگرچہ نرم و نازک ہے اور پہلی بار کسی بھاری پتھر یا بوجھ کی تاب نہیں لاتا، لیکن رفتہ رفتہ یہی ہاتھ اس بوجھ کا عادی ہو جاتا ہے، یعنی ایک داخلی طاقت اس کی بناوٹ میں اس بوجھ کی مناسبت سے تغیر و تبدیلی لاتی ہے، تاکہ نئے عوامل کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ کرسکے۔

جاندار، تغذیہ کی خاصیت رکھتا ہے، وہ خودکار (خودکفیل) اور داخلی عوامل کے زیر اثر بیرونی مواد کو لینے لئے جذب کرتا ہے، اور اسے خاص انداز میں تجزیہ و ترکیب کے ذریعے اپنی بقا اور دوامِ زندگی کے کام میں لاتا ہے، لیکن یہ خاصیت بے جان چیزوں میں نہیں ہے۔ جاندار موجود اور زندہ عناصر جہاں بھی ہوں، رفتہ رفتہ ترقی کرتے اور نئی شکل و صورت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ کمال پذیر بھی ہوتے ہیں اور ہر لمحہ اپنی طاقت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب اپنی نسل باقی رکھنے کے لائق ہو جاتے ہیں تو خود ختم ہو کر اپنے نتائج کے ذریعے اپنا وجود قائم رکھتے ہیں۔

حیات و زندگی جہاں کہیں دکھائی دیتی ہے، وہاں کے ماحول (اور فضا) پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے اور کائنات کے بے جان عناصر کو ترکیب بدل کر نئی ترکیب و حالت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ حیات، مصور، منصوبہ ساز اور کلاکار ہے اور اس میں ترقی و تکامل کی خاصیت موجود ہے۔

حیات، مقصد اور صلاحیتِ انتخاب رکھتی ہے، وہ اپنی منزل و راہ کو جانتی ہے، جس راہ کو لاکھوں سال پہلے انتخاب کیا جاچکا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مقصد و منزل کی طرف بڑھتی رہتی اور جس حد سے آگے اسے کمال نہیں ملتا وہاں سے آگے نہیں بڑھتی۔

یہ تمام خواص، بے جان میں نہیں، صرف جاندار موجودات میں ہوتے ہیں۔ کرسی موریسن کے بقول: "مادہ بذات خود ذکاوتِ عمل (ابتکار) سے عاری اور صرف حیات ہے جو ہر لمحہ خوبصورت

ر نئے مناظر پیش کرتی ہے۔"

اس نکتے سے ہم مکمل طور سے درک کرتے (سمجھتے) ہیں کہ حیات و زندگی بذات خود ایک خاص طاقت اور جداگانہ کمال و فعلیت ہے جو مادے میں پیدا ہو کر اپنی فعالیت کے علاوہ مختلف کے سرگرمیوں اور فعالیتوں کا اظہار کرتی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ "زیست شناسی" (حیاتیات) کے موضوع پر دانشوران مغرب کی طرف سے اس قدر عمدہ تحقیقات سامنے آچکے ہیں جو موضوع روح و بدن کے لئے بڑی اچھی زمین ہموار کرتے ہیں ہر چند خود ان دانشوروں کی مراد یہ تحقیق نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ حیات و زندگی اور جاندار موجودات کے خواص کے بارے میں وہ زبردست تحقیقات عمل میں آئیں جو حیاتی طاقت کی اصالت کو مکمل طور سے واضح کرتی ہیں۔ زیادہ تر دانشوروں نے اس حقیقت کو درک کر کے اپنی تحقیقات میں حیاتی طاقت کی اصالت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے، انہوں نے سنجیدگی سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حیاتی طاقت وہ قوت ہے جو طبیعت کے سلسلے میں مادے پر خارج سے آتی ہے اور آثار زندگی محض مادے کی ترکیب، جمع و تفریق سے نہیں بلکہ اسی قوت کے معلول ہیں۔ اجزاء مادہ کی ترکیب، جمع و تفریق و تالیف حیاتی آثار کی پیدائش کے لئے شرط کافی نہیں بلکہ شرط لازم ہے اور جو لوگ حیاتیات کے مشہور عالم و دانشور، لامارک کی طرح حیاتی قوت کی اصالت کے منکر ہیں اور رسمی طور پر یہ اظہار کرتے ہیں کہ جاندار کی طبیعت کا مکانیکی قوانین کی رو سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ جب ان کے نظریہ کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ حیاتی قوت کی اصالت کے بارے میں انکا انکار اس لئے ہے کہ یہ لوگ حیاتی قوت کی اصالت کو دوئی اور جدائی کے برابر اور حیاتی قوت کے وجود کو مادہ اور اس کے آثار سے جدا اور منفصل مانتے ہیں۔ انہوں نے یوں سوچا کہ اگر حیاتی قوت، اصالت رکھتی ہے تو اسے ماحول سے وابستہ ہونے کے بجائے ہر فضا اور ہر مقام میں یکساں رہنا چاہیے، ماحول کے عوامل سے متأثر نہیں ہونا چاہیے۔ جسم کی فزیکی اور کیمیاوی تحریک و عمل سے تعلق و وابستگی نہ رکھنا چاہیے، حالانکہ علمی مشاہدات ان سب کے برخلاف بات ثابت کرتے ہیں۔

لامارک کہتا ہے:

" زندگی فیزیکی کیفیت کے علاوہ کچھ نہیں۔ زندگی کی تمام کیفیتیں فیزیکی یا کیمیادی علل پر موقوف ہیں اور ان کا "مرکز نمو" (منشا)

جاندار کی مادّی تعمیر کے اندر ہے۔"

شاید لارمک نے سوچا کہ اگر حیاتی قوت اصالت رکھتی ہے تو فیزکی اور کیمیاوی علل سے اس کا تعلق اور اس کے (مرکز نمو) منشأ کو جاندار کے مادّے میں نہ ہونا چاہیے۔

اس سے پہلے بیان ہو چکا کہ دیکارت کا نظریۂ دوئی اور نظریۂ افلاطون کی طرف اس کی الٹی دوڑ بہت مشکل سے تمام ہوئی کیونکہ اس نے دانشوروں کو اس طرف اکسایا کہ وہ حیاتی طاقت کی اصالت کے بارے میں ہی سوچتے رہیں اور حیات و بدن کے جوہری اور ذاتی رابطہ کو نگاہوں سے دور رکھیں اور دو مخالف قطبوں کو مرکز فکر بنائیں۔

کیونکہ دیکارت خود نظریہ دوئی کی راہ سے وارد میدان ہوا۔ اس نے دیکھا کہ جسم جس کی خاصیت ہے، بعد — اور نفس، جس کی خاصیت ہے، فکر و شعور۔ اور ان دونوں کے درمیان ہیں دو گہرے درّے، لہٰذا وہ مجبور ہو گیا کہ انسان کے علاوہ دوسرے جانداروں میں حیات کو اصلی طاقت ماننے سے انکار کرے، اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انسان کے علاوہ وہ تمام حیوانات کے اعضاء و جوارح کو نہ صرف مشینی مانتا بلکہ ان میں احساس و ادراک کا منکر بھی تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ حیوان فاقد احساس و ادراک ہے، لذّت و الم (خوشی اور دکھ درد) کو محسوس نہیں کرتا اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ خاص موقع پر ملتا، پھرتا اور گنگناتا ہے، یہ احساس و ارادہ پر منحصر نہیں، بلکہ ان مشینوں کو اس طرح سے بنایا گیا ہے، کہ وہ خاص موقعوں پر یہ آثار ظاہر کرتی ہیں اور ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ احساس و ارادہ کے تحت کر رہی ہیں!!!

بہر حال، حیاتی قوت کی اصالت کا نظریہ ان نظریات میں سے ہے جو نئی علمی تحقیقات کی بنا پر مورد تائید قرار پایا ہے اور خاص طور سے تکامل (ایولوشن) انواع کے نظریہ نے حیاتی قوت کی اصالت اور مادے نیز طبیعت کے بے جان عناصر کی طاقت پر اس کے تسلّط کو پہلے سے کہیں زیادہ ثابت کر دیا۔ ڈارون جو خود اس نظریہ کا موجد ہے، اگرچہ وہ حیاتی طاقت کی اصالت کو ثابت کرنے کے حق میں نہیں، لطف یہ ہے کہ یہی شخص جو اپنے کام کی بنیاد طبیعی انتخاب پر رکھتا ہے اور طبیعی انتخاب کو محض اتفاقی تغیّر کا نتیجہ قرار دیتا ہے، جب انواع کی ترقی و پیش رفت اور تکامل کی منظم رفتار کی طرف دیکھتا ہے تو خود اپنے قول کے مطابق مجبوراً "جاندار طبیعت کیلئے "وجود مشخص" کا قائل ہو جاتا ہے۔ حیاتی قوت کی اصالت کا اثبات، ڈارون کی تحقیق کا موضوع نہ تھا، شروع میں اس نے کام شروع کیا تھا، لیکن خود بخود اس نتیجہ پر جا پہنچا، یہاں تک کہ اس کے زمانے ہی میں کچھ لوگوں نے اس سے کہا کہ "تم تو طبیعی انتخاب سے مراد ایک ایسی فعال

طاقت لیتے تھے جو ماوراء طبیعت ہے۔"[۲۶]

وہ لوگ جنھوں نے انسانی نفسیات کے پہلوؤں کا مطالعہ کیا، بغیر اس کے کہ وہ حیاتی قوت کی اصالت کے بارے میں جستجو کریں اور بغیر اس کے کہ وہ اپنے فلسفیانہ تحقیقات کے نتائج سے آگاہ ہوں، اسی نتیجہ پر پہنچے۔

پسیکانالیز کے مشہور و معروف ماہر نفسیات فرائیڈ نے نفسیات کے میدان میں ایک انقلاب برپا کردیا، یہ دانشور اپنے مطالعے، آزمائشوں اور تجربوں کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ عصبی بیماریوں کے لیے فیزیالوجی اور تشریح الاعضا کے علما کی صرف دماغ اور اس کے پیچ وخم پر تحقیق ناکافی ہے۔ اس نے تحت الشعور کے اس گوشے کا انکشاف کیا جس کی آگاہی و اطلاع شعور کی سطح سے بہت گہری ہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ پریشانیوں کی وجہ سے نفسیاتی اسباب وعلل کے ظہور کی بذات خود ایک حقیقت ہے اور یہی حقیقت بیماریوں کا باعث ہوتی ہے۔ بیماریوں کا علاج نفسیاتی طریقۂ علاج اور الجھنوں کو دور کرنے کے ذریعہ ہونا چاہیے اس سے جسمانی بیماری ختم ہوسکتی ہے۔

نفسیاتی اور کچھ جسمی بیماریوں کا علاج نفسیاتی طریقۂ علاج کے ذریعہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ محمد بن ذکریا رازی اور ابن سینا نے بھی عملی طور پر اس طریقے کو اپنایا ہے، البتہ آج اس فن کا دائرہ بہت وسیع ہوچکا ہے اور اس کی بعض صورتیں واقعاً حیران کن ہونے کے ساتھ ساتھ اصالت حیات اور خاص طور سے انسان میں اصالت روح کی تائید کرتی ہیں لیکن فرائیڈازم میں بڑا انکشاف شعور ولاشعور اور اس کے گرہ در گرہ سلسلوں کا ہے۔ پرانے زمانے میں ملائی ونفسیاتی بیماریوں کو فقط "عادت" کے زاویے سے دیکھا جاتا تھا اور عادت اس حالت کا نام ہے جو کسی عمل کو بار بار انجام دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ عادت، مادی حالت کی روانی جیسی حالت ہے۔ اس کی مثال ہے:

کسی ٹہنی کو دوہرا کریں پھر چھوڑدیں، تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ سیدھی ہوجائے گی دوبارہ اگر اسے دوہرا کیا جائے تو دوسری بار کم سیدھی ہوتی ہے اور اگر اس عمل کو کئی بار دہرایا جائے تو دُہری ہوجائے گی۔ کہا جاتا تھا کہ عادت بھی کسی ٹہنی یا کاغذ کو دوہرانے کے مانند ہے۔ اسی طرح سے کوئی بھی عمل تکرار کے نتیجہ میں دماغ پر اپنا اثر و رسوخ جماتا ہے، جسے ہم اخلاقی برائی یا اچھائی کا نام دیتے ہیں۔ لیکن تحت الشعور یا "شعور باطن" اور "الجھنوں" کے نظریات یہ ثابت کرتے ہیں کہ اخلاقی ظواہر دوسرے ظواہر سے علیحدہ اور مستقل ہیں۔

فرائیڈ اپنے نظریہ کے ذریعے حیاتی قوت کی اصالت یا مادہ پر حیات کی حکومت کو ثابت نہیں کرتا چاہتا تھا، بلکہ علمی تحقیقات جس کا وہ اہل بھی تھا۔ اس میں اہلیت و شائستگی کا ثبوت دیا۔ لیکن جب فلسفی استنتاج و استنباط میں وارد ہوتا ہے، تو وہ شائستگی اور لیاقت کھو بیٹھتا ہے نامطلوب فرضیہ اور نظریات قائم کرتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال اس دانشور کی علمی تحقیقات کی قدر و قیمت جو ہے وہ مسلم ہے۔

فرائیڈ کے بعض شاگردوں میں "یونگ" جیسوں نے نفسیاتی نظریات کے سلسلے میں فلسفی استنتاج و استنباط کے طرز میں اپنے استاد کی مکمل طور سے مخالفت کی اور اس نظریہ میں کافی حد تک حیاتی قوت کی اصالت کو نمایاں کیا اور وہ ان معنوں میں کہ فرائیڈ کے نظریہ کو ماوراء الطبیعت کا حامل پہلو قرار دیا۔

اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے بڑا اعتراض محض جسم و جان اور مادہ و حیات کی نوعیتِ اختلاف کی تشخیص سے عبارت نہیں، کیونکہ یورپی محققین کے ذریعے حیاتی قوت کی اصالت کے بارے میں شواہد پیش کرنے سے پہلے انہیں سطحی مشاہدات کی مدد سے بھی اس سلسلے میں ثبوت اور دلائل فراہم ہو سکتے تھے۔ دوسرا بڑا اشکال، جسم و جان کے تعلق کے بارے میں طرز تصور کا ہے، جس نے بہت سے مفکرین اور دانشوروں کو حیاتی قوت کی اصالت کے بارے میں سوچنے سے دور رکھا اور جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس عظیم مشکل کا حل "صدرالمتألہین" کے فلسفے میں بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

حیاتی قوت کی اصالت ایسا مسئلہ ہے جو ماوراء الطبیعت پہلو رکھتا ہے، اگر حیات مادے کا اثر و خاصیت رکھتی تو ماوراء الطبیعت پہلو اس میں نہ ہوتا۔ کیوں کہ حیات و زندگی مادے میں حالت ترکیب و انفراد کے اثر کی طرح پوشیدہ رہتی، درحقیقت جب کبھی جاندار موجود پیدا ہوتا ہے تو مادے میں کسی قسم کی تخلیق یا فوق العادہ چیز رونما نہیں ہوتی، لیکن حیاتی قوت کی اصالت کے نظریہ کے مطابق، مادہ بذات خود فاقد حیات و زندگی ہے اور جب مادے میں استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے اس وقت زندگی اور حیات کا وجود ظاہر ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ میں، مادہ اپنی تکاملی سیر و حرکت کے دوران زندگی پا کر اس کمال تک رسائی حاصل کرتا ہے جو اس سے پہلے موجود نہ تھا، اسی کے نتیجہ میں وہ خاص قسم کی فعالیت حاصل ہو جاتی ہے، جس سے وہ پہلے عاری تھا، لہذا کسی بھی موجود کا زندہ ہونا درحقیقت اس کی خلقت و ایجاد کی دلیل ہے۔

ممکن ہے یہاں یہ کہا جائے کہ یہ بات درست ہے کہ بے جان مادہ انفرادی حالت میں حیاتی خاصیت نہیں رکھتا، لیکن مادے کے اجزاء میں ترکیب اور فعل وانفعال کے نتیجہ میں اگر حیات کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ چند مادی یا غیر مادی اجزاء جب ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پاکر ایک دوسرے پر متقابل اثر ڈالتے ہیں، تو اس عمل کے نتیجہ میں کچھ اجزاء اثر ڈالتے ہیں اور کچھ قبول کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ "مزاج متوسط" پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بات محال ہے کہ چند جزء ترکیب پاکر ایک ایسے اثر کو جنم دیں جو اجزاء ان کے "مزاج متوسط" کے آثار کے ماسوا ہے، مگر یہ کہ ان اجزاء کی ترکیب خود اپنی قوت سے بڑھ کر ایک ایسی جوہری قوت کی تشکیل کا باعث بنے جو ان اجزاء کو واقعی وحدت بخشے۔ اب سوال یہ ہے کہ: مادے کے اجزاء میں ترکیب اور فعل و انفعال کے نتیجہ میں اگر حیات کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جو تشریح کا محتاج ہے۔ مادے کے اجزاء میں فعل و انفعال سے مراد اگر حیاتی قوت کی تشکیل ہے اور حیاتی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو بات قابل قبول ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ حیاتی قوت کے بغیر مادے کے اجزاء میں حیاتی قوت کی خاصیت (جو اجزاء کی خاصیت سے مختلف ہے) پیدا ہو جاتی ہے تو محال و ممتنع ہے۔

ایک مفروضہ اور باقی رہا، مفروضہ یہ ہے کہ مادہ بذات خود فاقد حیات ہے، اور حیات ایک ایسی قوت ہے جو بے جان مادے کے تمام قوا پر مسلط ہے، لیکن یہاں پر دانشوروں کی تحقیق کے مطابق فرض کیا جائے، کہ بے جان موجودات میں (انرجی) قوت کی ایک مقدار معین وثابت ہے اور انکا وجود و عدم، خلق ہونا نہیں، بلکہ مادے کے اجزا کی جمع و تفریق اور انرجی کا نقل و انتقال سے خاص قسم کی قوت اگر حیات کے لئے بھی فرض کی جائے تو نتیجۃً حیاتی قوتیں بھی غیر حیاتی قوتوں کی طرح خلق وایجاد نہ ہوں گی، بلکہ جمع و تفریق اور (انرجی) قوتوں کے نقل و انتقال کے نتیجہ میں ایک خاص موقع پر یکجا جمع ہو جائیں گی، لہٰذا زندہ ہونا بھی خلق و ایجاد نہیں۔

اس مفروضے کے بے نتیجہ ہونے کے بارے میں ہم کہیں گے: سب سے پہلے حیاتی (انرجی) قوت کے بارے میں توضیح دی جائے، کہ آیا یہ قوت بذات خود بے جان میں ہوتی ہے یا جاندار میں؟ اور اگر دوسرے مفروضہ کے مطابق جاندار میں ہوتی ہے، تو آیا یہ ایسی شئی ہے جو حیات رکھتی ہے؟ یعنی حیات کیا اس شئی سے جدا اور مستقل چیز ہے، جس کے ساتھ وہ مل جل کر رہتی ہے یا کوئی تیسرا مفروضہ یعنی عین حیات ہے؟ پہلے اور دوسرے مفروضہ کے مطابق حیاتی قوت اور

دوسری قوتوں میں (ان کے حیاتی یا باعث حیات ہونے کے اعتبار سے) کسی قسم کی حیاتی قوت نہیں۔ اس لئے کہ یہ قوت یا تو مکمل طور سے زندہ نہیں (پہلا مفروضہ) اور یا پھر باعث حیات وہ اضافہ شدہ چیز ہے جو اس کی ذات میں نہیں لیکن اس سے وابستہ ہے۔ رہی تیسرے مفروضہ کی بات تو اس کے معنے یہ ہیں کہ (حیات اور حیاتی قوت) وہ مجرد موجود ہے جو اپنے آثار باقی رکھتے ہوئے تنزل پیدا کر کے مادے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ محال ہے۔ البتہ تنزل کے نام سے جو فلسفی دعویٰ کرتے ہیں کہ کائنات اور مادہ، ماوراء طبیعت کی تنزل یافتہ شکل ہے تو اس کی نوعیت قوت کے نقل و انتقال اور تغیر اشکال کی نوعیت سے مختلف اور بذات خود ایک جدا بحث ہے۔ ان دونوں کو ایک نہیں سمجھنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ بالفرض بے جان مادّے میں خلق و ایجاد کے منکر ہوں، اور ان موجودات کی تخلیق کو مادے کے اجزاء کی جمع و تفریق اور قوتوں کے نقل و انتقال کے سوا اور کچھ نہ جانیں، تو جاندار موجودات میں دانشوروں کی رائے کے مطابق یہ بات صادق نہیں آتی۔ حیات کے خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے لئے کوئی معین اور ثابت مقدار فرض نہیں کی جا سکتی اور ایک نقطہ کی دوسرے نقطہ کی جانب حیات کے انتقال اور موجودات کے زندہ ہونے کو بھی درحقیقت ایک قسم کا تناسخ کہنا مناسب نہیں۔ اس لئے کہ حیات کی کوئی ثابت اور معین مقدار نہیں، جس دن سے زمین پر حیات ظاہر ہوئی ہے اس دن سے ترقی کی طرف گامزن ہے اور اگر اتفاقاً ختم ہو جائے یعنی بہت سے جاندار موت کے گھاٹ اتر جائیں تو وہ انرجی کسی دوسرے نقطہ پر متمرکز نہیں ہوتی۔ البتہ حیات و موت ایک قسم کا بسط و قبض ہے۔ لیکن ایسا بسط و قبض جس کا تعلق کائنات کے وجودی درجہ سے کہیں بلند و بالاتر ہے، وہ فیض ہے جو غیب سے آتا اور اسی جانب واپس ہو جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا باتوں کی تائید کے لئے ہم یہاں پر "ازوالڈ کولپہ" کی مؤلفہ کتاب "مقدمای بر فلسفہ" ترجمۂ جناب احمد آرام۔ سے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔ مذہب مادیت پر تنقید کرتے ہوئے "ازوالڈ کولپہ" کہتا ہے:

"مذہب مادیت جدید علم فزکس کے قوانین میں سے ایک اہم قانون "بقائے قوت" کی مخالفت کرتا ہے، اس قانون کے مطابق دنیا میں موجود انرجی کی مکمل مقدار قائم ہے، ہمارے چاروں طرف جو تغیرات اور تبدیلیاں نظر آتی ہیں، وہ انرجی کے ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک انتقال اور ایک صورت سے دوسری صورت و شکل اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں، اس قانون کے مطابق بخوبی واضح

ہو جاتا ہے کہ فزکس کے آثار و ظواہر ایک "مربوط حلقے" کی تشکیل کرتے ہیں جس میں عقلی اور نفسیاتی آثار و ظواہر کی گنجائش ناممکن ہے۔ لہذا دماغی عملیات خاص قسم کی پیچیدگی اور ابہام رکھنے کے باوجود آن ظواہر میں محسوب ہونگے جو قانون (علت و معلول) علیت کے تابع ہوتے ہیں اور خارجی اثرات کے نتیجہ میں جو تغییرات دماغ پر طاری ہونگے وہ بہر حال خالص فزیکل اور کیمیکل شکل میں ہوں گے پھر اسی شکل میں انہیں منتشر بھی ہونا چاہیئے، اس طرح کے کلی نظریہ سے اشیا کا (عقلانی ہونا) عقلی پہلو ہوا میں معلق رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ ظواہر کی فزیکل قوت سے کچھ کم و کاست کیے بغیر نفسیاتی ظواہر کو فزیکل اور مادی تصور کرنا کیسے ممکن ہے؟ اس کا منطقی حل صرف یہ ہے کہ ہم عقلی عملیات کے لئے بھی اس کی دوسری کیمکل، الکٹریکل اور حرارتی اور مکانیکی قوتوں کے مدمقابل ایک خاص قوت کے قائل ہو جائیں، اور یہ قبول کریں کہ اس خاص قوت اور دوسری جانی پہچانی انرجیوں کے درمیان وہی نسبت ثابت و برقرار ہے جو دوسری تمام قوتوں کے درمیان موجود ہے، لیکن یہ کہنا لازمی ہے کہ مادیت پسند علما اور دانشوروں نے اس نظریہ کے بارے میں نہ اظہار خیال کیا ہے اور نہ ہی کسی نے مادیت پسند تحریروں میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے البتہ مجموعی اعتراضات جو اس عقیدے کے مدمقابل ہیں ان پر اظہار نظر سے روکتے رہتے ہیں، تمام ہونے والے اعتراضات کی اساس یہ ہے کہ فزکس کے ماہرین، انرجی کی جو تعبیر کرتے ہیں وہ عقلی و فکری ظواہر و اعمال پر ہرگز قابل انطباق نہیں ہے۔

کرسی موریسن اپنی کتاب "راز آفرینش انسان" ترجمہ محمد سعیدی" میں بیان کرتا ہے:

" جانوروں کے درمیان صاحب فکر و شعور انسان کا ظہور، اس تصور سے "کہ یہ ظہور مادے کے تحوّل اور تبدیلی کا معلول ہے اور کسی خالق کا اس میں دخل نہیں" کہیں بلند و بالا تر ہے۔ اس صورت کے علاوہ انسان کو ایک مکانیکی آلہ ہونا چاہیے جس کی کارکردگی دوسرے کے ہاتھ ہے۔ اب یہ دیکھا جائے کہ

اس مشین سے کام لینے اور اسے چلانے والا کون ہے ؟
سائنس نے اب تک اس مشین کے چلانے والے کے بارے میں نہ
کوئی تاویل پیش کی ہے اور نہ ہی اسے پہچان سکی ہے ، لیکن دنیا
بھر میں یہ بات مسلّم ہے کہ اس مشین کو چلانے والا بذات خود
مادے کا جزء نہیں ہے ۔"

اسی طرح کہتا ہے :

"مادّہ ، اپنے ذاتی قوانین و مقررات کے سوا کوئی عمل انجام نہیں
دیتا ، ذرّات اور ایٹم زمینی قوتِ جاذبہ اور کیمیاوی فعل و انفعالات
نیز فضائی اثر اور الکٹریسٹی سے متعلق قوانین کے تابع ہیں ۔ مادہ بذاتِ خود
کوئی نیا عمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یہ فقط زندگی ہی ہے جو ہر لمحہ
خوبصورت اور نئے نئے مناظر پیش کرتی رہتی ہے ۔"

علماء و حکما ، علّت و معلول یا کائنات کے رموز و اسرار سے متعلق بحث کرتے ہوئے
(جیسے ابن سینا ، اشارات کی دسویں نمط میں) روحی آثار و قوا کا ذکر خصوصیت سے کرتے ہیں
صدر المتألہین ملاصدرا نے علّت و معلول سے متعلق بحث کو اسفار میں ایک فصل کی شکل دی
ہے اور وہ اس عنوان سے کہ : " فکر و تصوّر کبھی کبھی اشیاء کے حدوث کا سبب بنتے ہیں"
اس فصل سے انکی مراد مادے پر حیات کی حکومت و قاہریت نیز فکر و تصوّر کے اثرات
کا اثبات ہے جو شئون حیات میں داخل ہے ۔

اس فصل کے اجزا (پیراگراف اور ضمنی مباحث) میں ایک موضوع یہ بھی چھیڑا ہے
کہ صحت و بیماری کی ایجاد میں سمجھنے سمجھانے اور توہّم کے اثرات کا بھی دخل ہے ۔
بحث بہت طویل و دلچسپ ہے مگر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ آج کے دور میں اس
پرانے اور دقیانوسی طرز فکر (دنیا محض مشینی دنیا ہے اور خلقتِ ذرّات کی تالیف و
ترکیب اور جمع و تفریق کے سوا اور کچھ نہیں) کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ، بات اس کے آگے
بڑھ چکی ہے ۔

دانشوروں کی تحقیقات نے مادیت پسندوں کے غرور کو مکمل طور سے ختم کر دیا ہے
اور اب کوئی ڈیکارتے اور دوسروں کی طرح یہ نہیں کہے گا کہ " مادہ اور حرکت مجھے دے دو
میں دنیا بناؤں گا " ، دنیا کی شاخیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ہم اسے مادہ ، اور مادے

حسی اور عرضی حرکت میں محصور کر سکیں۔

حوالے

۱۔ دیکھئے: اصول فلسفہ و روش ریالیسم، جلد دوم
۲۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو یہی ماخذ، جلد سوم
۳۔ داروینیسم: تالیف ڈاکٹر محمود بہزاد۔ طبع پنجم ص ۹۹
۴۔ تفہیم و تلقین اور اس کے اثرات کے لئے دیکھئے:
تداوی روحی" تالیف کاظم زادہ۔ ایرانشہر

جہاد

علامہ اقبال

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی، تو دل ہیں موت کی لذّت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر!
تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے، تو مغرب میں بھی ہے شر؟
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

جناب سید علی نقی

خالق کے نظام ہدایت میں خواتین کا حصہ

ہدایت تخلیق کا لازمی تتمہ ہے جو مقتضائے ربوبیت ہے اور ربوبیت ہمہ گیر ہے اس لئے نظام ہدایت کا بھی ہمہ گیر ہونا ضروری ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری کائنات ارضی و سماوی ہدایت تکوینی و تسخیری کی زنجیروں میں اسیر ہے لیکن انسان فاعل مختار ہے لہٰذا اس کی تربیت کے لئے صلاحیت تکلیف پیدا ہونے کے بعد تشریعی ہدایت کی ضرورت ہوئی جو نظام نبوت و امامت کے قیام کی بنیاد ہے۔

اس طرح نوع انسانی کی ہدایت کا کام اس نوع کے ان افراد کے ذمے ہوا جن سے خلق خدا کی گمراہی کا اندیشہ نہ ہو جس کی دوسری تعبیر ضرورت عصمت ہے۔

اس ہدایت کے دو پہلو ہیں:- ایک ہدایت بصورت تبلیغ احکام قولی طور پر جس کے لئے اطاعت ضروری سہی۔ دوسرے عملی طور پر ان کے لئے نمونہ بننا جس سے اتباع کا تعلق ہے اور سنت عملیہ خالق کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ قول سے زیادہ عملی تربیت کا اہتمام ہے اس لئے کتابیں گنتی کی چند ہیں مگر پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بڑا رسول آتا تھا کتاب لے کر جو لفظی تعلیمات کا مجموعہ ہوتی ہے پھر کثیر التعداد انبیاء آتے تھے اس تعلیم کا نمونہ بن کر خلق خدا کو اس کے مطابق عمل پیرا بنانے کے لئے۔

اب یہ دیکھیے کہ نوع انسانی دو حصوں میں منقسم ہے، ایک مردوں کا طبقہ اور دوسرا عورتوں کا طبقہ۔ اگر اس طرف کے رہنما سب ایک ہی طبقہ سے متعلق ہوں، یعنی صنف رجال میں محدود ہوں تو طبقہ اناث کی عملی ہدایت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کے لئے کوئی معصوم نمونہ عمل موجود نہیں ہوگا اور حجت خدا

اس طبقہ پر تمام نہ ہوگا، حالانکہ مقصد نظام رسالت کے قیام کا اتمام حجت ہے لہٰذا دلائل عقلیہ و نقلیہ کی پشت پناہی میں یہ نظریہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہے کہ طبقۂ خواتین میں بھی ابتدائے دور تکلیف سے صاحب منصب معصوم رہنما افراد وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس منصب کا نام نبوت رسالت یا امامت نہو۔ خواہ وہ منصب بلانام ہو یا اس کا کوئی نام ہو جو ہمیں معلوم نہیں ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ دلیل قطعی سے منصب نبوت کے قوام ماہیت میں ذکوریت کی قید ثابت ہو جائے ورنہ یہ سمجھنے کی بھی کوئی قطعی بنیاد نہیں ہوگی کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو مبعوث ہوئے یہ سب لازماً ایک ہی صنف سے تھے جیسا کہ بعض اہل مذہب کا تصور ہے اور قطعیت کے ساتھ کہتے سنا گیا ہے کہ خداوند عالم نے کسی عورت کو کبھی نبوت عطا نہیں کی ہے۔ یہ شرف طبقہ رجال کے لئے مخصوص ہے۔ جبکہ حقیقتیں تابع الفاظ نہیں ہیں تو اس میں کوئی اہمیت بھی نہیں کہ وہ منصب نبوت ہی کے نام سے موسوم ہو لیکن بہرحال جو شرط نبوت ہے یعنی عصمت، وہ اس منصب کے لئے بھی فرضاً سمجھنا ناگزیر ہے۔

جبکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے جن کا طبقۂ رجال سے ہونا تقریباً مسلمات میں سے ہے، ہمیں معدودے چند کے سوا، نام معلوم نہیں ہیں تو اس مطالبہ کا مجھ سے کسی کو حق نہیں کہ میں ان خواتین کی کوئی جامع فہرست بتاؤں جو خالق کی طرف سے اس منصب پر مامور تھیں۔ ہاں، متفرق طور پر کچھ خواتین کے لئے قرآن مجید اور اخبار معصومین علیہم السلام سے شواہد ملتے ہیں جیسے ابوالبشر کے ساتھ اس صنف کی مخلوق اوّل جناب حوّا جن کے متعلق ترک اولیٰ والے آیات سے معصوم ہونے کا پتہ چلتا ہے اور جناب سارہ جن سے فرشتوں کا تخاطب اور سلام قرآن مجید میں ہے اور مادر حضرت موسیٰؑ جن کے لئے قرآن مجید میں متعدد جگہ پر جو تفصیل وحی کے الفاظ ہیں ان پر ہم نے "تفسیر قرآن" میں جابجا روشنی ڈالی ہے کہ انہیں صرف القائے ذہنی یا خواب پر محمول کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ ان سے خالق کے خطاب لفظی کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے علاوہ ولادت حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا یا ولادت امام حسین علیہ السلام کے موقع پر اور بعض دوسرے اوقات میں عورتوں کے ساتھ جن خواتین کے نام اخبار معصومینؑ میں وارد ہوئے ہیں ان میں کلثوم خواہر جناب موسیٰؑ کا نام بھی ملتا ہے اور حضرت مریم علیہا السلام اور آخر میں سیدۃ نساء العالمین حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ و سلامہ علیہا جن کی عصمت پر قرآن و حدیث کے ادلہ قطعیہ قائم ہیں۔

سردست اس موضوع پر یہ ایک مختصر تبصرہ ہے۔ اگر قرآن و حدیث کے تتبع سے شواہد و دلائل کے ساتھ قلم اٹھایا جائے تو اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف عالم شہود میں آسکتی ہے والسلام۔

بہائیت

سامراج کا خدمت گذار ادارہ

بین الاقوامی سامراج اپنی نوآبادیوں کی بقا اور اپنی زندگی کے لئے آزادی طلب قوموں سے طرح طرح کی لڑائیاں لڑتا ہے اور آزادی چاہنے والی قومیں بھی اپنے معاشرتی، عملی اور نفسیاتی وسائل کے سہارے استعماری قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ اس کا توڑ یہ ہے کہ حکمراں چاہتے ہیں کہ متصادم قوتوں کو متحد نہ ہونے دیا جائے۔ تاریخ وسیاست کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ طاقت ور، قابض اور مسلط شدہ استعماریوں کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے والی چیز قوموں کا اتحاد ہے۔ اسی لئے وہ اسے پارہ پارہ کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔

اجنبی حکمراں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی ہر جگہ اور ہر موڑ پر سامنے رہی، معاشرتی بندھنوں کو توڑنے، تاریخی روابط منقطع کرنے اور عوامی زنجیروں کی کڑیاں الگ الگ کرنے کی مہم جاری رکھی گئی، اس سلسلے میں سامراج نے اپنی قوت سے کام لیا اور اس راہ میں حائل رکاوٹوں کو ہٹا دیا ہے۔ حملوں کے وقت بڑی طاقتیں فقط جغرافیائی علاقے یا اقتصادی منڈیوں ہی کو نہیں تاکتے بلکہ ان کی تیز تلواروں کا پہلا نشانہ قوموں کی ثقافت اور مذہبی عقائد ہوتے ہیں۔ جو قوم کسی ثقافت اور اعتقاد میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہو، جس کے اخلاق پختہ ہوں وہ اپنے اسی پس منظر سے زندگی و توانائی حاصل کرتی ہے، وہ اسی فضا میں شخصیتوں کو ان کے جوش و خروش و کردار کو آگے بڑھاتی ہے، استعمار، قوم کو پس منظر سے جدا اور ان افکار سے خالی کرتا ہے کیونکہ جب تک کسی قوم کی ثقافتی صورت کو مسخ نہ کیا جائے، جب تک اس کے مضبوط رشتۂ اتصال اور مرکز اجتماع کو کمزور و متزلزل نہ کیا جائے اس وقت تک وہ اپنی جڑوں سے اپنے معاشرے کو اعتقادات و اخلاق کی رطوبت مہیا کرتی رہے گی اور زندگی میں تازگی برقرار رکھ سکے گی اور جب تک قوم میں پائداری اور زندگی رہتی ہے اس وقت تک تسلط و حاکمیت اور فرمانبرداری کا حصول مشکل رہتا ہے۔ استعمار کی تاریخ کا خلاصہ و تجربہ یہی ہے کہ اس کا پہلا نصب العین، ثقافتی اکائی اور اعتقادی وحدت کو نقصان پہنچانا، اس اکائی کو توڑنا اور معاشرے کی اعتقادی ہم آہنگی کو پارہ پارہ کرنا اوّلین قدم ہو۔ اس کے بعد وہ اپنی حکمران ثقافت اور استعماری تہذیب کو مسلط

کرنے کی راہ ہموار کرکے محکوم قوم کی تاریخ، ثقافت، تمدن اور فن و ہنر کو مٹا دیتا ہے۔ بلا خوف تردید، انسانی اقدار کے عین مطابق، حقیقی اور سب سے بڑا انقلابی معاشرہ اسلامی معاشرہ ہے کیونکہ اسلام کی حیات آفرین تکنیک اس کی خالق ہے۔ اب سے چودہ سو سال قبل مکہ میں رونما ہونے والی ثقافت پہلے دن سے آج تک استبداد اور سامراج سے برسرپیکار ہے، پرستاران اسلام اللہ پر توکل، دینی تعلیمات اور مستحکم ضوابط کی بنیاد پر ہمہ جہت کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہر جگہ اسلامی معاشرہ وجود میں آئے اور ایمان، اجتماعی انصاف، آزادی و ترقی کا راج ہو۔ استعمار اور آمریت کا خاتمہ ہو۔ اخیری دو صدیوں میں بین الاقوامی سامراج نے ایک نیا لبادہ اوڑھا وہ افریقہ، ایشیا اور امریکہ کے ممالک پر قابض ہوا، اس وقت ان سے مردانہ وار و استوار مقابلہ کرنے والے لوگ مسلمان ہی تھے، جب یہ سیلاب رواں چلا تو صحیح آئیڈیالوجی رکھنے والے علما، مسلمانوں کے صحیح دینی رہنما اور دبستان اسلام کے واقعی نمایندے آگے بڑھے اور ان طوفانوں اور سیلابوں کے سامنے بند باندھنے لگے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ترکیہ کا عثمانی اور ایران کا قاجاری خاندان (اسلامی جغرافیہ کی دو بڑی طاقتیں)، زوال کے نقطۂ آخر پر پہنچ گئی تھیں، ان کے بڑوں نے اسلامی حکومت کی شاہراہ چھوڑ دی تھی، انگریز اور روس مدتوں سے مسلمانوں کے زرخیز علاقوں پر قبضے کے منصوبے بنا رہے اور خیالی پلاؤ پکا رہے تھے ہر ایک کے دندان آز تیز تھے، مشرق وسطیٰ کے ممالک پر بالا دستی حاصل کرنے میں رسہ کشی تھی، ایران، ہندوستان اور روس کے درمیان خاص اہمیت کا حامل تھا، انگریز ایک سے بچنے اور ایک کو بچانے کے لئے اور روس گرم پانی میں آنے کی خاطر بے چین تھا، دونوں سامراج اپنی نئی تاریخ شروع کرنے کی فکر میں نئے نئے نقشے بنا رہے تھے دونوں کی اسٹریٹجی برسر کار تھی۔ ان کے مقابلے میں اسلامی ثقافت کی استواری اور ثروتمندی اور نظریاتی سرحدوں کے محافظ علما دونوں سامراجیوں کے مقابلے میں دیوار بنے کھڑے تھے دونوں دشمن چاہتے تھے کہ اس رکاوٹ کو اکھاڑ پھینکیں۔

فرقہ سازی اور جھوٹے مذاہب کی ایجاد، قوم کے ذہنوں میں پراگندگی پیدا کرنا حکومتوں کا شعار رہا ہے، استعمار کے یہ پرانے حربے ہیں، معاشرے میں تشنج اور عوام کے عقائد پر حملے لوگوں میں اختلاف پیدا کرتے ہیں اور نام و نمود چاہنے والے نئے فرقے سے وابستگی حاصل کرکے قوم کو نئی تنظیم کے نام سے دھوکہ دیتے ہیں اس طرح سامراج کا مقصد پورا ہو جاتا ہے سماج کا اعتقادی شیرازہ بکھرنا اس کی تمنا کا پورا ہونا ہے۔ چنانچہ ایران کے علماء کو معاشرے سے جدا کرنے، علماء کے کردار کو بے اثر بنانے اور وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے استعمار نے اس طرح کی تدبیر سوچی

بہائیت انہیں تدبیروں میں سے ایک تدبیر ہے۔ استعماریوں نے اس گروہ سے مقصد برآری کی۔ چونکہ یہ گروہ ایران میں پیدا ہوا ہے اس لیے انہیں پہچاننے کے واسطے تاریخ و ثقافت ایران کا جاننا ضروری ہے۔ یہ عمل ایرانی افراد کے لئے نسبتاً آسان ہے، وہ اس نومولود اور پروردۂ استعمار کو زیادہ بہتر طریقے سے جانتے پہچانتے ہیں۔ گھر کی بات گھر والے ہی جانتے ہیں۔

ادھر نئی بات یہ ہوئی کہ سامراجیوں نے گذشتہ دنوں سے ایک نئی مہم آغاز کی ہے اور وہ بہائیوں کی از سر نو اصلاح و تنظیم و تبلیغ کا کام ہے ان کی یہ مہم ایران سے باہر شروع ہوئی کہ وہاں کے لوگ اس گروہ سے ناواقف ہیں اور ان لوگوں نے چہروں پر آزادی طلبی جیسے نعروں کے نقاب ڈال لیے ہیں۔ سامراج اس پردے میں بیٹھ کر ایک اور غلامی کا جال پھینک رہا ہے۔

بہائیوں کے سامراجی پٹھو اور ان کے آلۂ کار سرکار ہونے کا معاملہ ایران میں تو سب پر عیاں ہے اور بچے بچے کی زبان پر ہے، البتہ ایران سے باہر ایشیاء، خصوصاً ایشیا سے دور رہنے والے لوگ ان بہائیوں کو اصلی روپ میں نہیں دیکھ سکتے، وہاں کے لوگ انہیں صلح و سعادت، روشن خیال و آزادی کے نقیب ہی سمجھیں گے۔ زیر نظر مقالہ اسی ضرورت کی بنا پر لکھا گیا ہے کہ ایک مقامی واقف حال ان کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اصلی خد و خال کو نمایاں کرے۔

بہائیت کی مختصر تاریخ

تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں ایک شخص علی محمد شیرازی کے نام سے پیدا ہوا، شیخیت[2] اور تصوف کے مبہم اور غیر واضح افکار و تعلیمات سے مرکب خیالات کی مہم شروع کر کے مہدی کا دعویدار بن بیٹھا۔ اس نے اپنے آپ کو واسطہ "باب امام زمانہ" کہلوانا شروع کیا۔ اس لئے اس کے ہمنوا لوگ "بابی" کہلائے گئے۔

علی محمد، علمی طور پر درمیانی درجے کا پڑھا لکھا آدمی تھا۔ عربی و فارسی ادب وغیرہ کا جو نصاب نجی طور پر رائج تھا اسی کا درمیانی درجہ طے کیا تھا[3]۔ طالب علمی کے زمانے میں نفسیاتی لحاظ سے غیر متوازن تھا اور جادوگری، رمل، چلہ کشی اور رمزیہ اوراد و وظائف، جن، بھوت رجال غیب، حاضرات پر عجیب قسم کے اعتقادات رکھتا تھا۔ مثلاً آفتاب مسخر کرنے کے لئے ایران کی جنوبی بندرگاہ بوشہر کی تیز دھوپ اور سخت گرم دوپہر میں چھت پر گھنٹوں جادو ٹونے پڑھتا اور عجیب و غریب حرکتیں کرتا تھا۔ بے چارے سادہ لوح عوام کو دعا، فال، رمل،

گنڈے تعویز کے ذریعے فریفتہ کرتا رہا ۶ شروع میں دعوےٰ کیا کہ نائب امام زمان ہے! پھر دو دن بعد امام زمانہ بن بیٹھا ۷ پھر نبوت اور دین جدید لانے کا اعلان کر دیا ۸ آخر میں تو یہ نوبت پہنچی کہ تقریر و تحریر میں خدائی کا دعویٰ کرنے سے بھی نہ رکتا تھا۔ ۹

شیراز میں اہل دانش نے علی محمد کو گھیرا تو بحث کے بعد موصوف نے مسجد جاکر عوام کے سامنے اپنے خودساختہ اعتقادات سے توبہ کی ۱۰۔ دوسری مرتبہ پھر اپنی مہم جاری کرنے کے بعد اہل تبریز نے پکڑا تو بہت رویا پیٹا اور ایک مرتبہ تحریری معافی نامہ بادشاہ کو لکھ کر بھیجا ۱۱۔ مگر علمائے تبریز نے توبہ کو قابل قبول جاننے سے انکار کر دیا، لیکن دیوانگی و خلل دماغ کی بنا پر حکم قتل سے معاف رکھا ۱۲ لیکن بابیوں کی ہنگامہ آرائی اور شورش پسندی سے مجبور ہو کر امیر کبیر صدر اعظم نے اس بنیاد پر قتل کا فرمان جاری کر دیا کہ جب تک باب زندہ ہے اس کے پیروکار ہنگامہ آرائی سے باز نہیں آئیں گے ۱۳

اصفہان کا حاکم، روسی الاصل، ارمنی منوچہر خان بڑا ظالم و سفاک آدمی تھا۔ اسے باب اور بابیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ تاریخ سفارت خانہ ہائے روس و انگلستان سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ منوچہر کو بابیوں سے دلچسپی تھی بلکہ وہ زبانی طور پر ان کی حمایت اور عملاً ان کا دفاع کرتا تھا ۔ ۱۵۔ اس نے حکم قتل کے بارے میں دخل بھی دیا، لیکن امیر کبیر نے اپنی رائے نہ بدلی اور حکم واپس نہ لیا ۱۶۔ قزوین، مازندران، یزد، تبریز اور زنجان میں بابیوں نے علی محمد کی رہائی کے لئے زبردست ہنگامے شروع کیے جن سے بہت زیادہ جانی و مالی نقصان کے علاوہ متعدد علاقوں میں بدنظمی پھیل گئی ۱۷۔ سفارت خانوں کے لئے یہ گڑبڑ خاص دلچسپی کا باعث بنی، جو ممالک اپنے استعماری پروگرام بنائے بیٹھے تھے، انھیں اپنے مقاصد حاصل کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ سفیر برطانیہ نے اپنی حکومت کو ایک نوٹ بھیجا:

> "اس واعظ (علی محمد شیرازی) کے اصول و عقائد کوئی نئی بات اپنے دامن میں نہیں رکھتے۔ اگر اس کے ماننے والوں کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جائے اور ان کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے تو یہ لوگ اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ البتہ یہ قید و بند ایسی چیز ہے کہ جس کے سہارے یہ مرنے سے بچ نکلیں گے"۔ ۱۸

بابیوں کے ہنگامے ایک بے بنیاد گروہ کو معاشرتی حیثیت دینے کا باعث ہوئے اور سادہ لوح، فرصت طلب افراد میں قوت حاصل کرنے کا راستہ بنے۔

علی محمد شیرازی کے پھانسی پانے کے بعد، مرزا یحییٰ نوری — صبح ازل — نے اپنی جانشینی کی دستخطی دستاویز پیش کر کے بابیوں کی رہبری و قیادت سنبھال لی۔ یحییٰ اپنے سوتیلے بھائیوں

کے ساتھ دو سال تک ایران کے مختلف علاقوں میں روپوش رہا، اس مدت میں تین بہائی، بادشاہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانے کے جرم میں اور کچھ لوگ دوسرے جرموں میں گرفتار و قتل کیے گئے۔ حکومت نے ان کی سرگرمیاں ختم کرنے کے لئے چن چن کر پھانسیاں دیں، خطرناک فضا دیکھی تو مرزا یحییٰ، درویشی حلیہ بدل کر بغداد نکل گیا اور مرزا حسین علی یحییٰ کا سوتیلا بھائی روسی سفارت خانے میں پناہ گزین ہوا، سفیر روس نے واضح حمایتی موقف اختیار کیا اور صدر اعظم ایران کو ایک خط دیا جس میں حسین علی کی جان و مال کی حفاظت کا مطالبہ درج تھا۔ لیکن حسین علی قید کیا گیا جس کے جواب میں حکومت روس نے حکومت ایران کو تنبیہی خط لکھا اور سفیر نے بڑی کوشش سے اسے آزاد کرالیا ۱۹۔ ایران کی کھلم کھلا بابی دشمنی اور روس کی کھلم کھلا حمایتِ باب و بابیہ کے بعد ان لوگوں کو ایران میں ٹھکانا نظر نہ آیا تو سفیر روس کی سعی و سفارش کے حسین علی کو بغداد بھیجنے کا فیصلہ ہوا، اس کے بعد بابیوں کی گرفتاری اور قتل کا عمل شروع ہو گیا، اسی عالم میں حسین علی کو روسی و ایرانی محافظین کے ساتھ ایران سے بغداد پہنچا دیا گیا۔ ۲۰

روس اور بہائیت سے متعلق یہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ عشق آباد شہر جنوب روس میں حکومت نے بابیوں کو عبادت گاہ بنانے کی اجازت دی تاکہ روسی مسلمانوں سے مقابلہ ہو سکے۔ عشق آباد میں بہائیوں کی جمعیت بنی اور حکومت نے ان کے مطبوعات اور تبلیغات کی حمایت کی ۲۱۔ جس کے جواب میں حسین علی نے زار روس کو ایک لوح بھیجی جس میں بادشاہ کی تعریف و خوشامد کے ساتھ اپنے خادمانہ جذباتِ خدمت و شکر گذاری کا اظہار تھا ۲۲۔

بغداد میں مقامی حکومت اور روس کی سعی و سفارش سے بابیوں کو عثمانی حکومت کا وفادار مان لیا گیا اس کے نتیجہ میں منصب قیادت پر آپس میں رسہ کشی، پھر جھگڑا، پھر قتل و خونریزی تک نوبت پہنچی ہر شخص کے پاس محمد علی کا دستخطی پروانہ اور ہر شخص دعویدار جانشینی تھا۔ فتنہ و فساد، چوری اور ڈاکہ بابیوں کا شعار بن چکا تھا لہذا لوگ بددل تھے۔ اس کے علاوہ مجاہد علما کی سربراہی میں مسلمان عوام بھی ان کے مقابلے میں صف آرا تھے ۲۳۔ حکومت ایران بھی مسلسل سرکاری و غیر سرکاری طور پر عثمانی حکومت سے احتجاج کر رہی تھی ۲۴۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابی بغداد سے استانبول اور چند ماہ بعد اَدِرْنَہ منتقل کر دیے گئے۔ مرزا حسین نے یہاں رسمی طور پر جانشینی باب کا دعویٰ کر کے اپنے سوتیلے بھائی مرزا یحییٰ سے ٹکر لی۔ اس کے بعد فریقین نے جعلی دستاویزات، فریب کارانہ دھوکا دھڑی سے گروپ بنا لیے۔ باہمی اختلافات بڑے عروج پکڑ گئے۔ حسین علی اور یحییٰ نے اپنے طور پر کسی نہ کسی مخالف ترکیہ سفارت خانے سے وابستہ ہو کر اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لی

مگر یہ بات حکومت کو ناگوار گذری اور فیصلہ کیا کہ پیروان مرزا یحیی کو قبرص اور مرزا حسین علی کو مع ساتھیوں کے (فلسطین)، عکا میں جلا وطن کر دیا جائے ۲۵۔

یحیی کے طرف دار، بیرونی امداد کے منقطع ہونے کے بعد آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑنے لگے اور حسین علی جو بہاء اللہ کے لقب سے ملقب ہو کر علی محمد کو اپنا مبشر بتا کر خود نئے مذہب کا نیا سربراہ بن بیٹھا۔ حسین علی نے باب کی طرح قدم بڑھائے۔ پہلی بات یہ کہی کہ علی محمد تمہید تھے اصل وہی ہے، باب ہماری آمد سے مطلع کرتے، ہمارے ظہور کی خبر دینے آئے تھے، اب بابیت کا دور ختم ہوا اور بہائیت کا آغاز ہے۔ اس نے پیغمبری کا دعوی کیا ۲۶۔ اس کے بعد خدائی کا دعوی بھی کیا ۲۷۔ لیکن عکا کی فضا سازگار نہ دیکھ کر خود کو مسلمان بھی کہتا رہا ۲۸۔ بیس سال سے زیادہ عرصے تک اس نے فضا ہموار کرنے اور بابیوں میں اثر و اقتدار جمانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اور کام بھی کیے۔ خاص بات یہ ہے کہ حکومت روس یہاں بھی اس کی مکمل حمایت کرتی رہی اور ماہانہ تنخواہ یا وظیفہ بھی دیتی رہی ۲۹۔ حکومت عثمانیہ اس فرقہ پر مسلسل نظر جمائے تھی اور لگاتار اس کا دباؤ جاری تھا۔ اس لیے بہائیوں نے ایک مرتبہ پھر ایران کی طرف رجوع کی اور واپسی کی تدبیر سوچی شاہ ایران کو خود حسین علی نے معافی اور ایران واپسی کی درخواست لکھی ۳۰۔ لیکن حکومت نے کوئی نوٹس نہ لیا، اب عکا کے بہائی پوری طرح حکومت ترکیہ سے امداد و وابستگی پر نظر جما بیٹھے اور دربار سلطان عثمانی سے بمنت سماجت طلب گار رضا ہوئے۔

حسین علی بہا کے مرنے پر اس کا بیٹا مرزا عباس، یعنی عباس آفندی بہائیوں کا لیڈر بنا اور اس نے عبد البہا کے نام سے اپنی شہرت چاہی۔ عباس آفندی بھی بادشاہ ترکیہ کو خوش کرنے کے لئے ہر قسم کی خوشامد کرتا اور مسلمان ہونے کا دم بھرتا رہا ۳۱۔ اس نے علانیہ عثمانی حکومت کی حمایت جاری رکھی ۳۲۔

روس میں کیمونسٹ انقلاب برپا ہونے سے حالات بدل گئے۔ نئی حکومت نے بہائیوں کو زار روس کا دوست قرار دیا اور اپنے اخراجات کی زیادتی کی بنا پر مالی امداد میں بے حد کمی کر دی۔ عبد البہا نے برطانیہ کے ساتھ تعلقات کو از سر نو بحال کرنے اور حکومت عثمانیہ کے خلاف کام کرنے کی ٹھانی اور جاسوسی کرنے لگا ۳۳۔ جنگ عظیم اول اور فلسطین میں انگریزی فوج کے داخل ہوتے وقت عبد البہا کی رہبری میں بہائیوں نے انگریزوں کی مدد کی۔ حکومت ترکی نے عباس آفندی کی زیر زمین سرگرمیوں سے باخبر ہوتے ہی اقدامات تجویز کیے، فلسطین کے کمانڈر انچیف نے جاسوسی کے الزام میں قتل کا فیصلہ کیا ۳۴۔ لیکن برطانیہ کی انٹلی جنس سروس نے تیزی دکھائی اس کی اطلاع پر لارڈ بالفر

وزیر خارجہ برطانیہ نے جنرل ایلن بی کو فلسطین تار دیا جس میں عبدالبہا کی جان بچانے اور بہائیوں کی حفاظت کا حکم تھا ۳۵۔

برطانیہ کی طرف سے اعتراف خدمت

عبدالبہا کی جاسوسانہ خدمات کے صلے میں جنگ ختم ہونے کے بعد گورنمنٹ برطانیہ نے ایک شاندار اجتماع میں "نائٹ ہڈ" کا اعزازی میڈل اور سر کے خطاب سے نوازا ۳۶۔ اس کے جواب میں عبدالبہا نے حکومت برطانیہ کی خوشامد و وفاداری و مدح گستری میں ایک لوح جاری کی ۳۷۔

عبدالبہا کی موت پر برطانوی سفارت خانوں اور کونسل خانوں نے بہائیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور سرکاری طور پر تار اور خط بھیجے، سرونسٹن چرچل وزیر نوآبادیات نے جنرل ایلن بی کو حکم دیا کہ شہنشاہ برطانیہ کی طرف سے بہائیوں کو تعزیت پیش کرے۔ سر ہربرٹ سموئیل برطانوی چیف کمشنر اور سر ڈونالڈ ہربرٹ، مشرق وسطی کے پولیٹیکل ایجنٹ اور دوسرے بڑے بڑے عہدیداران کو عبدالبہا کے جنازے میں شرکت کا حکم دیا گیا ۳۸۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہربرٹ سموئیل ہی وہ شخص ہے جس نے اسرائیلی حکومت قائم کی۔

عبدالبہا کے بعد اس کا نواسہ، جنسی کج روی کا شکار شوقی آفندی ,۳۹، وصیت کے مطابق بہائیوں کا رہنما بنا اور اب یہ نظام برطانیہ کے استعمار کا ایک سیاسی و خطرناک ادارہ ہے ۴۰۔

شوقی نے لندن میں تعلیم حاصل کی ,۴۱، اور انگریزوں کے ہدایات کے مطابق "محفل بہائیان انگلستان" کی بنیاد رکھی۔ پورے انگلستان، اسکاٹ لینڈ، ویلز، شمالی و جنوبی آئرلینڈ میں انجمن کا جال پھیلایا۔

یوگنڈا پر انگریزی تسلط کا دور بہائیوں کے لئے مفید رہا۔ ان لوگوں نے جاسوسی ادارے کے ذریعے کمپالا میں ایک عبادت خانہ بنایا ,۴۲،۔ شوقی آفندی نے استعماریوں سے تعلقات بڑھائے۔ امریکہ اور دوسری دنیا میں "محافل" کی تاسیس شروع کردی۔ حقیقت یہ ہے کہ فری میسن اداروں نے نیچے آکر بہائیت کا روپ دھار لیا ہے۔ دنیا کے انٹلی جینس اداروں، خصوصاً سی آئی اے نے اپنے شرارت پسندانہ منصوبوں میں بہائیوں سے مدد لی ہے۔

شوقی آفندی کا کوئی لڑکا نہ تھا، اس لئے نو افراد پر مشتمل ایک کونسل تشکیل دی جسے "بیت العدل" کہا گیا، یہ کونسل اور ارکان شورای دنیا بھر کے بہائیوں کے معاملات کے لئے اساسی ارکان تھے۔ شوقی آفندی کی موت کے بعد اس کی وصیت کے مطابق چارلس میسن ریمی کو

صدر بیت العدل نامزد کیا گیا (۲۴)۔ چارلس، سی آئی اے کا امریکی نمائندہ تھا، اس کی سربراہی پر بہائیوں نے اعتراض کیا، خصوصاً برطانیہ نواز گروپ نے اچھی خاصی مخالفت کی۔ اب بہائیوں میں دائیں بائیں بازو اور رنگارنگ فرقے ابھر چکے تھے (۲۵) اور آج کل بہائیت سامراجیوں کا آلہ کار ہے وہ مونخواران جہاں کے بین الاقوامی اقتدار کا خواب دیکھ رہی ہے۔

سامراجی طاقتوں سے بہائیوں کے روابط

۱۔ بہائیت اور روس

بہائیت کے نقطہ آغاز ہی سے روسی حکومت خفیہ اور علانیہ طور پر اس گروپ کی حمایت کرتی رہی، وہ جنوبی گرم پانی تک پہنچنے کے لئے پطرز کبیر کی آرزو پوری کرنے کی خاطر جو توسیع طلب منصوبے بناتی تھی ان میں ایرانی حکومت سے مقابلہ بھی داخل ہوتا تھا، بہائی تحریک کی حمایت اس سلسلے کی ایک کڑی تھی حسین علی کا روسی سفارت خانے میں پناہ لینا، بابیوں کے معاملات میں حکومت روس کی مداخلت، حسین علی کی جان کا تحفظ اور عراق پہنچانے کی نگرانی، ماہوار تنخواہ کا تقرر، زار حکومت کی دعا اور حمایت میں الواح کا لکھنا اور دعاؤں کا بھیجنا، ایسے حقائق ہیں جن کا بے چون وچرا آج بھی بہائی اعتراف کرتے ہیں۔

۲۔ بہائیت اور عثمانی حکمراں

عثمانی شہنشاہیت، خلافت اسلامی کی مدعی اور مسلمان آبادی کے طویل وعریض علاقے پر حکمران تھی، سیاسی اور فرقہ وارانہ اختلاف کے علاوہ سامراجیوں کی سازش کے ہاتھوں اس کے ایران سے تعلقات کشیدہ، معاملات پیچیدہ اور جنگ جیسے حالات رہتے تھے۔ ہر ممکن ملے ایران پر چوٹ لگانے اور فائدہ اٹھانے سے غافل نہ ہوتی تھی۔ اسی نکتے کے پیش نظر حکومت عثمانی نے بابیوں کو اپنے دامن میں پناہ دینا قرین مصلحت سمجھا، بابی گروپ کو حکومت ایران کے خلاف استعمال کرنے کا امکان ہونے کے ساتھ ساتھ یہ نقصان رسانی کا فائدہ بھی تھا کہ مسلمانان ایران کے مذہبی قلعے میں شگاف پیدا ہو۔ چنانچہ والی بغداد نے بابیوں کے لئے شہریت حاصل کی اور جس قدر مدد کر سکتا تھا مدد کی۔ جواب میں حسین علی نے تائید و دعا حکومت کے بارے میں لوح لکھی۔

۲۔ بہائیت اور انگریز

عثمانی حکومت بابیوں کو پناہ دے کر کچھ افراد کے ہاتھوں چند مشکلات سے دوچار ہوگئی، سب سے بڑی بات ان لوگوں کا مخالف حکومتوں کی سفارتوں سے وابستگی تھی ترکیہ حکومت نے خطرہ محسوس کرتے ہی بابیوں کی حمایت چھوڑ دی اور بشر انقلاب میں آئے ہوئے روس نے تعلقات توڑ لیے۔ دوسری طرف قدیم ترین برطانوی سامراج اپنے استعماری ذرائع مثلاً جاسوسوں اور سفیروں کے ذریعے بابیوں کے مسئلہ کو بڑی اہمیت و نزاکت کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور موقع بموقع حمایت و کمک بھی جاری تھی۔ انگریز تاک میں تھے کہ موقع ملتے ہی جال پھینکیں روس اور حکومت عثمانیہ کی دست کشی کے بعد میدان خالی ہوگیا، ادھر بابی بھی کسی طاقتور پناہ گاہ کی تلاش میں تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی، دونوں نے پرانے مراسم بڑھانا شروع کیے اور بہائی برطانوی سرکار میں مقرب بن گئے اور فری مشنری اور بین الاقوامی سامراجیت کے مرکزی کردار کا قلادہ گلے میں ڈال کر فسلطین میں مطلوبہ خدمات کے لئے آگے بڑھے۔ برطانیہ نے اس کے صلے میں "سر" کا خطاب دیا، حکومت برطانیہ نے وزارت نوآبادیات اور شعبۂ مذہبی امور کے مقاصد و مفادات کے مطابق اس سے کام لیا اور بہائیوں نے انگریزوں کے تسلط یا نیم تسلط یافتہ علاقوں میں وزارت خارجہ، جاسوسی ادارے اور استعماری مقاصد کی پیشرفت میں مدد کی۔ خصوصاً براعظم افریقہ میں توان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر خدمات انجام دیں اور دل کھول کر فائدے اٹھائے، برطانیہ کا گرگ باراں دیدہ، ستم رسیدہ، مظلوم و محکوم عوام کی بیداری و آزادی کی تحریک اور اتحاد، خصوصاً اسلام کی طرف افریقہ والوں کے جھکاؤ کو خطرہ کی علامت سمجھ رہا تھا، اس طوفان کی تیزی روکنے کے لئے "بہائیت" اسلامی فرقہ کے نام سے بہت کارآمد تھی۔ اس تعلق کے ثبوت میں "محفل بہائیان" کی مرکزی اور ذیلی تنظیموں کا برطانوی ممالک میں قیام کے علاوہ، بہائیوں اور ان کے رہنماؤں کے وہ جذبات ہیں جو انہوں نے درندہ صفت برطانوی افراد حکومت یا حکومت کے لئے لکھے ہیں۔

بہائیت اور صیہونیت

پہلی جنگ عظیم کے افسوسناک ترین نتائج میں وہ معاہدہ ہے جو وزیر خارجۂ برطانیہ لارڈ بالفور اور یہودی سرمایہ دار" لارڈ ریچلڈ" میں ہوا، جس کی بنیاد پر فلسطین میں یہودیوں کی ازسرنوآبادکاری اور قومی کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ فلسطین کی مقدس سرزمین پر یہودیوں کی آبادکاری بوڑھے

سامراج برطانیہ کے چہرے پر بدنما داغ ہے اور امریکہ کے جرائم میں اس جرم عظیم نے اسے اور رسوا کیا ہے۔ فلسطین پر کنٹرول سنبھالنے کے بعد برطانیہ نے مشرق وسطی میں اپنے قدم مضبوط رکھنے اور مسلمان علاقوں پر اقتدار جمانے کا خواب دیکھا، ادھر مسلمانوں میں بیداری و آزادی کی لہر اٹھ رہی تھی اور مشرق وسطی میں سامراجی مفادات کو خطروں کا سامنا دکھائی دیا۔ اس نے سوچا کہ منطقے میں ایک چوکی رکھنا ضروری ہے۔ سر ہربرٹ سموئیل، یہودی سرمایہ دار ڈیپلومیٹ کو اس کام کے واسطے چنا، یہ پولیٹکل ایجنٹ یا کمشنر یہودیوں کی فلسطین واپسی کا پروگرام بنانے کے لئے آیا تھا، بہائیوں کا دوست اور مددگار آدمی تھا جس نے عبدالبہا کے جنازے میں شرکت بھی کی تھی۔

فلسطین پر انگریزی تسلط کے سلسلے میں بہائی شانہ بشانہ مددگار تھے، صیہونیوں سے تعاون اور طرح طرح کے معاملات میں ان کے قدم بقدم چل رہے تھے۔ چنانچہ ریاست یہود کے قیام کے بعد بہائی فلسطین میں حصہ داری کا دعوی کرنے اور اسے ارض مقدس کہنے لگے۔ فلسطین میں انہوں نے اپنے بڑوں کو دفن کیا اور مسلمانوں کی دشمنی کا مورچہ لگایا۔ بہائیوں نے فلسطین میں صیہونی حکومت کے قیام کا خیر مقدم کیا۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کے مسئلے کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیشن بھیجا تھا بہائیوں نے اس کمیشن کو مطالبۂ یہود کی حمایت میں ایک یادداشت لکھی ۴۵۔ اسرائیل کی غاصب حکومت کے قیام و استحکام کے لیے دل وجان سے کوشاں ہیں، وہ بڑی ڈھٹائی سے ایک قوم کے حقوق کی پامالی اور سامراج کے پھیلاؤ کو خدائی عہد کی تکمیل کا نام دیتے ہیں ۴۶۔ اس خدمت وخلوص کے جواب میں حکومت اسرائیل نے سرکاری طور پر ان کے گروہی افکار کو قانونی دین تسلیم کیا ہے ۴۷ اور بہائیوں نے پوری آزادی اور سہولتوں کے ساتھ عکا میں عالمی بہائی مرکز قائم کر لیا جسے صیہونی حکومت امداد بھی دیتی ہے۔ عکا ہی پر کیا منحصر، امریکہ میں بھی ان کا مرکز صیہونی امداد سے بنا اور وہ مرکز خونخوار سامراج کے مفادات کی تکمیل و توسیع میں سرگرم عمل ہے۔ بہائیوں کی جاسوسی اور نقصان دہ سرگرمیاں (صیہونزم کی ترقی اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ) بڑھتے بڑھتے عربستان تک پھیل گئیں اور اسرائیل عرب جنگ میں ان کا کردار سب نے دیکھ لیا۔ ۴۸۔

ایران میں بہائیت اور صیہونزم قبل از انقلاب اسلامی

پہلوی دور میں ایران، مشرق وسطی کا ایک سرحدی قلعہ تھا اور استعماریوں کے مفادات کی نگہبانی اس کے ذمے تھی۔ اس لیے بہائی اور صیہونی شاہ کے ساتھ تھے اور بہائیوں نے خائن محمد رضا پہلوی کو رشوت اور پارٹی بازی کی بنیاد پر حامی بنا کر حکومت میں دست رس حاصل کر لی

پھر آہستہ آہستہ ذمہ دار اور کلیدی اسامیوں پر قبضہ کر کے رکن سلطنت پہلوی بن بیٹھے تھے ، صیہونی رژیم ہویدا کے پندرہ برسوں میں ان کے متعدد افراد وزیر و نمایندگان مجلس ہوئے ان لوگوں نے کار خانے بنائے ، بینک کاری اور صنعتی سرمایہ کاری و سرمایہ داری کے مالک ہوئے ۴۸ اس عہد کے متعدد سیاسی لیڈر بہائی تھے ، مثلاً ، ہژبر یزدانی (مشہور سرمایہ دار)، منوچہر تسلیمی (ہویدا کابینہ میں وزیر تجارت) ، بریگیڈیر مقربی ، جنرل علائی ، پروفیسر عکیم اور شاہی خصوصی ڈاکٹر ایادی .... کے نام مشہور ہیں ۔ بلامبالغہ ، مجرم شاہ کے دور میں فری میشنز کے بعد جس گروپ نے سیاست و اقتصادیات ایران میں مرکزیت حاصل کر رکھی تھی وہ بہائی تھے اور پنتیس سالہ دور حکومت پہلوی کے ظلم و ستم ، بدبختی ، قتل اور کشتن کا کام ان بہائیوں کے کاندھوں پر رہا جو اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کے داعی تھے ۔

بہائیت اور امریکہ

جنگ عظیم دوم کے بعد ، نوجوان استعماری قوت امریکہ ، دراصل برطانوی سامراج اور صیہونزم کا مرکب بنی ۔ گرگ باراں دیدۂ برطانیہ نے بہت سے مقامات پر کمزور قوموں کو ہضم کرنے تکے نسخے جس بین الاقوامی صیہونزم کو دیے وہ ان کا نیا اور تازہ دم جوان شاگرد ہے اور خونخواری عالم کا ٹھیکہ آج کل اسی کو دے رکھا ہے ۔ اس وقت مرکز قوت ہونے کے دعویدار دو ہیں امریکہ اور اسرائیل ۔ دنیا بھر کا سرمایہ امریکہ اور امریکہ (نیز دوسری دنیا) کا سرمایہ یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور یہی لوگ فری مشنری اداروں کے راس و رئیس ہیں ۔ بین الاقوامی سامراج کا سمبل امریکہ ہے ۔ جفاکش محرومین عالم کے خلاف اقدامات کے منصوبے امریکہ سے آتے ہیں اور انہیں بروے کار لانے میں اسرائیل پیش پیش ہیں اور یہ بات شک و شبہے سے بالا ہے کہ بہائیوں نے بھی امپیرلزم سے ارادت مندی کے اظہار میں کوئی لمحہ ضایع نہیں ہونے دیا اس ارادت و خدمت گذاری کا وہ اظہار بھی کر چکے ہیں ۴۹ ۔

خود صدر امریکہ ریگن نے بھی رسمی و قانونی طور پر ایک بیان میں بہائیوں کی حمایت کرتے ہوئے ایران میں بہائیوں کی حالت پر مگر مچھ کے آنسو بہائے اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے (۴۹ مکرر) اور رہبر کبیر انقلاب اسلامی ایران حضرت امام خمینی مدظلہ نے ۲۸ مئی ۱۹۸۳ء کے ایک بیان میں فرمایا :

"اگر ما دلیلی نداشتیم بر اینکه بہائیہا جاسوس امریکا ہستند، جز طرفداری ریگان از آنہا کافی بود۔"

"بہائیوں کے امریکی جاسوس ہونے پر اگر ہمارے پاس کوئی دلیل نہ ہوتی تو بھی ریگن (صدر امریکہ) کی حمایت بہائیاں ہمارے لئے مکمل دلیل تھی۔"

یہ حقائق ثابت کرتے ہیں کہ بہائیت استعمار کا آلہ کار، امریکہ کی تجربہ کار سیاہ اور سامراجیوں کا ایجنٹ ادارہ ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں سامراج سے مقابلہ کیا جا رہا ہے وہاں وہاں بہائیت سے نپٹنا ضروری ہے۔

چند اہم نکات

بہائیت کے کارکنِ استعمار ہونے سے قطع نظر، بہائی عقائد کی تشہیر بذات خود سامراج کے لئے مفید ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے باطل و غلط عقائد کسی معاشرے میں پھیلا دے تو سامراجیوں کے لئے اپنی ثقافت مسلط کرنا آسان ہو جاتی ہے، کیونکہ فضا بنی بنائی ملتی ہے، لہٰذا وہ قانونی اور رسمی طور پر آزادی یعنی مادر پدر آزادی کو لوگوں کی گردن پر مسلط کرنا آسان سمجھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں استعمار، جدید ترین اسلحہ سے مسلح اور اعلیٰ درجے کے ساز و سامان سے لیس ہو کر نکلا، نیوکالونی ازم (نئی ذیلی ریاستی سیاست) کو معلوم ہے کہ دینی عقائد معاشرے کی تشکیل و استحکام میں بڑے دور رس اثرات رکھتے ہیں۔ زندگانی بشر سے مذہبی عقائد کی جدائی ممکن نہیں۔ اسی بنا پر سامراجی اس فکر میں رہتے ہیں کہ مذہبی اعتقادات کی نئی تعبیر و تاویل و تشہیر کے بنیادی اصول عقائد کی جڑیں ہلائیں پھر معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے اثرات کو بے نتیجہ کر دیں۔ خصوصاً اسلامی فکر، اسلامی عقائد اور اسلامک آئیڈیالوجی مستضعفین عالم میں قوت مقاومت و آزادی کوشہ دیتی اور ظلم و ستم سے ٹکر لینے کی جرأت پیدا کرتی ہے۔ سامراجیوں کے خیال میں اس کا توڑ فرقہ سازی اور عقائد میں مسخ و تحریف کا عمل ہے، جس سے انقلابی شخصیتوں کے ابھرنے کی صلاحیت ختم ہو سکتی ہے۔

اعتقادات کا مسخ و انحراف

مہدویت یا ایک نجات دہندۂ بشریت کا اعتقاد، یعنی خدا کی طرف سے ایک طاقت ور مصلح

کی آمد ہوگی، خدا کی امداد و قوت سے کمزور اور محروم انسانوں کو انصاف مہیا کیا جائے گا اور عالمی عادلانہ حکومت قائم ہو گی۔ یہ عقیدہ آسمان سے وابستہ تمام ادیان و مذاہب میں موجود ہے بہ مزور ہے کہ اسلام میں یہ عقیدہ گہرائی، معقولیت اور زور کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ عدل پرور نجات دہندۂ بشر کے فلسفے نے محروم اور کمزور عوام کو ہمیشہ ظلم سے ٹکر لینے پر ابھارا اور کامیابی کی امیدوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ اسی زاویہ سے مذہب پر حملہ بھی کیا جاتا ہے، سرمایہ دار زور آور، فریب کار اس عقیدہ کا مذاق اڑاتے اور نفی کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ استعماریوں کے مقابل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ شیطانی فتنہ پرور گروہ شگوفہ چھوڑنے اور تحریف و تغیر کے ذریعے اس عقیدے کو ضعف پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ایک شخص مہدی موعود بن بیٹھے تو کوئی تکسیر نہیں پھوٹے گی، ظالم اپنی جگہ مستحکم بیٹھا رہے گا، بلکہ مہدی صاحب بجائے ان سے ٹکر لینے کے ان کی تائید فرماتے، دعائیں دیتے امداد دریغ نہ رکھتے۔ اس کے نتیجے میں کمزور عوام عقیدے سے بددل ہوتے، ان کی آس، یاس سے بدل جاتی، مقابلے کی طاقت سلب ہوجاتی، ثابت قدمی میں کمزوری اور استعمار کو قوت ملتی ہے۔ مہدی سازی کی یہ چال استعمار کے لئے مفید ثابت ہوئی، انیسویں بیسویں صدی کے درمیان مہدیوں کا ایک وقت ظہور شروع ہوگیا، مگر انگریزی نوآبادیات میں وہ بھی سونے کی چڑیا ہندوستان یا اس کے ارد گرد راہ پاٹ میں اور شمالی افریقہ میں بھی، ان مدعیانِ مہدویت کے پرستاروں میں بہائی مشہور ترین و مضبوط ترین گروہ ہے۔ اسی وجہ سے فرقہ بہائی اپنے جھوٹے اور بے دلیل دعوے کے علاوہ کمزور اور زیردست اقوام کے لئے خطرناک ترین گروہ ہے، یہ گروپ استعمار کے لئے راہ ہموار کرنے اور لشکر سامراج کے لئے مورچے بنانے کا کام کر رہا ہے۔

بہائی تعلیمات میں تضادات سے ان کے مذہب پر یقین کو ضعف پہنچتا ہے اور انسان شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حسین علی بہا، ایک جگہ امام زمانہ بنتا ہے، دوسرے دن پیغمبر آخرالزمان و داعیِ دینِ جدید ہونے کا مدعی ہے، تیسرے دن خدائی کا اعلان کرتا ہے۔ اس کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ آدمی بھروسہ کھو بیٹھے اور معاشرے میں یہ تأثر پھیلے کہ مذہب بے بنیاد چیز ہے، جب مذہب میں تضادات ہی تضادات ہیں تو اس سے بہتر ہے کہ آدمی بے دین رہے۔
ایک اور شعبدہ بازی، لفظوں سے کھیل اور حروف ابجد کا تماشا ہے۔ عجیب عجیب عبارتیں اور نئی نئی اشارتیں ہیں، روشن خیال اور پڑھے لکھے لوگ اس سے بھی بدظن ہوتے اور سادہ لوح جاہل اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔

بہائی کتابوں میں اس قسم کے مہملات و تضادات جب مکمل کر سب کے سامنے آئے تو ان کے سربراہوں نے تمام کتابیں اور تحریریں سمیٹ کر چھپا دیں اور آج انہیں خاص الخاص محرمانِ راز اور محافل بہائیت کی مذہبی شخصیتوں کے علاوہ کسی کی رسائی ان کتابوں تک ممکن نہیں ہے۔ اس احتیاط کے باوجود اربابِ تحقیق، کتابخانۂ مجلس شورای اسلامی ایران (تہران)، مصر، لندن، پیرس، ماسکو، لاہور وغیرہ کے کتب خانوں میں کچھ نہ کچھ مطبوعہ اور قلمی کتابیں تلاش کر لیتے ہیں۔

بہائیت نے شروع میں تضادات کا پرچار اس لئے کیا کہ بے معنی و کمزور عقائد کے بعد اعتقادی حس بے جان کر کے، چند نام نہاد نعرے اپنائے۔ تعصب دشمنی، درگذر اور اعتقادات میں عدم مداخلت جیسی باتوں کی تبلیغ شروع کر دی۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ گروپ نہ اعتقادات کا حامل ہے، نہ مذہبی گہرائی و گیرائی رکھتا ہے۔ نہ انسانی اقدار کا احترام کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے کبھی سامراجی کلچر اور استعماری تہذیب و افکار کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔

اخلاق سے جنگ

یہ کلیہ ہے کہ جہاں بھی سامراج قدم رکھتا ہے وہاں سے اخلاق اور باہمی احترامات کو نکال باہر کرتا ہے۔ اس سے محکوم قوم میں مقابلہ کی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جس قوم میں اخلاقی اقدار ہوں، تقویٰ، پاکدامنی، صداقت، شرافت، غیرت و حمیت جیسے جذبات ہوں تو اس کیلئے کسی نااہل کے سامنے جھکنا مشکل ہوتا ہے اور کوئی استعمار آسانی سے اس پر مسلط نہیں ہو سکتا۔

بے حیائی، شراب نوشی، بے غیرتی عوام میں پھیلے گی تو اخلاقی کھنڈروں سے اخلاقی شخصیتیں گرفتار ہو کر شکنجہ میں لائی جا سکیں گی۔ سامراج کی ماتحت قوموں پر ایک نظر ڈالیے تو آپ پر یہ حقیقت عیاں ہو گی کہ دنیا کے غریب عوام زور و زر کی کن بھٹیوں میں جلائے جا رہے ہیں۔ نائٹ کلب، میخانے، ناچ گھر اور رقص و موسیقی کے جشن اور تقریبات کے اجتماع اور ان میں پاگل بنا دینے والے پروگرام، جادوگرانہ رقص، کلچر، ہنر اور عوامی یا لوک سماج کے نام سے عیاشی و اوباشی کی جو ترویج کی جاتی ہے، معاشرے میں جو سرطان پھوٹتے ہیں، وہ استعمار کی پہلی دین ہوتی ہے۔ مسجدیں اور عبادت خانے بند، عوام کا مقدس مقامات سے قطع تعلق، مطالعے میں کمی اور عوام کے اطلاعات میں انحطاط، اخلاقی اور ذہنی استواری کے عوامل کا فقدان سامراجی تہذیبی فتوحات کا پہلا ثمرہ ہوتا ہے۔

تمدن جدید، یعنی مغرب کے عہد بربریت و وحشت اخلاقی کو بہائیت بطور تحفہ و سوغات کے عام کرنے میں پیش پیش ہے۔ وہ انسانیت کے اعلی اخلاقی اقدار اور احساسات سے جنگ کر رہی ہے۔ برہنگی، بے پردگی اور عورتوں کی سامراجی آزادی کی تائید و تبلیغ کرتی ہے۔[۵۰] اس کا اعلان ہے کہ اگر میاں بیوی صاحب اولاد نہیں تو وہ دوسرے مرد یا دوسری عورت سے مدد لے کر تولید مثل کر سکتے ہیں۔ [۵۱]

ان کی شریعت میں استمنا مباح ہے [۵۲]۔ فطری، نفسیاتی اور دستوری پردۂ محرم و نامحرم بھی اٹھا دیا گیا، اب سوائے باپ بیٹی کے باہمی ازدواج کے، سب کچھ جائز ہے[۵۳] زنا کا جرمانہ نو مثقال۔ شادی شدہ عورت ہو یا غیر شادی شدہ عورت کا کوئی فرق نہیں ہے[۵۴] ظاہر ہے کہ اس طرح اوباشی کو پوری چھوٹ دی گئی ہے۔

عوامی سیاست کا مقابلہ

بہائی، سیاسی گروہ اور سامراجی مہرۂ شطرنج سیاست ہونے کے باوجود پہلے دن سے اپنے پیروکاروں سے کہتے اور دنیا میں پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں کہ بہائیت کے ماننے والے سیاست سے دور رہیں۔ سیاست ممنوع ہے۔ اس سلسلے میں عباس آفندی کا مشہور جملہ بہائیوں کا قومی شعار سمجھا جاتا ہے۔ عباس آفندی نے کہا:

> "بہائی ہونے نہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ جو شخص سیاسی معاملات میں دخل دیتا اور اپنے فرائض سے زیادہ بات کرتا یا قدم اٹھاتا ہے تو یہی مکمل دلیل ہے کہ وہ بہائی نہیں ہے" [۵۵]

یہی شخص ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

> "عوام پر حکمران حکام و حکومت پر اعتراض کرنے کا کسی بہائی کو حق نہیں ہے، ان کے معاملات میں دخل نہ دیں، ان کو ان کے اختیارات و حکومت پر چھوڑ کر دلوں پر نظر رکھیں" [۵۶]

ان افکار و عقائد کا پروپیگنڈا کر کے دراصل ارباب استعمار کی خدمت گزاری کا فریضہ ادا کیا گیا ہے اور اپنے حلقہ بگوش کو سیاسی پلیٹ فارم سے ہٹا کر ان کے معاشرے کو اپنا پابند و غلام بنایا ہے۔ سیاسی لیڈروں اور سامراجی حکمرانوں کو استبدادیت اور استعمار کے لئے ڈھیل دی، اپنے عوام کو دوھری غلامی پر راضی کیا۔ اس ظلم و ستم کے عوض انہوں نے اپنے

سیاسی کردار کو پس پردہ رکھ کر دوسروں کے خیالات سے پیچھا چھڑایا اور دین و مذہب کے نام پر استعمار کی خوشنودی حاصل کی ہے۔
دوسری لفظوں میں بہائیوں کی سیاست یہ ہے کہ حکومت کی سیاست میں دخل نہ دینے کا اعلان کیا جائے اور حکومت کی امداد کو سیاسی دستور بنایا جائے۔

ماخذ

۱۔ اس سے مراد وہ ثقافت نہیں ہے جو دور حاضر میں اکثر مسلمانوں کے درمیان رائج ہے، کیونکہ آج اکثر مسلمان معاشروں کی ثقافت، بعض اسلامی تعلیمات، قومیت پرستی، مشرقی و مغربی افکار کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے ثقافتی استعمار نے ایجاد کیا ہے۔

لہذا جن خصوصیات کو ہم نے بیان کیا ہے وہ اسلامی ثقافت کی انسانی اسلامی انقلابی اور حقیقی صفات ہیں۔ اور ماضی سے آج تک سامراجیوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس حقیقی و اصلی اسلامی ثقافت کو مسلمانوں کے درمیان پنپنے نہ دیں۔

۲۔ کتاب "نقطۃ الکاف" ص ۹۹-۱۰۷، تالیف: میرزا جانی کاشانی۔ اہتمام: ایڈورڈ براون۔ مطبع: بریل لائڈن ہالینڈ۔ ۱۹۱۰ء

خود علی محمد شیرازی اپنی کتاب "احسن القصص تفسیر سورۂ یوسف" میں اس بات کے معترف ہیں اور میرزا حسین علی نے بھی اپنی کتاب "ایقان" طبع مصر سنہ ۱۹۲۳ء ص ۵۱ میں اس مسئلہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔

۳۔ "تلخیص تاریخ نبیل" ص ۶۳، تالیف: محمد نبیل زرندی۔ عربی سے فارسی ترجمہ: عبدالحمید اشراق خاوری۔ طبع تہران۔ انتشارات بہائیان (لجنہ ملی نشر آثار امری) سنہ ۱۹۴۶ء۔

"الکواکب الدریہ" جلد اول ص ۳۱، تالیف: عبدالحسین آوارہ، طبع مصر سنہ ۱۹۲۳ء۔ اسی طرح "کشف الغطا" "گنجینہ حدود و احکام"۔ "نفحات مشکبار"۔ "ایام تسعہ"۔ "رحیق مختوم" "قاموس توقیع منیع"۔ "اسرار الآثار خصوصی" "ظہور الحق" "نظر اجمالی بر دیانت بہائی"۔ "درس نہم اخلاق"۔ ان تمام کتابوں میں جنھیں خود بہائیوں نے شایع کیا ہے۔ اس موضوع کی جانب اشارے ہوئے ہیں۔ لیکن ہم طول کلام کے پیش نظر ان کی تفصیلات وصفحات بیان کرنے سے اجتناب کر رہے ہیں۔

۴۔ "ہشت بہشت" ص ۲۷۶، تالیف: میرزا احمد روحی و آقاخان کرمانی۔ طبع: تہران۔ انتشارات بابیان۔ "تلخیص تاریخ نبیل زرندی" ص ۶۶۔ "روضۃ الصفاء ناصری" جلد ۱۰ ص ۳۱۱، تالیف:

میرزا رضا قلی خان ہدایت، طبع: تہران۔ "تحقیق در تاریخ و فلسفہ بابیگری، بہائیگری و کسروی گرائی" ص۲۶۔ تالیف: ڈاکٹر یوسف فضائی۔ طبع: تہران ۱۳۵۴ھ ش/۱۹۷۵ء

۵۔ "الکوکب الدریہ" جلد اوّل ص۳۴

۶۔ علی محمد شیرازی نے اپنی کتاب "تفسیر سورہ یوسف" میں مختلف صفحات پر اپنے دعووں کو تحریری طور بیان کیا ہے اور "تفسیر سورۂ بقرہ" "رسالہ بین الحرمین" "مطالع الانوار" "رحیق مختوم" "ظہور الحق" وغیرہ میں بھی اس بات کی جانب مرکزی اشارہ موجود ہے۔

۷۔ "نقطۃ الکاف" ص۲۱۳۔ "پنج شان" تالیف: علی محمد شیرازی۔ "تلخیص تاریخ نبیل زرندی" اور "ظہور الحق" ص۱۰۳

۸۔ "نقطۃ الکاف" ص۱۵۱۔ "بیان" کے متعدد مقامات خاص کر "باب السابع من الواحد الثانی" تالیف: علی محمد شیرازی۔ "مکاتیب" جلد دوم ص۲۶۶۔ تالیف: عباس آفندی، طبع مصر ۱۳۳۵ھ ش اور "مفاوضات" ص۱۲۴۔ تالیف: عباس آفندی، طبع بریل لائڈن ہالینڈ ۱۹۰۸ء

۹۔ "لوح ہیکل الدین" ص۵، ضمیمہ "بیان" عربی۔ تالیف: علی محمد شیرازی۔ اسی طرح دیکھئے "رسالہ للثمرۃ"، تالیف علی محمد شیرازی۔ موصوف اس کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

انني انا الله، لا اله الا انا الوحاد الوحيد انني انا الله لا اله الا انا الاحاد الاحيد، انني انا الله لا اله الا انا الصّاد الصّميد، انني انا الله لا اله الا انا الفراد الفريد..... بسم الله الامنع الاقدس سبحانك اللّهم يا الهي لاشهدنك وكل شيء على انك انت الله لا اله الّا انت۔"

اسی طرح میرزا حسین علی نے کتاب "بدیع" اور عباس آفندی نے "تاریخ صدر الصدور" ص۲۰۵ میں علی محمد شیرازی کے دعویٰ الوہیت کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۰۔ "تلخیص تاریخ نبیل زرندی" ص۱۳۸ "روضۃ الصفاء ناصری" جلد ۱۰ ص۳۱۱۔ "انشعاب در بہائیت" ص۸ تالیف: اسماعیل رائین۔ طبع تہران ۱۹۷۸ء

۱۱۔ "مقالہ شخصی سیاح" ص۲۲ تحریر: عباس آفندی۔ طبع مؤسسہ ملی مطبوعات امری تہران ۱۹۶۲ء "نقطۃ الکاف" ص۱۳۳ "کشف الغطا" ص۲۰۳ و ۲۰۴ "قرن بدیع" جلد اول ص۴۲۳۔ تالیف: شوقی آفندی، طبع مؤسسہ ملی مطبوعات امری۔ انگلش سے فارسی ترجمہ، نصرت اللہ مودت، "روضۃ الصفا ناصری" جلد دہم ص۴۲۳۔ ناسخ التواریخ "فصل سلاطین قاجاریہ" جلد ۲ ص۱۲۰ تالیف:

میرزا محمد تقی لسان الملک سپہر۔ طبع تہران ۱۳۵۳ھ ش۔ "مواد تحقیق درباره مذہب باب"
ایڈورڈ براون۔ "انشعاب در بہائیت" ص ۴۷

۱۲۔ "کشف الغطا" ص ۲۰۴ "انشعاب در بہائیت" ص ۴۲۔ "روضۃ الصفاء ناصری"۔ "ناسخ التواریخ"
"تلخیص تاریخ نبیل زرندی"۔ "الکواکب الدریہ"۔ "مقالہ شخصی سیاح" وغیرہ میں بھی جن صفحات پر شہر تبریز
میں باب کے توبہ نامہ کا ماجرا بیان ہوا ہے وہیں ان باتوں کی جانب بھی اشارہ موجود ہے۔ اور اسی طرح ایڈورڈ
براؤن نے "مواد تحقیق درباره مذہب باب" میں ص ۵۴ پر صریحی طور پر اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۔ گذشتہ مآخذ۔

۱۴۔ "تاریخ رجال ایران" جلد ۴ ص ۱۶۲ تالیف: مہدی بامداد۔ طبع تہران ۱۳۴۷ھ ش۔ "تلخیص تاریخ
نبیل زرندی" ص ۱۹۶۔ اسی طرح علی محمد شیرازی کے حالات زندگی سے متعلق تمام مآخذ میں حاکم اصفہان کی جانب
سے علی محمد شیرازی کی حمایت کا تذکرہ موجود ہے۔

۱۵۔ بطور نمونہ، ایران میں اس وقت کے روسی سفیر پرنس دالگورکی وزارت خارجہ کو رپورٹ دیتے
ہوئے لکھتے ہیں:

"بہت اچھی بات ہے کہ فرقہ بابیہ نے علماء اسلام کی مخالفت اور ان کے خلاف شدید مبارزہ
کا آغاز کرتے ہوئے انھیں منحرف قرار دے رہے ہیں۔" "شورش بابیان در ایران" جلد
۳۔ ص ۱۴۳-۱۵۹ طبع ماسکو، روس کلچرل سنٹر۔

مؤلف "نقطۃ الکاف" نے ص ۲۶۶ پر بیرونی ممالک کے سفراء کی جانب سے علی محمد شیرازی کی حمایت
کا تذکرہ کیا ہے۔

سامراجی طاقتوں کی جانب سے بابیوں کی حمایت خود ایک مستقل باب ہے، جہاں ہم تفصیل سے ماخذ کا
ذکر کریں گے۔ پرنس دالگورکی کی رپورٹ "انشعاب در بہائیت" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۶۔ نقطۃ الکاف ص ۲۳۳

۱۷۔ بابیوں کے ہنگامی دور سے متعلق تمام کتابوں اور تاریخوں میں ان شورشوں کا ذکر موجود ہے
اور بعضوں نے تفصیل سے ان واقعات کو بیان کیا ہے۔ گذشتہ مآخذ کی طرف رجوع کیجئے۔

۱۸۔ "انشعاب در بہائیت" ص ۳۸ ایران میں برطانوی سفیر کی اپنی وزارت خارجہ کو رپورٹ
کا سرکاری ترجمہ، منقول از برطانیہ ریکارڈ آفس۔

۱۹۔ "قرن بدیع" جلد اول ص ۲۱۸، جلد دوم ص ۴۱۔ "انشعاب در بہائیت ص ۱۰۶
"تلخیص تاریخ نبیل زرندی" ص ۶۲۵۔ "بہاء اللہ و عصر جدید" ص ۲۴ مؤلف ڈاکٹر اسلمنت، طبع:
امافرت۔ حیفا اسرائیل ۱۹۳۲ء۔ رسالۂ ایام تسعہ" ص ۲۸۷، "اشراقات" ص ۲۵۳ تالیف:

میرزا حسین علی۔ "الکواکب الدریہ" ص۲۳۶

۲۰۔ گذشتہ مآخذ میرزا حسین علی کی گرفتاری اور شہر بدری سے متعلق واقعات۔

۲۱۔ "مصابیح ہدایت" جلد دوم ص۲۸۲ مؤلف: عزیز اللہ سلیمانی، طبع تہران، لجنۂ ملی نشریات امری۔ ۱۳۲۶ھ ش۔

اس طرح سرکاری کتابوں اور نشریات میں۔ عشق آبادِ روس میں بہائیوں کی عبادت گاہوں کی تفصیلات مندرج ہیں۔

۲۲۔ میرزا حسین علی کی کتاب "مبین" میں لوح کا متن ص۲۶ پر مندرج ہے اور کتاب "قرن بدیع" جلد دوم ص۸۶ پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی ہے۔

۲۳۔ "انشعاب در بہائیت" ص۹۳۔ "مائدہ ہای آسمانی" ص۱۳۰ طبع تہران، مؤسسۂ ملی مطبوعات امری، یہ کتاب میرزا حسین علی کی الواح کا مجموعہ ہے۔ "قرن بدیع" جلد دوم ص۱۷۱۔

۲۴۔ "مواد تحقیق دربارۂ مذہبِ باب"۔ "حضرت بہاء اللہ" ص۱۴۸، تالیف: محمد علی فیضی طبع تہران مؤسسۂ ملی مطبوعات امری۔ "مکاتیب" جلد دوم ص۱۷۱۔

۲۵۔ "قرن بدیع" جلد دوم ص۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۵۔ "الکواکب الدریہ" جلد اوّل ص۳۷۹، ۳۸۱، ۳۸۳ "انشعاب در بہائیت" ص۴۹۔ "نقطۃ الکاف" پر ایڈورڈ براؤن کا مقدمہ اور اکثر سابقہ مآخذ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

۲۶۔ "مقالہ شخصی سیاح" ص۶۷۔ "ایقان" تالیف: میرزا حسین علی۔ "مفاوضات"۔ "الفرائد" تالیف: میرزا ابو الفضل گلپائیگانی۔ اور "تحقیق در تاریخ و فلسفہ بابیگری و بہائی گری۔" باب سوم میں بہائی مآخذ کی روشنی میں اس سلسلہ میں تفصیل بحث ہوئی ہے۔

۲۷۔ میرزا حسین علی نے اپنی کتاب "مبین" کے صفحات ۲۱ و ۴۸، ۵۶، ۲۱۰، ۲۳۲، ۲۸۶، ۳۰۸، ۳۴۲، ۴۰۵، ۴۱۷ پر صراحتاً الوہیت کا دعویٰ کیا ہے اور "مائدہ ہای آسمانی"۔ "رسالہ ایام تسعہ" "ادعیۂ حضرتِ محبوب"۔ "مجموعۂ مبارکہ" "مصابیح ہدایت" جیسی کتابیں۔ میرزا حسین علی کے دعویٰ الوہیت سے بھری پڑی ہیں۔ اسی طرح "مکاتیب" کے ص۲۲۵ پر عباس آفندی نے میرزا حسین علی کے دعوائے الوہیت کا اعتراف کیا ہے۔

۲۸۔ "قرن بدیع" بہائیوں کی تاریخ سے متعلق بلانفیلڈ کی کتاب دیکھئے، جس میں یہ واقعہ میرزا حسین علی کی لڑکی کی زبانی نقل ہوا ہے۔

۲۹۔ "مجموعہ الواح مبارک" ص۱۵۹ پر خود میرزا حسین علی نے روسی حکومت سے وظیفہ لینے کا واضح لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔

۳۰۔ کتاب "مبین" میں ص۱۵۹ پر ناصر الدین شاہ قاچار کی خدمت میں میرزا حسین علی کے استغاثہ کا پہلا تتمہ مندرج ہے۔

۳۱۔ "خاطرات صبحی" ص۹۸۔ تالیف: صبحی مہتدی (میرزا حسین علی کے پرسنل سیکرٹری) "عباس آفندی کے خطوط" "مکاتیب" جلد سوم ص۳۲۲۔ "قرن بدیع" جلد سوم ص۳۲۶ ص۲۱۸ اور عباس آفندی کے حالات سے متعلق بعض دوسری کتابیں۔

۳۲۔ "مکاتیب" جلد دوم، ص۳۱۲۔ "مکاتیب" جلد چہارم ص۱۲۱، جلد سوم ص۱۵۵ پر عثمانی حکومت کی حمایت میں خطوط مندرج ہیں۔ "انشعاب در بہائیت" ص۱۳۶

۳۳۔ "قرن بدیع" جلد دوم ص۱۲۵۔ جلد سوم ص۲۹۱۔ "انشعاب در بہائیت" ص۱۲۷۔

۳۴۔ "بیان الحقائق" ص۷۱ تالیف: عبدالحسین آیتی۔ "قرن بدیع" جلد سوم ص۲۹۷ "انشعاب در بہائیت" ص۱۳۱ نیز مآخذ گزشتہ۔

۳۵۔ سابق مآخذ

۳۶۔ "الکواکب الدرّیہ" جلد دوم ص۳۰۵، "قرن بدیع" جلد سوم ص۲۹۹، "انشعاب در بہائیت" ص۱۱۸۔

۳۷۔ لوح "مکاتیب" میں مندرج ہے اور "انشعاب در بہائیت ص۱۱۹، ۱۲۰۔ "مکاتیب" جلد سوم ص۲۹۵ میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے، یہاں تک کہ عبدالبہاء نے ایک تقریر کے دوران انگریزوں کو مخاطب کرکے کہا: ایرانی انگریزوں کے جاں باز و جاں نثار ہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب "مجموعہ ای در خطابات عبدالبہاء" جلد اوّل ص۳۳۔

۳۸۔ "قرن بدیع" جلد سوم ص۳۲۱۔ "رسالہ ایام تسعہ" ص۵۰۸۔ "الکواکب الدرّیہ" جلد دوم ص۳۰۳۔ مجلہ "اخبار امری" ص۷ ترجمان محفل ملی بہائیاں ایران شمارہ ۵، ۸ - ۷ نومبر - دسمبر ۱۹۴۵ء۔ (آبان و آذر ۱۳۲۴ھ ش)۔ مأخوذ از "عالم بہائی" جلد ہشتم۔ تالیف: سر رونیلڈ اسٹورز۔

۳۹۔ "کشف الحیل" ص۱۵۴ تالیف: عبدالحسین آیتی۔ طبع تہران ۱۳۴۵ھ ش۔ "پیام پدر" ص۱۴۳ تالیف: صبحی مہتدی (عباس آفندی کے پرسنل سیکرٹری)

۴۰۔ "شرح حال حضرت ولی امر اللہ" ص۳۸۔ تالیف: عبدالحمید اشراق خاوری۔

۴۱۔ سابق مآخذ

۴۲۔ شوقی ربّانی کا ٹیلیگرام۔ ماخوذ از مجلہ "اخبار امری" شمارہ (۲۴ جولائی ۱۹۵۰ء و جولائی ۱۹۵۱ء) ۲۴ مرداد ماہ ۱۳۲۹ھ ش اور نشریۂ مرداد ماہ ۱۳۳۰ھ ش۔

۴۳۔ "انشعاب در بہائیت" ص۱۹۵ - ۲۰۳

۴۴۔ سابق مآخذ ص۲۱۷ - ۲۲۴

۴۵۔ دیکھئے "بہائی نیوز" ستمبر ۱۹۴۷ء اور مجلہ "اخبار امری" شمارہ ۸ نومبر ۱۹۴۷ء۔

۴۶۔ "توقیعات مبارکہ حضرت ولی امر اللہ" ص۲۹۰ طبع تہران مؤسسہ ملی مطبوعات امری۔

۴۷۔ مجلہ "اخبار امری" شمارہ ۵ شہریور ۱۳۳۱ھ ش (اگست ۱۹۵۲ء) ص۱۶ و شمارہ ۱-۲ اردی بہشت - خرداد ۱۳۳۲، وہی مجلہ شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ دیہی، اسفند، فروردین ۱۳۳۲، ۱۳۳۳ھ ش (۱۹۵۳ء - ۱۹۵۴)

۴۸۔ اخبار "الاہرام" طبع قاہرہ، ۲۳ فروری ۱۹۷۵ء اور ایران ریڈیو، ٹی وی اور دفتر مرکزی برائے خبر کا "نیوز بلیٹن" نمبر ۲۳۲ - مورخہ ۲۱ دی ۱۳۵۳ھ ش (۱۱ جنوری ۱۹۷۵ء) نقل از مشرق وسطی نیوز ایجنسی اور اخبار "المحور" طبع بیروت تاریخ ۲۵ فروری و مجلہ "اخبار دبئی" مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء ص۳ اور اخبار الاہرام مؤرخہ ۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء

۴۸۔ مکرر "انشعاب در بہائیت" ص۲۵۷، ۲۹۹، مابعد۔

۴۹۔ "خطابات عبد البہاء" جلد اول، سفر امریکہ کے دوران، مس کراپر کے مکان پر ایک تقریر ۱۹۱۱ء اور محفل بہائیان ایران و مرکز جبانی بہائیان کے مابین مراسلات اور ٹیلیگرام، جو بہائیوں کے رسالوں میں شایع ہو چکے ہیں، اسی طرح وہ کتابیں جو امریکہ میں مقیم بہائیوں نے شائع کی ہیں۔

۴۹۔ مکرر - خبر رساں ایجنسیاں، مؤرخہ ۶۲/۳/۳ "خلاصہ اہم اخبار ایران و جہان" بلیٹن، وزارت خارجہ جمہوری اسلامی ایران تعلقات عامہ۔

۵۰۔ "تفسیر سورۂ یوسف" خطاب بہ قرۃ العین، "بیان" باب دہم از قسم ہشتم و دہم - تحقیق در تاریخ و فلسفہ بابیگری و بہائیگری۔"

۵۱۔ "بیان" باب ۵ قسم چہارم و باب ۱۵ از قسم ہشتم

۵۲۔ "بیان" باب دہم از قسم ہشتم۔

۵۳۔ "اقدس" ص۳۸، تالیف، مرزا حسین علی بہاء۔

۵۴۔ "اقدس" ص۱۹

۵۵۔ مأخوذ از مجلہ "اخبار امری" (۳۰ دسمبر ۱۹۴۵ء) ۹ دی ۱۳۲۴ھ ش۔

۵۶۔ "اقدس" ص۲۲۵

سیاست سے اجتناب کے سلسلہ میں مزید اطلاعات کے لئے دیکھئے مجلہ "اخبار امری" شمارہ ۲۵، ۲۵ فروردین ۱۳۲۶ھ ش (۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء)، شمارہ ۴ مرداد ۱۳۲۵ (۴ اپریل ۱۹۴۶ء)، شمارہ ۱۱ اسفند ۱۳۲۶

تحقیق ...

(۱۰-۱۱ جنوری ۱۹۵۱ء) شمارہ (۱۱ فروری سنہ ۱۹۴۶ء) شمارہ ۵، مئی سنہ ۱۹۴۶ء (۵ شہریور ۱۳۲۵ ھ ش)
کتاب "نظر اجمالی در دیانت بہائی" تالیف: احمد یزدانی، طبع تہران، مؤسسہ ملی مطبوعات امری
سنہ ۱۳۲۹ ھ ش سنہ ۱۹۵۰ء -

"رسالۂ سیاسیہ" تالیف: عباس افندی، قلمی نسخہ، مجلس شورای اسلامی کی لائبریری
میں، تحت عنوان "رسالہ بہائی ہا" نمبر ۵۷ - ۲۳۱ -

جناب محمد علی تسخیری

انقلاب اسلامی
بداخلاقی کے خلاف مہم

ترجمہ: جناب خادم حسین

انسانی شخصیت کے عناصر

انسانی شخصیت کے عناصر کا مطالعہ کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اپنی ذات کا گہرائی سے جائزہ لیں اور اپنے وجودی عناصر کی تشکیل کے بارے میں سوچیں کہ آیا ہم میں سے ہر ایک انسانی نوع کا ایک فرد نہیں؟ آیا ان عناصر کا وجود، ہماری غفلت کے باوجود ضرورت سے زیادہ نہیں؟ جو لوگ اس عنصر سے غافل رہتے ہیں وہ دراصل حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

مذکورہ سوالات پر غور کرنے کے بعد ان عناصر کو مندرجہ ذیل پہلوؤں کے لحاظ سے تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ **فکری پہلو**: جس کے ذریعہ ماضی اور حال نیز مستقبل کی نقشہ کشی کی جاسکتی ہے اور ذہنی ارتکاز کے نتیجہ میں جزئیات سے قاعدۂ کلیہ بنایا جاسکتا ہے۔

۲۔ **ارادی پہلو**: وہ ہے جو موقف کے اعلان میں آزادی بیان کے نام سے جانا جاتا ہے۔

۳۔ **اخلاقی پہلو**: اس پہلو کا نام ہے جو انسان کی ترقی و پیش رفت کی فطری رغبت اور انسانی وجدان و ضمیر سے سیراب ہوتا ہے۔

۴۔ **سماجی پہلو**: فرد کی وہ فطری جہت جو اسے سماج کی طرف بڑھاتی ہے۔

عناصر شخصیت کے یہ پہلو فکر و نظر کے بعد نمایاں ہوتے ہیں اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ عناصر انسانیت اور انسانی شخصیت کے تشکیل دہندہ ہیں۔ درحقیقت انسانیت کی رو سے جس اچھے کردار یا نیک عمل کا دعویٰ کیا جائے، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اس کی پرکھ کا معیار یہی ہوگا۔

انسانی شخصیت کے بنیادی ستون:

انسانیت کے دائرے کو اگر محض انسانیت کے دائرے سے ہٹ کر اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس میں جہتوں سے زیادہ گہرائیاں اور محدودیتیں نظر آتی ہیں۔ اور اس اعتبار سے اس کے چند پہلو یہ ہوں گے۔

اولاً: اعتقادی پہلو۔

درحقیقت انسان کی فطرت میں حقیقت کی تلاش مضمر ہے اور انسان وہی انسان ہے جو اپنی فکری توانائی کو حیات اور کائنات کے اسرار و رموز جاننے میں صرف کرتا ہے، اور حقیقت سے آگاہ ہونے کی بنا پر ہی خداوند کریم کی صفات سلبیہ و ثبوتیہ سے روشناس ہو کر اس حقیقت کو درک کرتا ہے کہ وہ عین کمال ہے، اور کائنات میں موجودہ آثار اسی کی بے پناہ رحمت کا نتیجہ ہیں، اس رحمت کا تقاضا، انسانیت کو درجۂ کمال تک پہنچانا ہے، اسی غرض کی تکمیل و ہدایت کے لیے انبیاء کرام "صلوات اللہ علیہم اجمعین" آئے اور اللہ نے انہیں رہنمائی کے لیے شمع راہ بنایا۔

ثانیاً: اخلاقی پہلو:

اخلاقی پہلو کو متعدد خصوصیات کی بنا پر ہم یوں تقسیم کرتے ہیں:

الف) اختلافات پر مضبوط اور محکم ارادے کا تسلط۔

ب) عقیدے کے ساتھ جیتے جاگتے احساسات کا مربوط ہونا۔

ج) اعلیٰ اقدار و روایات سے ہم آہنگی، جو تزکیۂ نفس اور اس کی ترقی و پیش رفت کا باعث بنتی ہے

د) سماجی طور پر "خلیفۃ اللہ فی الارض" کا اثبات۔

اب سمجھا جا سکتا ہے کہ شخصیت کے بنیادی ستونوں میں دوسرا ستون "اخلاق" کے ذریعے اعتقاد اور ایمان عقیدے کی ظاہری شکل وجودی صورت اختیار کرتی ہے، اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا قول سمجھ میں آتا ہے:

"بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"

میں اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

یا اس سے پہلے ارشاد رب العزت ہے کہ:

"ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم آیاته ویزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین "

" وہی ہے جس نے مکے کے رہنے والوں میں ایک رسول ان ہی میں سے مبعوث فرمایا جو ان کو

خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان (کے ظاہر و باطن) کو پاک کرتا ہے، اور ان کو قرآن اور شریعت کی تعلیم دیتا ہے، گو اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔"

اصل مقصد، فطری طور پر انسان کے تکامل کا ہے، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام نے اپنے قوانین میں سب سے پہلے اسی نصب العین کا لحاظ رکھا، درحقیقت اسلامی قوانین کی اساس اعتقادی اور اخلاقی بعد پر رکھی گئی ہے، اور ان دونوں ابعاد کی وسعت اتنی ہے کہ تمام فردی اور سماجی قوانین ان میں اس طرح سموئے ہوئے ہیں کہ یہ کہنا مبنی بر حقیقت ہے کہ اسلام کا اخلاقی نظام، ایک مکمل حیاتی نظام ہے، جو انسانیت کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔

یہاں اخلاقی نظام کے بارے میں گفتگو کرنا ہمارا مقصد نہیں، اس لیے کہ یہ بذات خود ایک نہایت وسیع باب ہے اور مقصد صرف اتنا ہے کہ مندرجہ ذیل نکات کی وضاحت ہو سکے کہ:

انسان، اپنے سلوک اور اچھے اخلاق سے پہچانا جاتا ہے، اور وہی معاشرہ اچھا کہلاتا ہے جس نے اخلاقی نظام پر اپنے نظام حیات کی بنیاد رکھی ہو۔

دوسرے یہ کہ قرآن مختلف قوموں کے بارے میں جب ذکر کرتا ہے تو جہاں اعلیٰ مدارج پر پہنچنے والی قوموں کی مثال دیتا ہے وہاں ساتھ ساتھ پست اور گری ہوئی قوموں کی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔

اور قرآنی نقطۂ نظر سے مثالی قوم و ملت وہی ہے جو اخلاقی اور اعتقادی پہلو کے سوا دوسرا پہلو اختیار نہ کرے، اور یہی وجہ ہے کہ مومنوں کو اس سے آراستہ ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ آئیے سب مل کر ان آیات کو پڑھیں۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ (آل عمران - ۱۰۲)

"اے ایمان لانے والو اللہ سے ایسا ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔"

یا ایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا (آل عمران ۲۰۰)

"اے ایمان لانے والو، صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر دلاؤ، اور (اطاعت امام پر) کمر کس لو۔"

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین اولیاء (النساء - ۱۴۴)

"اے ایمان لانے والو "مومنوں کو چھوڑ کر" کافروں کو دوست نہ بناؤ۔

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ (النساء - ۱۳۵)

"اے ایمان لانے والو۔ تم انصاف کے لیے بڑے مضبوط بن جاؤ، اور خدا کے گواہ ہو جاؤ"

یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ (المائدہ۔ ۹۰)

"اے ایمان لانے والو، شراب، جوا، بجے ہوئے بت اور پانسے شیطان کے ناپاک اعمال ہیں ان سے اجتناب کرو۔"

یاایھا الذین آمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم (الحج - ۷۷)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، تم رکوع، سجدے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔"

یاایھا الذین آمنوا لاتخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم (الانفال - ۲۷)

"اے ایمان لانے والو، اللہ اور رسول اور اپنی امانتوں کے حق میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔"

مذکورہ آیات سے یہ واضح ہے کہ:

مندرجہ ذیل صفات میں قرآن مجید امت مسلمہ کی تعریف بیان کرتا ہے۔

امت مبلغہ، امت وسط، شاہد، نیک، ایک دوسرے پر رحم کرنے والی، کریم و اہانت ناپذیر، بخشش کرنے والی، پرہیزگار، مضبوط ارادہ رکھنے والی، اپنوں میں کسی کا استحصال نہ کرنے والی، برا نہ سوچنے والی، متحد اور لہو و لعب سے دور امت ہے۔ یعنی امت مسلمہ زمین پر بسنے والوں کے درمیان سب سے بہتر ہے۔

اسی کے مدمقابل، قرآن کریم پست اور گمراہ قوموں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ بعنوان مثال: قوم لوط، جنہوں نے اپنی زندگی شہوت رانی میں، فرعونیوں نے ظلم میں اور اہل القریٰ نے جھوٹ اور اسراف میں گذار دی تھی، البتہ ان سب کے لیے ہلاکت ہے۔

وتلک القریٰ اھلکناھم لما ظلموا (الکہف - ۵۹)

"اور یہ بستیاں، جس وقت ان کے باشندوں نے نافرمانی کی، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔"

ان کا انجام ذلیل و خوار ہونے (فجعلنا عالیھا سافلھا (الحجر - ۷۴) پھر ہم نے ان بستیوں کو زیروزبر کردیا) اور راہ حق سے پیچھے رہ جانے کے سوا کچھ نہ ہوگا: (وقیل بعداً للقوم الظالمین (ہود - ۴۴) اور یہ کہہ دیا گیا کہ ظالم لوگوں کے لیے ہلاکت ہو۔)

قرآنی واقعات کا مطالعہ کرنے والا بخوبی محسوس کرتا ہے کہ انسانیت کی راہ سے منحرف کرنے والے اسباب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ سماج کے درمیان اخلاقی قدروں کو پامال کریں، تاکہ اپنے خبیث اور بیہودہ ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

لہٰذا زیادہ تر جہالت، عیاشی، اندھی تقلید، شہوت رانی اور جاہلانہ نیز وہمی تصورات پر مبنی خیالات کو رائج کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ تاکہ انسانی معاشرے میں لوگ اپنی شخصیت کھو بیٹھیں، اور عوام کی رائے میں ان کی شخصیت کا کوئی وزن نہ رہے اور اطمینان کے ساتھ اسارت و غلامی کے پھندے ان کی گردنوں میں ڈال دیں۔ درحقیقت یہ وہی حالت ہے جس کو قرآن کریم فرعونی ظلم و ستم کے نام سے بیان کرتا ہے

فاستخف قومہ فاطاعوہ

"اپنی قوم کی شخصیت مٹا دی، تب قوم نے اطاعت کی۔"

ظالم، عیاش اور اوباش گروہوں کے دھوکے اور فریب کے شکار معاشرے جتنے بھی گذرے

ہیں ان کی حقیقت اور حالات کو جاننے کے لیے، آیئے ہم سب مل کر ان قرآنی آیات کا مطالعہ کریں:

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلاۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیاً (مریم۔ ۵۹)

"پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے، جنہوں نے نماز بھی کھو دی اور خواہش نفسانی کے پیچھے پڑ گئے۔ پس عنقریب ان کو مصیبت پیش آئے گی۔"

واللہ یرید ان یتوب علیکم ویرید الذین یتبعون الشھوات ان تمیلوا میلاً عظیماً (النساء۔ ۲۷)

"اور خدا تو چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے، اور جو لوگ خواہشوں کے پابند ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم پورے منحرف ہو جاؤ۔"

وذر الذین اتخذوا دینھم لعباً ولھواً وغرتھم الحیاۃ الدنیا وذکر بہ ان تبسل نفس بما کسبت لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع (الانعام۔ ۷۰)

"اور ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے، اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکا دیا ہے چھوڑ دو اور اسی قرآن کے ذریعے نصیحت کرو کہ نفس اپنے افعال سے باز رہے، کیونکہ خدا کے سوا اس کا کوئی سفارشی اور حمایتی نہ ہوگا۔"

ما یأتیھم من ذکر من ربھم محدث الا استمعوہ وھم یلعبون، لاھیۃ قلوبھم واسرّوا النجوی الذین ظلموا ھل ھذا الا بشر مثلکم..... (الانبیا۔ ۳)

"کوئی نئی نصیحت ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی، مگر یہ کہ وہ اسے کان لگا کر سنتے ہیں اور پھر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دل ان کے کھیل میں لگے ہوئے ہیں، اور یہ ظالم چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے ہیں، اور یہ (کہتے ہیں کہ) یہ رسول ہے ہی کیا؟ تم ہی جیسا تو آدمی ہے۔"

واذا فعلوا فاحشۃ قالوا وجدنا علیھا آباءنا واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لا یأمر بالفحشاء، اتقولون علی اللہ ما لا تعلمون۔ (الاعراف۔ ۲۸)

"اور جس وقت وہ کوئی بدی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو یہی کرتے پایا ہے اور اللہ نے (بھی) ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، تم یہ کہہ دو کہ اللہ یقیناً بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے برخلاف وہ کچھ کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔"

واذا تتلی علیھم آیاتنا بینات قالوا ما ھذا الا رجل یرید ان یصدکم عما کان یعبد آباؤکم وقالوا ما ھذا الا افک مفتری، وقال الذین کفروا للحق لما جاءھم ان ھذا الا سحر مبین (سبا۔ ۴۳)

"اور جس وقت ان کو ہماری کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص فقط اتنا چاہتا ہے کہ جس چیزوں کی تمہارے باپ دادا پرستش کیا کرتے تھے ان سے تم کو باز رکھے اور یہ بھی

کہتے ہیں کہ یہ محض بنی ہوئی باتیں ہیں، اور ان لوگوں نے جو کافر ہوگئے ہیں۔ حق کی نسبت جس وقت وہ ان کے پاس آیا یہ کہہ دیا کہ یہ تو بلاشبہ کھلا جادو ہے۔"

و اذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول (الاسراء - ١٦)

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کر دینے کا ارادہ کرتے ہیں، تو ہم اس میں مالدار لوگوں کو زیادہ کر دیتے ہیں، پس وہ اس بستی میں (ہمارے احکام کے بارے میں) نافرمانی کرنے لگتے ہیں، پھر وہ بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔"

سرمایہ دار اور طاغوتی عناصر کا پیشہ فسق و فجور اور گمراہی میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ سماج میں فسق و فساد پھیلانے کا ہے اور جب کسی معاشرے میں فساد پھیلتا ہے تو یقیناً تباہی جزو لاینفک بن جاتی ہے۔

اخلاقی فساد اگر کسی معاشرے میں سرایت کر جائے تو پیدا ہونے والی سماجی بیماریوں کی نوعیت لاعلاج قسم کی ہوتی ہے، اور ضمناً نتیجہ میں:

- اعلیٰ مثال قائم کرنے والی انسانی شخصیت، اپنی خصوصیت کھو بیٹھتی ہے۔
- بچوں کی طرح، انسان، سرمایہ داروں کے قائم کردہ غلامی اور استحصالی راستوں پر چلنے لگتا ہے۔
- معاشرے میں اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔
- عزت، شرف اور مستقبل پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔
- ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، نتیجہ میں ظلم و ستم رائج کرتا ہے۔

اس صورت میں آیا تباہی حتمی نہیں؟ اسلامی شہر اندلس کو دیکھیے، آیا اخلاقی فساد کے سوا اور کوئی شئ اس کی تباہی و ویرانی کا باعث بنی؟

یا آجکل ملت اسلامیہ کے اکثر و بیشتر افراد جس انداز سے فسق و فجور اور فساد میں آلودہ ہیں اور احکام خداوندی پر عمل کرنے کے بجائے امور مملکت کی باگ ڈور ظالم و فاسد اشخاص کے سپرد کیے ہوئے ہیں۔ کیا مکر، فریب اور ذہنی انحرافات کے سوا اور کسی چیز کے شکار ہیں؟ درحقیقت یہی وہ امور ہیں جو ملت اسلامیہ کو اس کی حقیقت سے دور کرتے ہیں۔

صیہونی سربراہ اور حکام نے جب دنیا کو تباہ کرنے کے منصوبے تیار کیے تو سب سے پہلا ہدف اخلاقی نظام کو درہم برہم کر کے فساد و عیاشی کو رائج کرنا قرار دیا، اس ظالمانہ حملے کے نتیجہ میں بڑی حد تک انسانی قدروں کو پامال کیا، ان عملیات سے انہوں نے۔

بنی نوع انسانی کے مذہبی اعتقادات کو لپے پتے، ملمع کار شبہات کے ذریعہ کمزور کیا، تاکہ اخلاقی بنیادوں کا اساسی طور پر خاتمہ ہو سکے، نہ صرف یہ بلکہ جنسی امور کو فروغ دینے والی اشیاء کی فراہمی کر کے

بے شرمی اور فساد کو وسعت دینے کی غرض سے ہر کس و ناکس کو ترغیب دلائی تاکہ یہ وبا اچھی طرح سے پھیل سکے۔ اس کے علاوہ صیہونی اور سامراجی طاقتوں نے اس وبا کو پھیلانے کے لیے ان حکام اور حکومتی عہدہ داروں کو مددگار پایا جنہوں نے ظلم اور دھوکے فریب کے ذریعہ اقتدار حاصل کیا، اور اپنے عوام کے لیے ذلت و خواری کے سوا کچھ نہ سوچا۔

ان حکام کو ایک طرف تو مالی، سیاسی اور فوجی امداد کی ضرورت تھی، دوسری طرف ایسے وسائل اور مشورے درکار تھے، جن کے ذریعہ عوام کو اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے سے روک سکیں۔

ایسے حکمراں اور حکام، پروپیگنڈے اور رویے اس قسم کے اختیار کرتے ہیں کہ لوگ حسن ظن رکھنے لگتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام اور خدا پر قطعی ایمان نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کو سامراج نے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے، تاکہ ان کے ذریعہ اپنے بیہودہ اور خیانت آمیز ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔

شاہ کی خائن حکومت :

ایران کا گذشتہ شاہی نظام سامراجی سازشوں کو بروئے کار لانے اور ان پر عمل درآمد کرنے کے سلسلے میں ایک زندہ مثال تھا، اس امت مسلمہ کے نظریات، خیالات اور اخلاق کو مٹانے کے لیے اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ البتہ یہ حکومت تنہا۔ اس کام کو نہیں کر رہی تھی، بلکہ اس کی ہم نوا اور بھی بہت سی حکومتیں تھیں، اور آج بھی ایسی حکومتیں مسلمانوں پر مسلط ہیں اور من مانی حکمرانیاں کر رہی ہیں۔ ان حکومتوں کے بارے میں ہم مزید کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ لیکن امت مسلمہ سے یہ کہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جس طرح سے ایران کے مسلمان عوام نے سابق طاغوتی رژیم سے مقابلہ کر کے اسے واصل جہنم کیا، اسی طرح وہ بھی اسلامی ممالک میں اسلامی اقدار کو زندہ رکھنے کے لیے جدوجہد جاری رکھیں۔ کیونکہ اسلام سے جو عہد ہر مسلمان باندھتا ہے اس کا وفا کرنا بھی اس پر واجب ہوتا ہے۔

شاہی حکومت اور سماج میں فساد کی توسیع

ہم زیر بحث موضوع میں انشاء اللہ ان طریقوں کا ذکر کریں گے جو کسی ایک اسلامی خطے ہی میں نہیں بلکہ تمام اسلامی خطوں میں بروئے کار لائے گئے، اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہیں، لیکن سب کا اصلی مقصد فساد، گمراہی اور حرامکاری پھیلانا ہے۔

راقم الحروف ایک واقعہ نقل کرتا ہے۔ جو درد سے خالی نہیں۔ تقریباً ایک سال پہلے اس نے میامی میں منعقد ہونے والی اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی تیرھویں کانفرنس میں شرکت کی، اس کانفرنس میں چوالیس اسلامی ملکوں اور تقریباً تمام بین الاقوامی اسلامی تنظیموں نے شرکت کی تھی۔ اس ماحول میں جہاں

[illegible] سایہ افگن تھا اسلامی جمہوریہ ایران کے نمائندے نے "اخلاقی فساد کی روک تھام کے لیے" ایک کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی، تاکہ اس کمیٹی کے ذریعہ اسلامی ملکوں میں اخلاقی انحرافات کے اسباب کی تحقیق کی جائے اور اس مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنے والے ملکوں کی مدد سے اس خطرناک مہم پر قابو پایا جائے۔ لیکن جو کمیٹی وزیروں کے لیے ریزولیشن تیار کرنے پر مامور تھی اس نے نہ صرف یہ کہ اس تجویز پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا بلکہ مختلف بہانوں سے اس کو قراردادوں کی فہرست ہی سے نکال دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس مہم کے طرفدار و حامی ہیں۔

ایرانی اسلامی وفد کے اراکین کو کانفرنس میں شریک ہونے والوں کی حقیقت جاننے کے بعد یہی توقع تھی لیکن ان کا مقصد اپنے شرعی فریضہ کی تکمیل اور مسلمان عوام کو بتانے کے لیے تھا کہ لوگ جان لیں کہ یہ اسلامی تنظیمیں صرف نام کی ہیں اور انہیں اسلام اور مسائل اہل اسلام کے حل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بہرحال:

اب ان خیانت آمیز، مکر اور فریب پر مبنی طریقوں کا ذکر کرتے ہیں جو شاہ نے فساد اور منکرات رائج کرنے اور عوام کے اخلاق کو تہس نہس کرنے کے لیے اختیار کیے تھے۔

تباہ کاری عوام کے اس طویل الذیل منصوبے کے اہم نکتے یہ تھے:

۱۔ نام نہاد ثقافتی ادارے:

ان اداروں کا اصلی کام ان فاسدوں کو جمع کرنا تھا جو سماج میں فساد، بے شرمی پھیلانے کے داعی اور جنسی معاملات میں ہرفن مولا تھے یہ لوگ عوام کو فساد و جرائم کی تشویق دلاتے تھے۔

اس کے علاوہ حکومت نے جان بوجھ کر بد اخلاق بلکہ بے اخلاق افراد کو بڑے بڑے عہدے بھی دے رکھے تھے تاکہ اس جہنمی منصوبے کو اچھی طرح عملی جامہ پہنا سکیں۔ یہ گروہ مختلف عناصر، اسلام دشمن یہودی ملحد، کمیونسٹ اور بہائیوں پر مشتمل تھا۔ ان کے علاوہ جرائم پیشہ اور شرپسند عناصر، سرمایہ دار اور زمین دار طبقہ بھی اس زمرے سے باہر نہیں تھا۔

اگر اس گروہ میں شامل افراد کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک دفتر اور سینکڑوں صفحے بھر جائیں آپ چند نام سن لیجئے کہ ہر ایک اپنی جگہ پر بے راہ روی و فساد کا ادارہ تھا۔

امیر عباس ہویدا: فساد و انحراف میں ڈوبے ہوئے اس بہائی نے اپنے تمام وزیروں کو بھی اپنا جیسا چن رکھا تھا۔

اشرف پہلوی: جس کی زندگی ساری کی ساری فسق و فجور اور فساد میں گذری، سابق شاہ کے دور میں فساد و تباہ کاری کی زندہ مثال تھی۔

اس کے علاوہ سابق رژیم نے اپنے خبیث ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جوان لڑکے اور لڑکیوں کو کھیل کود اور ورزشی مقابلوں کے نام سے گمراہی اور فساد کے حوالے کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور اس کام کے لیے اربوں روپیہ خرچ کیا۔

گلوکار مرد اور عورتوں، نیز موسیقی کے ماہرین کی گرم بازاری، ننگی اور جنسی فلموں کا رواج، نائٹ کلب، شراب، فحاشی کے اڈے، کوٹھے، بار، جنسی کہانیاں، افیم، گانجا، چرس اور ہیروئن جیسے تمام وسائل تھے جن کی مدد سے پہلوی حکومت اخلاقی بنیادوں کو تباہ کر رہی تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود آیا ہم کسی حکومت کو بے اخلاق اور گری پڑی حکومت کا نام نہیں دے سکتے؟

آیا اس سماج اور معاشرے کو جو اس کینسر میں مبتلا ہو، مومن باللہ کہہ سکتے ہیں؟

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

"انّ الّذین یحبون أن تشیع الفاحشة فی الّذین آمنوا لهم عذاب أليم فی الدنیا و الاخرة والله یعلم وانتم لا تعلمون، ولو لا فضل الله علیکم و رحمته و ان الله رؤف رحیم، یا ایها الذین آمنوا لا تتبعوا خطوات الشیطان ومن یتبع خطوات الشیطان فانه یامر بالفحشاء والمنکر" (النور: ۱۹-۲۱)

"یقیناً وہ لوگ جو اس بات کو دوست رکھتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی باتیں رائج ہوں، ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی، اور اللہ اس کو خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو وہ تم پر جلد عذاب نازل کرتا ہے) اور بے شک اللہ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ایمان لانے والو! شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔ اور جو شخص شیطان کے قدم بہ قدم چلے گا تو وہ ضرور اس کو بے حیائی اور بدی کی باتوں کا حکم دے گا"

سابق رژیم نے گمراہی کے تمام وسائل معاشرے میں فراہم کیے اور مشکل ترین صورت حال بنادی تھی۔ اس کے باوجود ہماری امت مسلمہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس مصیبت کے بھنور سے نکلی اور شیطانی حکومت کے مقاصد پر پانی پھر گیا۔

۲۔ اخبار و رسائل:

شاہی حکومت نے داخلی اعتبار سے عریانیت، بیہودہ خبریں، جرم، فساد اور بے حیائی رائج کرنے اور علمائے دین پر کیچڑ اچھالنے اور ان کی شخصیت کو گرانے نیز اپنے جرائم کی پردہ پوشی اور اس نظام کے استحکام کے لیے اخبار و رسائل کو دوسرا حربہ قرار دیا۔ یہ اخبار بدکار رژیم اور خارجہ سیاست کی بدولت مختلف زبانوں میں ہر اچھائی اور ملت کی ہر تعمیری بات کو ہدف ملامت بناتے اور فساد

وعریانیت کے سوا اور کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اسلامی انقلاب سے پہلے اخبارات ورسائل کا حال یہی تھا' معدودے چند کے سوا سبھی اس مرض کے شکار تھے۔

اس صحافتی رویّے نے مختلف طریقوں سے اپنے پلید ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کیں۔ جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

زہریلے مقالوں کی نشر واشاعت، جھوٹے پروپیگنڈے اور افواہوں کو پھیلانا، جھوٹی خبریں شائع کرنا، برہنہ اور ننگے فوٹو اور پوسٹر چھاپنے پر زور دینا، جنسی اور شہوت انگیز کہانیوں کو عام کرنا اور عوام کی توجہ حکومت کی جانب سے ہٹانے کی غرض سے فرضی خبریں چھاپنا، حکومت اور اس کے ہم نوا افراد کو ملک وملت کا بہی خواہ بنانا اور بتانا۔

۳۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن :

ریڈیو پروگرام میں دن رات شہوت انگیز گانوں، گمراہ کن باتوں، جھوٹی خبروں اور اخلاقی معیار سے گرے ہوئے ڈراموں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ٹیلی ویژن نے ریڈیو سے کہیں بڑھ چڑھ کر لوگوں کے اخلاق کو فاسد کرنے میں حصہ لیا، اس لیے کہ مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس میں جنسی خواہشات کے پیاسے افراد کے لیے ننگی فلمیں اور شہوت انگیز متحرک تصویروں کو اس طرح پیش کیا جاتا تھا کہ لوگ جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے اسی سے دلچسپی رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ ٹی وی پر وگرام پیش کرنے والوں نے گمراہی اور فساد سے ہٹ کر کبھی بھی درسی، تربیتی اور اخلاقی پہلو کی افادیت کے بارے میں ذرّہ بھر سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

درحقیقت ذرائع ابلاغ عامہ کے ان دو وسیلوں پر ان اشخاص کا تسلط تھا، جنہوں نے اپنی عزت، ناموس وشرف اور اخلاقی جرأت شیطان کے سپرد کر دی تھی اور اسی کے اغراض ومقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمہ وقت کمر بستہ رہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں ٹیلی ویژن نوجوان طبقے کے لیے جرم، قتل، فساد اور بے حرمتی نیز عزت وآبرو لوٹنے کی تربیت دینے کے اعتبار سے بہترین ادارہ تھا۔

ریڈیو۔ ٹیلی ویژن کا یہ رویّہ محض ایران ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں یہاں تک سعودیہ اور حجاز میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، خاص طور سے عراقی اور مصری ٹی وی کا تو عالم ہی عجیب ہے۔ برہنہ فلموں کا رواج سعودیہ میں آئے دن بڑھتا جا رہا ہے، زیادہ تر لوگ اس مقصد کے لیے ویڈیو اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ جب سعودیہ کا یہ حال ہے تو دوسرے ممالک کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو سکتا ہے۔

۴۔ سینما اور تھیٹر :

سینما ہال اور فلموں کی طرح، تھیٹر بھی عریانیت، دہشت گردی، اور پاک وپاکیزہ رشتوں کو توڑنے

کے اہم مراکز میں شمار کئے جاتے تھے۔

جہاں، فلم یا ڈراموں کے لکھنے والوں کے درمیان ان موضوعات پر مقابلہ رہتا تھا وہاں دونوں اصناف کے ڈائریکٹروں اور فلمی ہدایت کاروں کے درمیان جنسی مناظر پیش کرنے میں بھی مقابلہ ہوا کرتا تھا، محض یہی نہیں، اخبارات و رسائل میں بھی ان چیزوں کا چرچا کیا جاتا تھا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان منصوبوں میں حصہ اور جالوں میں گرفتار ہو سکیں۔ شاہ کے دور میں ایرانی فلمیں اخلاقی فساد کے لحاظ سے اگرچہ مغربی فلموں کی برابری نہیں کر سکیں، لیکن برہنگی اور عریانیت میں ان سے کم نہ تھیں۔ اس دور میں ایک طرف تو سازش سے بے خبر اور جنسی خواہشات کے غلام، بہت سے نوجوان سینما ہال کے دروازوں پر نظر آتے تھے، دوسری طرف کچھ ایسے بھی مؤمن افراد موجود تھے جو ان کی تباہی اور گمراہی پر افسوس کرتے تھے، اور ننگے پوسٹروں پر نظر پڑتے ہی خون کا گھونٹ پیتے اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔

ہم جب رسمی دستاویزات پر نظر دوڑاتے ہیں تو اس میں یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۷۱ء میں ہونے والے دو ہزار پانچ سو سالہ جشن شاہنشاہی کے موقعہ پر حکومت شاہ یہ اعلان کرتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے کہ "صرف ہمارے تہران میں ۱۲۲ سینما ہال ہیں، جن میں سے دو ممتاز ترین، ۳۹ اول درجے، ۴۲ دوسرے درجے اور ۳۹ تیسرے درجے کے ہیں۔"

اس کے علاوہ تہران میں ۷ اتھیٹر تھے، جن میں سے چھ خصوصی، چھ گورنمنٹ اداروں اور پانچ یونیورسٹیوں کے لیے تھے، اسی طرح ۹۴ فلم انڈسٹریاں اور برآمداتی فلموں کی تقسیم کے مراکز تھے۔ جن کی فی صد نسبت حسب ذیل تھی۔

۳۵٫۲٪ میں سے = ۲۶ ڈاکومنٹری اور پروپیگنڈا فلمیں بنانے کے مراکز۔

۲۷٪ میں سے = بیرونی ممالک سے فلمیں منگانے اور تقسیم کرنے کے ۲۰ مرکز۔

۳۷٫۸٪ میں سے = فلمیں تیار اور تقسیم کرنے کے ۲۸ مرکز۔

۵۔ کوٹھے اور طوائف گھر:

ایران جیسے اسلامی ملک میں سابق مجرم رژیم نے کوٹھے اور قحبہ خانے کھولنے کی عام اجازت دیکر اسلام کو شدید ضرب لگانے کی کوشش کی۔ ہر طوائف سرکاری نوکر شمار ہوتی تھی، تمام بازاری عورتوں کی صحت و تندرستی کی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر مقرر تھے، اس کے علاوہ ان سے ٹیکس بھی وصول کیا جاتا تھا اور آخر میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو راغب کرنے کے لیے خاص بسوں کا بندوبست بھی منصوبے میں شامل تھا۔

ایک طرف تو یہ کارگذاری و بدکاری دوسری طرف سرکاری اخبارات میں نماز ادا کرتے ہوئے

اماکن مقدسہ کی زیارت نیز اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کی اس دجال کی آئے دن تصویریں چھاپتی تھیں۔ اور کبھی کبھی حج عمرہ کے چرچے بھی مختلف ذرائع ابلاغ کے توسط سے سننے میں آتے تھے۔
لائسنس یافتہ طوائفوں کے علاوہ نجی قسم کے قحبہ خانے بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے، کچھ طوائفوں کو کالونیوں میں اپنا منہ کالا کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ غیر قانونی قحبہ خانوں کی تعداد پولیس کی اطلاع کے مطابق صرف تہران میں ۱۸۷۶ تھی۔ لڑکیوں کو چھیڑنے اور اغوا کرنے کے ۲۴۰۶۷ کیس بتائے گئے تھے جبکہ لوگوں نے انکشاف کیا تو پتہ یہ چلا کہ ۲۷۰۵۰ کیس ہیں اور یہ صرف وہ ہیں جن کے بارے میں پولیس کو جانکاری حاصل ہوئی یا ان کا اندراج ہوا۔
خانگی عورتیں بھی اس فساد کا شکار تھیں، اس سلسلہ میں شوہروں کے لکھائے ہوئے مقدمات کی تعداد (۱۰۱۲۴۸) تک پہنچ گئی تھی۔ اور بھی بہت سے ایسے کیس جو بذات خود سنگین جرم محسوب ہوتے ہیں۔ والدین یا دونوں میں سے کوئی ایک جو اپنے بچوں کو سڑکوں پر چھوڑ گئے تھے (۵۱۴۰) کیس۔ اسقاط حمل کے وہ تمام کیس جن کے بارے میں اعلان ہو چکا تھا (۴۵۶) کیس۔ عورتوں اور بچوں کو اغوا کرنے کے (۵۸۰) کیس صرف سابق فرح ہسپتال کی رپورٹ کو اگر دیکھا جائے تو اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۶۰ سے سنہ ۱۹۶۸ تک تقریباً ۲۹۱,۸۷۵ عورتوں نے اس ہسپتال کی خدمات حاصل کی ہیں، ان تمام میں (۴۰,۵۵۷) اسقاط حمل کے کیس تھے۔

۶۔ نائٹ کلب اور کیبرے:

طاغوتی حکومت نے انسانیت کے نام پر ننگے اور کھلے عام ناچ گانے کو فروغ دینے کے لیے آرٹ سینٹر نائٹ کلب اور کیبروں کے افتتاح و قیام میں لاکھوں اور اربوں ڈالر خرچ کیئے۔ ان رنگین راتوں کو امراء، وزراء اور سرمایہ داروں کی عیش و عشرت اور جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے طاغوتی رژیم لاکھوں غریب انسانوں کا خون چوس کر فراہم کرتی تھی۔
ہم ان رنگین محفلوں اور عریانیت کے مظاہروں کو فراموش نہیں کر سکتے، جس میں شاہ نے غریبوں کا خون چوس کر ان کا محنت سے کمایا ہوا پیسہ گلوکار، رقاصاؤں، امیروں، وزیروں اور سرمایہ داروں کی جیبیں بھرنے میں صرف کیا۔ اس کے علاوہ ہر سال شیراز میں ننگی فلموں کا فیسٹول منانے کے ساتھ ساتھ کھلے عام بدفعلی و بدکاری کے مسابقے بھی ہوا کرتے تھے۔ جو نہ صرف اخلاقی گراوٹ بلکہ انسانیت مخالف اور رسوا کن اسلام تھے۔
رسمی اعداد و شمار کے مطابق صرف تہران میں (۶۹) نائٹ کلب اور کیبرے، (۵۲۱) ڈانسنگ ہال (۸۶)، کلب، (۲۴۲) ڈانسنگ اسکول (۸)، ننگے ڈراموں وغیرہ کے ہال موجود تھے۔ ان سب کے باوجود زیادہ تر

سرمایہ داروں کے گھر رنگین شامیں گذارنے کے اڈے تھے۔

ایسے ماحول میں کچھ لوگ تھے جن کے پاس دو وقت کی روٹی کھانے کو میسر نہ تھی اور تمام زندگی جھونپڑوں میں گذارتے تھے۔ سردی اور گرمی سے بچنے کے لیئے ان کے پاس تحفظ کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔

دوسری طرف شاہ کے تمام محل اور قصور دنیا کے رؤسا و امراء کی عیاشی کے لیے اتنے تھے کہ آسانی سے گننا مشکل ہے۔

۷۔ نوجوانوں کے کیمپ، گھر اور تنظیمیں:

فساد پھیلانے کے نئے طریقوں میں ایک طریقہ شاہی حکومت نے یہ اختیار کیا تھا کہ نوجوانوں کے لیے زبردست بنگلے تیار کروائے تاکہ اس میں ان کی عیاشی اور عریانیت اور سیکسی تجربوں کی تربیت و تعلیم باسانی ہو سکے۔ ان میں سے چار عدد تہران میں قائم کیے گئے۔ اور زیادہ تر پروگرام ان عملیات پر مبنی ہوا کرتے تھے، جن سے نوجوانوں کی شخصیت تباہ کی جاتی تھی۔

اچھی آب و ہوا اور موسمی علاقوں میں حکومت ہزاروں جوان لڑکے لڑکیوں کے لیے کیمپ کے انتظامات کرتی تھی، تاکہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر پوری آزادی کے ساتھ فساد اور انحرافی اعمال کے مرتکب ہوں، ان نوجوانوں کے درمیان حکومت کی طرف سے ان پیشہ ور عورت اور مردوں کا تقرر بھی ہوتا تھا۔ جو جنسی عمل کے نئے سے نئے طریقوں کی تربیت دیا کرتے تھے۔ اس گروہ میں پھنسنے والے زیادہ تر نوجوان دیہاتوں اور قصبوں میں رہنے والے ہوا کرتے تھے، جو آسانی سے ان انسان فریب اشیاء کے اسیر ہو جاتے تھے۔ مذکورہ اداروں کے علاوہ بہائیوں، یہودیوں اور دیگر مذہبی اقلیتوں کے ادارے بھی ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کام کر رہے تھے۔

اس کے علاوہ علمی ادارے بھی صحافتی دورہ معلوماتی سفر، ثقافتی وفود، علمی سیاحت کے نام سے جوان لڑکے لڑکیوں کو ساتھ لے جا کر مذکورہ اعراض و مقاصد کو پورا کر رہے تھے۔ البتہ یہ طریق کار دوسرے طریقوں سے مختلف تھا۔

زیادہ تر تعلیمی اداروں میں تقرر انہیں لوگوں کا ہوا کرتا تھا جو عیاشی اور فساد کے معاملات میں ہر فن مولا ہیں۔

۸۔ مشترک سوئمنگ پول اور پلاژا:

پہلوی دور میں یہ وبا بھی زور شور سے پھیلائی گئی، آوارگی کے یہ اڈے بھی استعماریوں کی شہ پر کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ تمام ملکوں میں سوئمنگ پول فراوانی سے بن چکے تھے۔ اور شہر پلاژا بن

...تھے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کے استعمال اور اس کے نتائج بد اسلامی احکام کے خلاف ہیں۔ ...میں انہیں پھیلایا اور مقبول بنایا جا رہا تھا۔

سابق حکومت نے اچھی آب و ہوا رکھنے والے سمندری علاقوں کے کنارے نہ صرف نئے نئے طرز کے پلاژا جنسی مخالطت اور فساد و بے حیائی کو فروغ دینے کی غرض سے قائم کروائے تھے، بلکہ "دو صدائے دریا" نام سے ایک ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کیا تھا۔ جو ان علاقوں میں شہوت انگیز گانوں کو نشر کیا کرتا تھا جس سے جنسی ہیجان میں مزید اضافہ ہو سکے۔ ان علاقوں میں عیش و عشرت کے لیے ہر ہفتے تقریباً دس ہزار موٹریں جمع ہوتی تھیں۔ سوئمنگ پول تہران کے گوشے گوشے میں پائے جاتے تھے کوئی بھی ہوٹل یا سرمایہ دار کا گھر اس سے خالی نہ تھا، صرف تہران ہی میں (۱۵) مشترکہ اور (۸۲) ورزشی سوئمنگ پول تھے۔

۹۔ ورزش (کھیل کود):

کھیل کود بھی گذشتہ رژیم کے دوران فساد پھیلانے کا بہترین وسیلہ تھا، اس لیے کہ ورزشی مشق اور تربیت کے بہانے جسم کے مختلف حصے تماشائیوں کے سامنے ننگے پیش کئے جاتے تھے۔ ہر کھیل میں شرط اور جوا چلتا تھا، واقعی یا فرضی ہار جیت پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا تھا۔

یہ ایک ایسا طریقہ واردات تھا جو تمام اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور تمام آبادیوں اور محلوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا، صرف تہران میں (۱۹۶) ورزشی مرکز تھے، اس کے علاوہ ایسے رسالے بھی موجود تھے جو صرف ورزشی خبروں کے لیے مخصوص اور صحت بنانے کا خیال رکھنے والوں کو پھانسنے اور غلط مقامات تک لے جانے کا کام کر رہے تھے۔

۱۰۔ شراب کا رواج:

اس کے لیے صرف اعداد و شمار دینا ہی کافی ہے۔ صرف تہران میں غیر ملکی شراب فروخت کرنے کا لائسنس رکھنے والی دکانوں کی تعداد (۸۲) تک پہنچ چکی تھی۔ جبکہ ایران میں بنی ہوئی شراب کی دکانیں (۲۰۷۵) تھیں۔ یہ دکانیں بھی کیا نہیں کرتی تھیں۔

جہاں تک مقدار اور نوعیت کی بات ہے وہ حسب ذیل تھی۔

نوع (قسم)	وزن	ریال میں قیمت
بیئر	۳۹,۶۸۴,۳۵۰ کیلوگرام	۳۰۹,۵۳۶ ر ۴۶۰ ر اریال
شراب (مختلف قسم کی)	۵۵۴,۸۰۰ " "	۸۳,۰۳۲,۲۶۱ "

جین اور وہسکی ۲,۹۸۰,۸۴۹ " " " " ۳۸۳,۸۸۲,۰۶۲ "

۱۱۔ میک اپ اور خوبصورتی میں اضافہ کرنے والی اشیاء استعمال کرنے کی تشویق کے نتیجہ میں نو سال کے دوران ۹,۵۲۳,۶۲۰ کیلو کی فروخت ہوئی جس کی کل قیمت ۱,۷۵,۳۳۶,۱۶۳ ریال ہے۔

۱۲۔ جرائم کی تشویق اور کھلی چھٹی؛

شاہ کی حکومت نے اپنے دور میں نہ صرف جرائم پر پابندی نہیں لگائی، بلکہ تشویق بھی کی ہے جس کا ثبوت پولیس رپورٹ کے مطابق چھ سال کے درج ذیل اعداد و شمار سے ملتا ہے؛

جرائم کے نام	درج شدہ مقدمات	جرائم کے نام	درج شدہ مقدمات
قتل عمد	۶۵۰	قتل غیر عمد	۴۴۵
زخمی کرنا	۸۵۶۵۰ ۸۵۶۵۰	مار پیٹ (لڑائی)	۲۱۷۶۲۹
دھمکی	۱۳۶۴۸	آتش زنی	۱۵۹۰۷
سرکاری اموال میں غبن	۱۳۷۰	جعلی مارکہ بنانا	۶۰۸
دوسروں کا مال ہتھیانا	۱۴۴۹۱	عام لوگوں پر سرکاری عملے کے مظالم	۳۸۱
دشمنی اور دھمکی	۴۵۹۳	تجارتی معاملات میں دھوکہ فریب	۴۱۱۱
جعلسازی	۲۵۲۱	بچوں پر حملہ	۱۵۲۹
جنازوں پر حملہ	۳۸۶	چاقو زنی	۱۵۱۹۰
بغیر رسید کے چیک	۵۷۶۴۱	امانت میں خیانت	۹۲۹۸
چوری کا سامان خریدنا اور بیچنا	۱۴۹۲	رشوت	۳۵۸
بغیر لائسنس ڈرائیونگ	۱۲۵۸۵۵	ہتھیار کے زور پر چوری	۶۴۴
جھوٹی گواہی	۳۷	لوٹ مار	۱۹۰۷۱
مال ہتھیانے کے لیے دھوکہ فریب	۱۲۰۴۱	عمداً زہر دے کر قتل کرنا	۱۰۰۳۰
غیر مسلح لڑائی جھگڑے	۶۰۲۴	مختلف جرائم	۳۴۹۴۳۶

یہ ان جرائم کی فہرست ہے جن کے بارے میں رپورٹیں لکھی ہوئی موجود ہیں، جو رپورٹیں نہیں لکھوائی یا نہیں لکھی گئیں یا لکھی گئیں اور تلف ہو گئیں ان کے اعداد و شمار کیسے مل سکتے ہیں۔ بہر حال اس دور میں سنگین جرائم کی تعداد فراوانی کی وجہ سے ناقابل شمار ہے۔

۱۳۔ نشہ آور چیزوں کی طرف لوگوں کو مائل کرنا:

احساس شخصیت و کردار اخلاق اور انسانی وجود تباہ کرنے کے علاوہ سامراجی عناصر کی جیبوں میں حرام کی دولت بھرنے کا بہترین وسیلہ لوگوں کو نشہ آور چیزوں کی طرف مائل کرنا تھا "نشہ آور چیزوں کا کاروبار" کی عالمی تنظیمیں ہی اس جرم کے فروغ میں حصہ دار نہ تھیں بلکہ شاہ کی بہن اشرف پہلوی کی سرپرستی میں ایران کے بڑے بڑے سرمایہ دار اور اسمگلر بھی یہ بدترین کام کرتے تھے۔ حکومت کا رویہ یہ تھا کہ ظاہری طور پر ان بدعنوانیوں سے مقابلہ کرنے کے پروپیگنڈے شائع کرتی تھی، جبکہ چار برسوں کے دوران ... (۱۹۷۶ – ۱۹۸۰) افیوں کا استعمال سرکاری طور پر ۶۶۴ ٹن اور ۲۲۳ کلو تک پہنچ چکا تھا۔

۱۹۷۹ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق نشہ آور چیزوں کے عادی اشخاص کی تعداد (۱۶۵) ہزار تھی ۱۹۷۶ء سے کر ۱۹۸۱ء تک جتنی مقدار میں نشہ آور چیزوں کا انکشاف ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

نشہ آور کا نام	کیلوگرام	گرام	نشہ آور کا نام	کیلوگرام	گرام
ہیروئین	۲۰۳۶	۲۷۴	مورفین	۲۳۳۴	۵۳۱
افیم	۳۵۱۸۹	۹۵۵	افیم کا گل	۵۷۸	۷۶۷
افیم کا خمیرہ	۴۴۹	۹۴۳	افیم کا مقطر	۱۶۷	۸۵۰
گانجا	۱۷۱۸۳	۴۱۵	دوسری نشہ آور چیزیں	۴.۱۰	۶۷۱
ہیروئین کے کارخانے	۷ عدد		نشہ آور گولیاں	۵۵۶۱۰ عدد	
مریجوانا	۱۰ گرام		عادی ملزموں کی تعداد	۶۲۲۶۳۰	
نشہ آور چیزیں فراہم کرنے والے وسائل کی تعداد	۳۴۸۱۰		کوکین	۷۷۴ گرام	

جہالت و ناخواندگی کے خلاف کام کرنے والے اداروں کا دعویٰ ہے کہ جتنی رقم ان معاملات پر صرف ہوئی وہ (۳۶٬۵۰۰ اسکول قائم کرنے اور ۳٬۶۵۰٬۰۰۰ افراد کو تعلیم دینے میں کام آ سکتی تھی) اس کے برخلاف موجودہ اعداد و شمار کے مطابق ہر ایک ملین افراد کے درمیان ۲۵ ہزار افراد نشہ آور چیزوں کے عادی ہیں۔

۱۴۔ دوسرے ذرائع

بدکاری و غیر اسلامی و غیر انسانی حرکات کو فروغ دینے کے وسائل کا تفصیلی ذکر تو ممکن نہیں مگر چند وسائل و ذرائع پر ایک نظر ڈالتے چلیں:

الف) گمراہ کن اغراض و مقاصد کے لیے، مجسمہ تراشی، نقاشی اور موسیقی وغیرہ سے کام لینا۔ آرٹ گیلریاں۔ کلاسیکی میوزک سینٹر جیسے دل کش ناموں سے فریفتہ کرنا۔

ب) شعر و شاعری، کہانیاں اور ادبی موضوعات کو اسی مقصد کے لیے کام میں لانا۔
ج) لوگوں کو مغربی طرز کے لباس پہننے، طور طریقے اور رہن سہن کے انداز کی ترغیب دلانا۔
د) فساد کی لو بھڑکانے میں یہودی عناصر کو کھلی چھوٹ دینا۔
ھ) ننگی فلمیں خاص طور پر ویڈیو فلموں کی نشر و اشاعت۔
و) لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان غیر اخلاقی خطوط لکھنے کو بڑھاوا دینا۔
ز) مشکلیں ایجاد کرکے، تجارت، اقتصاد اور زندگی کے تمام شعبوں میں سود کو رائج کرنا۔
ح) تعلیم کی باگ ڈور ان افراد کے سپرد کرنا جو شہد کے نام پر زہر دیتے، قدیم ترین قومیت کے فلسفے کو محبوب بناتے اور اسلامی تحریکات کو سامراج یا سامراجی منصوبوں کا نام دیتے تھے اور نئی نسل کو گمراہ کرنے کی تربیت حاصل کیے ہوئے تھے۔
ط) تمام بڑے اور چھوٹے ہوٹلوں میں جوے کو عام کرنا، ریس اور دوسرے کھیلوں میں شرط بازی کو فروغ دینے کی مہم چلانا۔

فساد پھیلانے کی مہم:

فساد کے تمام وسائل کی رنگارنگی، ان کے اثر، ان کی گہرائی اور نتائج پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ تباہی کے سپرد کیے جا چکے تھے وہ لوگ گمراہی کی راہ پر چلنے اور اسلامی اصول و تعالیم کی بے حرمتی کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں کوئی شخص اگر فردی تکامل کی راہ طے کرنا اور اپنی اصلاح کرنے کے بعد سماج اور معاشرے میں سدھار لانا چاہے تو یہ تمام امور اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے تھے اور اچھائی کچلتے، رائی کو بڑھاوا دیتے تھے۔

یہ سب وسائل اور راستے صرف لذت اور دنیا کو سب کچھ سمجھنے سمجھانے کے لیے تھے۔ اس کے عقیدوں کے رخ موڑے گئے۔ انسانیت کو حیوانیت کی طرف لوٹایا گیا، آخر اس کا عذاب بھی آیا۔ قرآن مجید نے سچ فرمایا ہے:

ثم کان عاقبة الذین أساؤا السوأی ان کذبوا بآیات الله۔

انسانیت دشمن، صیہونی اور سامراجی عناصر مادی زندگی کے طور طریقے محض اس لیے رائج کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ تمام رکاوٹیں ختم ہو جائیں گے۔ اور وہ آسانی سے قوم اور عوام کا خون چوس سکیں گے۔

اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ تر اسلامی ممالک اس کی زد میں ہیں (مادی زندگی کی لذتوں کے سیلاب)، لہذا ہم اس معاشرے کو بھی اسلامی معاشرے کا نام نہیں دے سکتے۔

قرآن

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست — زیر گردوں سر تمکین تو چیست

آن کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم

نوع انساں را پیام آخریں — حامل او رحمۃ للعالمین

از جہاں بانی نواز د ساز او — مسند جم گشت پا انداز او

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

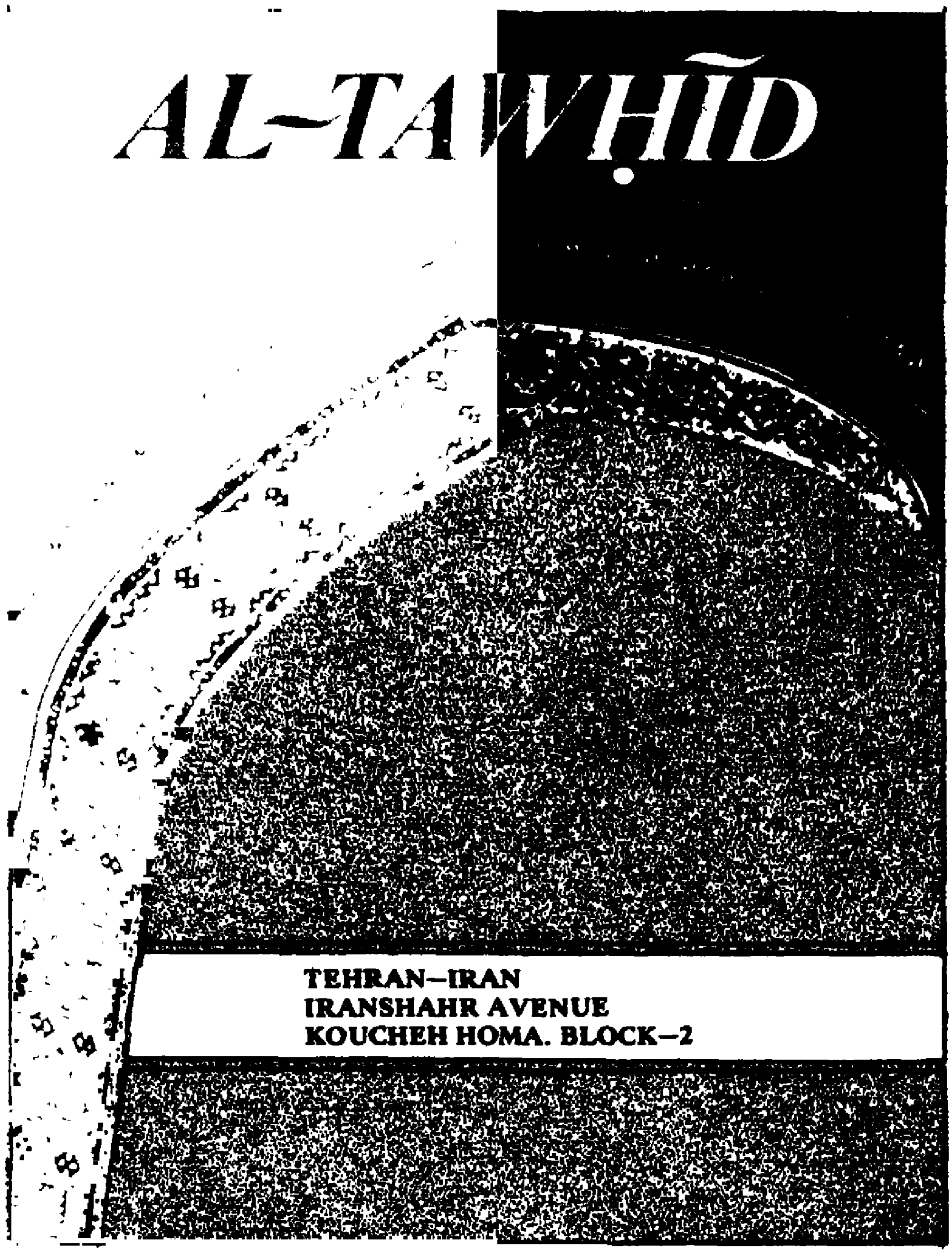
رمز قرآں از حسینؓ آموختم
زاتش او شعلہ ہا اندوختم

اقبال

علم و دین

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم
وہ علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

اقبال


AL-TAWḤĪD
TEHRAN–IRAN
IRANSHAHR AVENUE
KOUCHEH HOMA. BLOCK–2

توحيد ١٦٥

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۶ – ۵۱

جمہوری اسلامی ایران – تہران

فارم ممبری

براہ مہربانی درج ذیل پتے پر مجلۂ توحید اردو ارسال فرمادیا کریں۔

از .... تا ....

نام .... کوچہ .... روڈ ....

شہر .... صوبہ .... ملک ....

تاریخ .... دستخط

بدل اشتراک

ملک	فی مجلّہ	سالانہ
اسلامی جمہوریہ ایران	۱۵۰ ریال	۵۰۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے	۵۰ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم	۳۲ درہم
سعودی عرب	۸ ریال	۳۲ ریال
قطر	۸ ریال	۳۲ ریال
کویت	۶۵۰ فلس	۲½ دینار
افریقہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ	۸ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
کینیڈا	۴½	۱۸ ڈالر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

توحید

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد (۱) شمارہ ۲

ترتیب

جمہوری اسلامی ایران
مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۶ - ۵۱ تہران
فون ۲۵ - ۸۲۵۰۲۲

شعبان ۱۴۰۴ھ تا شوال ۱۴۰۴ھ - مئی ۱۹۸۴ء تا جولائی ۱۹۸۴ء

بسم الله الرحمن الرحيم

شذرہ

(۱)

توحید کا دوسرا شمارہ یوم بعثت، ۲۷، رجب کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ شعبان، توحید کے سب سے بڑے محافظ کا مہینہ ہے، رمضان سے پہلے شعبان بڑی معنی خیز ترتیب ہے۔ پیام و عمل، ذات اور کردار، شخصیت اور آثار کا زمانہ۔ اہل فکر و نظر کے لیے خود آگاہی و خود سازی کے یہی دن ہیں۔

پلاسٹک کے پھول، اور چمن ناز پرور کے نازک و نرم لالہ و گل، شاید دید سے ایک ہوں مگر صاحب ذوق کے لیے ایک میں خوشبو ہے ایک نقلی۔ طوطی شیریں زبان و بلبل ہزار داستاں دیکھیے اور نفیس و دلکش تصویر جسے بہترین مصوّر نے موقلم سے بنایا ہو سامنے رکھیے ایک کی صدا سامعہ نواز ہے ایک نظر فریب۔ حقیقت و مجاز، اصل و نقل، سچ اور جھوٹ کی بات یہیں سے چلتی ہے۔ علم و فکر و نظر کی کسوٹی یہ ہے اصل کی پرکھ اور انتخاب۔ ورنہ نقش بدیوار مجسّمہ اور انسان میں فرق ہی کیا رہے گا۔

دنیا کا سب سے بڑا عقلی و فکری پیام عقیدۂ توحید ہے۔ یہ عقیدہ ضمیر بشر کی بیداری آدم زاد کی قدر افزائی اور انسانیت کی آبرو ہے — اللہ — واحد و یکتا ہے۔ بے مثال و بے مانند ہے۔ جمال و جلال، علم و قدرت۔ غرض "خلق و امر" سب کچھ اس کا ہے جو اس کا ہے وہ سب سے بالا ہے۔ کوئی کسی کا بندہ نہیں، سب اشرف المخلوقات، سب خلیفۃ اللہ ہیں۔ بس بات آئین ماننے نہ ماننے کی ہے۔ جو اس کا قانون مانتا ہے، جو اس خالق کو مالک گردانتا ہے وہ سربلندیاں حاصل کرتا اور عزت و آبرو پاتا ہے۔ انّ اکرمکم عند اللہ

اتقاکم" اس بنیادی فلسفہ کا نتیجہ ہے کہ درس تقوی کے متن قرآن اور اس کی شرح سنت و تعلیم نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری دستاویز نجات بشر قرار دیا گیا۔ اس کو محفوظ رکھنے، انحراف و تحریف سے بچانے کے لیے یہ انتظام ہوا کہ: حضور سرور دو عالم نے فرمایا: انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اهل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی حتی یردا علی الحوض

دو چیزیں ہم وزن اور بھاری چھوڑ رہا ہوں۔ کتاب اللہ۔ اور عترت یعنی میرے اہل بیت۔ جب تک ان دونوں سے وابستہ رہو گے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ یہ دونوں جنت میں حوض (کوثر) پر ایک ساتھ میرے پاس آئیں گے۔

- قرآن علیؑ کے ساتھ اور علیؑ قرآن کے ساتھ۔
- میں علم کا شہر، علیؑ اس کا دروازہ۔
- حسنؑ و حسینؑ دونوں امام ہیں، صلح کریں یا جنگ۔
- حسینؑ منی و انا من الحسینؑ۔

یہ سال امام حسین علیہ السلام کی ولادت کا اہم ترین سال ہے، شعبان ۱۴۰۴ ہجری کو امام حسین علیہ السلام کی ولادت مبارک کو چودہ سو برس گذر چکے ہوں گے۔ پندرھویں صدی کا یادگار دن سب مسلمانوں کو مبارک ہو۔

امام حسینؑ، اسلام کی تعامہ، شریعت اسلام کے مسیحا، رسول اللہ کے جانشین اور اللہ کے خلیفہ برحق، مسلمانوں کے تیسرے امام ہونے کی بہت سی جہتوں کے مالک ہیں۔ نسل رسولؐ ان سے چل رہی ہے۔ تفسیر سورۃ کوثر ہیں۔ کلمہ ہرگزند سے محفوظ ہے۔ اعلان الیوم اکملت لکم دینکم کے ذمہ دار ہیں۔ دین میں خلل ڈالنے والے طاغوت اکبر کا مقابلہ کرکے ہمت بڑھانے والے قائد توحید و حکومت ربانی ہیں۔ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربك راضیۃ مرضیۃ کے مخاطب ہیں۔

اس امام ہمام پر لاکھوں سلام۔ اللھم صل علی محمد وآل محمد۔

امام حسین علیہ السلام ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے یا فرزند ہیں ۔ علی و فاطمہ سلام اللہ علیہا کے بیٹے ہیں ۔ سب کو معلوم ہے ۔ مگر فلسفی دوران جناب علامہ اقبال ان رشتوں کو جس انداز سے دیکھتے اور سمجھاتے ہیں ہم اسی کو دستاویز نجات بشر سمجھتے ہیں ۔

امام حسینؑ کے والد بزرگوار

مسلم اوّل، شہ مردان، علیؑ
عشق را سرمایۂ ایمان علیؑ

از ولای دودمانش زنده ام
در جہان مثل گہر تابنده ام

نرگسم وارفتۂ نظاره ام
در خیابانش چو بو آواره ام

زمزم ار جوشد ز خاک من ازوست
می اگر ریزد ز تاک من، ازوست

خاکم و از مہر او آئینہ ام
می توان دیدن نوا در سینہ ام

از رخ او فال پیغمبرؐ گرفت
ملت حق از شکوہش فر گرفت

قوت دین مبین فرموده اش
کائنات آئین پذیر از دوده اش

مرسلؐ حق کرد نامش بوترابؑ
حق "یداللہ" خواند در امّ الکتاب

(اسرار و رموز)

سیّدۃ النساءؑ والدۂ امام حسینؑ

مریمؑ از یک نسبت عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز

نورِ چشم رحمۃ للعالمینؐ
آن امام اولین و آخرین

آنکہ جان در پیکر گیتی دمید
روزگار تازه آئین آفرید

بانوی آن تاجدار "ھل اتیٰ"
مرتضیٰ، مشکل کشا، شیر خدا

پادشاه و کلبۂ ایوان او
یک حسام و یک زره سامان او

ما زِ آن مرکزِ پرکارِ عشق　　ما در آن کاروان سالارِ عشق
آں یکی شمع شبستانِ حرم　　حافظِ جمعیتِ خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کین　　پشت پا زد بر سرِ تاج و نگین
واں دگر مولای ابرارِ جہاں　　قوتِ بازوی احرارِ جہان
در نوائے زندگی سوز از حسینؑ　　اہلِ حق حریت آموز از حسینؑ

مولود شعبان

بنائے "لا الٰہ الا اللہ" حسینؑ

آن امامِ عاشقان، پورِ بتول　　سروِ آزادی ز بستانِ رسولؐ
اللہ اللہ، بای بسم اللہ پدر　　معنیٔ "ذبح عظیم" آمد پسر
بہرِ آں شہزادۂ خیر الملل　　دوشِ ختم المرسلینؐ نعم الجمل
سرخ رو عشقِ غیور از خونِ او　　شوخیٔ این مصرع از مضمونِ او
درمیانِ امت آن کیوان جناب　　ہمچو حرفِ "قل ہو اللہ" در کتاب
موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید　　این دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوتِ شبیریؑ است　　باطل آخر داغِ حسرت میری است
چون خلافت رشتہ از قرآں گسیخت　　حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آن سر جلوۂ خیر الامم　　چوں سحابِ قبلہ باران در قدم
بر زمینِ کربلا بارید و رفت　　لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطعِ استبداد کرد　　موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہرِ حق در خاک و خون غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

(۲)

جمادی الاولی ۱۴۰۴ھ، یعنی مجلہ توحید کی رونمائی کے موقعہ پر تہران میں بین الاقوامی اجتماع ہوا۔ افریقہ، ایشیا، یورپ اور امریکہ سے سینکڑوں دانشوروں نے شرکت کی۔ یہ "دومین کنفرانس اندیشۂ اسلامی" کا موقع تھا۔ ہوٹل استقلال (سابق ہلٹن) میں معزز مہمان فروکش تھے۔ اور تین دن اسی ہوٹل کے ہال میں کانفرنس کے دو سیشن ہوتے تھے۔

کانفرنس کا موضوع تھا "قرآن کریم" محققین و اساتذہ، علماء و مفکرین نے اپنی اپنی پسند کے موضوع تلاش کیے، قرآن مجید کو خصوصی نظر سے پڑھا اور بڑی محنت سے مقالے لکھے۔ یہ مقالے عربی، انگریزی، فارسی و اردو میں حاضرین کو مہیا کیے گئے اور بروقت ان چاروں زبانوں میں ترجمہ سے نوازا گیا۔ خوش خبری یہ ہے کہ ان مقالوں کو "التوحید" عربی میں شائع کیا جاچکا ہے ـــ اور ہم بھی آپ کی خدمت میں چند مقالے پیش کر رہے ہیں۔

کانفرنس کا آغاز جناب سید علی خامنہ ای، صدر جمہوری اسلامی ایران کے فکر انگیز پیام سے ہوا اور آخری نشست میں جناب ہاشمی رفسنجانی، اسپیکر مجلس شورای اسلامی (پارلیمنٹ) نے اپنی زندگی اور قید کے دنوں، انقلاب کے دوران، نیز مختلف جہات میں قرآن حکیم کی رہنمائی، غمگساری، ہمت آفرینی اور معجزنمائی کے خود گذشت حقائق سنا کر عرفان آشنا کیا۔

جن حضرات نے بین الاقوامی کانفرنسیں دیکھی ہیں وہ کہہ رہے تھے یہ کانفرنس جس قسم کی ثقافتی، علمی اور عملی فضا سے ہم آہنگ تھی ویسی کیفیت کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ پینتیس سے زیادہ مقالے اور متعدد تقریریں ہوئیں۔ لیکن شرکاء دل تنگ ہونے کے بجائے محو سماعت تھے اور اکثر اعلان خاتمۂ اجلاس پر لوگ کہتے تھے کہ وقت گذرتے معلوم نہیں ہوا۔

تفسیر

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

يا ايها الناس اعبدوا

ربكم الذي خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون ۝

الذي جعل لكم الارض فراشا والسماء بناء و

انزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لكم فلا

تجعلوا لله اندادا وانتم تعلمون ۝ وان كنتم في ريب مما

نزلنا على عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهداءكم

من دون الله ان كنتم صادقين ۝ فان لم تفعلوا ولن

تفعلوا فاتقوا النار التي وقودها الناس والحجارة اعدت

للكافرين ۝ وبشر الذين امنوا وعملوا الصالحات ان

لهم جنات تجري من تحتها الانهار كلما رزقوا منها

من ثمرة رزقا قالوا هذا الذي رزقنا من قبل واتوا به

متشابها ولهم فيها ازواج مطهرة وهم فيها خالدون ۝

ان الله لا يستحي ان يضرب مثلا ما بعوضة فما فوقها

فاما الذين امنوا فيعلمون انه الحق من ربهم واما الذين كفروا

فيقولون ماذا اراد الله بهذا مثلا يضل به كثيرا ويهدي

به كثيرا وما يضل به الا الفاسقين ۝ الذين ينقضون

عهد الله من بعد ميثاقه ويقطعون ما امر الله به ان يوصل

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ كَيْفَ تَكْفُرُونَ
بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ
تُرْجَعُونَ ۝ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ
اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمٌ

ترجمہ

(الف) لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا تاکہ تم اس سے تقویٰ اختیار کرو (۲۱) جس نے زمین کو تمھارا فرش اور آسمان کو سائبان بنایا اور بلندی سے پانی برسایا پھر اس سے اناج، پھل، پیدا کیے جو تمھارا آذوقہ ہے۔ پھر اب تو جان بوجھ کر اللہ کے حریف (و شریک) نہ بناؤ (۲۲)

(ب) ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر نازل کیا (اس کے بارے میں)، اگر تمھیں کچھ شک ہو تو ایک سورہ ایسا ہی بنا لاؤ! اور اپنے حاضر باشوں کو بھی بلا لو۔ اللہ کے علاوہ۔ اگر تم سچے ہو (۲۳) پھر اگر ایسا نہ کر اور ہرگز نہ کر سکو گے، تو اس آگ سے بھی ڈرتے رہو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں وہ آگ صرف کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (۲۴)

(ج) اور بشارت دیجیے، ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو، ان لوگوں کے لئے حتمی طور پر باغ ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہیں اور جب بھی انھیں کھانے کے لئے ان میں سے کوئی پھل ملے گا تو وہ

کہیں گے یہی تو ہم کو پہلے بھی (دنیا) میں دیا جا چکا ہے۔ حالانکہ انھیں
(دنیا کے میووں سے) ملتے جلتے (پھل اور میوے) دیے جائیں گے
اور ان کے لئے ان باغوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ سب
ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۵)

(ی) بے شک اللہ کو مچھر کی مثل بیان کرنے میں کوئی شرم نہیں، نہ اس سے
بڑھ کر کسی مخلوق کی اب مومن تو جانتے ہی ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے
ہے اور برحق ہے۔ رہے کافر تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا اس مثل سے مقصد
کیا ہے؟ اللہ، اس سے بہت سے لوگوں کو توفیق ہدایت سے محروم کرتا اور
بہت سے لوگوں کو توفیق ہدایت دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے صرف فاسقوں
کو گمراہ کرتا ہے (۲۶) جو اللہ سے عہد و پیمان کرکے پھر توڑ دیتے
ہیں اور جن سے اللہ نے وصل کا حکم دیا اس سے فصل کرتے ہیں اور
ایسے ہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں (۲۷)

(ک) تم لوگ اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے اس نے
تمھیں جان عطا کی، پھر تم کو موت دے گا پھر تم کو دوبارہ زندہ کریگا
پھر تم اس کے حضور میں حاضر کیے جاؤ گے (۲۸) وہی اللہ تو ہے
جس نے زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمھارے لئے پیدا کیا، پھر
آسمان کی جانب توجہ فرمائی، تو برابر د ہموار سات آسمان بنائے اور
وہی ہر چیز کا کما حقہ علم رکھنے والا (۲۹)

۲۱۔ یَا اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا . . . .

قرآن مجید میں "یا ایھا الناس" بیس جگہ آیا ہے اور اس خطاب کے بعد اللہ نے اپنی
عطا کردہ نعمتیں یاد دلائی ہیں، مثلاً سورۃ النساء کی ابتدا ہے "یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی
خلقکم" لوگو! اپنے اس رب سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔
یہ بتایا جا چکا ہے قرآن متقین کے لئے ہدایت ہے۔ اس کے بعد تمام انسانوں کو مخاطب کیا

جا رہا ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ قرآن تم سے بات نہیں کرتا۔ اللہ نے تو سب کو پیدا کیا ہے، سب کو زندگی کی نعمت دی ہے وہ سب کو کامل و معزز بنانا چاہتا ہے۔ اس کا خطاب سب سے ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو وہ معبود ہے، عبادت کروگے تو منزل تقوی تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ کافر و منافق چونکہ عبادت و اطاعت ہی نہیں کرتے اس لئے ہم انھیں قابل خطاب نہیں سمجھتے۔

۲۲- اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ....

اللہ نے تم کو پیدا کیا اور کائنات کو تمھارے لئے آسائشوں کا گہوارہ بنایا، غور کرو کتنی بڑی زمین تمھارا فرش پا انداز ہے۔ اس کو روندو، اس کو جوتو، اس کے شکم سے پھل پھول اور غذا اور لذت آفریں چیزیں پیدا کرو۔ یہ تمھاری ہے، تم اس کے مختار ہو۔ آسمان کو چھت بنایا، یہ ہوا کی تہہ بہ تہہ شفاف چادریں جو کشش زمین کی حد بندی کرتی ہیں تمھاری زندگی کے لیے کتنی ضروری ہیں؟ پھر اس سخت زمین پر پانی برسایا، جس سے اناج اور پھل پیدا کئے۔ یہ سب تمھارے لیے ہے۔ اتنے مشاہدات و دلائل یکتائی کے بعد تو کسی کو اللہ کے برابر نہ جانو۔ وانتم تعلمون (اور تم جانتے ہو) یعنی تمھاری فطرت آزاد اور ضمیر بیدار جانتی ہے کہ بت ہوں یا مصنوعی خدا اور بادشاہ ہو یا اس جیسا کوئی اور طاغوت نظام ربوبیت کا مالک نہیں ہو سکتا۔ پھر غیروں کے سامنے کیوں سر جھکاتے ہو؟ کرامت بشریہ ہے کہ وہ صرف خدا کے سامنے جھکے۔

۲۳- وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا ....

یہ قرآن جس کے بارے میں مومن و متقی کو تو شک ہے ہی نہیں، اگر تم (کافروں/منافقوں) کو اس وحی و کتاب میں شک ہے تو اس کا جواب لاؤ، چلو، ایک سورہ ہی اس جیسا لکھ لاؤ، اکیلے نہیں لکھ سکتے تو یہ لوگ جو ہر وقت تمھارے ساتھ رہتے سہتے، علم و دانش کا

ﻟﻪ قال ابو اسحٰق الشهيد من اسماء الله الامين فى شهادته. قال وقيل، الشهيد الذى لا يغيب عن علمه شئ. والشهيد الحاضر (لسان العرب)۔ شہید: اللہ کا نام، گواہی میں امین۔ وہ ذات جس کے

دم بھرتے ہیں، انہیں بلاؤ باہم صلاح مشورہ کرکے جواب تیار کرو۔ مگر یاد رہے کہ قرآن کا جواب نہیں ہوسکتا۔ لوگوں نے اسلام کے خلاف سب کچھ کیا، مگر دنیا کے دانشوروں نے آج تک قرآن کے ٹکر کی کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ معاصر حریفوں سے لے کر آج تک کے دشمن جواب قرآن لانے سے عاجز تھے اور ہیں، اسی کو معجزہ کہتے ہیں (عاجز بنانے والی شے)

۲۴۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ ....

اور اگر جواب نہ لاسکے — اور ہرگز قرآن کا جواب نہ لاسکو گے ۔ تو پھر اس آگ سے بچنے کی تدبیر سوچ لو، جس میں انسان اور پتھر (بت) ایندھن کا کام دیں گے خود بھی جلیں گے دوسروں کو بھی جلائیں گے ۔ اور جہنم سے بچنے کی تدبیر قبول اسلام اور اطاعت خدا و رسولؐ و ائمہؑ ہے۔

۲۵۔ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ....

اللہ، رسول اور تعلیمات قرآن پر اعتقاد کامل کے ساتھ عمل صالح کرنے والے مومنوں کو جنت کی بشارت ہے۔ عمل صالح سے مراد وہی اچھے کام ہیں جو قرآن و سنّت کے مطابق ہوں۔ جو کام صرف ہمارے آپ کے نزدیک اچھے ہیں۔ انھیں اللہ و رسول و ائمہ بھی اچھا کہیں، ضروری نہیں ہے ۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہم کلمہ پڑھنے کے بعد فکر و عمل میں ان حضرات کے پابند ہیں یا وہ ہمارے مؤید ہیں ؟ دراصل شریعت نے جیسے معروف کہا، شریعت نے جسے واجب یا سنت کہا وہی اچھا ہے اور ہمیں اپنی پسند کو فقہ کی روشنی میں پرکھنا چاہیے کہ عمل کا پیمانہ ہی اتباع رسول و ائمہ ہے ۔ گذشتہ آیت میں جہنم کا بھیانک نقشہ دو لفظوں میں کھینچا اور یہاں جنت کا حال تین سطروں میں ہے کہ غضب پر رحمت

؎ علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو۔ شہید حاضر کو کہتے ہیں (لسان) "ولقد شھدت الخیل یوم طرادھا" فوج کشی کے دن میں ساتھ تھا قوم شہود، حاضر لوگ۔ شاھد، وہ باپ جو ہمیشہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہے جیسے اس سے نتھی ہو (الذی یخرج مع الولد کانہ مخاط) آیت میں وادعوا شھداءکم من دون اللہ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے مدعیان علم ساتھیوں ہر وقت ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کو بلاؤ، اللہ کے سوا۔

کا غلبہ سمجھ میں آئے۔ جنتیں ایسی جس کے نیچے چشمے رواں، نہریں اور دریا بہتے ہوئے، پھلوں سے لدے درختوں کا جو میوہ جنتیوں کو دیا جائے گا وہ ان کے لئے شک و اجنبیت سے بلند ہوگا۔ وہ نفسیاتی طور پر صورت آشنا ہوں گے۔ تعجب سے کہیں گے ارے یہ تو ہم کھا چکے ہیں۔ حالانکہ وہ بعینہ وہ نہ ہوگا۔ اس میں پاک پاکیزہ زندگی کی رفیق ہوں گی۔ یہ مومن و خوش عمل اس عالم میں دوامی طور پر رہیں گے۔

۲۶۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا ....

مثال بیان کرنا مثل اور ضرب المثل اعلے ادبی کلام میں حسن بڑھانے والی چیزیں ہیں خصوصًا قادر الکلام ادیب کے قلم و زبان سے۔ مگر کچھ لوگوں کو خوردہ گیری کی عادت ہوتی ہے۔ خود لکھ نہیں سکتے لکھنے والوں کے عیب ہی بیان کرنے کو استادی جانتے ہیں۔ قرآن نے جو اسلوب بیان رکھا ہے اس میں، امثال کا ایک فکری اور تفہیمی مقام ہے۔ مثلاً عاجزی و بے چارگی کے لئے:

ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا
لہ وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ضعف
الطالب والمطلوب

سورۂ عنکبوت کی اکتالیسویں آیت ہے:

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت
اتخذت بیتا وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون

ایک آیت میں مشرکوں کے دیوتاؤں کی مجبوری بتائی ہے کہ ان کے جسم پر مکھی بیٹھی ہو تو ہلا نہیں سکتے ان کا کچھ اٹھالے تو مکھی سے چھین نہیں سکتے۔ دوسری آیت میں خود مشرکوں کی بے بسی کا حال سمجھایا ہے کہ یہ ایسے ہیں جیسے مکڑی اپنے گرد جالا تنتی ہے اسے گھر بناتی ہے، یہ بھی عقائد کے کمزور جال میں پھنسے ہیں نہ اس کے جال میں قوت نہ ان کے عقیدے میں جان۔

چاروں مثالیں اپنی معنویت میں کتنی جاندار ہیں اسے تو ارباب ادب ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو اعتراض تھا یا ہے تو ان سے خطاب ہے کہ اللہ کو مکھی مچھر کی مثال بیان کرنے میں شرم کے بجائے حکمت آفرینی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو محمدؐ کو سچا جان چکے ہیں وہ ان حقائق کو اپنے رب کی حقانیت کی دلیل سمجھتے ہیں اور جن کا کام حق کا انکار ہے وہ ان کا مقصد سمجھنے سے عاری ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ان باتوں سے بہت لوگ گمراہ اور بہت لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے"۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ اس اسلوب بیان سے گمراہ وہی ہوں گے جو اچھائی کی مخالفت اور حق سے انحراف کو اپنا شیوہ بنا چکے ہیں۔

۲۷۔ اَلَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ ....

فاسق، کل کے لوگ ہوں یا آج کے، ان کی پہچان یہ ہے کہ اللہ سے پختہ عہد کر کے اس سے منحرف ہو گئے ہوں، اللہ نے جن رشتوں کو مضبوط کرنے کا حکم دیا ہے انھیں توڑنا اور زمین میں فتنہ و فساد کرنا ان کا مشغلہ ہو۔ تعلیم اسلام کے مطابق یہ لوگ معاشرے کے غلط افراد ہیں، اور ان کو اس رویّے سے کبھی فائدہ نہ ہوگا۔

عزیزوں سے حسن سلوک اسلامی اخلاق کا اہم ترین ستون ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے متعدد احادیث و واقعات موجود ہیں جن میں سے ایک حدیث یہ ہے "صلۂ رحم سے بستیاں آباد ہوتی ہیں، عمریں بڑھتی ہیں خواہ وہ لوگ نیک نہ بھی ہوں"۔ دوسری حدیث ہے: "اپنے رشتے داروں سے حسن سلوک کرو خواہ ایک گھونٹ پانی ہی کیوں نہ ہو سب سے بہتر صلۂ رحمی یہ ہے کہ ان سے ان کے دکھ دور کرو۔"

۲۸۔ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَکُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا ....

فاسقوں اور منکروں کو سمجھنا چاہیے کہ معدوم تھے موجود کیا، موجود ہو، موت پاؤ گے، مرنے کے بعد زندہ ہوگے، پھر اسی قادر و خالق کے حضور میں جواب دہی کے لئے حاضر ہوگے۔ ایسے اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو، سوچو اور غور کرو۔

آواگون (تناسخ)، اس آیت سے باطل ہوتا ہے کہ موت محض اور فنا سے زندگی اور زندگی سے موت اور پھر خدا کے حضور میں حاضری کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں آنے سے پہلے کچھ نہ تھے اور موت بعد زندگی کے بعد قیامت تک موت ہی موت ہے۔

رجعت کا عقیدہ چونکہ سب انسانوں کی واپسی نہیں بلکہ خاص تعداد کی زندگی پر مبنی ہے اور آیت عمومی بحث کر رہی ہے اس لیے استثنا میں کوئی خلل نہیں اور استثنا بھی قرآن ہی میں ہے۔

۲۹. هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ....

آیت میں زمین میں آسائش حیات پر انسان کی ملکیت اور برتری کے عظیم انعام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ غور کرنا چاہیے نیست سے انسان کو ہست کرنے والے معبود نے اس کے لئے کیا کیا انتظام فرمائے ہیں؟ پہلے یہ آدم زاد فقط زمین کی مخلوق اور حقیقتوں کو تو دیکھے، کیا وہ اس زمین اور اس کی ساری مخلوق کو سمجھ گیا؟ پھر اس کے سات آسمانوں کی تہہ دریافت کرے اور یہ بھی طے کرلے کہ وہ قادر مطلق ہے یا عاجز؟ اور جب بڑے سے بڑا سائنس دان ہر مرحلۂ کامیابی پر یہ کہے کہ یہ کام نقطۂ آخر نہیں خدا جانے کل کیا بات نئی معلوم ہو تو ماننا چاہیے کہ اللہ ہی ہر چیز کا عالم و دانا ہے، ہمیں تو جتنا بھی علم ملتا جائے کم ہی ہوگا اور ناواقفیت باقی ہی رہے گی۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ
خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝
وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ
أَنبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ

لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ
يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَاۗىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ
لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ
وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

ترجمہ

اور جب تمھارے رب نے ملائکہ سے فرمایا: میں زمین پر خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ ان سب نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے کو (خلیفہ) بنائے گا جو وہاں فساد کرے اور خوں ریزی کرے، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں! فرمایا: جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (۳۰) اور آدمؑ کو سب نام بتائے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اس کے بعد انھیں حکم دیا: اگر تم سچے ہو تو ان کے نام مجھے بتاؤ (۳۱) ملائکہ نے عرض کی: تیری شان عالی! ہمیں تو اتنا ہی معلوم ہے جتنا علم تو نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ بے شک علم و حکمت کا مالک تو ہی ہے (۳۲) حکم دیا: اے آدمؑ! ان کے نام ملائکہ کو بتا دو۔ چنانچہ جب آدمؑ نے ان کو نام بتلائے تو، (اللہ نے) فرمایا: کیوں؟ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان و زمین کی پوشیدہ باتوں سے آگاہ ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کر رہے ہو اور جو کچھ چھپا رہے ہو اس سے بھی خوب واقف ہوں (۳۳) اور جس وقت ہم نے ملائکہ سے کہا: آدمؑ کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اس نے انکار کیا، وہ اکڑ گیا اور (نتیجہ یہ ہوا کہ) کافروں میں ہوگیا (۳۴)

۳۰۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ ....

چونکہ قرآن میں یہ پہلا واقعہ پڑھ رہے ہیں اور معجزہ کی بات یہ ہے کہ پہلا واقعہ آیا تو پہلے ہادی اور ابوالبشر کا ہے، اس لئے غور کرنے کا مقام اور فکر کی جگہ ہے۔ یہ بات

اس زمان و مکان ، اس پس منظر اور ماحول سے متعلق ہے جس کا آج کے فکری ماحول اور زمان و مکان و زبان و بیان میں اندازہ لگانا اور مسئلہ کو سمجھنا سمجھانا بے حد مشکل یا ناممکن ہے۔ بات اس وقت کی ہے جب خدا جانے کس عالم میں صدا گونجی کہ ہم زمین پر "خلیفہ" بنانے والے ہیں۔ پھر ملائکہ نے تخلیق آدمؑ کا منظر دیکھا۔ خالق کل نے ارادۂ کن سے آدم علی نبیینا و علیہ السلام کو خلق فرمادیا۔ اس نے موجودِ اول بشر کی تخلیق کا پس منظر بتا کر غیب سے ایک پردہ اٹھایا تو ہم چیخ اٹھے۔ یہ خمیرِ آب و گل کہاں ہوا؟ کیسے ہوا؟ ملائکہ نے آدمؑ کو سجدہ کیوں کیا؟ سجدہ کس قسم کا تھا؟ پھر یہ سوال کہ آدم کو تعلیم دیکر ملائکہ سے مقابلہ کیوں کرایا؟ کلمات کیا تھے؟ آدم کس اور کہاں کی جنت میں تھے؟ درخت کون سا تھا؟ شیطان جنت میں کیسے پہنچا؟ شیطان نے آدم علیہ السلام کو گمراہ کیسے کیا؟ آدم نے گناہ کیا؟ بے شمار سوال اور بے حساب شبہے پیدا ہوتے ہیں۔ یقیناً انسان کا ذہن بال کی کھال نکالنا چاہتا ہے۔ مگر جوشِ طلب کے ساتھ ہوشِ قوت پرواز پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔ سوچنا چاہیے کہ ہمیں ماضی کی بات سمجھنا مشکل ہوتی ہے چہ جائے کہ ماضی سے پہلے کی بات۔

قصۂ تخلیق آدم علیہ السلام کے بارے میں قرآن نے کئی جگہ اشارے کئے ہیں جس ہمیں کم از کم یہ ہدایت ضرور حاصل ہوتی ہے کہ انسان اول مسجودِ ملک ہے۔ خلیفۂ مخصوص ہے۔ علم میں ملائکہ سے افضل ہے۔ اس کی آمد کا اہتمام ہوا، اس کی تخلیق سے پہلے عالم نور و حضور، فضا رحمید و تکبیر و تہلیل میں ایک آواز گونجی: "ہم زمین پر ایک خلیفہ بنانے والے ہیں"!

مخلوقِ نور و سجادہ نشینانِ قدس نے آرزومندیِ منصب کے لہجے میں عرض کی: تیری مصلحت ہے، تو ہی مالک و مختار ہے، مختلف عناصر و اجزا، مختلف رجحانات و خواہشات رکھنے والا انسان تو زمین میں فساد و خونریزی ہی کرے گا۔ اس کے مقابلے میں ہم تیرے تسبیح خوان اور فقط تیرے ہی عبادت گذار فرشتے ہیں: نیک ہی نیک، پاک ہی پاک۔ جواب ملا: میرے علم و حکمت کی تمہیں کیا خبر!

۳۱ - ۳۳ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ ....

خلافت کے مستحق اور خلافت کے امیدواروں میں مقابلہ کا امتحان ہوا۔ آدم کو ادراک و بیان، فطرت میں ملا تھا ان کا علم تکوینی تھا "خلق الانسان علمہ البیان" خلقت کے ساتھ قوت اظہار عطا کی جا چکی تھی۔ نام بتا دیے تھے۔ چیزوں میں امتیاز۔ حفظ اسماء اور مطابقت مسمّیٰ کی صلاحیت آدم علیہ السلام میں تھی اور ملائکہ اس معاملے میں کمزور تھے۔ اللہ عزاسمہ نے ان افراد و ذوات کو سامنے لا کر کہا: بتاؤ یہ کون ہیں؟ ان کے نام کیا ہیں؟ ملائکہ جواب نہ دے سکے، اپنی جہالت کا اقرار اور خدا کی ثنا و صفت کر کے چپ ہو گئے۔ حکم ہوا آدمؑ تم نام بتاؤ: آدم علیہ السلام نے ان ذوات کے نام بتا دیے۔ وہ ذات اور نام میں تطبیق کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرشتے ان اشخاص و ذوات کو دیکھ چکے ہوں گے (کیونکہ وہ نوری تھے) مگر نام نہ دریافت کر سکے۔ آدمؑ نام جانتے تھے ذوات کو پہلی مرتبہ دیکھ کر پہچان لینا ان کی برتری کی دلیل تھی۔ یہ برتری علم و ادراک، سوال اور برمحل جواب کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خلافت کا معیار علم ہے۔ عبادت و مَلَکیت نہیں — اسم: وہ کلمہ ہے جس کے معنی اور حقیقت زمانے کی قید سے آزاد ہو۔ اصطلاحات و حقائق فکر یہ کا بھی یہی حال ہے۔ خلیفۂ اوّل کو اسماء کون سے بتائے گئے؟ اسماء حسنیٰ بتائے گئے؟ اسماء نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ اور ائمہ علیہم السلام کے نام بتائے گئے، یہ بات واضح ہے کہ غیب کی باتیں اور مستقبل کے مسائل تھے۔ آدمؑ ان حقائق سے باخبر تھے اور فرشتے بے خبر۔ اور اللہ عزاسمہ ان سب سے بڑا غیب و شہود کا عالم بلکہ عین علم ہے۔

قرآن مجید میں لفظ خلیفہ دو جگہ ہے ایک زیر نظر آیت میں اور دوسرے سورۂ صٓ کی آیت ۲۶ میں:

یٰداؤد انّا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلّک عن سبیل اللّٰہ ....

اے داؤد! ہم نے تمھیں زمین پر خلیفہ قرار دیا، تم لوگوں میں برحق فیصلہ کرو

اور خواہشات و رجحانات کے پیچھے نہ چلو ورنہ یہ بات تمہیں راہ خدا سے بہکا دے گی۔

دونوں جگہ "خلیفہ" اللہ کے نمایندۂ خاص کے معنی میں ہے اور خاص قدرت و اختیار کے حامل معصوم و پاک نبی کو اللہ نے یہ منصب دیا ہے۔ اسی بنا پر اسے اصول عقائد اسلام میں ایک اصل مانا جاتا ہے۔

اللہ، معبود و حاکم مطلق و مالک کل ہے اور بندۂ عبادت گذار، محکوم اور مملوک چونکہ اس تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے اصول حکمت کے مطابق مالک کی ذمہ داری تھی کہ وہ محکومین کے لیے کسی معلم و مختار و نگران کو بھیجتا۔ اس نے یہی کیا۔ زمین کا والی، انسانوں کا باپ مخلوق کا ہادی آدمؑ کو بنایا۔ آدم علیہ السلام نے زمین آباد کی اس کو استعمال کیا، وہ خدا کے مختار عام تھے۔ انھوں نے نسل پیدا کی، وہ پدر بزرگوار تھے، انہوں نے اللہ کی راہ دکھائی نتیجے میں ایک ہابیل بنا ایک قابیل — معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام حاکم مطلق اور اللہ کے ترجمان و مختار مکمل تھے، ان کے تین کام تھے، زمین کو آباد کرنا، معاشرہ کی تخلیق و تعمیر، عبادت کے اصول و احکام بتانا اور سب کی رہنمائی کرنا۔

جناب داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بناتے ہوئے ارشاد ہوا کہ "لوگوں میں قانون کا نفاذ حق کے ساتھ کرو۔" یعنی خلیفہ کا ایک کام قانون کا نفاذ، اطلاق، فیصلہ اور اس کی حفاظت ہے۔ قرآن مجید نے امت محمدیہ میں ایک ضابطہ جاری کیا:

یاایھاالذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ (النساء ۵۹)

اللہ کی اطاعت اصل اصول ہے اس کی خلافت رسول کو ملی لہذا رسولؐ کی اطاعت بھی اصل و بنیاد، کیونکہ رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے" اولی الامر" رسولؐ کا جانشین ہے اس کی اطاعت نہ کرنا، اللہ اور رسولؐ سے بغاوت ہے۔ تو خلافت دراصل نیابت الہی کا منصب ہے اس کے دو معنی ہیں ایک خاص معنی جس کے

حامل نبی و رسول و امام ہیں ۔ دوسرے معنی ان آیات سے واضح ہوتے ہیں، جہاں زمین اور انسانی معاشرے کو الٰہی نظم ونسق کے مطابق چلنے اور چلانے کا حکم ہے ۔ظاہر ہے کہ قانون کا مقصد ہے نفاذ اور فائدہ ۔ اسلام ایک قانون ہے تو اسے نفاذ بھی پانا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ نفاذ کنندہ کے بغیر بے معنی ہے اور اسلام کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ہے ۔ظاہر ہے کہ سب مسلمان مل کر اس وقت نافذ کر سکتے ہیں جب ان کا کوئی ذمہ دار سربراہ ہو اور وہ ذمہ دار سربراہ، علم وکردار، قوت واقتدار میں سب مسلمانوں سے بہتر یا اکثر سے بالاتر ہو ۔ ہم اس کو شرط عدالت و اعلمیت کہتے ہیں ۔

۳۴۔ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا ....

حضرت آدم ؑ کی عزت افزائی اور ان کے صلب میں انبیاء و اوصیاءؑ و ائمہ کے احترام میں سجدے کا حکم دیا گیا تو فرشتے سجدے میں جھک گئے ۔ ابلیس نے نافرمانی کی اس نے سجدہ نہ کیا (وہ ملائکہ میں تھا بھی نہیں) اس نافرمانی کی بنا پر اللہ نے اسے کافر و ملعون قرار دیا۔ گویا خلیفہ خدا کے علم وقدرت، عظمتِ خلافت و ترقی انسان کے مقابل میں غیر کامل کا سر تسلیم جھکانا قابل ستائش و مغفرت ہے اور آدم و فخر آدم سے سرتابی موجب کفر ولعنت ہے ۔ یہ اللہ کا قانون روز اول سے جاری ہو چکا، اب یہی دستور اللہ والوں کا راستہ ہے ۔ اس سلسلے میں بعض حضرات نے نبی آخر الزمان ؐ اور ائمہ طاہرین کی اطاعت و احترام میں جھکنے اور ان کے مزار پر جلنے کو جائز قرار دینے کی سند جانا ہے بہ شرطیکہ قربتہً الی اللہ ہو۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا

رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ

الظّٰلِمِيْنَ ۞ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا

كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ

فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ
كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْنَا
اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ
هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

(ب) اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ اس جنت میں رہو اور جہاں جہاں سے چاہو خوشی خوشی خوب کھاؤ (پیو)، مگر تم دونوں اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ دونوں نافرمانوں میں شمار ہو گے۔ (۳۵) شیطان نے ان دونوں کو وہاں سے نکالنے کی تدبیر کی اور جس حال میں وہ دونوں تھے اس میں ان دونوں کو نہ رہنے دیا (وہاں سے دونوں کو نکال لیا) اور ہم نے حکم دیا کہ نیچے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور زمین تمہارے لئے رہنے کی جگہ اور وہیں سرمایہ حیات ہے۔ (۳۶) پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے۔ اس کے بعد اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے اور بے حد رحم کرنے والا ہے (۳۷)

(ج) ہم نے حکم دیا کہ تم سب نیچے ہی رہو۔ پھر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت ضرور پہنچے گی، اس کے بعد جو لوگ میری ہدایت کے مطابق چلیں گے انھیں کوئی خوف اور گذشتہ پر کوئی غم نہ ہوگا (۳۸) اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی جہنمی ہوں گے اور وہ اس دوزخ میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے (۳۹)

۳۵. وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ ....

یہاں پر قرآن نے معاشرتی زندگی کا پہلا حوالہ پیش کیا ہے۔ ایک جوڑا، اس دنیا کی آبادی اور اس کے سیاق و سباق سے دور، انجان عالم اور، رفاحیت کی جگہ آباد ہوتا اور آبادکاری کے ساتھ ہی ایک قانون کا پابند بنا دیا جاتا ہے۔ اس جنت میں کھانے پینے پر کوئی پابندی نہیں، پابندی ہے تو صرف اتنی کہ فلاں درخت کے پاس نہ جانا۔ جیسے ہمارے باغوں میں لکھا ہوتا ہے پھولدار درختوں کو نہ چھوئیں۔ پھول نہ توڑیں۔ اگر کوئی پھول توڑ لے تو اسے سزا نہیں دی جاتی، باغ کا محافظ ڈانٹتا ہے اور زیادہ سے زیادہ باغ سے نکال دیتا ہے۔ بظاہر صرف وجودِ قانون کا احساس دلانے کی طرف توجہ موڑنا اور یہ کہ پہلا انسان بھی قانون سے آزاد نہ تھا خلیفتہ اللہ پر بھی قانون نافذ ہوتا ہے۔ اگر بعد میں آنے والوں پر قانون کی بالادستی ہو تو گھبرائیں نہیں۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو "ظالم" "نافرمان" اور "بے راہ" رو کہا جا سکتا ہے۔

۳۶۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا ....

شیطان نے انھیں بہکایا، جس راحت و آرام میں تھے وہاں سے اس نے ان دونوں کو نکلوا دیا۔ یہ شیطان۔ اذیت، دشمنی، سرکشی اور غلط روی کا محرک ہے۔ اسے انسان کی روحانی ترقی کے مرحلے میں منفی قوت بنایا گیا ہے۔ فطرت اصلی اور طینتِ پاک کے تقاضوں کے خلاف ابھارنا اس کا کام ہے۔ اس نے جنت میں آدمؑ و حوا کو راہ میں ڈگمگا کر ہر صاحب ہوش کو کھٹکھٹایا ہے جس کا مزید تذکرہ اللہ نے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا ہے۔

شیطان۔ مخلوق خاص بھی ہے اور اہل عرفان کی زبان میں نفس امارہ بھی ہے، دونوں کا کام ایک ہے، راستے سے موڑنا، نافرمانی پر ابھارنا۔ انسان کو دونوں سے خبردار رہنا چاہیے۔

یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ حضرتِ آدمؑ کا عہد۔ اللہ کی ممانعت۔ جناب آدم کا درخت

کے پاس جانا۔ ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق "غیب" سے ہے۔ ان حقائق کا دارِ تکلیف سے تعلق نہیں ہے۔ محلِ تکلیف زندگانی ارضی ہے۔ جنت میں واجب و حرام کے وہ معنی نہیں جو زمین پر زندگی بسر کرنے والوں کے لیے معین کیے گئے ہیں۔ وہ اطاعت و نافرمانی، شیطان کا اثر جس کا ہم احساس کرتے ہیں وہ یقیناً اس جنت اور عالم قبل استحقاق جزا و سزا سے غیر متعلق ہے۔ معاملات آدم و جنت د، ماورا مردنیا پر اپنے معاملات کو یا ان حقائق کو اپنے مسائل پر قیاس کرنا خلاف دستور عقل ہے۔ امام رضا علیہ السلام نے ایک حدیث میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت آدمؑ خلافتِ ارضی کے لیے نامزد ہو چکے تھے، ان کی سکونت جنت کی مدت تمام ہوئی۔ تو حکم ہوا یہاں سے اترو، تم لوگوں میں نفسیاتی کشیدگی اور ایک دوسرے سے عداوت ہوگی۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تمہارا دشمن ہوگا۔ زمین میں چند روزہ زندگی اور اس میں سرمایۂ مستعار موجود ہے۔ رہو سہو، پیام خدا پہنچاؤ اطاعت خدا کرو۔ انسانی معاشرے کے دو اساسی نکتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ باہمی روابط اور زمین پر چند روزہ زندگی میں فوائد کا حصول۔

۳۷۔ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ....

اپنی مخلوق کی ٹھوکر پر رحمت نے دستگیری کی اور آدم کو دوبارہ وہی درجہ حاصل کرنے کی راہ بتائی، محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ناموں کے ذریعہ توبہ کرنے کو کہا۔ آدمؑ نے توبہ کی تو اس توبہ کو قبول کرنے والے نے اپنی رحیمیت سے گذشتہ معاملہ ختم کر دیا۔ اس سے یہ سبق ملا کہ لغزش ہو تو فوراً توبہ کرو، توبہ کرو اللہ کے تعلیم کردہ کلمات کے ذریعہ۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا نظام جزا و سزا خود کردہ خود بھرو کی بنیاد پر ہے اور عیسائیوں کا عقیدۂ فدیہ صحیح نہیں ہے۔

۳۸۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى ....

توبہ قبول ہو چکی، اب زمین پر جاؤ، وہاں اللہ کا حکم ملے تو اس کی پیروی کرنے والوں کو کوئی خوف اور غم فردا نہیں ہوگا۔ زمین پر اطاعت و نافرمانی کی بنیاد پر خدا کے دوست اور اس کے نہ ماننے والے دو گروہوں میں بٹیں گے۔

۳۹۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ....

پہلا گروہ غم، عذاب و فکر جہنم سے آزاد ہوگا اور دوسرا گروہ یعنی کافروں کے لئے ہمارا دائمی اصول ہے کہ ہماری ہدایت، ہمارے ہادی اور ہمارے قانون کو نہ ماننے والے یا اسے جھٹلانے والے بہر حال جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا
بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَآمِنُوا بِمَا
أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ
وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا
الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَأَقِيمُوا
الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ۝ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ
بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝
وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝
الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو تمہیں انعام میں دے چکا اور تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ڈرتے رہنا ﴿۴۰﴾ اور جو میں نازل کر چکا ہوں اس پر ایمان لاؤ، کیونکہ جو (کتاب و دین) تمہارے پاس ہے وہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور میری آیتیں تھوڑی قیمت پر نہ بیچو اور صرف مجھ ہی سے تقویٰ (خوف) رکھو ﴿۴۱﴾ اور حق کو باطل سے نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ ﴿۴۲﴾ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو۔ ﴿۴۳﴾ کیا تم دوسروں کو تو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہو؟ اور خود کو فراموش کر جاتے ہو! حالانکہ کتاب پڑھتے ہو، کیا تم یہ بات سمجھتے نہیں (اور شعور ہی نہیں رکھتے) ﴿۴۴﴾ اور صبر و نماز کو سہارا بناؤ اور یقیناً وہ (نماز) بھاری ہے مگر ان خوف (خدا) رکھنے والوں پر گراں نہیں ﴿۴۵﴾ جو اپنے خدا کے حضور حاضری کا اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ لوگ پلٹ کر اسی کی طرف جائیں گے ﴿۴۶﴾

۴۰۔ یٰبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ ....

یہاں سے بنی اسرائیل کے عقائد و اعمال، ان کے رویے اور کردار کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اسلام کو مکے اور مدینے (بلکہ آغاز دعوت) سے آج تک اس گروہ سے عجیب طرح کے مقابلے کرنا پڑے ہیں۔ یہ قوم استدلال کے بجائے، جھوٹ، فساد اور تحریف یا اپنی بدکرداری سے معاشرے میں تباہی مچاتی اور مسلمانوں کو ستاتی رہی ہے۔ یہ قوم دولت و بدکاری کی پجاری اور صرف اپنے آزاد مفادات کی طلبگار ہے، سودخواری اس کا پیشہ اور اقوام دشمنی اس کی تاریخ ہے۔ انسانوں نے صدیوں سے اسے مسترد کر رکھا ہے اور دنیا اسے حقیر ترین مخلوق مانتی ہے۔ مگر اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔

اسلام، ہر انسان اور ہر آدم زاد سے خطاب کرتا رہا، اس نے احترام آدمیت کو ملحوظ رکھا اور دعوت رد کرنے والوں کو نظر انداز کیا، مگر کینہ جو اور فساد پرور افراد و اقوام کا محاسبہ بہت سخت کیا۔ مکہ و مدینہ میں یہودیوں کی فکری اور سیاسی و معاشرتی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ قومی جنتری سے لے کر ملک کی پیداوار تک ان کے قبضے میں تھی اور جھوٹے قصے کہانیوں کے پرچار سے لے کر اللہ، انبیاء و مرسلین پر گندے حملوں تک ان کی دست درازیاں تھیں۔ قرآن مجید نے مکے میں اسرائیلی کہانیوں کو رد کیا اور مدینے میں ان کو عملی و فکری سطح پر زک دی۔ زیر نظر آیات مدنی ہیں جب کہ اس قسم کے بیانات عموماً مکی آیتوں میں آئے ہیں۔ آغاز قرآن میں ان کا تذکرہ ہدایت اور تاریخی فوائد کے لیے ہے۔

حضرت ابراھیم بارگاہ خدا میں بڑے بلند مرتبہ پیغمبر تھے۔ اللہ نے ان کی اولاد کو نبوت و امامت کے منصب دیے۔ جناب اسحاق ع ثانی تھے ان کے بیٹے حضرت یعقوب ان کے فرزند حضرت یوسف، علیٰ نبینا و علیہم السلام جلیل القدر انبیا گزرے

بنی اسرائیل:

حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ تفسیر نمونہ میں قاموس کتاب مقدس سے نقل ہے "وہ شخص جو خدا پر غالب آیا"... یہ لقب حضرت یعقوب ابن اسحاق کو فرشتۂ خدا فنیئیل سے کشتی میں اسے چت کرنے پر حاصل ہوا۔" اسی کتاب میں یعقوب کے ذیل میں ہے: انھوں نے اپنے ثبات و استقامت ایمان کے ایسے مظاہرے کیے کہ خدا نے ان کا نام بدل کر اسرائیل رکھا اور وعدہ کیا کہ انھیں بڑے بڑے خاندانوں کا باپ بنائے گا.... انتہائی بڑھاپے میں رحلت کی اور بادشاہان دنیا کی طرح دفن ہوئے۔ بنی یعقوب و اسرائیل ان کی پوری قوم کو کہا جاتا ہے۔

ہمارے لغات و تفاسیر میں ان خرافات کو رد کیا گیا ہے اور علما نے لکھا ہے کہ "اسر" غلام و عبد کو، اور "ئیل" اللہ، خدا کو کہتے ہیں اس بنا پر "اسرائیل" کے معنی ہوئے "عبداللہ" اسی سے یہودیوں کی ذہنی ساخت اور مسلمانوں کی فکری لطافت

اندازہ ہوسکتا ہے۔ کہاں وہ اساطیری لہجہ کہاں یہ صاف شفاف علمی، تاریخی اور ثقافتی بیان۔ سبحان ربی الاعلی وبحمدہ۔

عہد اسرائیل:

اس خاندان کو خدا نے مدتوں پیامبری کی عزت سے سرفراز رکھا۔ اس لیے یہ لوگ اطاعت خدا، پیروی انبیا، علم کتاب اور عمل براحکام خدا کے ذمہ دار تھے، (عہد کے کچھ جزئیات کا بیان آیت ۸۳ و ۸۴ میں آرہا ہے۔ نیز دیکھیے تفسیر آیت ۴۳، بقرہ) ان کی کتابوں میں آخری نبی کی بشارت اور اس پر ایمان لانے کا حکم اس لیے ان کو یہ عہد پورا کرنا چاہیے تھا، مگر یہ قوم آنحضرت کی دشمنی پر کمر بستہ ہوگئی اس لیے آیت نے سابقہ انعامات و عہد سے منحرف ہونے پر تنبیہ کی۔ اگرچہ آیت کا خطاب بنی اسرائیل سے ہے مگر حکم وہدایت عام ہے، یعنی آج بھی کسی مومن بالقرآن کے لیے زیب نہیں دیتا کہ انعامات خدا کو فراموش کرے اور عہد خدا کو توڑے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: "اوف بعہدکم" تم سے اپنا عہد پورا کروں گا کے معنی ہیں " اوف لکم الجنۃ" تمہیں جنت دوں گا جس کا وعدہ تم سے کیا ہے۔

۴۱۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ . . . .

تمہارے پاس جو کتابیں ہیں ان کے مطابق اس رسول پر ایمان لاؤ۔ توریت و انجیل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے مطلع کیا جاچکا ہے۔ مشرکوں کے مقابلے میں تمہارا انکار رسالت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلط ہے، تم کو پہلا کافر ہونے کے بجائے پہلا مومن ہونا چاہیے، تم اسلام قبول کروگے تو بے کتاب قومیں بھی ایمان لائیں گی۔

آیتوں کا کاروبار:

یہودی اپنے فکری و معاشرتی نظام میں مصلحتوں کے پرستار تھے، بڑوں کے

حکم سے مہینوں کی ترتیب تو خیر بدلتے ہی تھے، غضب یہ تھا کہ حسب موقع اور حسب قیمت کتاب مقدس کی آیتیں بھی بدل دیتے تھے (سورۂ مائدہ کی آیت ۱۲ و ۱۳ اور سورۂ بقرہ کی آیت ۸۰، و ۸۹ دیکھیے) ایک روایت کے مطابق کعب ابن اشرف اور حی ابن اخطب کے اعزاز میں یہودی ایک شاندار دعوت کیا کرتے تھے جہاں معاشرتی و سیاسی و اعتقادی مسائل پر بحث ہوتی ہوگی اور فیصلہ کے مطابق توریت یا اس کے مفہوم میں تبدیلی کا اعلان ہوتا تھا، انھی تبدیلیوں میں آنحضرتؐ کے صفات و آمد کا بیان بھی تھا۔

جیسے ابھی تین سال قبل وٹیکن میں پوپ پال نے اعلان کیا تھا کہ حضرت یسوع کے قتل کے مجرم آج سے یہودی نہ ملنے جائیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:
صفات پیغمبرؐ کی تبدیلی اور آیات کی تحریف سے جو بھی نفع ملتا ہو وہ انعام خدا کے مقابلے میں بہرحال کم ہی تھا۔

اور آج بھی قرآن کے معانی و تفسیر میں تحریف اور بیان صفات محمد و آل محمد میں کوتاہی برتنے والا۔ اسی طرح کا مجرم ہے۔

۴۲۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حق و باطل کے شبہے میں ڈالنا اور حق کو چھپانا بدترین جرم ہے۔ تم ربیّون کو محمدؐ کی رسالت اور اسلام کی حقانیت معلوم ہے مگر اس کا اظہار و اقرار نہیں کرتے اور دوسروں کو جھوٹ سچ ملا کر دھوکا دیتے ہو۔ آل عمران میں ہے " ان یہودیوں میں کچھ لوگ زبان سے کچھ ادا کرتے ہیں۔ بڑبڑاتے ہیں کہ لوگ سمجھیں توریت پڑھ رہے ہیں حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، پھر لوگوں کا شک دور کرنے کیلیے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ بات اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی وہ لوگ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹی بات تھوپتے ہیں۔

مرد مومن، عالم قرآن و سنّت کو ہر موقع پر یہ نصیحت قرآن یاد رکھنا چاہیے کہ

لوگوں کی خوشنودی اور داد حاصل کرنے کی خاطر حق و باطل کی آمیزش یہودیوں کا وطیرہ ہے اور غیرت دار مسلمانوں کو یہود کے قریب بھی نہ جانا چاہیے کہ یہ پیشہ ور حق کے مخالف بننے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔

۴۳۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ . . . .

سورۂ مائدہ میں عہدنامہ کا تذکرہ ہے، جس میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی شقیں بھی تھیں۔ اس مقام پر اسی کی یاددہانی ہے کہ ہمارا رسولِ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ تم سے کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہے یہ تمہارے عہدنامہ میں پہلے سے ہے اب اٹھو اور جہاں نمازی کھڑے ہوں ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ اگر رکوع میں ہوں تو رکوع ہی میں مل جاؤ نماز کا ثواب دوگنا اور رکوع میں شرکت کامل رکعت کے لیے کافی ہے۔

رکوع:

قیام حاضریِ دربارِ الٰہی ہے اور سجدہ معراجِ مومن، ان دونوں کے درمیان رکوع قوس صعود و نزول ہے جو عارف کے لئے مقام خاص ہے اور صاحب دل کے لیے خضوع و خشوع کی منزل۔

۴۴۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ . . . .

نصیحت کے آداب میں یہ بات داخل ہے کہ نصیحت گر اپنی بات کی سچائی پر یقین رکھتا ہو اور یقین کا ثبوت مثبت عمل ہوتا ہے۔ یہودیوں کی طرح کتاب پڑھنا امر معروف کرنا اور خود اس کے مطابق عمل نہ کرنا بے عقلی کی بات ہے۔ اہل علم کے قول و فعل کا تضاد لوگوں کو انکار و بغاوت پر ابھارتا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

ہمارے شیعوں کو یہ پیغام پہنچا دو کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت اسے ہوگی جو عدل و انصاف کی تعریف کرے اور خود دوسروں پر ظلم کرے۔

۴۵۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ

۴۶۔ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

انسان اپنی جبلی کمزوریوں سے گھبرا کر حق سے فرار کا جواز نکالتا ہے۔ قرآن مجید اس موقع پر حوصلہ بڑھاتا اور نسخہ بتاتا ہے۔ وہ سمجھاتا ہے کہ ایسے مرحلوں میں صبر و صلوٰۃ سے سہارا لو۔

صبر: مضبوط ارادے پر قابو رکھنا اور مادی و ظاہری مشکلات کے سامنے عزیمت کے ساتھ کھڑے رہنا اور راضی برضا رہ کر مخفی طاقتوں کو ابھارنا ہے اور صبر و عزیمت ارادہ و عمل کا بڑا نمونہ روزہ ہے۔

نماز: اللہ عزّ اسمہ سے ربط کا ذریعہ ہے۔ دونوں باتیں ان لوگوں کیلئے آسان ہیں جنھیں قیامت کا یقین اور حضور باری تعالیٰ میں حاضری کا اعتقاد ہو۔ جنھیں یہ مقام حاصل نہیں ان کے لیے یہ عمل گراں گذرے گا۔ مگر معرکۂ حیات میں اس سے بہتر کوئی قوت ہے بھی نہیں۔

حاکمیت قرآن

جناب سید علی خامنہ ای
صدر جمہوری اسلامی ایران

فکر اسلامی کی دوسری مؤتمر کی پہلی نشست یکم جمادی الثانیہ ۱۴۰۴ھ صدر مملکت سید علی خامنہ ای کے پیام سے شروع ہوئی۔ پیام کا ترجمہ نذر ناظرین ہے۔ یہ پیام فکر انگیز ہے اور کئی جہتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے مؤتمر کے تمام اہل دانش وبینش نے قدر کی نظر سے دیکھا مؤتمر فکر اسلامی کا یہ دوسرا اجتماع موضوع قرآن سے متعلق تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب انزلناہ الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور باذن ربھم الی صراط العزیز الحمید ۔ ۱ ۔ ابراہیم۔

قرآن آپ پر ہم نے اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی میں نکال کر لے جائیں ان کے رب کے حکم سے غالب و قابل (صد ہزار) حمد ذات کے راستے کی طرف۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانہ شافع مشفع وماحل مصدق من جعلہ امامہ قادہ الی الجنۃ ومن جعلہ خلفہ ساقہ الی النار .... الی آخر الحدیث

جب اندھیری رات کے تاریک حصوں کی طرح فتنے تمھارے لیے الجھنیں پیدا کردیں تو تمھیں قرآن ہی سے وابستہ رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ قرآن شفاعت، سفارش کرنے والا ہے، اس کی شفاعت قبول ہے قرآن تصدیق شدہ مدبر ہے جس نے اسے اپنے سامنے رکھا قرآن اسے جنت میں لے جائے گا اور جس نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا وہ ایسے شخص کو جہنم پہنچا دے گا۔ وہ بہترین راستے کا رہنما ہے"۔

وہ ایسی کتاب ہے جس میں تفصیل و تشریح اور نتیجہ خیزی ہے۔ وہ حتمی و قطعی (کتاب فیصلہ کن) ہے۔ غیر سنجیدہ چیز نہیں۔ اس کا ظاہر ہے اس کا باطن ہے۔ اس کا ظاہر حکم (وفیصلہ) ہے اور اس کا باطن علم ہے اس کا ظاہر دل کش وحسین، اس کا باطن گہرا۔ اس کی تہہ ہے پھر تہوں پر تہیں ہیں۔ اس کے عجائب کا شمار اور اس کے غرائب (ندرتوں) پر کہنگی نہیں۔ قرآن میں ہدایتوں کے چراغ اور حکمتوں کے مینار ہیں۔ جو صفات کو سمجھ لے اس کی معرفت پر قرآن رہنما ہے۔

نظر دوڑانے والے کو اسے دیکھنا چاہیے اور نگاہ کو اس کے صفات تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے قرآن مبتلا رہلاکت کو نجات اور مشکلوں میں پھنسے ہوئے کو خلاصی دلاتا ہے۔

اور حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

واعلموا انّ ھذا القران ھوالناصح الذی لا یغش والھادی
الذی لا یضل .... الخ

یا درکھو! یہ قرآن (مجید) وہ مخلص ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا۔ وہ سخن گو ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جو بھی قرآن کے ساتھ بیٹھتا ہے تو یا کچھ زیادہ لے کر یا کمی لے کر اٹھتا ہے۔ ہدایت میں اضافہ اور نابینائی (جہالت) میں کمی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے قرآن کی جو تعریف کی ہے (اور اس کا جس طرح تعارف فرمایا ہے) آج امت اسلامیہ کے لیے خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ جس قسم کی تہہ در تہہ تاریکیوں اور کالے بادلوں سے مسلمانوں کی زندگی کا ماحول آج تاریک ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کا پہلا مرحلہ وہ تھا جب اسلامی خلافت، طاغوتی سلطنت سے بدلی۔ قرآن کریم درحقیقت ایک اوپری قسم کے تکلف میں (اور رسم میں) شمار ہونے لگا۔ اسماً نہیں۔ وہ مسلمانوں کی زندگی کی سطح سے باہر ہوگیا۔ لیکن بیسویں صدی کے عہد جاہلیت میں سیاسی پیچ و خم اور پروپیگنڈے کے ایسے مرحلے میں داخل کردیا گیا ہے کہ جو کہیں زیادہ خطرناک اور کہیں زیادہ فکر مند کرنے والی بات ہے سب سے بڑا ذریعہ اور مؤثر ترین حیلہ، جس سے اسلام کو ایک گوشے میں کیا جاسکتا تھا، یہی تھا کہ مسلمان عوام کے دل و دماغ کی فضا سے قرآن کو نکال دیا جائے۔ اسلامی ممالک میں استعماری طاقتوں کے آتے ہی یہ کام نقطۂ مرکزی اور بیرونی اقتدار طلب لوگوں کا عمل بن گیا، طرح طرح

کے طور طریقوں سے یہ راستہ اختیار کیا گیا۔

قرآن، جسے خود اسی کتاب مقدس میں نور، ھدایت، حق کو باطل سے جدا کرنے والا، زندگی، میزان، شفا، ذکر، جیسے نام دیے گئے ہیں۔ اسی وقت ان خصوصیات کا مظہر ہو سکے گا جب پہلے مرکز فکر و فہم اور دوسرے مرحلے میں محور عمل قرار پائے۔

صدر اوّل، اسلامی حکومت کے دور میں۔ قرآن ہی حرف آخر اور فیصلہ کن حکم تھا۔ حد یہ ہے کہ خود کلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کو اسی کی بنیاد پر پرکھتے تھے۔ معاشرے میں علماء قرآن صحیح قدر و منزلت کے حامل تھے۔ حضورؐ نے لوگوں کو سمجھایا تھا:

اشراف امتی اصحاب اللیل وحملۃ القرآن۔ میری امت کے معزز لوگ شب بیدار (نماز شب پڑھنے والے) اور حاملین قرآن ہیں۔

حمل قرآن، قرآن یاد کرنا، اس کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ ان دنوں یہ صفت ایک معاشرتی "قدر" تھی۔ زندگی کی ہر مشکل میں قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ہر بات کو ماننے نہ ماننے پر دعوے کو پرکھنے اور ہر رویّے کو قبول کرنے نہ کرنے کا معیار قرآن تھا۔ وہ لوگ حق و باطل کو قرآن کے ذریعے پہچانتے۔ اس کے بعد زندگی کے میدان میں اس کے نمونے دیکھتے اور معین کرتے تھے۔ جب سے اسلامی معاشروں پر مسلط ہونے والی قوتیں اسلامی اقدار سے تہی دست و اجنبی ہونے لگیں اسی وقت سے انھوں نے قرآن کو جو حق و باطل میں فرقان ہے اپنے لئے رکاوٹ سمجھنا شروع کیا پھر اس مہم کا آغاز ہوا کہ خدا کا کلام زندگی کے میدان سے ہٹا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین، معاشرتی زندگی سے جدا، دنیا آخرت سے الگ ہوگئی اور حقیقی دین داروں اور دنیا طلب طاقت وروں میں ٹھن گئی۔ زندگی کے میدانوں اور مسلمانوں کے معاشرے میں اسلام کو انتظامی منصب سے ہٹا دیا گیا۔ اس کا تعلق عبادت گاہوں، مسجدوں اور گوشہ ہائے دل سے سمجھ لیا گیا۔ یوں ایک طویل نقصان رساں فراق زندگی و دین رونما ہوا۔ مغربی تسلط سے صلیبی و صیہونی ہمہ جہت حملوں سے پہلے اگرچہ حقیقی معنوں میں قرآن زندگی کے میدان میں غالب نہ تھا، مگر یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر کم و بیش (اس کا ایک اثر تھا) صلیبی و صیہونی حملہ آور اسے بھی برداشت نہ کرسکے جو قرآن آشکارا حکم دیتا ہے " ان کے لیے جہنم

۔۔۔وں اور جتنے رہواروں کی طاقت تم سے جسع ہوسکے جمع کرو (سامان جنگ مہیا کرو) الانفال(۶۰)
جو قرآن فرماتا ہے: "اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دے گا۔ النساء (۱۴۱) جو قرآن
مومنوں کو ایک دوسرے کا بھائی، دشمنوں پر سخت گران اور غضبناک دیکھنا پسند کرتا ہے۔
وہ قرآن ایسے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھا جو مسلمانوں کے معاملات کی باگ ڈور اپنے
ہاتھ میں لے کر ان پر مسلط ہو کر ان کا سب کچھ تباہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ اقتدار حاصل کرنے والے
اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ عوام کی قرآن سے اپنی زندگی میں تھوڑی سی بھی وابستگی ان کے اقتدار
و نفوذ کی راہ کو ناہموار بنا دے گی۔ لہذا انہوں نے قرآن کو یکسر ہٹا دینے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن یہ
منصوبہ ہرگز عملی جامہ نہ پہن سکے گا خدا نے امت اسلامیہ سے قرآن کی دائمی حفاظت کا وعدہ
فرمایا ہے۔ اس کے باوجود دشمنوں کے اس مدعا کو انجام تک پہنچانے کے ارادے اور اس کے نتائج
و اثرات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

آج مسلمانوں کی زندگی پر ایک نظر ڈالیے، قرآن کہاں ہے؟ سرکاری اداروں میں ہے؟
اقتصادی نظام میں ہے؟ روابط کے نظم و نسق اور عوام کے باہمی تعلقات میں ہے؟ اسکولوں
اور یونیورسٹیوں میں ہے؟ خارجہ سیاست یا حکومتوں سے تعلقات میں قرآن ہے؟ عوام میں
قومی سرمایہ کی تقسیم میں ہے؟ اسلامی معاشرے کے سربراہوں کے عادات و خصائل میں، اقوام
و ملل کے مختلف طبقات میں جن کے کم و بیش اثرات ہیں، کہیں قرآن نظر آتا ہے؟ اسلامی
احکام کی انفرادی رفتار میں، زن و مرد کے روابط میں، خوراک و لباس میں؟ زندگی کے کس
اصلی پرتو میں قرآن ہے؟ ایوانوں میں؟ امانتوں اور بینک ڈپازٹ میں؟ معاشرت میں؟
آخر انسانوں کے عوامی اور سماجی تحریکات میں کہاں قرآن ہے؟ زندگی کے اتنے میدان ہیں۔
مسجدوں اور میناروں، عوام فریبی اور ریاکاری کے لیے ریڈیو کے چند پروگرام البتہ مستثنیٰ
ہیں۔ مگر کیا قرآن فقط اسی لیے ہے؟ سید جمال الدین سو برس پہلے اس بات پر روئے تھے انھوں
نے رلایا تھا کہ قرآن ہدیہ دینے اور آرائش و زینت، قبرستان میں تلاوت کرنے، طاقوں میں رکھنے
کے لیے رہ گیا ہے۔ بتائیے سو سال میں کوئی فرق پڑا ہے؟ کیا امت قرآن کی حالت پریشان کن
نہیں ہے؟

بات یہ ہے کہ قرآن انسانی زندگی کی کتاب ہے اور انسان کی حد نہیں ہے ۔ انسان ترقی پذیر ہے ۔ انسان کی بہت سی جہتیں ہیں ۔ وہ انسان جس کی ترقی پذیری کی حد اور سرحد نہیں ۔ ہر زمان وہ رہنما و معلم و دستگیر ہے ۔ انسان کی مہذب و موزوں زندگی فقط قرآن ہی کے ذریعے سکھائی جا سکتی ہے ۔ ظلم ، نسلی امتیاز ، فتنہ و فساد ، جھگڑے ، سرکشی ، ناروائی ، رسوائی ، خیانت جو انسانی تاریخ کے طویل دور میں ہوئی اور انسان کے نشوونما اور ترقی میں رکاوٹ رہی ہے اسے قرآن ہی کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے ۔ انسانی زندگی کا منشور قرآنی ہدایات بناتی ہیں ، فقط وہی عملی ہے اور بس ۔

قرآن کی طرف رجوع انسان کی شایستہ زندگی کی طرف رجوع ہے ۔ اس عمل کی ذمہ داری قرآن پر ایمان رکھنے والوں پر عموماً اور قرآن شناس حضرات پر ان سے زیادہ ہے ۔ یہ علما اور خطبا کی ذمہ داری ہے ۔

قرآن کی طرف رجوع ایک نعرہ ہے یہ نعرہ اگر حقیقت بن جائے تو یہ حقیقت حق و باطل میں فرق کردے ۔ جو قوتیں قرآن کی طرف بازگشت کو برداشت نہیں کر سکتیں ، مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسی قوموں کو برداشت نہ کریں ۔

برادران و خواہران اسلام !

ہم بھی قرآن سے دور افتادہ ، بین الاقوامی قرآن دشمن منصوبے کے آسیب زدہ تھے ، قرآن کی طرف بازگشت کا لطف نہیں دیکھا تھا ۔ ایران کا پرشکوہ اسلامی انقلاب ، اور نظام جمہوری اسلامی کا قیام اس بازگشت کی ایک برکت کا اثر ہے ۔ آج یہ قوم ، زندگی کی فضا ، معاشرتی تعلقات ، حکومت کی تشکیل و ہیئت ، اپنے رہنماؤں کے اخلاق و عادات ، سیاست خارجہ ، نظام تعلیم و تربیت میں قرآنی تعلیمات کے کچھ شرارے دیکھ رہی ہے ۔ اب تک بہشت قرآن کی ایک نسیم کا جھونکا ہم تک آیا ہے ۔ لیکن اس حقیقی جنت کے اندر جانے کا راستہ کھلا ہے ۔

ہمیں فخر ہے ، ہم نے گوش ہوش صدائے قرآن کے حوالے کر دیے ہیں ۔ تمام اقوام کی ذمے داری بھی یہی ہے ، خصوصاً علماء دین ، دانشور ، خطیب ، لکھنے والے اور محقق حضرات

پر یہ سب سے بڑا فریضہ ہے ۔

"اسلامی فکر" کانفرنس نے اگر قرآنی معارف پیش کیے اور معرفت قرآن کے موضوع کی طرف نئے قدم بڑھائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اپنا مشن پورا کر لیا ۔ اس کانفرنس کے پروگرام میں جو موضوع زیر بحث آئیں وہ ذہنوں کو مطمئن کریں کہ زندہ انسانی معاشرے کی گردش و حرکت کے لیے ہر چیز قرآن میں موجود ہے ۔ ذہنی معلومات سے عملی اندازوں اور رہنما حرکت آفرین ، اور نظام بخش عقیدے سے لے کر اجتماعی و معاشرتی زندگی کے رنگارنگ نظام تشکیل دینے والے معاملات تک ۔ اور گذشتہ تاریخ بشر کی تحلیل و تجزیہ سے مستقبل کی پیشین گوئی تک ۔ آج تمام فلسفے ، تمام نظریات ، مادی آئیڈیالوجی کے رنگارنگ پہلو ذہنی و عملی بھول بھلیوں تک پہنچ چکے ہیں ، وہ انسانی قوتوں کو سمیٹنے اور ایک دوسرے کو جذب کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں ۔

اب قرآن کی حاکمیت کا دور ہے ۔ وہی انسان کے ذہنی و عملی خلا کو پر کرے گا وہ "لیظھرہ علی الدین کلہ" کی بشارت دے رہا ہے ۔

بھائیو اور بہنو ! اطلاعات سے عمل ، تلاوت سے تفسیر ، قبول ذہنی سے وجود خارجی تک اپنی کوششوں کا محور قرآن کو قرار دیجیے ، اسی کا اتباع کیجیے ۔ قرآن کی طرف رجوع و بازگشت کا نعرہ اپنے ملکوں اور اپنے عوام میں لے جائیے اور اس نصب العین کو عملی بنانے کے لیے عوام کو قریب لائیے اور ان کی ہمت بڑھائیے ۔

اس مبارک کوشش میں مجھے امید ہے کہ روح قرآن آپ کی مدد اور رہنمائی کرے گی ۔

والسلام علیکم

سید علی خامنہ ای

صدر جمہوری اسلامی ایران

جناب محمد تقی رہبر
ترجمہ: جناب غلام حسین ام.اے علیگ

قرآن کا سیاسی نظام

انسانی زندگی کے مختلف تاریخی ادوار نے ثابت کیا ہے کہ انسانی معاشرے سے وابستہ امور کی تدبیر اور سیاست پر خاص توجہ رکھنا چاہیے، کیونکہ معاشرے کے نظام کو عقل و رسم و رواج و شرع نے موضوع بحث بنایا ہے اور ان میں سے ہر ایک تقاضے کی بنا پر انسانی معاشرے کا نظام تیار ہوا ہے۔

سیاست اور نظم و نسق کا مسئلہ اسلام میں دوسرے ادیان سے کہیں زیادہ اہم اور نمایاں ہے۔ اسلامی احکام و قوانین پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی یقین ہوتا ہے کہ سیاست کو شرع مقدس سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ شرع کے تار و پود میں سیاست مضمر ہے۔

حکومت، ولایت، امر بہ معروف، نہی عن المنکر، جہاد، دفاع، قضاوت، شہادات، حدود، قصاص، تجارت، معاملات، نابالغوں، یتیموں اور مجانین کی ولایت، سماجی اور گھریلو حقوق، تربیتی اور ثقافتی امور، اقتصادی مسائل، زکوٰۃ، خمس، غنائم، ذمی اور اہل کتاب کے احکام، دوسری ملتوں سے امت مسلمہ کے تعلقات، جنگ و صلح اور اسی طرح کے دوسرے مسائل اُن فقہی اور اسلامی معارف کے زمرے میں شامل ہیں جنھیں معاشرے کی سیاست و تدبیر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ عبادات میں سے حج، نماز جمعہ، اور جماعت وغیرہ کا تعلق سیاست سے قابل توجہ ہونے کے ساتھ ناقابل جدائی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور سیاست دونوں ایک کھلی کتاب کے مانند ہے، جو تمام مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض عبادات و اعتقادات و تربیت و ہدایت ہی کرتے رہے۔ اسلامی ملک کی اندرونی و بیرونی سیاست سے انکا کوئی واسطہ نہ تھا؛ مختلف ملکی سربراہوں کے نام آنحضرتؐ کے خطوط، عملی طور پر ظالم و جابر افراد کے خلاف اقدامات، شیطانی سیاست اور سیاست مداروں سے ٹکر، باطل کے خلاف جنگ میں لوگوں کو جمع کرنا، مسند قضاوت پر بیٹھنا، (عدل و انصاف قائم کرنا) اور تمام سماجی امور میں رہنمائی کرنا .... ایسے رویّے اور طور طریقے ہیں جن کو پیغمبرؐ کی سنت و سیرت سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ لھٰذا سیاسی مسائل کی اہمیت، ان کا شریعت سے تعلق، اور ربانی اسلام کی براہ راست ان معاملات میں رہنما کارکردگی، نیز اسلامی معاشرے کو ہدایت کی ذمہ داری نہ صرف عقل و شرع کے بدیہی امور میں شمار کی جاتی ہے بلکہ ان میں ابہام کی کوئی گنجائش نہیں۔

چونکہ مقالے کا موضوع اسلام کا سیاسی نظام ہے، لہٰذا اس میں حسب ذیل امور کا تجزیہ ہونا چاہیئے۔

۱۔ سیاست کا مفہوم اور حیات انسانی میں اس کا مقام۔
۲۔ اسلام میں سیاست اور اس کے ابعاد۔
۳۔ اسلام کا سیاسی نظام اور قرآن میں اس کے مقدمات و اصول۔
۴۔ قرآنی نقطۂ نظر سے سیاست کے مقاصد۔

سیاست کا مفہوم:

کلمہ سیاست کے مروجہ معنوں اور دنیا کے دھوکے باز سیاسی رہنماؤں کے عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ لفظ سیاست کے معنوں میں اتنی تحریف کی گئی ہے کہ آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس لفظ کے لغوی و حقیقی معنوں سے تضاد رکھتا ہے

یہ بات ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم سب سے پہلے لفظ سیاست کے مفہوم کی توضیح پیش کریں، اس کے بعد سیاسی نظام کے ابعاد اور قرآنی نقطۂ نظر سے اس کے مقاصد پر روشنی ڈالیں۔

لغت اور اسلامی کتابوں کے مآخذ اور متون میں مندرج لفظ سیاست کے معنوں پر غور کرنے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ سیاست کے حقیقی معنی، انسانی معاشرے، ملک اور عوام کی سرپرستی و قیادت کے ان ابعاد پر مشتمل ہیں، جن کے ذریعہ ان کی فلاح و بہبود اور ترقی کی ضمانت ملتی ہے۔

لفظ سیاست پر مشتمل تشریحات کو لغت کی بعض کتابوں نے درج کیا ہے۔

مجمع البحرین: "ساس، یسوس: الرعیہ: امرہا و نہاہا۔" سیاست کے معنی، عوام پر احکام جاری کرنا۔ پابندی عائد کرنا کے ہیں۔ حدیث ہے:

ثم فوض الی النبی امر الدین والامۃ لیسوس عبادہ

دین اور امت مسلمہ سے وابستہ امور کی ذمہ داری پیغمبر اکرمؐ کو سونپی گئی تاکہ لوگوں کو سیاست اور راہنمائی کریں۔

دائرۃ المعارف بستانی: ساس القوم: دبرہم و تولی امرہم۔ الامر: قام بہ، فہو سائس السیاسۃ: استصلاح الخلق بارشادہم الی الطریق المنجی فی العاجل او الآجل السیاسۃ المدنیۃ: تدبیر المعاش مع العموم علی سنن العدل والاستقامۃ۔"

کسی معاشرے کو سیاست کرنا: ان کے امور کی تدبیر اور ان کے تقاضوں کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ عدل و انصاف و رہنمائی کے معاملات کو آزادی سے بجالانا۔ سیاست۔ مدن: یعنی معاشرے کی معیشت عدل و انصاف و آزادی کے اصولوں پر فراہم کرنا۔

عربی لغت، لاروس: ساس الوالی الرعیہ: تولی امرہا واحسن النظر الیہا۔ الامور دبرہا۔" حاکم نے رعایا کو "سیاست کرنے" کی ذمہ داری قبول کی: یعنی عوام کے تمام کاروبار کی ذمہ داری قبول کرکے ان کی فلاح و بہبود کے لئے سوچا۔

"منجد الطلاب" کے ترجمے میں بھی سیاست کی اس طرح تعریف کی گئی ہے: "مملکت داری

امور عوام کی اصلاح، ملکی کاروبار کا انتظام، اور سیاست مدن یعنی معاشرے کو سیاست کرنا

فارسی لغت "معین" میں مذکورہ بالا معنوں کے علاوہ حسب ذیل معنی بھی درج کئے گئے ہیں۔ " قضاوت، عدالت، سزا، جزا، تنبیہ، ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور ملک کے داخلی اور خارجی امور کا انتظام۔"

اسی طرح "اخوان الصفا" کتاب کے حوالے سے سیاست کے کئی بعد بتائے جاتے ہیں، اقتصادی سیاست، سیاست مدن اور جسمانی سیاست جو بدن کو قوت بخشنے اور اس کی حفاظت کرنے کے علاوہ اسے توازن اور حد اعتدال سے خارج ہونے سے روکتی ہے۔ اور "اخلاق ناصری" کتاب سے نقل کیا گیا ہے کہ سیاست فاضلہ کو امامت کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد تکمیل خلق ہے جو سعادت کے حصول کے لیے ضروری اور لازمی ہے۔

علمی اور عقلی مباحث میں حکماء و فلاسفہ نے حکمت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلی، حکمت نظری: اس علم کو کہتے ہیں جو موجودات کے حقیقی حالات کے بارے میں عقل انسانی اپنی قدرت و توانائی سے مطابقت رکھتی ہو۔

دوسری، حکمت عملی: جس کو " خودسازی، اخلاق اور گھریلو امور کی تنظیم، سیاست مدن کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مذکورہ مفاہیم اور آج کی دنیا میں رائج سیاست اور سیاسی رہنماؤں کی منطق کے درمیان مکمل تضاد ہے، اس لیے کہ ان لوگوں نے عوامی مصلحت، ترقی اور سرحدوں کی حفاظت کے بجائے اپنی سیاست اور کاروبار کی بنیاد، مکاری، قتل و غارت گری، جاہ طلبی، ریاست اور وسعت طلبی نیز محروموں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے پر رکھی ہے یہ عوام دشمن عزیبوں کو موت کے حوالے کرنے، انھیں علمی، فنی اور فکری افلاس کے حوالے کرنے کو نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اس سیاست کی دین ضمیر اور عقل میں کوئی گنجائش نہیں۔

اب تک سیاست کے مختلف معنی جو ہم ذکر کرتے چلے آئے ہیں جن معنوں پر مصلح اور دانشور افراد غور و فکر کرتے رہے ہیں، وہ انسان کی ضروریات زندگی سے وابستہ

ہیں اور بے شک اسلام اور دوسرے ادیان نے اس کی نسبت خاص اہتمام کیا ہے اور کبھی اس پر غور و فکر کرنے سے منع نہیں کیا۔

اگر محض قرآنی نقطۂ نظر سے انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانوں کے حقیقی اور سچے رہنما اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے عوامی معاملات کی بھلائی کے لیے کس قدر جانفشانی کی ہے، خاص طور پر سیاست، رہبری اور اصلاح کے لحاظ سے ان کی خدمات شانی، قابل صد تحسین و قابل عمل و پیروی ہیں۔

دو طرح کے سربراہ :

بے جا نہ ہوگا اگر یہاں ایک خاص نکتے کی طرف توجہ مبذول کراتا چلوں۔ قرآن مجید نے دو طرح کے سربراہوں کا ذکر کیا ہے جو ایک دوسرے کی مخالف جہت میں (سیاست الٰہی اور سیاست شیطانی) چلتے رہے ہیں۔ قرآن میں جہاں کہیں ان دونوں طرح کے سربراہوں کا ذکر ہوا ہے وہاں ان کے حکمرانی کے طریقوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے، بعنوان مثال :

(۱) سلیمانؑ اور بلقیس کے سلسلے میں یوں بیان ہے :

قالت إن الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها و

جعلوا اعزة اهلها اذلة وكذلك يفعلون (سورہ نمل-آیہ ۳۴)

اس عورت نے کہا: جب کبھی کسی شہر پر بادشاہ حکمران ہوتے ہیں تو اسے تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس شہر کے معزز افراد کو بھی ذلیل و خوار کرتے ہیں۔ وہ لوگ اسی طرح کریں گے۔

اگرچہ آیت بلقیس کی ترجمانی کر رہی ہے، لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن مجید جب کبھی کسی بات کو درج کر کے رد نہیں کرتا تو اس کا حکم دستخط اور تصدیق کے برابر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہ بنیادی طور پر اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ یعنی مفسد، تباہ کار، گمراہ کن اور غاصب۔

(۲) حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ سے متعلق کشتی کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ وہاں حسب ذیل

آیت ہے :۔

"اما السفينة فكانت لمساكين يعلمون فى البحر فأردت أن اعيبها
وكان وراءهم ملك يأخذ كل سفينة غصبا"

جہاں تک اس کشتی کی بات ہے، اس کا تعلق اُن غریب افراد سے تھا جو دریا میں کام کرتے تھے میں نے اُس کشتی میں سوراخ اس لیے کرنا چاہا تھا، کہ ان پر ایک ایسے بادشاہ کا تسلط تھا جو کشتیوں کو ہتیا لیتا تھا۔

مسرفین، مستکبرین، مفسدین اور مترفین جیسی تعبیریں اور تاویلیں طاغوتی اور ما و قدرت سربراہوں کے لیے بارہا استعمال ہوئی ہیں۔

حقیقی سربراہوں کی خصوصیات :

قرآن میں ایسے واقعات بھی ہیں جن میں ایسے سربراہوں کا ذکر ہے جنھوں نے عوام مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح اقدامات کیے

ایک واقعہ تو وہی ہے جب بنی اسرائیل نے اپنے ایک نبی سے درخواست کی تھی ایک ایسا فرمانروا اور سربراہ انھیں دیا جائے جو ان کو ساتھ لے کر دشمن سے مقابلہ کرے

وقال لهم نبيهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكا قالوا أنى
يكون له الملك علينا ونحن أحق بالملك منه ولم يؤت سعة
من المال قال ان الله اصطفه عليكم وزاده بسطة فى العلم
والجسم والله يؤتى ملكه من يشاء والله واسع عليم" (سورۂ بقرہ-آیۃ۲۴۷)

ان کے پیغمبر نے ان سے فرمایا: خداوند تعالٰی نے طالوت کو تمھارے لیے سربراہ مقرر کیا انہوں نے کہا: وہ کیسے ہمارا سربراہ ہو سکتا ہے۔ ہم کو اس سے زیادہ استحقاق حاصل ہے۔ اس زیادہ دولت بھی نہیں رکھتا۔ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالٰی نے اسے تم پر فوقیت دی ہے اور وجسم کے لحاظ سے بھی مزید نوازا ہے۔ اللہ، جسے چاہے اپنا ملک عنایت کرتا ہے، اس لئے کہ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہ آیت سیاہ قلب افراد کے افکار و خیالات (کہ سربراہی کے لیے مال و ثروت ضروری ہے) کی تردید کرتی، اور ایک ایسے معیار سے آشنا کراتی ہے جو کسی فرد کی حاکمانہ لیاقت و قابلیت کا ثبوت فراہم کرتا ہو، یہاں علم و قدرت کو شائستگی کا معیار قرار دیا گیا ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں ایک بہت لطیف نکتہ یہ ہے کہ جو سربراہی قابلیت اور صلاحیت کی بنیادوں پر مستحکم ہوتی ہے، وہ الطاف باری تعالیٰ سے سرشار ہوتی ہے اور خداوند کریم سوائے ان لوگوں کے جو شائستگی رکھتے ہیں ہر کس و ناکس کو اس عطیہ سے نہیں نوازتا، اس لیے کہ یہ عطیہ وہی ملکیت مالک الملک ہے، جو لائق و شائستہ سربراہ کی ملوکیت میں چلایا تا ہے ورنہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ علم، قدرت اور اپنی سربراہی پر ناز کرے، اس لیے کہ قدرت اور علم درحقیقت ابتداء خداوندکریم کے لیے ہے پھر کہیں انسان تک اس کی پہنچ ہوتی ہے۔

قل اللّٰھم مالك الملك تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدك الخیر انك علی كل شئ قدیر

(سورۂ آل عمران - آیت ۲۶)

کہو، اے اللہ، مالک الملک تو ہے، تو جسے چاہے اپنا ملک دیدے اور جس سے چاہے چھین لے، تو ہی جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا ذلت و خواری عطا کرتا ہے، بھلائی تیرے ہاتھ ہے اور تو ہر شئ پر قدرت رکھتا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کے واقعات میں جہاں طالوت و جالوت کے درمیان جنگ کے واقعات میں ہے:

فھزموھم باذن اللہ وقتل داود جالوت واٰتاہ اللہ الملك والحكمۃ وعلمہ مما یشاء (سورۂ بقرہ - آیت ۲۵۱)

انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مدد سے دشمن کو شکست دی، داؤد نے جالوت کو قتل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حکمت و ملک عطا کرکے اپنی مشیت اور مرضی کے مطابق علم سے نوازا۔

اسی طرح یہ آیت حکومت کے اقتدار و مدارج کے ساتھ ساتھ علم اور حکمت پر زور دیتے ہوئے، ذمہ داریوں میں سے ایک ایسی ذمہ داری کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو الٰہی سربراہوں کے ذمے ہوتی ہے، جیسے دشمنان خدا سے مقابلہ کرنا..... اس بحث کو حکومت کے سیاسی مسائل

اور فرائض کے ضمن میں بیان ہونا چاہیے۔

قرآن کریم میں ایسے پیغمبروں کے نام بھی درج ہیں جو مقام نبوت کے علاوہ معاشری ثقافت و سیاست کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، اُن میں سے پیغمبر داؤدؑ، سلیمانؑ، یوسف صدیقؑ اور ذوالقرنین کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۱) یا داؤد انا جعلناک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ (سورہ ص۔ آیت ۲۶)

اے داؤد ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، لہذا لوگوں کے ساتھ انصاف سے پیش آؤ، اور اپنی نفسانی خواہشات کا پیچھا مت کرو کہ یہ تمہیں اللہ کے راستے سے منحرف کر دیں گی۔

(۲) "وورث سلیمان داؤد وقال یا ایھا الناس علمنا منطق الطیر و اوتینا من کل شئی ان ھذا لھو الفضل المبین"

وحشر لسلیمان جنودہ من الجن والانس والطیر فھم یوزعون
(سورہ نمل آیت ۱۶، ۱۷)

"داؤد علیہ السلام سے حضرت سلیمان کو (ملک و نبوت) جب وراثت میں ملی تو انہوں نے لوگوں سے کہا: اے لوگو! پرندوں کی زبان سے ہمیں آگاہ کر کے تمام چیزیں عطا کر دی گئیں، یہ اللہ تعالے کا آشکارا فضل و کرم ہے" "اور سلیمان علیہ السلام کی فوج میں جن و انس اور پرند سبھی شامل ہو کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی غیر حاضر نہ تھا۔"

تفسیر صافی میں مجمع البیان سے اور مجمع البیان میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا دائرہ مشرق سے لیکر مغرب تک پھیلا ہوا تھا، انہوں نے زمین پر بسنے والے تمام جن و انس، شیاطین، چرندو پرند اور وحشی جانوروں پر سات سو سال سے زیادہ حکومت کی تھی۔

(۳) "وقال الملک ائتونی بہ استخلصہ لنفسی فلما کلمہ قال انک الیوم لدینا مکین امین"

"قال اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم۔"

"وکذلک مکنا لیوسف فی الارض یتبوأ منھا حیث یشاء

نصیب برحمتنا من نشاء ولا نضیع اجر المحسنین" (سورہ یوسف آیہ ۵۴-۵۶)

یوسف ؑ نے درخواست کی کہ اس ملک کے سب خزانوں پر مجھے متعین کردو، اور دیکھو کہ میں کیا حفاظت کرنے والا اور وجوہ مصارف جاننے والا ہوں۔ اور اس طرح ہم نے یوسف کو سرزمین مصر پر بالادستی دی کہ اس میں جہاں جی چاہے وہاں رہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت سے اسی طرح پہنچا دیا کرتے ہیں اور نیک افراد کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے زندان میں بھی لوگوں کی بری حالت اور حکومت وقت کے فتنہ و فساد سے باخبر تھے اور انہوں نے مصری عوام پر حکمران سیاسی نظام کو ختم کرکے انھیں امن و انصاف مہیا کرنے کی فکر میں کوئی فروگذاشت نہیں کی جس وقت وہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر بیان کرنے کے سلسلے میں بے گناہ قیدی کی حیثیت سے پہچانے گئے، بادشاہ نے ان کے چہرۂ مبارک پر دانشمندی و بیدار مغزی کے آثار دیکھے تو بادشاہ نے عزیز مصر سے کسی چیز کی درخواست یا فرمائش کرنا چاہی۔ وہ چاہتا تھا کہ ملک وملت کی شہ رگ یعنی ملک کی اقتصادی سیاست کی ذمہ داری انھیں سونپ دے۔ اس اہم نکتے سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہئے کہ اقتصادی سیاست پر ملک کے سارے نظام اور عوام کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے۔

ملک کی سیاست سنبھالنے کے سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اقوال سے ایک اور اہم نکتہ سامنے آتا ہے جو دو بنیادی شرطوں پر مبنی ہے۔ ایک "حفیظ" یعنی محافظ، امانت دار اور قابل اعتماد ہونا، دوسری شرط "علیم" یعنی ملکی منافع، مال و دولت، ذخیروں اور سیاست دولت سے باخبر ہونا ہر سربراہ کے لیے شرط لازم ہے۔

آیا حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت وحکومت میں علم و امانت کے سوا اور کوئی دوسرا محور تھا؟

"وعلم آدم الاسماء کلها"

"اناعرضنا الامانة ...... وحملها الانسان"

جو شخص ان دونوں صفتوں سے محروم رہا وہ یقینی طور پر "ظلوم وجھول" نادان دستگر ٹھہرا۔ انسانیت پر اب تک جتنے مصائب گذرے ہیں وہ سب انھیں نادان وستمگر افراد کے ہاتھوں گذرے، جنھوں نے خلافت کی امانت غصب کرکے انسانی زندگی کے نظام

کو تباہی کے حوالے کر رکھا ہے۔

(۴) "ویسئلونك عن ذی القرنین، قل سأتلوا علیکم منه ذکرا انا مکنا له فی الارض وآتیناه من کل شیءٍ سببا۔"

لوگ ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اُن سے کہہ دیجیئے ہم ان کے بارے میں کچھ تذکرہ کیے دیتے ہیں: ہم نے ان کو زمین پر اقتدار دیا اور ہر چیز کے اسباب فراہم کر دیے تھے۔

اس کے بعد محروم طبقوں کو نجات دلانے کے لیے ان کے مشرق و مغرب کے سفر کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک سفر کے حالات بیان کرنے کے ضمن میں یاجوج و ماجوج کے نام زمین پر اُن مفسدوں کی فہرست میں بتاتے ہیں۔ جن کے ظلم و ستم اور فساد کو روکنے اور مستضعفین اور محرومین کو شکنجے سے نجات دلانے کے لیے اسکندر نے دونوں طبقوں کے درمیان ایک دفاعی دیوار بنانے کے لیے کچھ اقدامات کیے تھے، اس کی مزید تفصیل قرآن مجید اور تفسیروں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ خداوند کریم کی جانب سے مبعوث ہونے والے اس سربراہ اور انصاف پسند حکمران نے (اسکندر نام کا ایک بند) قائم کیا، تاکہ محروموں پر حملہ آور دشمن کے حملوں میں رکاوٹ ڈال سکے اور اس قابل تعریف اقدام کو اس طرح انجام دیا، جس طرح سے ایک الٰہی سیاست کار اور ذمہ دار کو انجام دینا چاہیے (سورۂ کہف کی ۸۳ سے لیکر ۹۸ ویں آیت تک ملاحظہ ہو)

بیان کردہ واقعات و حقائق ثابت کرتے ہیں کہ تاریخ کے طویل عرصے میں ایسے پیغمبر اور مردان حق گذرے ہیں، جنھوں نے ملک اور عوام کی باگ ڈور سنبھالنے کے ساتھ ساتھ عوام کو راہنمائی اور سیاست کے فرائض بھی معیاری طریقے پر انجام دیے ہیں۔ اور جس راہ پر سیاسی کارکنوں کو چلنا اور جن اغراض و مقاصد کو پورا کرنا چاہیے ان کی نشاندہی بھی اس طرح سے کی ہے کہ دوسروں کے لیے بطور نمونہ باقی رہیں۔

اس باب کی اصولی تخلیص

(۱) قرآن میں حکومت اور قانونی حکمراں (حاکم شرع) کی بنیاد۔

(۲) قرآنی نقطہ نظر سے سیاسی نظام کے مقاصد و نتائج ۔
(۳) قرآن میں سیاسی نظام کے ارکان ۔
(۴) قرآنی نقطہ نظر سے طرز حکومت ۔
تتمہ : سیاسی رجحانات کے سامنے عوام اور مذہبی رہنماؤں کی ذمہ داری۔

بنیادِ حکومت

فرمانروائی :

نصِ قرآن کے مطابق مطلق اور کلی حاکمیت صرف خالق کائنات کو حاصل ہے۔ کائناتی مطالعے، آئیڈیالوجی اور اعتقاد کا نتیجہ بھی ہے ۔ یہی عقیدہ پورے نظام کی اساس ہے ، چونکہ ایک وجود مطلق ہی پوری کائنات کا فرمانروائے حکیم و عادل و قادر و سرمدی ہے۔ ظاہر ہے اس کے نتیجہ میں انسانی سرنوشت اسی نظام کائنات کا ایک جزء ہوگی ، اسی فلسفے سے یہ نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ اولا و بالذات اللہ حاکم اور اس کے بعد ہر انسان خلیفہ، نمایندہ اور رضائے خدا یا احکام خدا کا نفاذ کنندہ ہے ۔ اس فلسفے کے لیے قرآن کی درج ذیل آیتیں تائید و راہنمائی کرتی ہیں :

"ان الحکم الا للہ امر الا تعبدوا الا ایاہ" (سورۂ یوسف آیہ ۴۰)
فرمانروائی دراصل خدا ہی کی ہے ، اور اس نے یہ حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو ۔

"فالحکم للہ العلی الکبیر" (سورۂ غافر آیت ۱۲)
فرمانروائی دراصل خدائے بزرگ ہی کو حاصل ہے ۔

"ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون" (سورہ مائدہ آیت ۵۰)
اور یقین کرنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر فرمانروا کون ہے۔

"ان الحکم الا للہ یقص الحق وھو خیر الفاصلین" (سورہ انعام آیت ۵۷)
فرمانروائی صرف خدا کو حاصل ہے ، وہ حق کو بیان کرتا ہے اور وہی سب سے بہتر

فیصلہ کرنے والا ہے۔

متعدد آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانروائی، انسانی فرمانروائی کی طرح نہیں ہے، جو طاقت اور سطوت کے بل بوتے پر حاصل ہوتی ہے، بلکہ ان اشاروں کے سہارے جو آیات میں موجود ہیں۔ اس فرمانروائی کا راز جبروت، استغنا، قدرت، علم، حکمت، ربوبیت، عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے دیگر جلال و جمال کی صفات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس طرح سے اگر خداوند عالم حاکمیت اور فرمانروائی اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے تو محض اس لیے کہ وہ بھی اس حکمت کے تابع اور اسی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں پیغمبر اکرمؐ کی فرمانروائی کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے۔

"فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما" (سورہ نساء آیت ۶۵)

تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ (کبھی) مومن نہ ہوں گے۔ جب تک کہ اپنے جھگڑوں میں تم کو حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں، اور اس کو اس طرح تسلیم کریں جیسا کہ تسلیم کرنے کا حق ہے۔

"وان حکمت فاحکم بینهم بالقسط ان الله یحب المقسطین" (سورہ مائدہ آیت ۴۲)

اور اگر فیصلہ کرو تو ان کے مابین انصاف سے فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ منصفوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

حق اور انصاف کے ساتھ فرمانروائی کا حکم اللہ تعالیٰ نے محض اپنے پیغمبروں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ تمام مؤمنوں پر بھی اس کا نفاذ ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی فیصلہ کریں تو حق اور انصاف کا پورا پورا خیال رکھیں اور پابند رہیں۔

"ان الله یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اهلها واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان الله نعما یعظکم به ان الله کان سمیعا بصیرا"۔ (سورۂ نساء آیت ۵۸)

بے شک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو پہنچا دو اور جس وقت لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ دو۔ اللہ اس بارے میں تم کو بہت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

آیت کے دو حصے ہیں۔ ان اللہ یامرکم .... واذا حکمتم .... ان دونوں حصوں میں اگر واو کو قرینہ مانا جائے تو امانت سے مراد امامت وحکومت وعدالت ہے۔ لیکن اگر امانت کو کلی بھی مان لیا جائے تو اس میں ہر قسم کی امانتیں شامل ہوں گی اور اگر اس بحث میں نہ بھی پڑیں جب بھی ماننا ہوگا کہ امامت وحکومت تمام انواع امانت میں نمایاں ترین امانت ہے اور یقینی طور پر آیت سے یہی حکم ملتا ہے کہ یہ امانت یعنی حکومت، اہل افراد کے حوالے کی جائے، کیونکہ اگر ایک ناچیز مادی شئی کو امانت کا نام دیکر اہل کے حوالے کرنے کا فرض ہے تو حکومت وقضا، سیاست وتدبیر معاشرہ، امانت کا برتر وبہتر مصداق کیوں نہ ہو؟ چنانچہ تفاسیر میں "امانت" کو امامت وزعامت سے تعبیر کیا گیا ہے اور "انا عرضنا الامانۃ" میں، امانت سے متعلق واضح ترین تفسیر یہی ہے۔ ائمہ اہل بیتؑ کے روایات اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

بہر حال یہ دیکھا جائے کہ اس امانت کا اہل کون ہے؟ کیا "ظلوم وجہول افراد ہیں" جو "لاینال عہدی الظالمین" کے مصداق ہیں؟ یا صالح، مؤمن، بے لوث اور عالم ومتقی افراد ہیں؟ ظاہر ہے کہ جوابوں میں دوسرا جواب صحیح ہے۔

بہر حال، خداوند کریم نے مومنوں کو، امانت کی نمایاں قسم امامت وسیاست کو ان اہل افراد کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے، جو خلافت الٰہی کی صلاحیت اور پیغمبروں کی نیابت رکھتے ہوئے امت مسلمہ کی قیادت اور اسلامی قدروں کی حفاظت کر سکتے ہوں۔ صرف یہی نہیں "حکم بین الناس" کے سلسلے میں بھی لوگوں کو یہ ہدایت ہوا ہے کہ انصاف کا دامن نہ چھوڑیں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہترین نصیحت ہے۔

ولایت:

جس طرح سے لفظ "حکم" کا تعلق ابتداءً اللہ سے پھر اس کے بندوں سے ہے، اسی طرح لفظ "ولایت" جو سرپرستی اور سربراہی کے معنی رکھتا ہے، پہلے اللہ تعالیٰ پھر پیغمبر

اور اولی الامر سے تعلق رکھتا ہے۔

"انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۵۵)

سوائے اس کے نہیں ہے کہ حاکم تمہارا اللہ ہے اور اس کا رسولؐ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔ نماز پڑھتے اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

"البنی اولی بالمومنین انفسھم" (سورہ احزاب۔ آیت ۶)

نبیؐ مومنین کی جانوں کا خود آن سے زیادہ اختیار رکھنے والا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اللہ، رسولؐ اور آن والیان امر کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہیں۔

والیان امر کون ہیں؟ مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت کون رکھتا ہے؟ آیا مسند حکومت پر ہر بیٹھنے والے شخص کی اطاعت واجب ہے؟

نعوذ باللہ، ایسا ہرگز نہیں، کیا قرآن یہ نہیں کہتا؟

ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون۔" (سورۂ شعراء۔ آیت ۱۵۱)

اور ان زیادتی (اسراف) کرنے والوں کا جو زمین پر فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے کہنا نہ مانو۔

قرآن کریم ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں سے بے رخی اختیار کرتے اور ظالم وجابر افراد کے نقش قدم پر گامزن رہتے ہیں۔

"وعصوا رسلہ واتبعوا امر کل جبار عنید" (سورۂ ھود۔ آیت ۵۹)

یہ قوم عاد کے افراد جو اس کے رسولوں کی نافرمانی کیا کرتے تھے اور ہر کینہ ور ظالم کے فرمان کی تعمیل کرتے تھے۔

اسی طرح فرعون کے بارے میں ارشاد ہے:

"وما امر فرعون برشید" (سورۂ ھود - آیت ۹۷)
فرعون کا حکم صحیح نہ تھا۔

ولایت وامر کے متعلق جو آیتیں پیش کی گئیں۔ ان پر غور وفکر کرنے سے یہ نتیجہ عائد ہوتا ہے کہ ظالم وجابر اور بے صلاحیت حکام جو ضدی، مسرف، غاصب اور عقل وعلم کے دشمن ہیں ہرگز "اولی الامر" کا مصداق نہیں ہو سکتے۔

"اولی الامر" کا اطلاق ان رہبروں پر ہوتا ہے جو صالح، عالم اور منصف ہوں پہلے مرحلے میں اولی الامر سے مراد اگر پیغمبرؐ کے ذریعے منتخب افراد ہیں تو دوسرے مرحلے میں مراد ان افراد سے ہے جو علم، زھد وتقوی، عصمت اور عدل وانصاف کے لحاظ سے تمام انسانوں پر برتری رکھتے ہو۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تھوڑی سمجھ بوجھ رکھنے والا بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس تعریف کے باوجود "اولی الامر" جیسی مقدس اصطلاح کو ظالم وجابر افراد کے لیے استعمال کر کے انھیں اللہ و رسولؐ کی صف میں کھڑا کرے تو تعجب کا مقام ہے!

لھذا، اسلامی معاشرے کو سیاست کرنے کی ذمہ داری، اسی شخص کو زیب دیتی ہے، جو صراط مستقیم پر ایمان رکھتا ہو اور انبیاء ورسل کی راہ پر چلتا اور برحق اماموں کے مشن کی توسیع وتبلیغ کرتا ہو۔

امامت:

قرآن مجید میں اصطلاح (امام) کا ذکر متعدد آیات میں ہے۔ بعض جگہوں پر انسانی ارتقا کے بلند ترین مقام سے اسے تعبیر کیا ہے، کہ نبوت ورسالت کے مقام سے بھی بالا و برتر ہے، بعنوان مثال درج ذیل آیت ملاحظہ ہو۔

واذ ابتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن، قال انی جاعلک للناس اماما۔ قال ومن ذریتی قال لاینال عھدی الظالمین" (سورہ بقرہ - آیت ۱۲۴)

اور (اس وقت کو یاد کرو) جبکہ ابراھیمؑ کا اس کے رب نے چند کلمات سے امتحان لیا اور ابراھیمؑ نے ان کو پورا کر دیا (خدا نے) فرمایا کہ میں تم کو تمام

انسانوں کا امام مقرر کرنے والا ہوں (ابراہیمؑ نے) عرض کی اور میری اولاد میں سے۔ (خدا نے) فرمایا جو ظالم ہوں گے (وہ) میرے عہد سے فائدہ نہ اٹھائیں گے۔

اگرچہ یہ آیت نفوس و قلوب کے اس معنوی مقام و منزل کی نشاندہی کرتی ہے جس کا تعلق عالم ملکوت اور ولایت تکوینی تک محدود ہے اس سے ہٹ کر عام چیزوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس لفظ کے عام مفہوم اور آیت کے آخری حصے کو مدنظر رکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظالم افراد قیادت و امامت کے لائق نہیں ہیں۔ لفظ ظلم کی ضد یعنی عدالت، امامت و رہبری کے لیے بنیادی شرط ہے۔

لیکن جن آیات میں لفظ امام استعمال ہوا ہے (اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ امام کے معنی رہبر و پیشوا اور مقدم ہیں) سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے رہبر و پیشوا دو قسم کے ہیں، جو ہمیشہ سے انسانوں کو الگ اور متضاد سمتوں میں لے جاتے رہے ہیں۔

بعنوان مثال لائق اور برحق اماموں کی بابت یوں بیان ہوا ہے۔

وجعلناهم ائمة يهدون بامرنا واوحينا اليهم فعل الخيرات واقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة وكانوا لنا عابدين (سورہ انبیاء آیت ۷۳)

اور ان کو ہم نے ایسا امام بنایا جو ہمارے حکم کے بموجب ہدایت کرتے تھے اور اُن کی طرف ہم نے نیکیاں کرنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی فرمائی اور وہ سب کے سب ہماری بندگی کرنے والے تھے۔

اگرچہ مذکورہ آیت پیغمبروں اور ان کے بار رسالت و ہدایت کے بارے میں نشاندہی کرتی ہے، لیکن اس کے باوجود انسان کی راہنمائی اور قیادت کو محض پیغمبروں ہی تک محدود نہ کرنا چاہیئے اور نہ ہی ان کے دائمی وجود کی کوئی شرط ہونا چاہیئے اور نہ ہی ان کے دائمی وجود کی کوئی شرط ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ بہرحال پیغمبروں کی زندگی کا دور بھی اختتام پذیر ہے۔ اگر یہ طے پائے کہ تاقیامت انسانوں کی راہنمائی الٰہی شریعت کا جذبہ ہی کرتا رہا ہے جو کر رہا ہے، تو اس جذبے اور اس کے اثرات کو شریعت کے دوسرے ابعاد کی طرح جاری و ساری رہنا چاہیے۔ لہٰذا فکری، دینی، سماجی اور سیاسی قیادت و رہبری اصلیں

لوگوں کو زیب دیتی ہے ، جن کی خصوصیات مذکورہ آیت میں بیان کردہ خصوصیات کے مطابق ہوں یعنی خالص بندگی خدا ، پابندی نماز و روزہ اور محرومین و مستضعفین کی مدد کا جذبہ ان میں پایا جاتا ہو ۔ اسی ضمن میں دوسری آیتوں میں بیان شدہ خصوصیات (علم ، عدل ، پرہیزگاری اور انسان دوستی) کا حامل بھی ہونا چاہیے ۔

یہ تھی مختصر سی بات انسانوں کے سچے اور حقیقی رہنماؤں کے سلسلے میں ۔ گمراہ اور لیاقت سے عاری رہنماؤں کے بارے میں بھی قرآن ایک اہم نکتہ بیان کرتا ہے ۔

"وجعلناهم ائمة يدعون الى النار ويوم القيامة لا ينصرون"
ہم نے ان کو ایسا امام بنایا ہے ، جو جہنم کی ترغیب دلاتے ہیں اور روز قیامت ایسے لوگوں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۔

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مصر میں حکومت فرعون اور اس کے نقش قدم پر چلنے والے لوگوں کے پاس تھی اور وہ لوگوں کو جہنم کی اس آگ کی طرف لے جا رہے تھے جس سے نجات پانا مشکل ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریکی و ظلمت کے دلال بننے ، دوزخ کا بیج بونے اور لوگوں کو دنیا و آخرت سے محروم کرنے کے سوا ظلم و جور کے سربراہوں کا پیشہ اور کوئی نہیں رہا ہے ۔ ان کی ہزاروں سال پر مشتمل حکومت کا نتیجہ یہی تھا کہ انہوں نے ہمیشہ جنگ کی آگ کو بھڑکایا اور ظلم و جور کا سہارا لیکر خود اپنے اور دوسروں کے لئے آخرت کی آگ فراہم کی ۔

اس قسم کی سیاست و رہبری کے مد مقابل لوگوں کے فرائض کیا ہیں ؟
اس کا جواب کسی دوسرے موقعہ پر بیان کریں گے ، فی الحال اسی سلسلے میں قرآن کریم کی ایک آیت پر غور کیجئے :

فقاتلوا ائمة الكفر انهم لا ايمان لهم (سورہ توبہ ۔ آیت ۱۲)
سرداران کفر کو یہاں تک مارو کہ وہ باز آجائیں ۔ بے شک وہ ایسے ہیں جن کی قسم کوئی چیز نہیں ۔

فتنہ و فساد کے اختتام اور الٰہی حکومت کے مستقر ہونے تک کفر و استکبار کے خلاف جنگ (فقاتلوھم حتی لا تکون فتنہ و یکون الدین کلہ للہ) اسلامی سیاست کا وہ جزء ہے، جسے فوجی سیاست یا اصولِ دفاع کا نام دیا جا سکتا ہے یہ بحث کافی طویل ہے اور اس مختصر مقالے میں بحث کی گنجائش نہیں۔

قرآنی نقطۂ نظر سے سیاسی نظام کے بنیادی مقاصد و نتائج:

کسی حکومت یا سیاسی نظام کی تشکیل اور اسے قانونی درجہ حاصل ہونے کے ہدف کو نظام خلقت اور کائنات کے سارے نظام سے علیحدہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسان کی روح پر حاکم کائناتی مطالعے کی قسم اور آئیڈیالوجی حیات اور انسانی زندگی سے وابستہ تمام مسائل کے ساتھ ساتھ ہم حکومت کے مقاصد کی تعین بھی کر سکتے ہیں۔

جس حکومت کی بنیاد مادیت یا اس کے نتائج پر مبنی ہو، اس کے اغراض و مقاصد استکبار، تسلط، جاہ طلبی، ہوا و ہوس اور زیادہ سے زیادہ عیش و عشرت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے۔ قرآن کریم فرعونی حکومت اور اس کی سیاست کے متعلق حسب ذیل وضاحت پیش کرتا ہے:۔

"ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناء ھم یستحی نساءھم انہ کان من المفسدین
(سورہ قصص۔ آیت ۴)

بے شک فرعون اس سرزمین میں غالب تھا اور اس کے باشندوں کو اس نے گروہ در گروہ بنا دیا تھا کہ ان میں سے ایک کو کمزور رکھتا تھا، ان کے بیٹوں کو ذبح کیا کرتا تھا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا۔

اس سیاست کے اصول

(۱) تکبر و غرور جو اپنی ذات کو مرکز سمجھنے کا نتیجہ اور جس کی غرض جاہ طلبی کی خواہش کو پورا کرنا ہے۔

(۲) جس امت میں اتحاد کی تاکید کی گئی تھی اس کے اتحاد کو ختم کرنا فرعونی سیاست

کا نصب العین تھا۔

(۳) مستکبر و صاحب جاہ و جلال افراد کی عیش و عشرت اور آرام کے خاطر ان محروموں اور مستضعفوں کو غلام بنانا جن کی زندگی فرعون کے ہاتھ میں تھی۔

(۴) لڑکوں کو اس خوف کی وجہ سے قتل کرنا کہ کسی دن یہ بغاوت نہ کر دیں۔

(۵) ان لڑکیوں کی عزت و آبرو سے کھیلنا جن کا کوئی وارث نہ تھا اور ایک نوالہ روٹی کے لئے فرعونیوں کے چنگل میں پھنسی تھیں۔

(۶) ہر طرح کے سیاسی، فکری، اعتقادی، اقتصادی، اخلاقی، فردی اور سماجی گراوٹ اور فساد کو فروغ دینا۔

مذکورہ چھ نکاتی اصول کو ان ظالم وجابر حکمرانوں کی اسٹراٹیجک سیاست کا نچوڑ سمجھا جا سکتا ہے، جو ماضی سے لیکر آج تک انسانوں پر حکومت کرتے چلے آئے ہیں اور انسانی تہذیب و تمدن، آبادی اور ملکوں کے وسیع ہونے کے نتیجہ میں ان کی ظالمانہ سیاست دن بدن رنگ لاتی رہی، یہاں تک کہ آج کی سیاست فرعونیوں کے زمانے سے کہیں زیادہ تباہ کن افسوسناک صورتحال اختیار کر چکی ہے۔ اس موضوع پر یہ ایک آیت سیاست کے اس رویے، اس کے مقاصد و نتائج کی فہرست مرتب کرنے کے لئے کافی ہے۔

خلافت الٰہی، وراثت زمین، امامت مستضعفین:

قرآن مجید میں حکمت الہیہ کی توضیح میں جن بنیادوں پر حکومت کے اغراض و مقاصد اور مطلوبہ نتائج بیان کیے ہیں ان میں چند باتیں یہ ہیں:

(۱) " ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلهم ائمه و نجعلهم الوارثین۔" (سورۂ قصص آیت ۵)

اور ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو اس سرزمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں احسان کریں اور ان کو امام بنائیں اور ان کو ہم وارث قرار دیں۔

اس سے پہلے کی آیت میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کی سیاست بیان ہوئی ہے۔

یہ آیت حضرت موسیٰؑ کا مقصد بعثت بیان کرتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لیے مبعوث ہوئے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کی حکومت ختم کرکے مستضعفین کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں اور اس سرزمین کے اصلی مالکوں کو ان کا حق دلائیں، مستقبل کے لیے صاحب اختیار امام و رہبر کا انتخاب کروائیں اور بنی اسرائیل کے مظلوم عوام کے طبقے سے نکلنے والے رہنما کو خدا کے پیام اور الٰہی فلسفے کی حفاظت کریں۔ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کی رسالت کا تقاضا یہی تھا۔

اس آیت کو حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل ہی تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ (فعل نرید ان نمن) صیغۂ مضارع مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی خداوند کریم کا ارادہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ وہ انسانوں کی امامت و رہبری اور زمین کی وراثت، ظالم و غاصب افراد سے چھین کر ان لوگوں کے سپرد فرماتا ہے جو نیک اور صالح ہوں، یہ سیاست الٰہیہ دنیا قائم رہنے تک جاری ہے اور اس کی مکمل کامیابی اسی وقت ہوگی جب دنیا میں مستبد اور مستکبروں کے آثار باقی نہ رہیں اور زمین پر امامت، امت مسلمہ کے نیک افراد اور الٰہی و لائق رہبروں کے سپرد ہوجائے، یہ قرآن مجید اور پیغمبر اکرمؐ کی بیان کی ہوئی خوشخبری ہے، جس کے مسلمان منتظر ہیں اور جس کو عملی جامہ پہنانے کی انھیں کوشش کرنا چاہیے۔

(باقی آئندہ)

جناب محمد باقر انصاری

قرآن میں اسماء وصفات قرآن

کلام اللہ مجید کی تلاوت کے دوران نظر اس نکتہ پر ٹھہری کہ قرآن مجید نے خود اپنا تعارف کیوں کر پیش کیا ہے۔ غور کرتے کرتے معلوم ہوا کہ اس معجز نما کتاب مقدس نے اپنے بہت سے اسماء و اوصاف بیان کئے ہیں۔ بعض الفاظ کے بارے میں واضح ہے کہ یہ اسماء قرآن ہیں جیسے "قرآن" و "کتاب" اور بعض ایسے ہیں جن کا صفات قرآن ہونا یقینی ہے جیسے "کریم" و "مبارک" کچھ تعبیریں ایسی ہیں جو کبھی بطور اسم استعمال ہوئی ہیں اور کبھی بعنوان صفت جیسے "ہدی" و "رحمت" لیکن بعض مقامات پر اسم و صفت کی تشخیص مشکل ہے۔

ہم اس مقالہ میں قرآن کریم کے اسماء اور اس کے عام اوصاف کا حروف تہجی کی ترتیب سے جائزہ لیں گے، مقالہ کے آخر میں ان کلمات کو جداگانہ بیان کیا جائے گا جو صفت محض ہیں۔

۱۔ **احسن ما انزل** : یہ تعبیر ایک مقام پر قرآن مجید کے لئے استعمال ہوئی ہے: وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ (زمر ۔ ۵۵)۔ لیکن یہ تعبیر دیگر آسمانی کتابوں کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہے کیونکہ قرآن مجید کامل ترین اور متقن ترین آسمانی کتاب ہے جو آخری پیغمبر پر نازل ہوئی۔

۲۔ **بشریٰ** : بشریٰ قرآن مجید کا ایک نام ہے۔ قرآن بشریٰ ہے کیونکہ وہ جنت، اخروی نعمتوں اور ان چیزوں کی بشارت دیتا ہے جو دنیا میں بھی انسان کی سعادت و خوش بختی کا باعث ہیں۔ لفظ بشریٰ حسب ذیل آیتوں میں قرآن مجید

کے لئے استعمال ہوا ہے : ھدی و بشریٰ للمومنین (بقرہ - ۹۷) ھدی و رحمۃ و بشری للمسلمین (نحل - ۸۹) ھدی و بشری للمسلمین (نحل - ۱۰۲) و بشری للمحسنین (احقاف - ۱۲) -

بعض آیتوں میں یہ لفظ ہدف و غایت قرآن کے عنوان سے بصورت فعل استعمال ہوا ہے -

۳- **بصائر** : بصائر : جمع بصیرت ہے - اس کا فعل بَصُرَ یبصر بضم صاد ہے، بصر و بصارت کے معنی عالم و آگاہ ہونا، کسی شئی کی معرفت حاصل کرنا ہے اور بصیرت کے معنی عقل و درایت اور عبرت و نصیحت ہے، لفظ بصیرت بیّنہ و رہنما کے لئے بھی استعمال ہوا ہے یعنی جس کے ذریعہ حقائق اشیاء کو دیکھا جا سکے، قرآن مجید کے لئے کلمہ بصیرت اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، کیونکہ قرآن ایک ایسا چراغ ہے جس کی روشنی میں حقائق کو دیکھا جا سکتا ہے قرآن کریم کو بصائر، بصورت جمع اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی ہر آیت اور ہر سورہ بیّنہ و رہنما ہے، قرآن ایسے واضح و روشن دلائل و برھان کا مجموعہ ہے جو حق کو باطل سے ممتاز کرتا ہے - قرآن کریم کے لئے یہ لفظ دو آیتوں میں ذکر ہوا ہے :

ھذا بصائر من ربکم وھدی و رحمۃ (اعراف - ۲۰۳) ھذا بصائر للناس وھدی و رحمۃ لقوم یوقنون (جاثیہ - ۲۰)

۴- **بلاغ** : ایک آیت میں قرآن مجید کے لئے لفظ بلاغ استعمال ہوا ہے : ھٰذا بلاغ "للناس ولینذروا بہ (ابراھیم - ۵۲) - بلاغ کے معنی بلوغ اور مقصد تک پہنچنا ہے - المنجد میں ہے :

البلاغ : ج بلاغات الاسم من الابلاغ والتبلیغ ای الایصال - لفظ بلاغ، قرآن مجید کے لئے اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی قرآن کریم انسان کے مقصد یعنی آخری ارتقا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے -

۵- **بیّنہ** : یہ لفظ بان، یبین، بیاناً و تبیاناً سے مشتق ہوا ہے - اس کے معنی روشن و واضح ہونا ہے - بیّنہ - تانیث بیّن اور اس کی جمع بیّنات، بمعنی دلیل و حجت

واضح ہے۔ چونکہ قرآن کریم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رسالت کی حقانیت کا معجزہ ہے لہذا قرآن کے لئے یہ لفظ اور اس کے مشتقات بکثرت استعمال ہوئے ہیں، کبھی بصورت اسم اور کبھی بطور صفت۔

لفظ مبین جو اسی مادہ سے مشتق ہوا ہے۔ متعدد آیتوں میں قرآن مجید کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کی مزید توضیح آئندہ صفحات پر بیان ہوگی۔

لفظ "بینہ" قرآن کریم میں اس آسمانی کتاب کے لئے حسب ذیل مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ قل انی علیٰ "بینۃ" من ربی (الانعام - ۵۷)۔ یہ آیت بعض مفسرین کے خیال میں قرآن مجید کے بارے میں ہے۔ فقد جاءکم "بینۃ" من ربکم (الانعام - ۵۷) بقیہ آیتوں میں یہ لفظ بصورت جمع استعمال ہوا ہے:

لقد انزلنا الیک آیات بینات (بقرہ - ۹۹) بعض مفسرین کے قول کے مطابق انزل فیہ القرآن ھدی للناس و"بینات" (بقرہ - ۱۸۵) و اذا تتلیٰ علیھم آیاتنا بینات" (یونس - ۱۵ - مریم - ۷۳ - حج - ۷۲ - سبا - ۴۳ - جاثیہ - ۲۵، احقاف - ۷) وکذٰلک انزلناہ آیات بینات (حج - ۱۶) و انزلنا فیھا آیات "بینات" (نور - ۱) بل ھو آیات بینات (عنکبوت) - ۴۹) ھو الذی ینزل علیٰ عبدہ آیات "بینات" (حدید - ۹) وقد انزلنا آیات بینات (مجادلہ - ۵)۔ چند آیتوں میں "مبینات" بھی استعمال ہوا ہے:

لقد انزلناہ الیکم آیات "مبینات" (نور - ۳۴) لقد انزلنا آیات مبینات (نور - ۴۶) یتلوا علیکم آیات اللہ مبینات (طلاق - ۱۱)

اس مقام پر یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ چونکہ لفظ "آیت" و "آیات" قرآن کریم کیلئے بھی استعمال ہوا ہے اور پیغمبر اسلامؐ و دیگر انبیاء کے معجزات کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور چونکہ یہ لفظ قرآن مجید کا کوئی مستقل نام یا صفت نہیں ہے اس لئے ہم نے اسے یہاں بیان نہیں کیا ہے، ان آیات سے استفادہ کے لئے "المعجم المفہرس" دیکھئے۔

حسب ذیل آیتوں میں قرآن مجید کے لئے صفت "مبین" استعمال ہوئی ہے:-

وانزلنا الیکم نوراً "مبینا" (نساء - ۱۷۴) نور و کتاب "مبین" (مائدہ - ۱۵)
تلک آیات الکتاب المبین (یوسف - ۱ ، شعراء - ۲ ، قصص - ۲) آیات الکتاب و
وقرآن مبین (حجر ۱) تلک آیات القرآن و کتاب "مبین" (نمل - ۱) ان
ھو الا ذکر وقرآن "مبین" (یٰسین - ۶۹) والکتاب المبین (زخرف - ۲، دخان ۲)
اس مادہ کے دوسرے مشتقات جو قرآن مجید کے لئے استعمال ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:
بیان: ھٰذا بیان للناس وھدی وموعظۃ للمتقین (آل عمران - ۱۳۸)
تبیان: ونزلنا علیک الکتاب "تبیانا" لکل شیئ (نحل - ۸۹)

۶۔ **تفصیل**: قرآن مجید کا دوسرا نام "تفصیل" ہے، معنی فصل، جدا کرنا ہے
فصل کا مزید فیہ، باب تفعیل (تفصیل) چند معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ان میں سے چند حسب
ذیل ہیں:

توضیح و بیان، وسیع پیمانے پر لانا، کتاب وغیرہ کو فصل فصل کرنا، پیراگراف، ابواب
وعناوین پر تقسیم کرنا۔ قرآن مجید کے لئے بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے،
شاید تبیان کے مترادف ہو۔

حسب ذیل آیتوں میں قرآن مجید کو لفظ تفصیل سے یاد کیا گیا ہے: ولکن
تصدیق الذی بین یدیہ "وتفصیل" الکتاب لاریب فیہ (یونس - ۳۷)۔ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شیئ (یوسف ۱۱۱)
ایک آیت میں بصورت مفعول بھی استعمال ہوا ہے: ھو الذی انزل الیکم الکتاب "مفصلاً" (انعام ۱۱۴)
چند آیتوں میں بصورت فعل استعمال ہوا ہے: ولقد جئناھم بکتاب "فصلناہ"
علیٰ علم (اعراف - ۵۲) کتاب احکمت آیاتہ ثم "فصلت" من لدن
حکیم خبیر (ہود - ۱) کتاب "فصلت" آیاتہ قرآنا عربیا (فصلت السجدہ - ۳)
ولو جعلناہ قرآنا اعجمیا لقالوا لولا "فصلت" آیاتہ (فصلت السجدہ - ۴۴)

اس آیت میں اعجمی سے مراد مبہم، غیر واضح یا غیر بلیغ ہے۔ لہٰذا فصلت کے بھی
وہی مذکورہ معنی ہوں گے۔ یعنی اگر قرآن مبین و بلیغ نہ ہوتا تو کفار کہتے کہ اس کی آیتیں
واضح و روشن کیوں نہیں؟

ایک آیت میں قرآن مجید کے لئے لفظ فصل استعمال ہوا ہے: انہ لقول "فصل" (طارق ۔ ۱۳) اس جگہ پر مصدر (فصل) بمعنی فاعل، مبالغہ کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ جیسے زید عدل (کہ عدل بمعنی عادل ہے اور مقصد مبالغہ ہے) یعنی قرآن مجید درحقیقت حق کو باطل سے جدا کرنے والا ہے، یہ تعبیر (فصل) مانند تعبیر فرقان ہے (کیونکہ اس کے معنی بھی جدا کرنا ہے)

۷۔ **تنزیل**: تنزیل بھی قرآن مجید کے لئے استعمال ہوا ہے، نزل ینزل کا مصدر اور معنی نازل کرنا ہے ۔ نزول قرآن مجید کے لئے باب افعال کو بھی استعمال کیا گیا ہے، جیسے: انا انزلناہ فی لیلۃ القدر (قدر ۔ ۱) اور باب تفعیل کو بھی۔ راغب اصفہانی انزال و تنزیل کے فرق کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: والفرق بین الانزال والتنزیل فی وصف القرآن والملائکۃ ان التنزیل تختص بالموضع الذی یشیر الیہ انزالہ مفرقا ومرۃ بعد اخری، والانزال عام"

تنزیل سے مراد قرآن مجید کا تدریجی نزول ہے ۔ لیکن انزال میں اس بات کی جانب کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہوا ہے یا تدریجاً ۔ المنجد کی نظر میں تنزیل کا معنی نزول تدریجی ہے، تنزیل کا ایک دوسرا معنی ترتیب دینا بھی ہے ۔

جن آیات میں قرآن کے لئے لفظ تنزیل استعمال ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

تنزیلا ممن خلق الارض والسموات العلیٰ (طہ ۔ ۴) وانہ "لتنزیل" رب العالمین (شعراء ۔ ۱۹۲) "تنزیل" الکتاب لاریب فیہ من رب العالمین (سجدہ ۔ ۲) "تنزیل" العزیز الرحیم (یٰس ۔ ۵) تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم (زمر ۔ ۱، جاثیہ ۲ احقاف ۔ ۲) تنزیل الکتاب من اللہ العزیز العلیم (مومن ۔ ۲) تنزیل من الرحمٰن الرحیم (فصلت السجدۃ ۔ ۲) تنزیل من حکیم حمید (فصلت السجدہ ۔ ۴۲) تنزیل من رب العالمین (الحاقہ ۔ ۴۳)

بعض آیتوں میں بصورت مصدر مفعول مطلق بھی استعمال ہوا ہے، جیسے: إنا نحن نزلنا علیک القرآن تنزیلا (دھر ۔ ۲۳)

۸۔ **حدیث واحسن الحدیث** ، حدیث بمعنی خبر ہے ۔ بقول صاحب "المفردات" حدیث ہر اس کلام سے عبارت ہے جو بذریعہ سماعت انسان تک پہنچے یا بوسیلۂ وحی انسان اس سے آگاہ ہو ، یہ علم حالت بیداری میں حاصل ہو یا عالمِ خواب میں۔

چونکہ قرآن مجید پیغمبر اسلامؐ پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے ، لہٰذا اسے حدیث ، یا احسن الحدیث کا نام دیا گیا ہے۔

حسب ذیل آیتوں میں قرآن مجید کو حدیث یا احسن الحدیث کے نام سے یاد کیا گیا ہے ؛ ماکان "حدیثا" یفتریٰ (یوسف ۔ ۱۱۱) ان لم یؤمنوا بھذا "الحدیث" اسفا (کہف ۔ ۶) اللہ نزل "احسن الحدیث" کتابا متشابھاً (زمر ۔ ۲۳) افمن ھذا الحدیث تعجبون (نجم ۔ ۵۹) افبھذا "الحدیث" انتم مدھنون (واقعہ ۔ ۸۱) فذرنی ومن یکذب بھذا "الحدیث" (قلم ۔ ۴۴) ۔ کچھ ایسی آیتیں ہیں جن میں چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر منکرین رسالت اس "حدیث" جیسی کوئی حدیث لاسکتے ہیں تو پیش کریں ۔ یا یہ کہ کسی اور حدیث میں غور و فکر کریں۔

حتی یخوضوا فی "حدیث" غیرہ (نساء ۔ ۱۴۰) فبای حدیث بعدہ یؤمنون (اعراف ۔ ۱۸۵ ، مرسلات ۔ ۵۰) فبایِّ "حدیث" بعد اللہ و آیاتہ یؤمنون (جاثیہ ۔ ۶) فلیأتوا بحدیثٍ" مثلہ (طور ۔ ۳۴)

۹۔ **حق ۔ حق الیقین** : حق کے اصلی معنی مطابقت و موافقت ہے ۔ لیکن صاحب المفردات راغبِ اصفہانی کے بقول قرآن مجید میں حق چار معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) وہ خالق جس کی تخلیق میں حکمت ہو ۔ اسی لئے خداوند عالم کو حق کہا جاتا ہے ۔ فذلکم اللہ ربکم الحق (یونس ۔ ۳۲)

(۲) وہ چیز جس کی تخلیق میں حکمت کے تقاضوں کا خیال رکھا گیا ہو۔
ماخلق اللہ ذالک الا بالحق (یونس ۔ ۵)

(۳) وہ عقیدہ جو مطابق واقع ہو۔

فہدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق (بقرہ - ۲۱۳)

۴۔ وہ قول و فعل جو بقدر ضرورت اور بوقت ضرورت ہو۔

کذٰلک حقت کلمة ربك (یونس - ۳۳)

قرآن مجید کے لئے شاید حق کے چوتھے معنی سب سے زیادہ مناسب ہوں۔ ویسے اس کا دوسرا معنی بھی مناسب ہے۔

جن آیات میں لفظ حق قرآن مجید کے لئے استعمال ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

وھو "الحق" مصدقا لما معھم (بقرہ - ۹۱) نزّل الکتاب "بالحق" (بقرہ - ۱۷۶) نتلوھا علیك بالحق (بقرہ - ۲۵۲) نزّل علیك الکتاب بالحق (آل عمران - ۳) انزلنا الیك الکتاب "بالحق" (نساء - ۱۰۵ - مائدہ - ۴۸) مما عرفوا من "الحق" (مائدہ - ۸۳) ومالنا لا نؤمن باللہ وما جاءنا من "الحق" (مائدہ - ۸۴) یعلمون انہ منزّل من ربك "بالحق" (انعام - ۱۱۴) لقد جاءك "الحق" من ربك (یونس - ۹۴) قد جاءکم الحق من ربکم (یونس - ۱۰۸) انہ الحق من ربك (ھود - ۱۷) الذی انزل الیك من ربك "الحق" (رعد - ۱) انما انزل الیك من ربك الحق (رعد - ۱۹) بالحق انزلناہ وبالحق نزل (بنی اسرائیل - ۱۰۵) وقل الحق من ربکم (کہف - ۲۹) أنہ الحق من ربك (حج - ۵۴) فلما جاءھم الحق من عندنا (قصص - ۴۸) انہ "الحق" من ربنا (قصص - ۵۳) او کذّب بالحق لما جاءہ (عنکبوت - ۶۸) بل ھو "الحق من" ربك (سجدہ - ۳) الذی انزل الیك من ربك ھو الحق (سباء - ۶) کفروا للحق لما جاءھم (سباء ۴۳ - احقاف - ۷) الذی اوحینا الیك من الکتاب "ھو الحق" (فاطر - ۳۱) انزلنا الیك الکتاب "بالحق" (زمر - ۲) انزلنا علیك الکتاب للناس بالحق (زمر - ۴۱) انزل الکتاب "بالحق" (شوریٰ - ۱۷) ولما جاءھم الحق قالوا ھٰذا سحر (زخرف - ۳۰) تلك آیات اللہ نتلوھا علیك بالحق (جاثیہ - ۵) آمنوا بما نزل علی محمد وھو "الحق من" ربھم (فتح - ۲) وما نزل من الحق

(حدید ۔ ۲۷) وقد کفروا بما جاءکم من الحق (ممتحنہ ۔ ۱) انہ لحق الیقین (الحاقہ ۔ ۵۱)

۱۰۔ حکم: "حکم" متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں: جدا کرنا، جھگڑوں کے فیصلے کرنا، حکومت کرنا، سیاسی تدبیر کرنا، پلٹنا، حکیم و دانشمند ہونا۔ یہ لفظ قرآن مجید کے لئے ایک آیت میں استعمال ہوا ہے۔ وکذلک انزلناہ "حکما" عربیا (رعد ۔ ۳۷)

اس آیت میں "حکم" کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ قرآن کے حکم ہونے کا کیا مطلب ہے؟ علامہ طباطبائی مرحوم دیگر آیات سے استنباط کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں حکم سے مراد حکمت نہیں ہے بلکہ لوگوں کے درمیان قضاوت اور فیصلے کرنا ہے، کیونکہ قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتابوں کے نزول کا ایک مقصد "حکم بین الناس" ہے، یہ مقصد قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں بیان ہوا ہے، جیسے: انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (نساء ۱۰۵) وانزل معھم الکتاب بالحق "لیحکم" بین الناس فیما اختلفوا فیہ (بقرہ ۔ ۲۱۳) چنانچہ آسمانی کتابوں کی شان ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حکم اور فیصلے کرے۔ کچھ آیتوں میں لفظ "حکم" قرآن مجید کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے: ذالک نتلوہ علیک من الایات والذکر "الحکیم" (آل عمران ۔ ۵۸) ۔ تلک آیات الکتاب "الحکیم" (یونس ۔ ۱ ۔ لقمان ۔ ۲) والقرآن "الحکیم" (یس ۔ ۲)

شاید ان آیات میں حکم سے مراد حکمت ہو اور حکمت اس علم سے عبارت ہے جو انسان کو افعالِ قبیحہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

ایک آیت میں قرآن مجید کو حکمت بتایا گیا ہے: "حکمۃ" بالغۃ فما تغن النذر (قمر ۔ ۵) ۔ ممکن ہے حکیم سے قرآن مجید کا محکم و متقن ہونا مراد ہو ۔ یعنی قرآن مجید اپنی تنظیم، ترتیب اور بیان میں محکم و متقن ہے، میرے خیال میں یہی احتمال زیادہ قوی ہے، کیونکہ دو آیتوں میں یہی لفظ باب افعال سے اتقان کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کتابٌ "احکمت" آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر (ھود ۔ ۱) ثم یحکم اللہ آیاتہ (حج ۔ ۵۲)

حسب ذیل آیت میں لفظ محکمہ بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

فاذا انزلت سورة محكمة وذكر فيها القتال (محمد - ۲۰)

البتہ جہاں آیات متشابہ کے مقابلہ میں آیات محکمہ کا استعمال ہوا ہے وہاں محکمہ سے دوسرے معانی مراد ہیں۔

خداوند عالم کی ایک صفت حکیم ہے، یعنی خداوند عالم کے تمام افعال منظم و مرتب و متقن ہیں۔ لہٰذا جب قرآن کا نازل کرنے والا خدا حکیم ہے تو قرآن بھی محکم و متقن ہوگا۔ اس کے اثبات کے لئے ہم ان آیات کو دلیل بنا سکتے ہیں جو براہ راست نزول قرآن کی نسبت اس خدا کی جانب دیتی ہیں جو صفت حکیم سے متصف ہے، جیسے: وانك لتلقى القرآن من لدن حكيم عليم (نمل - ۶) تنزيل الكتاب من الله العزيز الحكيم (۳۹ - ۱) تنزيل من حكيم حميد (فصلت - ۴۲)

۱۱۔ **ذکر**: راغب اصفہانی اپنی کتاب المفردات میں لکھتے ہیں:

الذكر تارة يقال ويراد به هيئة للنفس بها يمكن للانسان ان يحفظ ما يقتنيه من المعرفة وهو كالحفظ الا ان الحفظ يقال اعتبارا باحرازه والذكر يقال اعتبارا باستحضاره وتارة يقال لحضور الشئ القلب او القول ولذلك قيل: الذكر ذكران: ذكر بالقلب وذكر باللسان۔

چونکہ قرآن یاد دہانی اور مراجعت بہ نفس کا باعث ہے، اس لئے اسے ذکر کا نام دیا گیا۔

حسب ذیل آیتوں میں لفظ ذکر قرآن مجید کے لئے استعمال ہوا ہے:

"والذكر الحكيم (آل عمران - ۵۸) أوعجبتم ان جاءكم ذكر من ربكم (اعراف - ۶۳، آل عمران - ۶۹) ان هو الا ذكر للعالمين (یوسف - ۱۰۴) وقالوا يا ايها الذي نزل عليه الذكر انك لمجنون (حجر - ۶) انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحافظون (حجر - ۹) وانزلنا اليك الذكر (نحل - ۴۴) قد اتيناك من لدنا ذكرا (طہ - ۹۹) هذا ذكر من معي وذكر من قبلي (انبیاء - ۲۴) وهذا

... بارك انزلنا ہ (حجر - ٥٠) وما یاتیہم من "ذکر" من الرحمٰن محدث (شعراء - ٥) انما تنذر من اتبع "الذکر" (یس - ١١) ان ھو الا ذکر" وقرآن مبین (یس - ٦٩) فالتالیات ذکراً (صافات - ٣) والقرآن ذی "الذکر" (ص - ١) ءانزل علیہ الذکر من بیننا بل ھم فی شك من ذکری (ص - ٨) ان ھو الا "ذکر" للعالمین (ص - ٨٧ - تکویر - ٢٧) ان الذین کفروا بالذکر لما جاءھم وانہ لکتاب عزیز (فصلت - ٤١) افنضرب عنکم الذکر صفحا (زخرف - ٥) وانہ "لذکر" لك ولقومك (فصلت - ٤٤) ولقد یسرنا القرآن للذکر (قمر - ١٧ - ٢٢ - ٣٢ - ٤٠) ءالقی "الذکر" علیہ (قمر - ٢٥) قد انزل اللہ الیکم "ذکرا" (طلاق - ١٠) لما سمعوا الذکر ویقولون انہ لمجنون وما ھو الا "ذکر" للعالمین (قلم - ٥١ - ٥٢)

چند آیتوں میں قرآن مجید کو "ذکریٰ" سے یاد کیا گیا ہے۔ ان ھو الا ذکریٰ للعالمین (انعام - ٩٠) وذکریٰ للعالمین (اعراف ٢ - ھود ١٢٠) وذکریٰ لقوم یؤمنون (عنکبوت ٥١)

چند آیتوں میں تذکرہ بھی استعمال ہوا ہے - الا تذکرۃ لمن یخشیٰ (طہٰ - ٣) وانہ لتذکرۃ للمتقین (حاقہ - ٤٨) ان ھذہ تذکرۃ (دھر - ٢٩) کلا انھا تذکرۃ (عبس - ١١)

١٢ - **رحمت** : رحمت وہ نرم دلی اور توجہ ہے جس کا نتیجہ احسان و بخشش ہو، چونکہ ذات باری تعالیٰ محل حوادث نہیں - اسمیں تبدیلی و تغیر کا گذر نہیں لہذا اس کی دیگر صفات کی طرح اس صفت کو بھی مادّی مفاہیم سے طاہر و مجرد کرنا ضروری ہے ۔ پس رحمت الٰہی کا مطلب لائق و شائستہ بندوں پر خداوند عالم کا لطف و کرم اور بخشش ہے۔ فیض و رحمت الٰہی ہمیشہ جاری ہے، لائق و شائستہ بندے مستفیض ہوتے رہتے ہیں - رحمت الٰہی سے مستفیض ہونے کے لئے بندے کی شائستگی و لیاقت ضروری ہے ۔

قرآن مجید کے رحمت ہونے کا بھی یہی مطلب ہے، قرآن مجید ایک ایسا چشمہ ہدایت و سعادت ہے جو ہمیشہ جاری ہے، اب یہ عوام کا فریضہ ہے کہ وہ لینے میں اس سے

توحید ....

مستفیض ہونے کی صلاحیت ولیاقت پیدا کریں۔

جن آیتوں میں قرآن کریم کے لئے لفظ رحمت استعمال ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں:
فقد جاءکم بینة من ربکم وهدی و رحمة (انعام - ۱۵۷) هدی ورحمة لقوم یوقنون (اعراف - ۵۲) هدی و رحمة لقوم یومنون (اعراف - ۲۰۳) وهدی و رحمة للمؤمنین (یونس - ۵۷) وهدی و رحمة لقوم یومنون (یوسف ۱۱۱ - نحل - ۶۴) وهدی و رحمة وبشری للمسلمین (نحل - ۸۹) و رحمة للمومنین (اسراء - ۸۲) وانه لهدی و رحمة للمومنین (نمل ۷۷) هدیً و رحمة للمحسنین (لقمان - ۳) بصائر للناس وهدی و رحمة (جاثیه - ۲۰)

۱۳۔ **روح** : یہ لفظ ایک مقام پر قرآن کریم کے لئے استعمال ہوا ہے۔
وکذالک اوحینا الیک "روحا" من امرنا (شوریٰ - ۵۲)
راغب اصفہانی روح کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کہتے ہیں: وذالک لکون القرآن سببا للحیاة الاخرویه الموصوفه فی قوله وان الدار الآخرة لهی الحیوان (عنکبوت - ۶۴)

۱۴۔ **شفاء** : شفاء، یعنی بیماری کے بعد صحت یابی، چونکہ قرآن اخلاقی وروحانی بیماریوں سے شفا بخشتا ہے اس لئے اسے شفاء کہا گیا ہے۔
جن آیتوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہ حسب ذیل ہیں: قد جاءتکم موعظة من ربکم و "شفاء" لما فی الصدور (یونس - ۵۷) وننزل من القرآن ماهو "شفاء" و رحمة (اسراء - ۸۲) قل هو للذین آمنوا هدی وشفاء (فصلت - ۴۴)

۱۵۔ **صحف** : صحف صحیفہ کی جمع ہے۔ صحیفہ یعنی کھلی اور پھیلی ہوئی چیز، اس صفحہ کو بھی صحیفہ کہا جاتا ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہو، صحیفہ کی ایک اور جمع صحائف ہے۔
صحیفہ قرآن مجید کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور دیگر آسمانی کتابوں کے لئے بھی قرآن مجید کے لئے دو بار استعمال ہوا ہے۔

فمن شاء ذکرہ فی "صحف" مکرمۃ (عبس - ۱۳) "صحفا" مکرمۃ (بینہ - ۲)
سورہ اعلیٰ میں کتاب ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے بارے میں ہے: "صحف ابراہیم وموسیٰ (اعلیٰ - ۱۹) بعض مقام پر صحف اولیٰ بھی استعمال ہوا ہے، جیسے اولم تأتہم بینۃ ما فی الصحف الاولیٰ" طہ - ۱۳۳)

قرآن مجید میں لفظ مصحف استعمال نہیں ہوا، لیکن بعد میں لوگ قرآن مجید کو مصحف کہنے لگے۔ لغت میں مصحف ان صفحات کو کہا جاتا ہے۔ جو کتابی شکل میں دفتیوں کے بیچ میں ہوں، قرآن مجید عصر نزول قرآن میں مجلد نہیں تھا۔ بلکہ کچھ صحیفے تھے جن میں کاتبان وحی لکھا کرتے تھے۔

۱۶۔ **صدق**: قرآن مجید کا ایک اور نام صدق ہے، اس کے معنی اور قرآن سے اکی مناسبت واضح ہے، جن آیات میں اس کا ذکر ہے وہ یہ ہیں: وکذب "بالصدق" اذجاءہ (زمر) والذی جاء "بالصدق" وصدق بہ (زمر - ۳۳) وتمت کلمۃ ربک "صدقا" وعدلا لامبدل لکلماتہ (انعام - ۱۱۵)

ان دو مقامات پر کلام و قول الٰہی کو جو قرآن ہی ہے صادق کہا گیا ہے: ومن "اصدق" من اللہ حدیثا (نساء - ۸۷) ومن اصدق "من اللہ (نساء - ۱۲۲) کچھ مقامات پر قرآن مجید کو گذشتہ آسمانی کتابوں کا تصدیق کنندہ بتایا گیا ہے: وآمنوا بما انزلت "مصدقا" لما معکم (بقرہ - ۴۱) ولما جاءہم کتاب من عند اللہ مصدق لما معہم (بقرہ - ۸۹) وھو الحق مصدقا لما معہم (بقرہ - ۹۱) وھذا کتاب انزلناہ مبارک مصدق الذی بین یدیہ (انعام - ۹۲) نزلہ علی قلبک باذن اللہ مصدقا لما بین یدیہ (بقرہ - ۹۷) نزل علیک الکتاب بالحق "مصدقا" لما بین یدیہ (آل عمران - ۳) آمنوا بما نزلنا "مصدقا" لما معکم (نساء - ۴۷) فیہ ھدی ونور ومصدقا لما بین یدیہ (مائدہ - ۴۶) وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب (مائدہ - ۴۸) ولکن تصدیق الذی بین یدیہ (یونس - ۳۷ - یوسف - ۱۱۱) ھو الحق "مصدقا" لما بین یدیہ (فاطر - ۳۱

وھذا کتاب "مصدق" لسانا عربیا (احقاف - ۱۲) کتاباً انزل من بعد موسی مصدقا لما بین یدیہ (احقاف - ۳۰)

۱۷۔ **عدل** : ایک مقام پر قرآن مجید کو عدل کہا گیا ہے : وتمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا " لا مبدل لکلماتہ (انعام - ۱۱۵) مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید وقت نزول جن صفات کا حامل تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ اپنی حالت پر باقی ہے۔ لا مبدل لکلماتہ قرآن کے صدق و عدل ہونے کی تعلیل ہے۔ یعنی قرآن مجید کے صدق اور عدم انحراف کا سبب یہ ہے کہ اس کے کلمات میں تغیر و تبدل نہیں۔

۱۸۔ **فرقان** : فرق، یفرق، فرقا کا مصدر فرقان ہے۔ اس کے معنی جدا ہونا ہے، ہر اس چیز کو فرقان کہا جاتا ہے جو باطل سے حق کی جدائی کا باعث ہو۔ یہ لفظ برہان کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

چونکہ قرآن مجید حق کو باطل سے ممتاز کرتا ہے اس لئے اسے فرقان کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن اسی صفت میں اشتراک کی وجہ سے تورات کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔

ولقد آتینا موسیٰ وھارون "الفرقان" (انبیاء - ۴۸)

مندرجہ ذیل آیتوں میں قرآن مجید کو اس نام سے یاد کیا گیا ہے : وبینات من الھدیٰ و"الفرقان" (بقرہ - ۱۸۵) وانزل الفرقان (آل عمران - ۴) تبارک الذی نزل "الفرقان" علی عبدہ (فرقان - ۱)

۱۹۔ **قرآن** : اس آسمانی کتاب کا مشہور ترین نام قرآن ہے۔ قرآن قرء یقرء کا مصدر اور اس کے معنی جمع، اکٹھا کرنا اور ایک دوسرے کو آپس میں ملانا ہے۔ اس کا دوسرا مصدر "قرء" بروزن "فرع" ہے، قرآن قرء یقرء کا بھی مصدر ہے جس کے معنی پڑھنا ہیں اس کا دوسرا مصدر قرأت ہے، راغب اصفہانی نے اپنی کتاب المفردات میں پہلے معنی کو انتخاب کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ قرآن سے مراد حروف و کلمات کا ایک دوسرے سے ملنا ہے تاکہ اسے ترتیل سے پڑھا جائے، راغب اپنی تائید میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں : ان علینا جمعہ وقرآنہ (قیامت - ۱۷)

راغب بعض علماء کے اقوال نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آسمانی کتابوں میں اس کتاب کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے اندر تمام آسمانی کتابوں کے مفاہیم سمیٹے ہوئے ہے بلکہ یہ کتاب تمام علوم کی جامع ہے کیونکہ قرآن مجید کی ان الفاظ میں توصیف ہوئی ہے : وتفصیل کل شیء (یوسف - ۱۱۱)

از سمہ آیات میں اس مقدس کتاب کو "قرآن" کے نام سے یاد کیا گیا ہے جس کی تفصیل معجم المفہرس میں موجود ہے ، چونکہ ان تمام مقامات پر مراد صرف قرآن مجید ہے لہذا یہاں اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

(باقی آئندہ)

جناب سیّد مرتضیٰ حسین صدرالافاضل

پاک و ہند میں تفسیر اور اس کا اسلوب

مکہ قدیم الایام سے عرب کا مرکزی شہر تھا۔ اس کی دو خصوصیتیں اسے دنیا کے دوسرے شہروں سے ممتاز کرتی تھیں، ایک خانہ کعبہ کا وجود دوسرے حبشہ و ہند و سندھ و شام کے تاجروں کی سالانہ منڈی کا اجتماع۔ حج کے موقع پر دور دراز کے بت پرست، صابی، یہود و نصاریٰ مذہبی رسوم اور تجارتی مقاصد کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے۔ مذہبی چرچے، مقامی قصے سماجی تبادلۂ افکار و مشاہدات اور مختلف اقوام سے روابط کی تجدید عمل آتی تھی۔ مکہ کا قدیم تاریخی اور سماجی نظام جیسا بھی تھا، مختلف طاغوتوں اور استعماری طاقتوں کے ہاتھوں ایک بڑے تصادم سے اس وقت دوچار ہوا جب ابرہہ نے یمن کے اقتدار اعلیٰ کی نمود و نمائش کے لیے مکہ پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت مکہ سے زیادہ خانۂ کعبہ تباہی و بربادی کے قریب نظر آتا تھا۔

عین اس سیاسی و استعماری بحران کے موقع پر نورِ حق چمکا اور ابراہیم بت شکن کے خانوادہ عالی سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم رحمت خدا بن کر نمایاں ہوئے اور دیکھتے دیکھتے لوگوں کے لیے قبلۂ دل وجان بن گئے۔ حضرت ابوطالبؑ نے کہا:

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتامی عصمة للارامل

حملۂ ابرہہ کو چالیس سال گذرے تھے کہ فضا مکہ کو محمدؐ امین و صادق کے وزنی کردار نے ہلا دیا۔ امیوں کی بستی، خیال باف شاعروں کی آبادی اور خانہ جنگی میں مبتلا قبائل میں یہ

چرچا عام ہوگیا کہ عبد اللہ کا فرزند اور ابو طالب کا بھتیجا کہتا ہے کہ اس پر کلام خدا اترتا ہے، وہ پڑھنے لکھنے کی دعوت، بن دیکھے اللہ کو ماننے کی ہدایت اور دیوی، دیوتا، طاغوت اور جھوٹی خداؤں کا انکار کرنا سکھاتا ہے۔

وحی کا نزول مکے میں ہوا، عقیدۂ توحید، اخلاق، امر بمعروف اور نہی عن المنکر کا سبق شروع ہوا، ثواب و عقاب، حشر و نشر کی بات ہوئی۔ پہلے تو شہر والوں نے پیام سنا، پھر اس کا چرچا غیروں تک پہونچا، حج کے موقع پر دور دراز سے آنے والے تاجروں، قوموں، سیاستدانوں مختلف ملکتوں کے مختلف النوع عقائد و افکار کی ترویج کرتے والوں، رنگارنگ عقیدے رکھنے والوں نے بھی بات سنی، کسی نے تعجب کے ملے جلے انداز سے خبر سنائی، کسی نے تمسخر و طعن سے قصہ سنایا کچھ لوگوں نے ہمدردوں کی زبانی واقعات سنے اور کچھ خوش نصیبوں کو آیات قرآن سننے اور ان کا مدعا سمجھنے کا بھی موقع ملا۔ ایسا بھی ہوا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آیات کی تلاوت فرماتے اور اس کے تفصیلات بیان کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ یوں آغاز نزول وحی کے زمانے سے آیات کا مطلب مختلف زبانوں اور مختلف لہجوں میں بیان ہونا شروع ہوگیا، ان میں کچھ ذمے دار ترجمان ہوں گے جن کے نام آگے چل کر سب نے سنے، سلمان فارس کے، بلال حبش اور صہیب روم کے تھے۔ ان کی غیر عرب زبانوں سے واقفیت کا تقاضہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہم زبانوں کو بات سمجھائی ہوگی لہٰذا قرآن کی تفسیر کا دوسری زبانوں میں ہونا یقینی ہے۔ اسی طرح یہود و نصاری جو عبرانی و سریانی حبشی زبانوں کے واقف تھے

وحی کے نزول کو ابھی پانچ برس پورے نہ ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ جو سو سے زیادہ زن و مرد پر مشتمل تھا حبشے بھیجدیا، نجاشی نے قریش کے نمایندوں کی شکایت کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی اور مہاجرین کے سربراہ حضرت جعفر بن ابیطالب رضوان اللہ علیہما کو دربار میں طلب کیا، اس وقت دربار میں ارکان سلطنت، علمار نصاری اور نمایندگان مشرکین عرب جمع تھے بادشاہ نے جعفر سے پوچھا تمھارا نیا عقیدہ کیا ہے؟ انھوں نے سورۂ مریم کی آیتیں تلاوت فرمائیں۔ بادشاہ نے جواب میں کہا کہ اس کے عقیدے میں حضرت عیسیٰ ؑ اور مریم ایسی ہیں جیسے محمدؐ کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نجاشی کے دربار میں عربی جاننے والے کم اور حبشے کی زبان جاننے والوں کی کثرت

تھی، بادشاہ کی زبان بھی عربی نہ تھی اس لیے ترجمانِ اسلام نے جو آیتیں پڑھی تھیں اس کے ترجمہ و تفسیر کے لیے مقامی زبان ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کا آغاز، نزول قرآن کے وقت سے دو مقاصد کے تحت ہوا ایک تزکیۂ نفس جسے خود سازی کہہ لیجئے یہ کام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انجام دیا اس پر یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ دلیل ہے۔

دوسرے غیر عربی زبان والوں اور غیر ملکی افراد کے لیے افہامِ معانی و تفسیر مطالب کا غیر معتبر ذریعہ غیر مسلم اور معتبر ذریعہ مسلمان تھے، مسلمانوں پر واجب تھا کہ پیغام خدا اور احکام رسولؐ دوسروں تک پہنچائیں۔ آنحضرت روحی لہ الفداء نے یمن اور متعلقہ عرب علاقوں میں اپنے آدمی بھیجے اور حبشے میں اپنا بھائی بھیجا جو مدت تک وہاں قرآن اور اس کے تعلیمات کا بیان کرتا رہا، اس سے مسلمانوں کو تفسیر کے لیے سنت کا حوالہ ملا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حبشہ کی زبان امہری اور اس کے قریبی افریقی علاقے کی زبان بربری تھی قرن اوّل یا دوم میں قرآن کا ایک ترجمہ بربری میں پھر فارسی میں ہوا (اگست ۱۹۶۸ء رسالہ FRANC ISLAM)۔

قدیم تاریخ عرب کے واقف کار جانتے ہیں کہ سندھ و ہند، بلکہ ساحل بحر عرب و ہند کے رہنے والے مدتوں سے تجارتی سفر کرتے اور دیبل و سورت و کھمبات کی بندرگاہوں سے عربوں اور ہندی اقوام سے گوناگون روابط تھے۔

اسلام کی توسیع کے ابتدائی زمانے میں یہ تاجر اسلام کے تعلیمات کی خبریں لے کر برصغیر میں اُپنچے تھے اور جب ابتدائی خلافت میں قصدار و کابل و ملتان و دیبل و الرور میں مسلمان تاجر یا سیاست داں یا مبلغ یا فوجی وفود آئے تو انھوں نے قرآن بھی پڑھا اور پوچھنے والوں یا دوستوں کو اس کے معانی بھی بتلائے۔ اس وقت ان کا لہجہ حملے کے بجائے دوستانہ اور جدل کے بجائے صرف اپنا پیام پہنچانے والا تھا۔

تاریخی حوالے بتاتے ہیں کہ سندھ میں مسلمانوں کی عزت کی جاتی تھی، مسلمان سندھ کے بعض علاقوں میں آباد تھے اور ان کا مرکز حکومت "منصورہ" نامی نو آباد شہر تھا جہاں تیسری صدی ہجری میں ایک عرب خاندان حکومت کرتا تھا۔ سنہ ۲۷۰ ہجری مطابق سنہ ۸۸۳ء میں عبداللہ ابن عمر

بن عبدالعزیز نامی حکمران[1] نے اپنے پڑوسی ہندو راجہ مہروک بن رائک / رائق والی "الرا" کی فرمائش سے قرآن مجید کی تفسیر لکھوائی، بزرگ بن شہریار کے عربی سفرنامے "عجائب الهند"[2] کی روایت کے مطابق یہ کام ایسے عراقی الاصل عالم نے انجام دیا جو سندھ میں پلا بڑھا تھا، تفسیر زبان "ہندیہ" میں لکھی "ہندیہ" سے مراد سنسکرت بھی ہوسکتی ہے جو یہاں کی علمی زبان تھی اور سندھی بھی جو عوام کی بولی تھی۔ یہ تفسیر کم از کم برصغیر میں پہلی تفسیر ہے جو بزرگ بن شہریار کے زبانی حوالے پر تاریخ تفسیر نویسی کا جز بنی۔ یہ تفسیر سادہ افہام و ابلاغ کے لیے لکھی گئی تھی، یہی اسلوب تھا۔

محمود غزنوی کی فتح ہند سے پہلے اور بعد میں کسی تفسیر کا نام نہیں ملتا، صرف یہ معلوم ہے کہ سید محمد اسماعیل بخاری تفسیر کے بہت بڑے عالم لاہور میں درس قرآن دیا کرتے تھے۔ ان کی وفات ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں ہوئی[3]۔ اب تک مسلمانوں کے پاس بڑی تفسیریں لغوی اور روایتی مباحث سے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ شیخ ابوجعفر طوسی (متوفی ۴۶۰ھ) جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) اور فخرالدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کی تفسیروں نے استدلال و فلسفہ و عقائد کے تفاصیل کا راستہ دکھایا اور برصغیر میں مسلمانوں کو ریاست و سیاست کے تجربوں سے دوچار ہونے کا موقع ملا، ثقافت نے قدم جمائے اور فکر نے انگڑائی لی، درسِ تفسیر و مباحث کے مکتب کھلے تو نظام اعرج دولت آبادی قمی نیشاپوری نے "غرائب القرآن" لکھی (غالباً یہ کتاب دکن میں ۷۳۰ھ کے حدود میں لکھی گئی) اس کا اسلوب جدلی و منطقی و کلامی ہے۔ مؤلف نے تفسیر فخرالدین رازی سے بحث کی ہے۔ پھر نوراللہ شوستری شہید ثالث (متوفی ۱۰۱۹ھ) نے بیضاوی پر حاشیے کے علاوہ متعدد موضوعات پر الگ الگ تفسیری بحثیں لکھیں، یہاں سے مقامی مسائل اختلافی نے تفسیر کا ایک نیا موڑ لیا۔

ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) وہ نامور مصنف ہیں جنھوں نے تفسیر کے تقلیدی دور کو نئی اور سیاسی و سماجی رخ پر لانے کی طرف قدم بڑھایا ان کی کتاب "الفوز الکبیر فی

---

[1] دیکھئے: اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۵۵ء

[2] طبع لائیڈن، ہالینڈ۔ ۱۸۸۳ء تا ۱۸۸۶ء [3] تذکرہ علمائے ہند طبع لکھنؤ ص ۱۶۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۱۹۳

صول التفسیر اور "حجۃ اللہ البالغہ" نے نئی بحثوں کا آغاز کیا۔

تیرہویں صدی میں انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے، اب تک مسلمانوں کی علمی زبان عربی اور فارسی تھی اور ان کے علوم و تصانیف ان ہی زبانوں میں تھے، عربی و فارسی زبان میں لکھی ہوئی تفسیروں کے مخاطب بھی مسلمان تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس عہد کی تفسیر میں ہندو فلسفہ وافکار و تاریخ نیز سیاسی و ثقافتی رجحانات کا کوئی اثر نہیں ملتا۔

خلاصہ یہ کہ تیسری ہجری سے گیارہویں ہجری تک برصغیر میں تفسیر کا مقصد تھا:

۱۔ اپنوں اور غیروں تک قرآن اور اس کا سادہ مفہوم پہنچانا مگر مخاطب مسلمان تھے۔

۲۔ اختلافی مذاہب عقائد و فقہ پر روشنی ڈالنا اور اپنے مذہب کی تائید۔

۳۔ صرفی، نحوی، قرأتی بحث اور ربط آیات و سورات پر گفتگو۔

۴۔ نسبتاً کلامی فلسفہ اور ادبی بحث، مفسرین کے آراء و مباحث، مفصلات میں شیعہ و سنی مجادلے۔

۵۔ عرفانی اور صوفی تفسیر۔

۶۔ تفسیر کی زبان عربی یا فارسی ہونی چاہیے کا رجحان۔

انگریزوں کی آمد سے دو اثر نمایاں ہوئے ایک تو عیسائیوں نے اپنی کتابیں عوام کے لیے لکھنا اور چھاپنا شروع کیں جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے ترجمے اور اس پر اعتراضات کرنے کی مہم شروع کی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو دفاع کا انتظام کرنا پڑا۔

یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ میں عربی سے کسی دوسری زبان میں ترجمے کو تفسیر اس لیے قرار دیتا ہوں کہ اس میں قرآن کے الفاظ سے پردہ اٹھا کر غیر عرب کو مطالب کے چہرے دکھائے جاتے ہیں دوسرے ترجمہ کرنے والے اپنے معلومات کو مفہوم قرآن سمجھ کر کبھی حاشیے اور کبھی متن میں قوسین کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جیسے قدیم ترین مفسرین کا عمل تھا۔

ابھی تک ہندی، سنسکرت اور سندھی و پنجابی میں ترجمے کو بے ادبی بلکہ حرام سمجھا جاتا تھا لیکن جب انگریزوں نے ہندوستانی زبان اور رومن رسم الخط میں قرآن کا ترجمہ چھاپا تو مسلمان مجبور ہوئے اور انہوں نے بھی پہلے اپنے عوام کے لیے، پھر دوسروں کے جواب میں اردو ترجمے،

تفسیریں اور مقدماتِ تفسیر کا آغاز کیا۔ اس کام میں شہرت سرسید احمد خان، بانیٔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کو حاصل ہوئی۔ وہ انگریزی افکار و ثقافت سے مرعوب ہوئے اور کہا کہ ہمیں یورپ سے ٹکر لینے کے بجائے مفاہمت کی راہ اختیار کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ انگریز فاتح تھا اس سے کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر برابری کے ساتھ صلح ممکن نہ تھی اس لئے تفسیر پر ذہنی شکست کی ایک چھاپ لگی اور کتاب مقدس سے قرآن کو ہم آہنگ کرنے کی طرف پیش قدمی ہوئی۔

سرسید احمد نے "مکاتبات الخلان" اور "تحریر فی اصول التفسیر" پھر براہ راست تفسیر و مباحث آیات اردو میں لکھنا شروع کر دئے جس سے پورے ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا، انگریزوں نے اسے خوش آمدید کہا اور مسلمانوں نے اسے مسترد کیا۔ اسی دور میں سید جمال الدین اسد آبادی ہندوستان آئے اور انھوں نے سرسید احمد خان کے افکار کے خلاف تقریر و تحریر کے ذریعہ مسلمانوں کو ہوشیار باش کی صدا دی۔ سرسید کی تفسیر نے علما میں ایک نئی لہر پیدا کی اور شیعہ، سنی دونوں نے ان کے جواب میں کام شروع کیا۔ اسی کو ہم فن تفسیر میں نہضت کا دور کہتے ہیں۔ اس کے دو ستون تھے حالات سے مفاہمت قرآن کے ذریعہ اور دوسرے مسلمانوں کی بیداری و استقلال قرآن کے ذریعہ۔

مفاہمت کی طرف لے جانے والوں کے قائد چراغ علی و سرسید تھے اور ان کی مخالفت میں فن تفسیر میں عبدالحق حقانی اور سید علی محمد تاج العلما ..... آگے آگے تھے۔ عرب میں اس وقت محمد عبدہ، رشید رضا اور شیخ جواد بلاغی کا موقف بھی نئے افکار سے تصادم اور ان کی تردید کے ساتھ دفاعی انداز کے بجائے مقابلہ کی للکار کا لہجہ آیا، مسلمان بیداری کے نئے دور میں داخل ہوئے مصر و عراق کے علماء نے اسلام کی توانائی کا اعلان کیا اور مسلمان میدان میں اترے تو برصغیر کے مسلمانوں نے بھی انگڑائی لی، یہاں کے جوانوں اور یورپ کے تعلیم یافتہ لوگ بھی طاقت آزمائی کے لئے تیار ہوئے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے اشعار نے عوام کو دعوت تدبر فی القرآن دی:

---

[1] طبع مقبول احمد عثمانی ۱۹۱۵ء

[2] طبع اردو، آگرہ ۱۸۹۲ء

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟ زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟
آن کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لا یزال است و قدیم
نوع انسان را پیام آخرین حامل او رحمۃ للعالمین
از جہانبانی نوازد ساز او مسند جم گشت پا انداز او
گر تو میخواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

اور دوسری جگہ کہا

رمز قرآن از حسین آموختیم ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

قرآن کو اساس ماننے کا عقیدہ عمل میں آیا اور کچھ عرصہ بعد پاکستان قائم ہوا۔

قیام پاکستان سے پہلے برصغیر میں تفسیر نویسی کے رجحانات جو کھل کر سامنے آئے وہ کم از کم یہ ہیں، بارہویں صدی ہجری سے چودہویں صدی تک غلامی اور آزادی کا عہد ہے اس دور میں پہلے

۱۔ استعماری افکار کے دباؤ اور اس کے رد عمل کا اظہار رہوا

۲۔ اتحاد ملت اور دشمن سے مقابلے کی تیاری کا عمل شروع ہوا۔

۳۔ تفسیر کا لہجہ بدلا، اسلوب بیان اور انداز فکر میں تبدیلی آئی، مفاہمت و دفاع کا تیور ابھرا۔

۴۔ اسلام کے نظام حکومت اور اس کے مسائل پر بحث چھڑی تو .... قرآن کا نظام سیاست، قرآن کا نظام حکومت، قرآن کا نظام عدل، قرآن مجید کا نظام اقتصاد، پر بحث و نظر نے وسعت حاصل کی اور مفسرین نے ان موضوعات و مسائل پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھی اور قرآن کا مطالعہ نئے سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے ضروری بھی تھا کیونکہ قرآن مجید ہی مسلمانوں کی اصولی رہنما کتاب ہے۔

پاکستان کے قیام نے فکر کو ایک نیا افق دیا اور قرآن مجید کا مطالعہ دو الگ زاویوں سے شروع ہوا، ایک سرسید کا دبستان، دوسرے سید جمال الدین اسد آبادی کا دبستان کم و بیش نصف صدی سے اس انداز میں تفسیری کام ہو رہا ہے۔ علامہ شیخ عبدالعلی ہروی تہرانی اور علامہ اقبال پھر ان کے بعد والوں نے اہل علم کو جو دعوت دی تھی اس نے پھیلاؤ اور گہرائی

حاصل کی اور اس وقت پاکستان میں تفسیر پر بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

پندرھویں صدی ہجری کا سورج، انقلاب اسلامی ایران کو سلام کرتا ہوا مسلمانوں کے افق پر ابھرا۔ یہ انقلاب خالص اسلامی نظریات کی ان درس گاہوں سے اٹھا ہے، جہاں صدیوں سے موت کو لبیک کہی گئی مگر دوسرے نظریات زندگی کو قبول نہیں کیا گیا جن لوگوں نے صرف قرآن و رسول ص و آل رسول ص کی ثقافت و فکر سے عہد وفا باندھا ہے، غیر کی بیعت تو کیا ہاتھ میں ہاتھ دیکر بھی چلنا گوارا نہیں کیا۔ اس انقلاب میں قرآنی تعلیمات اور تفسیر کے قرآنی مطالب کو ذہنوں میں جاگزین کرنے کا سب سے بڑا دخل ہے۔ یہ انقلاب اوز بحمدہ تعالیٰ اس کی پنج سالہ کامیاب زندگی اور عملی مظاہرے نے دنیا کو مشاہدات کے ذریعہ سمجھا دیا کہ اسلام زندہ و پائندہ دین و نظام زندگی و سیاست و ریاست ہے اور قرآن اس کی اساس ہے، مجھے کہنے دیجئے کہ اسلامی انقلاب قرآن مجید کی ایک عملی تفسیر ہے جس کا حیرت آفرین اثر پوری دنیا پر عموماً، اسلامی دنیا پر خصوصاً اور پاکستان پر اس کے نظریاتی مملکت ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔

میں برصغیر میں قرآن پر تفسیری عمل کا ایک جائزہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پیش کر چکا ہوں، یہ کتاب" اردو دائرہ معارف اسلامیہ" کے نام سے چھپ چکی ہے احباب اسے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس مقالہ میں میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے ترجمہ و تفسیر کا کام، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں اس قدر کیا ہے کہ ارباب نظر کو اہمیت معلوم رہے۔

فارسی چونکہ اہل علم اور عوام کے لئے ایک بڑے طبقے کی زبان تھی اس لئے پہلے تفسیر و ترجمہ کا کام فارسی میں ہوا، فارسی تراجم قدیم زمانہ سے بارہویں صدی تک کتنے ہوئے؟ اور کس کس نے لکھے؟ بہت مشکل سوال ہیں۔ لیکن عام دسترس میں ایک وہ ترجمہ ہے جو اس وقت کتب خانہ حضرت امام رضا علیہ السلام میں موجود ہے اور اسی کے مطابق "غرائب القرآن" یعنی تفسیر نیشاپوری کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ فہرستوں میں مجمع البیان طبرسی کا خلاصہ فارسی میں خواجگی شیرازی نے ہندوستان میں لکھا [1] خالص ہندوستانی عالم قاضی جونپور شہاب الدین

[1] مقدمہ تفسیر قرآن عمل نقی۔ طبع لکھنو ص۲۳

دولت آبادی نے بحر مواج کے نام سے تفسیر لکھی جو چھپ چکی ہے اس میں نحو، عقائد اور فقہ حنفی پر بحث ہے۔ پھر بڑی تفسیر نورالدین نعمت اللہ ولی شافعی نے نعمت عظمیٰ کے نام سے جس کا ایک نسخہ لاہور کے کتب خانہ حائری میں آج بھی موجود ہے میں نے اسٹوری اور علی نقی کے حوالے سے اپنے مقالۂ اردو دائرہ معارف اسلامیہ[1] میں اس تفسیر تک رسائی سے پہلے اسے نعمت خان عالی کی تصنیف قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶) کا ترجمہ فتح الرحمٰن ترجمۃ القرآن (متعدد طباعات) پھر ان کے بیٹے کی فارسی تفسیر (مطبوعہ) اور اس کے بعد ایک ضخیم اور مفصل تفسیر سید ابوالقاسم حائری (متوفی ۱۳۲۴ھ) اور ان کے بیٹے سید علی حائری (متوفی ۱۳۶۰) نے لکھی جس کی بیس جلدوں سے زائد کی اشاعت کا مجھے علم ہے اور ۲۷ ویں جلد سورۂ قمر کی آیت ۱۰ تک میں نے قلمی دیکھی ہے یہ تفسیر پاکستان میں فارسی تفسیر کے سلسلہ کی اہم ترین خدمت ہے۔ اس کا نام "لوامع التنزیل" ہے۔

عربی میں تفسیری کام کا مختصر جائزہ لیا جائے تو اہم ترین تفسیروں میں جو دستیاب ہیں ان میں: "تفسیر مہائمی" یعنی تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان بعض مایشیر الی اعجاز القرآن ہے جس کے مؤلف مخدوم علی مہائمی بمبئی (متوفی ۸۳۵ھ) ہیں یہ کتاب فلسفہ وعرفان میں ابن عربی فقہ میں شافعی دبستان کی نمائندگی کرتی ہے[2]۔ دوسری اہم اور مفصل فلسفیانہ تفسیر "منبع عیون المعانی" ہے جس کے مؤلف ہیں: شیخ مبارک بن شیخ خضر ناگوری (متوفی ۱۰۰۱ھ) یہ تفسیر نایاب ہے مجھے اس کے کامل نسخے کا سراغ ایک سال قبل مولانا آغا مہدی صاحب نے دیا، یہ تفسیر ممتاز العلما کے کتب خانہ لکھنؤ میں ہے۔

تیسری بڑی تفسیر "التفسیر المظہری" تالیف قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی (متوفی ۱۲۲۵) کی ہے دہلی میں چھپی ہے۔

نواب صدیق حسن خان کی "فتح البیان فی مقاصد القرآن" پہلی مرتبہ بھوپال سے ۱۲۹۱ھ دوسری مرتبہ بولاق سے ۱۳۰۷ھ میں چھپی ہے۔

انھیں مصنف کی دوسری مختصر تفسیر "نیل المرام فی احکام القرآن" بھی ہند و مصر میں چھپی ہے۔

---

[1] مقالۂ تفسیر مشمولہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ طبع لاہور۔ [2] طبع مصر

"تفسیر القرآن بکلام الرحمن" آیت سے آیت کی تفسیر "ثناء اللہ امرتسری نے لکھی ہے یہ بھی چھپی ہے۔

احکام و فضائل اہلبیتؑ پر بھی تفسیریں لکھی گئی ہیں جن میں ادبی شان کی تفسیر "روائح القرآن" مفتی محمد عباس نے فضائل میں لکھی اور لکھنؤ سے ۱۲۷۷ھ میں شائع ہوئی اور دوبارہ چھپنے کے قابل ہے۔

"سواطع الالہام" فیضی ابن شیخ مبارک کی مکمل تفسیر قرآن عربی میں بشرط حروف غیر منقوط ایک ادبی تحفہ ہے، جو ۱۰۰۲ھ میں لکھی گئی اور ۱۳۰۶ھ لکھنؤ سے چھپی۔

مشکلات آیات، علوم قرآن، توحید و نبوت و امامت فی القرآن کے موضوعات پر عربی میں کم و بیش سو کتابیں مطبوعہ صورت میں مل سکتی ہیں جن سے تفسیری رجحانات کی نشان دہی ممکن ہے۔

برصغیر میں سب سے اہم کام انگریزی میں ہوا، ہندوستان کے انگریزی دان طبقہ کا خیال تھا کہ انگریز اپنے اقدامات میں معذور ہیں، ہمارا فریضہ ہے کہ ہم انگریزی میں قرآن کی تفسیر لکھیں تاکہ وہ ہمارا نقطۂ نظر سمجھ سکیں۔ چنانچہ یہ مہم شروع ہوئی۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی، مرزا ابو الفضل (جنھوں نے راڈویل اور نولڈ کی طرح) قرآن بترتیب نزول تیار کر کے ترجمہ کیا تو ملک میں ہنگامہ ہوگیا۔ دوسرا ترجمہ انہوں نے بترتیب نزول لکھا۔ شیخ بادشاہ حسین نے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ تفسیر اہلبیت کے ساتھ ترجمہ کیا۔ اسی طرح متعدد حضرات نے کام کیا عمومی طور پر یہ تفسیریں پسند کی گئیں۔

۱۔ تفسیر عبداللہ یوسف علی، طبع لاہور

۲۔ تفسیر مرزا مہدی پویا و امیر احمد علی، طبع کراچی ۱۹۶۴ء

۳۔ ترجمہ، پروفیسر عسکری با حواشی ایم ایچ شاکر ــــ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ کراچی سے بلامتن، اس کے بعد ایران و پاکستان سے متن کے ساتھ کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔

یوں تو ہندی، پنجابی، پشتو، گجراتی، سندھی وغیرہ میں بھی منظوم و منثور ترجمے اور تفسیریں موجود ہیں مگر اہم کام اردو میں ہوا۔

انگریزی اردو میں بھی تفسیر نویسی برصغیر ہی میں ہوئی۔ عربی و فارسی میں تفسیر تقلیدی تھی مگر اردو میں عموماً غرض و غایت طے کر کے تفسیریں لکھی گئیں۔

ان کا پہلا مقصد تھا، اپنوں میں قرآنی تعلیمات سے دلچسپی پیدا کرنا۔

دوسرا مقصد تھا مخالفین قرآن کے شبہات کا جواب، جو بعد میں مختلف نظریات و افکار و تعلیمات میں بدل گیا۔

تیسرا مقصد تھا لفظی پھر رواں معنی خیز ترجمہ اور متوسط اعلیٰ درجے کے تبلیغات۔

اور آخر میں سیاسی، سماجی اور نظام زندگی کے ہر پہلو کی تشریح قرآن مجید کی روشنی میں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ تفسیر اردو میں جدت اور خالص جدت، یعنی نفی حدیث اور قبول سخن غیر کی بات سرسید احمد خان نے کی جس نے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ایک دبستان کی صورت اختیار کر لی۔

دوسرا دبستان علماء دین کا ہے جس کی روش اور اسلوب الگ ہے، روایتی اور جدلی، عرفانی اور سادہ فلسفی بھی، آزادی کی بات بھی اور دوسرے معاملات بھی، ہم اس وقت ان تفسیروں کی فہرست نہیں دینا چاہتے، یہاں صرف اسالیب و رجحانات کا تذکرہ کر کے مقالہ ختم کرنا مقصود ہے۔

۱۔ عموماً مفسرین کا اسلوب سادہ زبان اور سادہ مطالب کا بیان ہے ایسی تفسیریں مقبول و مشہور بھی ہوئیں۔

۲۔ طویل تفاسیر میں بحث، رد اعتراضات اور مسلک کا بیان تو ہے مگر انداز بیان بھاری پن لیے ہوئے نہیں ہے۔

اس قسم کے مفسرین میں عبدالقادر دہلوی، نذیر احمد، تاج العلما علی محمد، محمد قلی خان کانپوری، مقبول احمد، حافظ فرمان علی، امداد حسین کاظمی، عبدالحق حقانی، عمار علی سونی پتی، مولانا احمد رضا خان بریلوی، اشرف علی تھانوی، مرزا امداد علی مترجم قرآن و خلاصۃ المنہج، مولانا محمود حسن و شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا راحت حسین صاحب گوپالپوری، مصنف تفسیر انوار القرآن اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام سر فہرست ہیں۔

تفسیر نویسی کا کام ہو رہا ہے اور اسلوب بدل رہا ہے، انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد جہاں جہاں امکان و استدلال کی بات کی جا رہی تھی اب وہاں وجود اور تجربوں کے حوالوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور سب دیکھ رہے ہیں کہ اردو تفسیر کا دور آنے والا ہے۔

تقابلی مطالعہ

جناب شیخ محمد قانصوہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

غسل یوم جمعہ

روایاتِ اہل بیتؑ:

١ ـ قال الصادق (ع): غسل يوم الجمعة طهور وكفارة لما بينهما من الذنوب من الجمعة الى الجمعة [1] علي بن ابراهيم عن أبيه عن حماد بن عيسى عن حريز عن زرارة قال: ابوجعفر (ع): لا تدع الغسل يوم الجمعة فإنه سنة، وشم الطيب والبس صالح ثيابك وليكن فراغك من الغسل قبل الزوال فإذا زالت فقم وعليك السكينة والوقار، وقال: الغسل واجب يوم الجمعة. [2]

١۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: غسل روز جمعہ بہت بڑی طہارت اور دو جمعوں کے درمیانی گناہوں کا کفارہ ہے۔

علی بن ابراہیم نے اپنے والد سے انہوں نے حماد بن عیسی سے انہوں نے حریز سے، انہوں نے زرارہ سے روایت کی ہے: غسل جمعہ ترک نہ کرو وہ سنت ہے، خوشبو سونگھو (لگاؤ) اچھے کپڑے پہنو، زوال سے پہلے پہلے غسل سے فارغ ہو جاؤ۔ زوال کے بعد تیاری کرو، اطمینان و وقار سے جاؤ۔

اور فرمایا: جمعہ کا غسل واجب ہے۔

۲ ـــ الصادق (ع): لايترك غسل يوم الجمعة إلا فاسق ومن فاته فليقضه يوم السبت.[۳]

۲۔ امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا: جمعہ کے دن صرف فاسق (بدکار) ہی غسل چھوڑتا ہے اور جس سے اتفاقاً غسل چھوٹ جائے وہ ہفتے کو قضا کرلے۔

۳ ـــ عن محمد بن علي (ع) قال: لا تدع الغسل يوم الجمعة فإنه من السنة وليكن غسلك قبل الزوال[۴]

۳۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: غسل جمعہ ترک نہ کرو، وہ سنّت ہے، تمہیں زوال سے پہلے غسل کرلینا چاہیئے۔

٤ ـــ عن علي بن ابراهيم، عن محمد بن عيسى عن يونس بن عبدالرحمن عن هشام بن الحكم قال: قال ابوعبد الله (ع): ليتزين احدكم يوم الجمعة ويغتسل ويتطيب ويسرح لحيته ويلبس انظف ثيابه وليتهيأ للجمعة... الحديث.[۵]

۴۔ ہشام بن حکم نے روایت کی ہے: امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ہر شخص کو جمعہ کے دن صاف ستھرا ہونا چاہیئے، نہائے، عطر لگائے، ڈاڑھی میں کنگھی کرے، عمدہ لباس پہنے اور جمعہ کے لئے تیار رہو...... حدیث۔

۵ ـــ محمد بن يحيى عن محمد بن الحسين عن صفوان بن يحيى عن منصور بن حازم عن أبي عبدالله (ع) قال: الغسل يوم الجمعة على الرجال والنساء في الحضر وعلى الرجال في السفر.[۶]

۵۔ ...... منصور بن حازم نے ابو عبد اللہ علیہ السلام سے روایت کی ہے: حالت قیام میں مرد عورت دونوں کو اور سفر میں مرد کو جمعہ کے دن نہانا ضرور چاہیئے۔

٦ ـــ اخبرنا محمد حدثني موسى حدثنا ابي عن ابيه عن جده جعفر بن محمد (ع) قال: كان عليٌّ يقول: ما أحب لأحد أن يدع الغسل يوم الجمعة إلا من عذر اولعلة مانعة.[۷]

۶۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا : حضرت علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے ۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ کوئی شخص کسی عذر، یا رکاوٹ کے بغیر جمعہ کے دن نہ نہائے ۔

۷ ــ عبد الله بن جعفر في (قرب الاسناد) عن أحمد بن اسحاق. عن بكر بن محمد. عن الصادق (ع) عن آبائه (ع) قال: اميرالمؤمنين (ع): الناس في الجمعة على ثلاثة منازل رجل أتى الجمعة قبل أن يخرج ...... شهدها بإنصات وسكون فإن ذلك كفارة لذنوبه من الجمعة الى الجمعة وزيادة ثلاثة أيام لقول الله عزوجل: «من جاء بالحسنة فله عشرأمثالها» ورجل شهدها بلغط وقلق فذلك حظه ورجل أتاها والإمام يخطب فقام يصلي فقد خالف، وهويسأل الله عزوجل إن شاء اعطاه وان شاء حرمه.

ورواه الصدوق (في المجالس) عن أحمدبن هارون الفامي، عن محمدبن جعفر بن بطة عن احمدبن اسحاق وعن أحمد بن هارون الفامي، عن أحمد بن اسحاق مثله.[۸]

قال النبي (ص): من اغتسل يوم الجمعة ومس من طيب امرأته إن كان لها ولبس من صالح ثيابه ثم لم يتخط رقاب الناس ولم يلغ عند الموعظة كان كفارة لما بينهما ومن لغى وتخطى رقاب الناس كانت له ظهراً.[۹]

۷۔ ..... قرب الاسناد میں احمد بن اسحاق نے اپنی سند سے .... امام جعفر صادق علیہ السلام، انہوں نے اپنے آباء کرام علیہم السلام سے، انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے : جمعہ کے دن آدمیوں کے تین درجے ہوتے ہیں ۔ ایک وہ آدمی جو اس وقت جائے کہ امام نہ پہنچا ہو .... مکمل خاموشی و احترام کے ساتھ اس درجے کے لوگوں کا عمل ایک جمعہ سے دوسرے جمعے کے درمیانی بلکہ تین دن زائد کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ اللہ نے فرمایا : **من جاء بالحسنة** .... جو ایک نیکی کرے گا اللہ دس گنا اجر دے گا ۔ ایک شخص وہ ہے جو جمعہ میں شریک تو ہوتا ہے مگر باتیں کرتا اور بے توجہی برتتا ہے ۔ اس کا عمل اس قسم کا ہے کہ جو نصیب میں ہے وہ پائے گا ۔ ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی جمعہ میں اس وقت

پہنچا جب امام خطبہ دے رہا تھا اس نے اپنی نماز شروع کردی۔ یہ شخص مخالف ہے۔ یہ آدمی اللہ سے دعا کرتا ہے۔ اللہ کی رضا ہو تو قبول فرمائے نہ رضا ہو تو محروم رکھے گا۔

صدوق نے المجالس میں احمد بن ہارون فامی، محمد بن جعفر بن بطہ، احمد بن اسحاق اور احمد بن ہارون فامی نے احمد بن اسحاق سے یہی متن نقل کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جمعہ کو نہاتا، اپنی اہلیہ کا عطر لگاتا (اگر اس کا ہو) اپنے اچھے کپڑے پہنتا ہے اور لوگوں کی گردنوں (اور سروں پر) سے نہیں گذرتا اور وعظ کے درمیان باتیں نہیں کرتا، تو اس کا یہ عمل دو جمعوں کی درمیانی مدت کا کفارہ ہے اور جو شخص شور و غل کرتا، سروں سے ہوتا گذرتا ہے تو اس کی نماز ظہر محسوب ہوگی۔

روایات اہل سنت:

١ ــ حدثنا علي قال حدثنا حرمي بن عمارة قال حدثنا شعبة عن أبي بكر بن المنكدر قال حدثني عمرو بن سليم الانصاري قال أشهد على ابي سعيد قال أشهد على رسول الله (ص) قال: الغسل يوم الجمعة واجب على كل محتلم وان يستن وأن يمس طيباً إن وجد.[10]

١. ہم سے علی نے بیان کیا۔ انھوں نے کہا ہم سے حرمی بن عمارہ نے کہا کہ ہم سے شعبہ نے ان سے ابو بکر بن منکدر نے کہا کہ مجھ سے عمرو بن سلیم انصاری نے کہا میرے سامنے ابو سعید نے اور انھوں نے کہا میرے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: ہر محتلم پر روز جمعہ غسل واجب ہے، نیز دانت صاف کرتا اور ممکن ہو تو عطر لگانا ضروری ہے۔

٢ ــ حدثنا عمرو بن سواد العامري حدثنا عبدالله بن وهب اخبرنا عمرو بن الحارث ان سعيد بن أبي هلال وبكير بن الاشج حدثاه عن أبي بكر بن المنكدر عن عمرو بن سليم عن عبدالرحمن بن أبي سعيد الخدري عن ابيه أن رسول الله (ص) قال: الغسل يوم الجمعة على كل محتلم والسواك ويمس من الطيب ماقدر عليه

وقال: ولومن طيب المرأة. بتغير بسيط عن بكير بن الاشج.[11]

۲۔ ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر محتلم پر غسل روز جمعہ ہے۔ مسواک اور بحسب امکان خوشبو لگانا بھی ضروری ہے۔
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خواہ وہ عطر اس کی اہلیہ ہی کا ہو۔ بکیر ابن اشج کی روایت میں ذرا سے فرق کے ساتھ یہی عبارت ہے۔

٣ ـــ روى البخاري قال حدثنا آدم قال حدثنا ابن أبي ذئب عن سعيد المقبري قال أخبرني أبي عن أبي وديعة عن سلمان الفارسي قال، قال النبي (ص): لايغتسل رجل يوم الجمعة و يستطهرما استطاع من طهر و يدهن من دهنه اويمس من طيب بيته ثم يخرج فلايفرق بين اثنين ثم يصلي ما كتب له ثم ينصت إذ تكلم الامام إلاغفرله ما بينه وبين الجمعة الأخرى.[12] وهذا الحديث رواه الشهيد الثاني. نقله عنه البحارج ٨٩ ص ٣٥٨.

۳۔ بخاری ...... سلمان فارسیؓ نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب آدمی جمعہ کے دن نہاتا اور اچھی طرح صاف ستھرا ہوتا، اپنے ملکیت کا تیل لگاتا اپنے گھر کا عطر استعمال کرتا، پھر گھر سے نکلتا اور لوگوں کو دھکا دیے بغیر (مسجد میں) حاضر ہوتا اور فرائض نماز بجا لاتا ہے، امام کے خطبے میں خاموش بیٹھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس جمعے سے اس جمعے کے مابین اس کے گناہ معاف کرتا ہے۔
یہ حدیث شہید ثانی رحؒ نے اور ان سے مجلسیؒ نے بحار (ج ۸۹ ص ۳۵۸) میں بھی نقل کی ہے۔

٤ ـــ حدثنا ابواليمان قال أخبرنا شعيب عن الزهري قال طاوس قلت لابن عباس ذكروا أن النبي (ص) قال: اغتسلوا يوم الجمعة واغسلوا رؤوسكم وإن لم تكونوا جنباً واطيبوا من الطيب ـــ قال ابن عباس... الحديث.[13]

۴۔ .... طاؤس نے ابن عباس سے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: محتلم نہ ہو جب بھی جمعہ کے دن سر دھو، نہاؤ، خوشبو لگاؤ۔ ابن عباس نے کہا:

.... الی آخر الحدیث ۔

۵ ــ حدثنا الحميدي، قال: ثنا سفيان، قال ثنا صفوان بن سليم عن عطاء بن يسار عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الغسل يوم الجمعة واجب على كل محتلم.[۱۴]

۵۔ .... ابو سعید خدری نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر محتلم پر جمعہ کے دن غسل جمعہ واجب ہے ۔

٦ــ حدثنا الحميدي، قال: ثنا سفيان، قال ثنا يحيى بن سعيد مالا أحصي عن عمره، عن عائشة قالت: كان الناس (اي عمال الناس) فكانوا يروحون بجهيأتهم يوم الجمعة فقيل لهم لواغتسلتم.[۱۵]

٦۔ ..... حضرت عائشہ فرماتی ہیں: جمعہ کے دن لوگ بد ہیئت عالم میں صبح کو نکلتے تھے ان سے کہا گیا "کاش نہا کے آئے ہوتے۔"

۷ ــ حدثنا الحميدى قال: ثنا سفيان قال: ثنا الزهري عن سالم بن عبدالله عن ابيه أنه سمع رسول الله صلى عليه وسلم على المنبر يقول: من جاء منكم الجمعة فليغتسل.[۱۶]

۷۔ .... سالم بن عبد اللہ کے باپ نے منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا: جو بھی جمعہ میں آئے نہا کر آئے (اس بارے میں روز جمعہ کفارے کے احادیث پیش نظر رہیں)۔

۸ ــ حدثنا عبدالله بن يوسف قال أخبرنا مالك عن نافع عن عبدالله بن عمر أن رسول الله (ص) قال: من أتى الجمعة فليغتسل.[۱۷]

۸۔ .... عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: جمعہ میں جو آئے، نہا کے آئے ۔

۹ ــ حدثنا عبد الله بن يوسف قال اخبرنا مالك عن صفوان بن سليم عن عطاء بن يسار عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله (ص) قال: غسل الجمعة واجب على كل محتلم.[۱۸]

۹۔ .... ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر محتلم پر غسل جمعہ واجب ہے۔

۱۰ ــ اغتسلوا يوم الجمعة فإنه من اغتسل يوم الجمعة فله كفارة مابين الجمعة الى الجمعة وزيادة ثلاثة ايام.[۱۹]

۱۰۔ جمعہ کے دن نہاؤ، جمعہ کے دن جو آدمی نہائے گا اس کے گناہ آئندہ جمعے تک دس دن کے بخشے جائیں گے۔

۱۱ ــ حدثنا اسحاق بن ابراهيم اخبرنا الوليد بن مسلم عن الاوزاعي قال حدثني يحيى بن أبي كثير حدثني ابوسلمة بن عبد الرحمن حدثني ابوهريرة قال: بينا عمر بن الخطاب يخطب... الى أن قال ألم تسمعوا رسول الله يقول: إذا جاء احدكم الجمعة فليغتسل.[۲۰]

۱۱۔ .... ابوہریرہ کے بقول حضرت عمر نے دوران تقریر کہا... کیا تم نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب جمعہ میں آؤ تو نہا دھو کے آؤ۔

قبول دعا کا لمحہ

روایات اھل بیت ع

۱ ــ عن احمد بن محمد بن النضر عن عبد الله بن سنان عن ابی عبدالله (ع) قال: الساعة التي يستجاب فيها الدعاء يوم الجمعة مابين فراغ الامام من الخطبة الى أن يستوي الناس في الصفوف وساعة أخرى من آخر النهار الى غروب الشمس.[۲۱]

۱۔ ...... عبد اللہ بن سنان نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی حضرت نے فرمایا: جمعہ کے دن جس لمحہ دعا قبول ہوتی ہے وہ امام کے خطبہ تمام ہونے سے صفوں کے درست ہونے تک کا لمحہ ہے۔ دوسرا لمحہ دن کے آخر سے غروب آفتاب تک کا ہے

۲ ــ عن محمد بن يحيى عن احمد بن محمد عن ابن ابى نصر عن معاوية بن عمار قال قلت لأبي عبدالله (ع): الساعة التي في يوم الجمعة التى لايدعو فيها مؤمن إلا استجيب له قال: نعم إذا خرج الامام. قلت إن الامام يعجل و يؤخر قال: إذا زاغت الشمس.[22]

۲۔ ...... معاویہ بن عمار نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی: جمعہ کے دن وہ لمحہ کون سا ہے جس میں مومن کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے؟ فرمایا: جب امام گھر سے چلے۔ میں نے پوچھا: امام کبھی جلدی پہنچتا ہے، کبھی دیر میں نکلتا ہے؟ فرمایا: جب سورج ڈھل جائے۔

۳ ــ العياشي عن زرارة ومحمد بن مسلم أنها سألا ابا جعفر (ع) عن قول الله «حافظوا على الصلوات والصلاة الوسطى» قال: صلاة الظهر وفيها فرض الله الجمعة وفيها الساعة التي لايوافقها عبد مسلم فيسأل خيراً إلا اعطاه اياه.[23]

۳۔ ...... زرارہ و ابو مسلم نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا "حافظوا على الصلوٰة والصلاة الوسطىٰ" کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا: نماز ظہر کے دھیان رکھنے کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: نماز ظہر اور اسی میں اللہ نے جمعہ فرض کیا اور جمعہ میں ایک ساعت ایسی ہے کہ جب بندۂ مسلم عین اس وقت دعائے خیر کرتا ہے تو خدا ضرور اسے نوازتا ہے۔

٤ ــ الحديث... وفيه ساعة لايوافقها من يدعو الله فيها بخير إلا استجاب الله له ولا... الحديث[24]

وفى هذا المعنى رواية اخرى باضافة، اعضا من حين نزول الشمس الى حين ينادى بالصلاة.[25]

۴۔ ایک حدیث میں ہے ...... ایک ایسی ساعت ہے کہ عین اس لمحے اللہ سے دعاءِ خیر کرنے والے کی آرزو ضرور پوری ہوتی ہے ....

۵ـ عن احمد بن الحسن القطان عن عبد الرحمن بن محمد بن حماد عن يحيى بن حكيم عن ابي قتيبة عن الأصبغ بن زيد عن سعد بن رافع عن زيد بن علي عن آبائه عن فاطمة بنت النبي (ص) قالت:سمعت النبي (ص) يقول: إن في الجمعة لساعة لايوافقها رجل مسلم يسأل الله عزوجل فيها خيراً إلا اعطاه اياه. قالت فقلت يارسول الله اي ساعة هی قال (ص): اذا تدلّى نصف عين الشمس للغروب.[۲۶]

۵۔ .... دخترِ پیغمبرؐ حضرت فاطمہؑ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ: جمعہ کے دن ایک ایسی ساعت ہے کہ جب کسی بندۂ مومن کی دعاءِ خیر عین اس لمحے میں واقع ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی حاجت ضرور پوری کرتا ہے۔ حضرت فاطمہؑ زہرا صلوٰت اللہ علیہا فرماتی ہیں، میں نے پوچھا: یارسول اللہؐ وہ ساعت کون سی ہے؟ فرمایا: جب سورج کی ٹکیا کا نصف حصہ ڈوبنے کو ہو۔

روایاتِ اہلِ سنّت

۱ ـ حدثنا عبد الرحمن بن سلام الجمحي حدثنا الربيع يعني ابن مسلم عن محمد عن زياد عن أبي هريرة عن النبي (ص) أنه قال: إن في الجمعة لساعة لايوافقها مسلم يسأل فيها خيراً إلا اعطاه اياه قال: وهي ساعة خفيفة.[۲۷]

۱۔ ...... ابو ہریرہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان کی دعاءِ خیر اگر اس لمحہ میں واقع ہو تو خدا ضرور پورا کرتا ہے۔ وہ لمحہ بہت مختصر ہے۔

۲ ــ وحدثني ابوالطاهر وعلي بن خشرم قالا اخبرنا ابن وهب عن مخرمة بن بكير. وحدثنا هارون بن سعيد الآيلي واحمد بن عيسى قالا حدثنا ابن وهب. اخبرنا مخرمة عن ابيه عن ابي بردة بن أبي موسى الاشعري قال: قال لي عبدالله بن عمر اسمعت اباك يحدث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في شأن ساعة الجمعة قال: قلت نعم، سمعتة يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: هي مابين أن يجلس الامام الى أن تقضى الصلاة.[۲۸]

۲۔ ...... ابوهریرہ بن ابوموسی اشعری کہتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن عمر نے کہا: کیا تم نے اپنے والد کو وہ حدیثِ رسول بیان کرتے سنا جو ساعتِ جمعہ کے بارے میں تھی؟ میں نے کہا: ہاں، میں نے سنا وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: وہ ساعت امام کے آن کر بیٹھنے سے نماز تمام کرنے تک کا وقت ہے۔

۳ ــ أخبرنا ابوالنضر محمد بن محمد الفقيه ثنا عثمان بن سعيد الدارمي ثنا احمد بن صالح ثنا ابن وهب اخبرني عمرو بن الحارث أن الحلاج بن كثير اخبره أن اباسلمة بن عبدالرحمن حدثه عن جابر بن عبدالله عن رسول الله (ص) أنه قال: الجمعة ثنتا عشرة ساعة ولايوجد عبد مسلم يسأل الله شيئا إلا اتاه الله فالتمسوها آخر الساعة بعد العصر.[۲۹]

وهذه الروايه نقلها مستدرك الوسائل عن ابن ابي جمهور في درراللئالج ۱ ص ۴۱۳.

۳۔ ..... جابر بن عبداللہ نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن بارہ گھنٹے ہیں، کوئی بندۂ مسلم ایسا نہ ہوگا جو اس دن خدا سے کچھ مانگے اور اللہ اسے نہ دے۔ لہذا عصر کے بعد آخر وقت (دعا ضرور) کیا کرو۔ اس روایت کو مستدرک الوسائل میں ابن ابی جمہور سے نقل کیا گیا ہے۔

نیز درراللئالی ج ۱ص ۴۱۳۔

جمعہ کے دن کی موت

روایات اہل بیتؑ

١ ــ الصدوق باسناده عن الأصبغ بن نباته عن أميرالمؤمنين (ع) أنه قال: ليلة الجمعة ليلة غراء و يومها أزهر، ومن مات ليلة الجمعة كتب له براءة من ضغطة القبر ومن مات يوم الجمعة كتب له براءة من النار.[٣٠]

۱۔ .... امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کی رات روشن اور جمعہ کا دن منور ہوتا ہے اور جو شب جمعہ رحلت کرتا ہے اسے فشار قبر سے آزادی دی جاتی ہے اور جو روز جمعہ فوت ہوتا ہے اسے جہنم سے آزادی دی جاتی ہے۔

٢ ــ عن محمد بن الحسن بن الوليد عن سعيد بن عبدالله عن أحمد بن أبي عبدالله البرقي عن ابن ابي نجران والحسين بن سعيد عن حماد عن حريز عن أبان بن تغلب عن الصادق (ع) قال: من مات يوم مابين زوال الشمس يوم الخميس الى زوال الشمس من يوم الجمعة اعاذه الله من ضغطة القبر.[٣١]

۲۔ .... حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: زوال یوم پنجشنبہ اور زوال یوم جمعہ کے درمیان جو شخص مرجائے، اللہ اسے فشار قبر سے پناہ دیتا ہے

٣ ــ قال ابوجعفر (ع) بلغني آن النبي (ص) قال: من مات يوم الجمعة اوليلة الجمعة رفع عند عذاب القبر.[٣٢]

۳۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جمعہ کے دن یا رات کو مرنے والے کی قبر سے عذاب اٹھالیا جائے گا۔

٤ــ عن أبي جعفر(ع): ليلة الجمعة غراء و يومها ازهر ومامن مؤمن مات ليلة الجمعة إلا كتب له براءة من عذاب القبر وإن مات في يومها اعتق من النار ولابأس بالصلاة يوم الجمعة كله لأنه لا تسعر فيه النار.[٣٣]

۴۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:
شب جمعہ و روز جمعہ روشن و منور ہیں۔ جب بھی کوئی مومن شب جمعہ کو مرتا ہے تو عذاب قبر سے، دن کو مرتا ہے تو عذاب جہنم سے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ کیا مضائقہ ہے اگر جمعہ کے پورے دن نماز پڑھی جائے۔ اس دن آتش جہنم خاموش رہتی ہے۔

روایات اہل سنت

١ ــ ما من مسلم يموت يوم الجمعة اوليلة الجمعة إلا وقاه الله تعالى فتنة القبر.[٣٤]

۱۔ جو مسلمان جمعہ کے دن یا رات کو وفات پاتا ہے اللہ اسے عذاب قبر سے بچاتا ہے۔

٢ــ من مات يوم الجمعة عوفي من عذاب القبر وجرى له عمله.[٣٥]

۲۔ جو شخص جمعے کے دن یا رات کو وفات پاتا ہے، عذاب قبر اس کے لئے معاف کیا جاتا ہے اور اس کا عمل اس کے لئے جاری رہتا ہے۔

٣ ــ من مات يوم الجمعة أوليلة الجمعة اجير من عذاب القبر وجاء يوم القيامة وعلية طابع الشهداء.[٣٦]

۳۔ جو شخص جمعے کے دن یا رات کو فوت ہوتا ہے عذاب قبر سے اسے پناہ ملتی ہے اور قیامت کے دن شہدا کے نشانات سے آراستہ محشور ہوگا۔

٤ ــ عبدالرزاق عن ابن جريح عن رجل عن ابن شهاب أن النبي (ص) قال: من مات ليلة الجمعة أو يوم الجمعة برئ من فتنة

القبر أ وقال وفي فتنة القبر وكتب شهيداً.[٣٧]

وعن عبدالرزاق عن ابن جريج عن رجل عن المطلب بن عبدالله بن حنطب عن النبي (ص) مثله وكذا عن عبدالرزاق عن ابن جريح عن ربيعة بن سيف عن عبدالله بن عمرو عن النبي (ص) مثله.

۴۔ عبدالرزاق نے ابن جریج انھوں نے کسی شخص سے اس نے ابن شہاب سے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ جو شخص شب جمعہ یا روز جمعہ فوت ہوتا ہے، عذاب قبر سے بری کیا جاتا ہے۔ یا اس کے بجائے یہ فرمایا ۔۔ اور عذاب قبر میں (معاف کیا جاتا ہے) اور شہید لکھا جاتا ہے۔

یہی روایت عبدالرزاق بن جریج، ایک شخص، مطلب بن عبداللہ بن حنطب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ یہی متن۔

اسی طرح ۔عبدالرزاق ابن جریج ۔ ربیعہ بن سیف ۔عبداللہ بن عمرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔ یہی متن۔

---

١ ــ الفقيه ج ١ ص ٦١-٦٢ والبحار ج ٨٩ ص ٣٥١ و٣٥٢ عن جمال الاسبوع بهذا الاسناد وباسناد آخر بتغيير بسيط في المتن.

٢ ــ فروع الكافي ج ٣ ص ٤١٧.

٣ ــ البحار ج ٨٩ ص ٣٥٦.

٤ ــ البحار ج ٨٩ ص ٣٦٥ عن الدعائم.

٥ ــ الوسائل ج ٣ ص ٧٨ والكافي ج ٣ ص ٤١٧ وعن الصدوق في الفقيه ج ١ ص ٦٢ مرسلاً.

٦ ــ الكافي ج ٣ ص ٤١٧.

٧ ــ الجعفريات ص ٤٥.

٨ ــ الوسائل ج ٣ ص ٩٣ ــ وعن قرب الاسناد ص ١٧. المجالس ص ــ ٢٢٣ ــ والبحار ج ٨٩ ص ١٨٩.

٩ ــ البحار ج ٨٩ ص ٢١٢ عن الشهيد الثاني في رسالة الجمعة

وراجع البحار ج ٨٩ ص ٢١٢.

١٠ ــ البخاري كتاب الجمعة ص (١٠٤). كنزالعمال ج ٧ حديث (٣٥٦٦) . واحمد ج ٣ ص ٣٠ و ٦٩ عن أبي سعيد وهذا الحديث رواه من علماء اهل البيت في البحار ج ٨٩ ص ٣٥٨ عن الشهيد الثاني والمستدرك للوسائل ج ١ ص ٤١٤ عن الشهيد الثاني ايضاً. ورواه ايضاً من طرق السنة البيهقي ج ٣ ص ٢٤٢.

١١ ــ مسلم ج ٢ ص ٣ ومثله كنزالعمال ج ٧ ح(٣٥٦٧) وراجع رقم (٣٥٥١ و٣٦٠١) والنسائي ج ٣ ص ٩٢ و ٩٧ و ابن حبان عن ابي سعيد نقله كنزالعمال ورواه البيهقي ج ٢ ص ٢٤٢ ومستدرك الحاكم ج ١ ص ٢٨١.

١٢ ــ البخاري كتاب الجمعه ص ١٠٤ و١٠٧ والبيهقي ج ٣ ص ٢٤٢ وص ٢٤٣ باسناده عن أبي سعيد وابي هريرا معاً ومثله المستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٧٧. مصابيح السنة للبغوي ج ١ ص ١٨ ومجمع الزوائد ج ٢ ص ١٧٤.

١٣ البخاري كتاب الجمعة ص ١٠٤ والبيهقي باسناده الى ابي اليمان ج ٣ ص ٢٤٢ وقال رواه مسلم.

١٤ ــ مسند الحميدي ج ٢ ص ٣٢٣ واخرجه البخاري ج ٢ ص ٢٤٤.

١٥ ــ مسند الحميدي ج ١ ص ٩٣ ــ ٩٤ ــ واخرجه البخاري ج ٢ ص ٢٦٤ من طريق ابن المبارك عن يحيى بن سعيد.

١٦ ــ مسند الحميدي ج ٢ ص ٢٧٦.

١٧ ــ البخاري ج ١ ص ١٠٣ و١٠٥ كتاب الجمعة كنزالعمال ج ٧ حديث (٣٥٥٣) والنسائي ج ٣ ١٠٦ و٩٣ ونقله في كنزالعمال عن مسند احمد و ابن ماجه عن عمر وصحيح مسلم ج ٢ ص ٣ و٢ منحة المعبود ج ١ ص ١٤٢ وسنن الدارمي ج ١ ص ٣٦١ وابن ماجة ج ١ ص ٣٤٦ ومجمع الزوائد ٢ ص ١٧٣.

١٨ ــ البخاري ص ١٠٤ كتاب الجمعة و١٠٧ عن ابن عمرو أبي سعيد وكنزالعمال ج ٧ ح (٣٥٥٦) مالك من شرح الزرقاني ج ١ ص ٣١٢ والنسائي ج ٣ ص ٩٣ ونقله كنزالعمال عن احمد و ابن ماجة

عن أبي سعيد وراجع سنن الدارمي ج ١ ص ٣٦٠ ومسلم ج ٢ ص ٢ باسناده عن مالك عن صفوان و ابن ماجة ج ١ ص ٣٤٦.

١٩ ــ كنزالعمال ج ٧ حديث (٢٥٥٨).

٢٠ ــ صحيح مسلم ج ٢ ص ٢ و٣ والبخاري ج ١ ص ١٠٣ و ١٠٤ وكنزالعمال ج ٧ حديث (٣٥٤٨) و(٣٥٤٩) عن ابن عساكر عن ابن عمروموطأ مالك في شرح الزرقاني ج ١ ص ٣١٥ ومنحة المعبود ج ١ ص ١٤٣ وكشف الاستار ج ١ ص ٣٠٠ و ٣٠١ والدارمي ج ١ ص ٣٦١.

٢١ ــ الكافي ج ٣ ص ٤١٤ والوسائل ج ٣ ص ٤٦ والبحار ج ٨٩ ص ٢١٧ نقله عن مصباح المتهجد ومستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٣ عن كتاب العروس.

٢٢ ــ الوسائل ج ٣ ص ٤٦ والكافي ج ٣ ص ٤١٦ والبحار ج ٨٩ ص ٢٨٤ ومستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٣ عن كتاب العروس وعن التهذيب ج ٣ ص ٤.

٢٣ ــ البحار ج ٨٩ ص ١٩٥ وفي هامشه عن العياشي ج ١ ص ١٢٧.

٢٤ ــ البحار ج ٨٩ ص ٢٦٣ عن مجمع البيان.

٢٥ ــ البحار ج ٨٩ ص ٢٧٩ ومسترك الوسائل ج ١ ص ٤١٣ و ص ٤١٨ نقله عن الشيخ أبي الفتوح.

٢٦ ــ البحار ج ٨٩ ص ٢٦٩: نقله عن معاني الأخبار وعن دلائل الامامة وفي الوسائل ج ٣ ص ٦٩ عن معاني الأخبار ايضاً وبنفس السند إلا أنه قال سعيد عوضاً عن سعد.

٢٧ ــ مسلم ج ٢ ص ٥ مثله ص٦. باسانيد مختلفة عن أبي هريرة والبخاري ج ١ ص ١٠٩ بزيادة: وهوقائم يصلي ـ وكذا النسائي ج ٣ ص ١١٥ بزياده تفسيرها بأنها حين تقام الصلاة الى الانصراف منها و مثله في الترمذي ج ٢ ص ٢٦١. والام ج ١ ص ١٨٥ وسنن أبي داوود ج ١ ص ٢٧٤ ومصابيح السنة للبغوي ج ١ ص ٦٧ ومنحة المعبود ج ١ ص ١٣٩ و ١٤٠ ومثله مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٦٣ و وفي كشف الاستار باسناده عن علي (ع) مثله ج ١ ص ٢٩٧ و مثله المستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٧٨ والمنتقى ج ٢ ص ١٤ وفيه ص

١٦ باسناده الى أبي هريرة وابي سعيد كلاهما ونقله عن أحمد وهوج ٣ ص ٣٩ و ٦٥ وأبي داود عن جابر بزيادة أنهابعد العصرج ١ ص ٢٧٥ وبهذه الزيادة في مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٦٥ والمستدرك ج ١ ص ٢٧٩ والمنتقي ج ١ ص ١٦ ونقله عن النسائي وابي داوود وكشف الاستارج ١ ص ٣٠٣ وبهذا المعنى عن الدارمي ج ١ ص ٣٦٠ وفيه ايضاً رواية بهذا المعنى وبزيادة أنها حين تقام الصلاة الى الانصراف منها.

٢٨ ـ مسلم ج ٢ ص ٦ وابي داوود ج ١ ص ٢٧٦ والمنتقي باسناده الى ابي موسى ج ٢ ص ١٤ ونقله عن مسلم وابي داوود وكذا رواه ص ١٥ باسنادة عن عوف المزني.

٢٩ ـ المستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٧٩. وقال هوصحيح. والترمذي عن أنس بهذا المعنى ج ٢ ص ٣٦٠ وراجع النسائي ج ٣ ص ١١٥ ومن اراد التوسع فليراجع مصادرساعة الإ جابة يوم الجمعة فقد نقلها في مفتاح كنوز السنة في باب الجمعة والمنتقي ج ٢ ص ١٦ نقله عن النسائي وابى داود وروى مثله عن أبي هريرة ونقله عن احمد وبهذا المعني عن أنس في مصابيح السنة للبغوي ج ١ ص ٦٧.

٣٠ ـ الوسائل ج ٣ ص ٦٥ وفي هامشه عن الفقيه ج ١ ص ١٣٨. وعن المقيد في المقنعة ص ٢٥.

٣١ ـ البحارج ٨٩ ص ٢٦٥ و ٢٧١ نقله عن مجالس الصدوق وعن المحاسن وعن ثواب الاعمال.

٣٢ ـ البحارج ٨٩ ص ٢٧١. نقله عن المحا سن.

٣٣ ـ البحارج ٨٩ ص ٢٧٩ وفي هامشه عن دعائم الاسلام ج ١ ص ٤١٨ وراجع مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٧ عن الجعفريات.

٣٤ ـ كنزالعمال ج٧حديث (٣٣٦١) ونقل في الهامش عن احمد والترمذي عن ابن عمر.

٣٥ ـ كنزالعمال ج ٧ حديث (٣٣٩٩) عن الشيرازى في الالقاب عن ابن عمر.

٣٦ ـ كنزالعمال ج ٧ الحديث رقم (٣٤٠٠) وحلية ابو نعيم عن جابر.

٣٧ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٣ ص (٢٦٩).

آخری قسط

جناب شیخ یوسف صانعی

اسلامی قوانین کے امتیازات

(۳)

اسلامی قوانین کا تیسرا امتیاز، اس کی انسانی و تخلیقی فطرت سے ہم آہنگی ہے، یعنی انسان باعتبار انسانیت جن چیزوں کا خواہاں ہے اسلام ان تقاضوں کو پورا کرنے آیا ہے خواہ ان کا تعلق اعتقادی واصولی امور سے ہو یا عملی و فرعی احکام سے:

فاقم وجهك للدين القيم من قبل ان ياتي يوم لامرد لـه من الله يومئذٍ يصدعون (روم - ۴۳)

"تم دین مستقیم، اسلام و خدا پرستی کا رخ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس کا پلٹ جانا اللہ کی طرف سے نہ ہوگا، اور اس دن لوگ الگ الگ ہوجائیں گے۔"

انسان جب کائنات اور اس کی باریکیوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو فطری طور پر خالق و صانع خدا کا معتقد اور اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوجاتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ چھوٹی سی چیونٹی اپنے سے ساٹھ گنا وزن اٹھا سکتی ہے حالانکہ انسان حد سے حد اپنے سے تین گنا وزن اٹھا سکتا ہے، تو پھر کیسے ممکن ہے کہ خدا پر ایمان نہ لائے:

الذی اعطی کل شئ خلقه ثم هدی (طہ - ۵۰)

"وہ خدا ہے جس نے ہر چیز کو خلق اور وسائل زندگی سے بہرہ مند ہونے کا طریقہ سکھایا۔"

انسان مشاہدہ کرتا ہے کہ پوری کائنات میں خاص نظم و ضبط کارفرما ہے، ہر چیز اپنی جگہ رہے، حتی اولاد سے والدین کی محبت بھی یکساں نہیں۔ انسان و حیوان میں اس لحاظ سے فرق ہے۔ ہر ایک کو بقدر ضرورت محبت و الفت عطا کی گئی:

وان من شیٔ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم (حجر ۲۱)

تخلیق کی بنیاد اور خزانے تمام چیزیں ہمارے پاس ہیں۔ ہم صحیح نظم و ضبط اور ٹھیک اندازے کے بغیر خلق و نازل نہیں کرتے۔

الذی احسن کل شیٔ خلقہ (سجدہ - ۷)

وہ خدا جس نے ہر چیز کو بہت ہی اچھا پیدا کیا۔

اللھم انی اسألک من کلماتک باتمّھا (دعاء سحر)

بار الہا! تجھ سے تیرے کامل ترین کلمات و مخلوقات کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں۔ خدایا! تیرے تمام کلمات و مخلوقات کامل ہیں ان میں کوئی عیب نہیں۔

ان چیزوں پر ایمان لانے کے لئے کسی استاد معلم کی حاجت، بلکہ والدین کی تعلیم و تربیت کی بھی ضرورت نہیں۔

جس طرح مبداء پر ایمان فطری ہے اسی طرح معاد کا اعتقاد بھی فطری ہے۔ کیونکہ مجرموں کے جرائم کی سزا اور نیکوں کے اچھے اعمال کی پاداش، انسان کا فطری تقاضا ہے اور ہر انسان یہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں اچھوں کو نیکی اور بدوں کو برائی کی حقیقی جزا و سزا نہیں ملتی، کیونکہ دنیا میں سب سے بڑی سزا پھانسی ہے۔ ذرا غور کیجئے وہ محارب جس نے مسلمانوں اور اسلام سے بغاوت کرتے ہوئے بے گناہ انسانوں اور معصوم بچوں کو بم کے دھماکے سے اڑا دیا، سینکڑوں انسانوں کو زندہ نذرِ آتش کر دیا، کیا اس کی قرار واقعی سزا صرف پھانسی ہے؟

وہ شہداء جنھوں نے اپنے خون سے شجرِ اسلام و انسانیت کی آبیاری کی، کیا ان کی پاداش اس دنیا میں دی جاسکتی ہے؟ کیا رہبر انقلاب اسلامی امام خمینی کی زحمتوں اور کوششوں کا اجر ادا ہو سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں!

یہی وہ مقام ہے جہاں فطرت انسان آخرت و معاد کی ضرورت کو محسوس اور روز

جزاء و سزا کو تلاش کرتی ہے ۔ مبداء و معاد کی طرح اسلام کے بقیہ اعتقادی اصول بھی فطری بنیادوں پر استوار ہیں ۔

اسلام کے عملی و فرعی احکام کے سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کی جانب توجہ ضروری ہے کہ اسلام، انسان کے غرائز و رجحانات، خواہشات اور اس کے انسانی جذبات و احساسات کا ہرگز مخالف نہیں، اسلام کا مقصد انسانی خواہشات و غرائز سے تصادم نہیں ، بلکہ اس کا نصب العین ان غرائز و خواہشات کو کنٹرول اور انہیں صحیح راستے پر لگانا ہے :

وتمت كلمة ربك صدقا وعدلا (انعام ــ ۱۱۵)

قوانین الہی ، حق و صداقت اور عدل و انصاف کی بنیاد پر استوار ہیں ، قانون میں عدل کا مطلب غرائز و خواہشات کو کنٹرول کرنا ہے نہ کہ ان کی سرکوبی کیونکہ یہ سراسر ظلم ہے :

وكذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ۔ (بقرہ ــ ۱۴۳)

ہم نے تم (امت اسلامی) کو امتِ وسط قرار دیا ہے تاکہ دوسروں کے لئے نمونہ و شاہد بنو ۔

معلوم ہوا کہ اسلام میں افراط و تفریط نہیں ۔ اور واضح بات ہے کہ انسان کے غرائز و خواہشات سے بے توجہی تفریط ہے اور ان کو کنٹرول کے بغیر آزاد چھوڑ دینا افراط ہے ۔ مسلمانوں کے نمونہ و شاہد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان گواہی دیتے ہیں کہ یہودی ، جن کی ساری توجہ مادیات اور تکمیل خواہشات نفسانی کی جانب ہے اور ان لوگوں کا طرز فکر جو دنیا سے منہ موڑ کر صرف ریاضت ، عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں ، دونوں گروہوں کے عقیدے غلط و باطل ہیں ۔ راہ صواب یہ ہے کہ ان غرائز سے منہ موڑنے کے بجائے ان کو کنٹرول کر کے صحیح راستہ پر لگایا جائے ۔ قرآن مجید سے اس بارے میں دلائل موجود ہیں ۔ مثلاً

۱۔ عدل و حکمت الہی :

ہوا و ہوس ، خواہشات و غرائز یہ ساری چیزیں خداوند عالم کی پیدا کردہ ہیں :

خلق كل شىء (فرقان ــ ۲)

خداوند عالم تمام چیزوں کا خالق ہے اور اسی نے سارے قوانین وضع کئے ہیں تخلیق وتشریع ذات باری سے مختص ہے :

ان الحکم الا للہ یقص الحق انعام ـ ۵۷

وضع قانون خداوند عالم کا خاص حق ہے ۔ خدا حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہ بہترین جدا کرنے والا ہے ۔ جب تخلیق وتشریع دونوں ہی ذات باری تعالیٰ سے مختص ہیں پھر ایسی چیز کی تخلیق عبث ہے جس سے انسان حکم وقانون الٰہی کی بناء پر منہ موڑے گا اور اسے اطاعت خالق کی خاطر سرکوب وفنا کرنے کے لئے مجبور ہوگا ۔ حالانکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ خداوند عالم حکیم ہے اور تخلیق وتشریع دونوں اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں ۔

یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ اسلام نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ سو فیصد غیر مفید نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ فائدے بھی ہیں ، لہٰذا ان کی تخلیق میں یہ اعتراض وارد نہیں ہے ۔

۲۔ خلقت انسان اور قرآنی تعبیریں

خلقت انسان کے بارے میں قرآن مجید کی تعبیریں ہمارے دعوے کی دوسری دلیل ہے ، خالق کائنات ایک مقام پر اپنی تخلیق کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے :

فتبارک اللہ احسن الخالقین (مومنون ـ ۱۴)

بابرکت ہے وہ اللہ جو بہترین خالق ہے ۔

قرآن مجید میں تعبیر " تبارک " انتہائی اہم مواقع پر استعمال ہوئی ہے ، مثلاً قرآن مجید جو حق کو باطل سے ممتاز کرتا ہے اور پیغمبر اکرم کی ہدایت کا وسیلہ ہے اگر قرآن نہ ہوتا تو حضور ، عالمین کے لئے منذر وہادی نہ ہوتے ، تعبیر " تبارک " نزول قرآن جیسے اہم موقع پر استعمال ہوئی ہے :

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا (فرقان ـ ۱)

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر فرقان نازل کیا جو عالمین کے لئے نذیر ہے ۔

توحید ۱۰۶

جس وقت کائنات پر خداوند عالم کی حکومت و اقتدار کا تذکرہ ہوتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے:

تبارك الذی بیدہ الملك وھو علی کل شیئ قدیر (ملک - ۱)

با برکت ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں پوری کائنات کی حکومت ہے اور وہ ہر شئ پر قادر و توانا ہے، اور یا تمام موجودات عالم کا مالک و مربی ہونے کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلکم اللہ ربکم فتبارك اللہ رب العالمین (غافر - ۶۴)

تمہارا خدا وہ ہے جو ہر شخص کا مالک و مربی ہے، پس با برکت ہے وہ خدا جو عالمین کا پروردگار ہے۔

جب ہم ان اہم چیزوں سے خلقت انسان کا موازنہ کرتے ہیں کہ خداوند عالم نے خلقت انسان کے سلسلہ میں "تبارك" کی تعبیر استعمال فرمائی ہے۔ اس وقت اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تخلیق انسان کے بارے میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ۔ (یٰسن - ۵)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین شکل میں خلق کیا۔

وصورکم فاحسن صورکم ۔ (غافر - ۶۴)

خداوند عالم نے تمہیں بہترین صورت عطا فرمائی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان تعبیرات کے ہوتے ہوئے قانون و شرع، ان ہی غرائز و خواہشات کی سرکوبی کا حکم دیں؟ اگر انسان کے غرائز و خواہشات کا کچلنا ضروری اور اس سے فائدہ اٹھانا منع ہو تو پھر تخلیق انسان کو خلق حسن کہنا بے جا اور تعبیر "تبارك" بے محل ہو گی۔

۳۔ قرآن مجید میں کچھ ایسی آیتیں ہیں جہاں خالقِ کائنات نے مال و دولت کو "خیر" اور انسان کو ان کا دلدادہ قرار دیا ہے:

ان ترك خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین (بقرہ - ۱۸۰)

اگر انسان اپنے بعد کچھ "خیر" چھوڑے تو اپنے والدین اور رشتہ داروں کو اس کے

بارے میں وصیت کر جائے۔
قرینۂ وصیت اور مفسرین کی تفسیر کی بنا پر "خیر" سے مراد مال ہے۔

وانه لحب الخير لشديد (عادیات - ۸)

اسے اپنے مال و دولت سے سخت لگاؤ ہے۔ ایک دوسری آیت میں بال بچوں سے محبت، سونے چاندی، شاندار سواری، مویشی، کھیتی اور باغات سے لگاؤ کو زینت بتایا گیا ہے۔ یعنی تمام وہ چیزیں جن کا انسان دلدادہ ہے:

زين للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسوّمة والانعام والحرث (آل عمران-۱۴)

سورۂ نحل میں تمام چیزوں کی خلقت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائے اور لطف اندوز ہو۔

والانعام خلقها لكم فيها دفء ومنافع ومنها تأكلون ولكم فيها جمال حين تريحون وحين تسرحون وتحمل أثقالكم الى بلد لم تكونوا بالغيه ..... (نحل ۴ - ۸)

چوپایوں کو تمہارے (نوع انسان کے) فائدے کے لئے خلق کیا تاکہ اس کی کھال اور بال سے اپنے کو سردی و گرمی سے محفوظ نیز اس کے دودھ اور گوشت سے شکم سیر ہو سکو اور اس میں تمہارے لئے تجمل ہے جب ان کو چراگاہوں سے واپس لاتے ہو اور تمہارے بھاری بھاری بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں جن کے اٹھانے کے لئے تمہیں انتہائی دقت و دشواری ہوتی، تمہارا پروردگار تم پر نہایت مہربان و رؤف ہے، اس نے اونٹ، گھوڑے اور گدھے کو تمہاری سواری کے لئے مسخر کر دیا۔

صاف سی بات ہے کہ ان چیزوں سے بہرہ مند ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے غرائز و خواہشات کو کام میں لائے۔

۴۔ وہ آیات و روایات جو زندگی دنیا اور مادیات سے بہرہ مند ہونے کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں:

وابتغ فیما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصیبك من الدنیا
واحسن کما احسن الله الیك ولا تبغ الفساد فی الارض ان الله
لا یحب المفسدین (قصص - ۷۷)

علم وعقل، ہاتھ اور پیر کی اپنی خداداد طاقتوں کے ذریعہ حصول آخرت کی کوشش کرو" اپنی تمام توانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے سعادت آخرت کا بیمہ کرلو مگر دنیاوی زندگی کو بھی فراموش نہ کرو، اس سے اپنا حصہ حاصل کرو جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ نیکی کی تم بھی معاشرہ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور فتنہ و فساد نہ کرو کیونکہ خداوند عالم مفسدوں سے بیزار ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب
النار - (بقرہ - ۲۰۰)

خداوندا، تو ہمیں دنیا و آخرت میں نیکی و حسنات عطا فرما۔ دنیا میں نیکی معیشت کی خوشحالی اور آخرت میں نیکی حصول مرضی معبود ہے۔

ضرب الله مثلا عبدا مملوکا لا یقدر علی شیئ ومن رزقناہ
منا رزقا حسنا - (نحل - ۷۵)

خداوند عالم دو اشخاص کی مثال دیتا ہے، ایک وہ جو اپنے اختیارات کو استعمال نہیں کرتا۔ دوسروں کا اسیر ہے اور ایک وہ جو خداوند عالم کی نعمتوں سے مستفید ہوتا ہے۔ اور خداوند عالم نے اسے رزق حسن عطا فرمایا ہے:

قال النبی ؐ یا علی للسعید ثلاث علامات قوت الحلال فی بلدہ
ومجالسة العلماء والصلوات الخمس مع الجماعة، وللشقی ثلاث
علامات قوت الحرام والاجتناب عن العلماء والصلوات الخمس
وحدہ۔

حضرت رسول اکرم ؐ فرماتے ہیں: اے علی ؑ! سعادتمند انسان کی تین علامتیں ہیں:

۱۔ رزق حلال حاصل کرتا ہے۔
۲۔ علماء کی بزم میں بیٹھتا ہے۔
۳۔ نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرتا ہے۔
شقی اور بدبخت انسان کی بھی تین نشانیاں ہیں:
۱۔ رزق حرام
۲۔ علماء سے پرہیز
۳۔ نماز پنجگانہ کو فرادا پڑھنا۔

ان تمام آیات و روایات سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا مقصد انسان کے غرائز و خواہشات کو کچلنا نہیں بلکہ اسے کنٹرول کرنا ہے۔ کیونکہ اسلام نے زندگی دنیا کی جانب خاص توجہ دی ہے، یہاں تک کہ بعض دعاؤں میں خداوند عالم ہمیں معیشت کی بہتری کے لئے دعا کا حکم دیتا ہے اور پیغمبر اکرم رزق حلال کو جزء سعادت اور اسے نماز جماعت کے ہم رتبہ قرار دیتے ہیں اور جن مقامات پر ہوائے نفس کی مخالفت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد خواہشات حرام ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کو خوف الٰہی کے ساتھ بیان کیا ہے:

وامّا من خاف مقام ربّہ ونھی النفس عن الھوی (نازعات - ۴۱)

جو شخص اپنے پروردگار سے ڈرے اور اپنے کو خواہشات نفسانی سے دور رکھے اس کا مقام بہشت ہے۔ بدیہی ہے کہ خوف خدا سے مراد خوف گناہ ہے لہٰذا خواہشات سے دور رکھنے کا مطلب بھی گناہوں اور معاصی سے اجتناب ہے۔

(۴)

عدالت

اسلامی قوانین کی چوتھی خصوصیت عدالت ہے۔ اسلامی قوانین ہر قسم کے ظلم و ناانصافی سے پاک ہیں خواہ وہ قانون سازی کا مرحلہ ہو یا نفاذ قانون کا۔

اسلام صرف رنگ و نسل یا مال و دولت کی بنیاد پر کسی شخص یا گروہ کو فوقیت نہیں دیتا۔ اس کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا جس کی صفت عادل

جس کا نام عادل وہ ایسا قانون بنائے جس میں انصاف و برابری کا لحاظ نہ کیا گیا ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ رنگت اور صنف کی بنیاد پر جس کا اختیار انسان کے اپنے ہاتھ میں نہیں ایک کو دوسرے پر فوقیت دے۔ عمل صالح و غیر صالح کی بجاآوری میں مال و دولت کو کوئی دخل نہیں۔ لہذا صرف مال و دولت کی بنیاد پر کسی کو فوقیت دینا سراسر ستم ہے اور خداوند عالم کی ذات اقدس کے لئے یہ محال ہے۔

وما ربك بظلّام للعبيد تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا

وما الله يريد ظلما للعالمين

خداوند عالم نہ صرف یہ کہ ظالم نہیں بلکہ ظلم کا ارادہ بھی نہیں کرتا، خداوند عالم کی کسی سے قرابت و رشتہ داری بھی نہیں۔

لم يلد ولم يولد

انسانوں کی برابری اور مساوات ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس پر اسلام نے بہت زیادہ زور دیا ہے۔

انا خلقناكم من ذكر و انثىٰ وجعلناكم شعوبًا و قبائل لتعارفوا۔ (حجرات ــ ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ابتدائے خلقت میں ایک مرد و زن سے پیدا کیا، پھر بہت سے قبیلے اور گروہ بنا دئے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

تمام انسانوں کی خلقت کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

فتبارك الله احسن الخالقين (مومنون ـ ۱۴)

بابرکت ہے وہ قدرت کامل جو بہترین خالق ہے (اور اس نے تمہیں اچھی خلقت عطا کی)۔

قرآن مجید تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھتا ہے:

يا ايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة

وخلق منها زوجها وبث منهما رجالًا كثيرا ونساء (النساء ـ ۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تمھیں ایک ماں باپ سے خلق کیا، اور ان سے بہت سے مرد و زن پیدا کئے۔ قرآن مجید کی نظر میں رنگ و نسل اور جغرافیائی ماحول نیز زندگی کے خاص حالات، دنیائے تخلیق و قدرتی اسباب کے رہین منت اور قدرت خالق کی نشانیاں ہیں، تفوق و برتری کے عوامل نہیں ہیں۔

ومن آیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذالک لآیات للعالمین (روم۔ ۲۱)

تخلیق زمین و آسمان، اس میں پائی جانے والی نعمتیں، رنگ و زبان کے اختلافات دانشمند و دانشور افراد کے لئے خداوند عالم کی نشانیاں ہیں۔

قرآن مجید کی نظر میں انسانیت اور قدر و قیمت کا معیار گناہوں سے دوری اور الٰہی قوانین کی اطاعت ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (حجرات)

خداوند عالم کی نظر میں مکرم ترین شخص وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

مفسرین نے اس آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں چند اقوال نقل کئے ہیں:

(۱) ثابت بن قیس، حضورؐ کے پہلو میں بیٹھنا چاہتے تھے، لیکن پہلے سے بیٹھے ہوئے شخص نے ان کے لئے جگہ خالی نہ کی۔ ثابت بن قیس کو اس بات پر غصہ آگیا اور اس شخص کو توہین آمیز انداز سے اس کی ماں کے نام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

اے فلاں عورت کے بیٹے، پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کس نے یہ بات کہی؟ ثابت نے عرض کیا میں نے یا رسول اللہؐ! حضورؐ نے فرمایا اس حقیقت کو دیکھ، ثابت نے حضرتؐ کے حکم کے مطابق نگاہ اٹھائی، پیغمبر نے دریافت فرمایا کیا دیکھ رہے ہو؟ ثابت نے کہا کچھ سیاہ سفید اور سرخ رنگت والے افراد ہیں، یا رسول اللہؐ! آنحضرتؐ نے فرمایا تمھیں ان لوگوں پر کوئی برتری و فوقیت نہیں، مگر تقویٰ و طہارت نفس کے ذریعہ۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) رسول خداؐ نے قبیلہ بنی بیاضہ کو ابا ھند حجام کی شادی کا پیغام دیا، ان لوگوں نے

عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم اپنی لڑکیوں کی شادی غلاموں سے کردیں؟ اس وقت ان کے جواب میں یہی آیت نازل ہوئی، یعنی اس غلط تفاخر اور جھوٹی فضیلتوں سے دست بردار ہو جاؤ اسلام ان غلط معیاروں کو تسلیم نہیں کرتا۔

ان آیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے کتنی خوبصورتی سے نسل پرستی اور طبقاتی امتیازات کی مخالفت کی ہے، قرآن مجید تمام انسانوں کو "یا ایھا الناس" اور "یا بنی آدم" سے خطاب کرتا ہے۔ کسی خاندان یا قبیلہ سے مخاطب نہیں۔ وہ تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد اور سب کی خلقت کا سرچشمہ ایک چیز قرار دیتا ہے:

ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین (مومنون - ۱۲)

ہم نے انسانوں کو مٹی (طین) سے خلق کیا ہے۔

منھا خلقناکم وفیھا نعیدکم ومنھا نخرجکم تارۃ اخریٰ (طہ - ۵۵)

ہم نے تمہیں مٹی سے خلق کیا اور اسی میں واپس کردیں گے اور پھر تمہیں اس خاک سے نکالیں گے۔

الم نخلقکم من ماء مھین (مرسلات - ۲۰)

کیا ہم نے تمہیں معمولی پانی سے خلق نہیں کیا؟

انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج نبتلیہ فجعلناہ سمیعا بصیراً۔ (انسان - ۲)

بے شک ہم نے انسان کو مرد و زن کے مخلوط نطفہ سے خلق کیا اور پھر اسے سمیع و بصیر بنایا۔

شہید ڈاکٹر بہشتی

مالکیت

اسلامی نقطۂ نظر سے

حیازت کیا ہے ؟

انسان کی مورد احتیاج کچھ مصرفی اقدار، کائنات میں پہلے سے تیار شدہ موجود ہیں، اسے قابل صرف بنانے کے لیے مزید محنت کی ضرورت نہیں۔

بطور مثال: شہر قم کے گرد و نواح میں قدرتی طور پر تیار شدہ نمک موجود ہے، ضرورت کے مطابق وہاں سے نمک حاصل کیا جا سکتا ہے یا جنگلوں میں انسان کے کھانے کے قابل جنگلی پھلوں کی بہتات ہے، یا چشموں اور ندیوں کا پانی کہ اس میں پہلے ہی سے قدر مصرف موجود ہے۔

ان مصرفی اقدار سے انسان کا کیا تعلق ہے ؟

مثال: زید و عمرو غذا کی جستجو میں جنگل جاتے ہیں، انھیں درخت سیب نظر آتا ہے جس کے پھل زمین پر گرے ہوئے ہیں، اگر زید آگے بڑھ کر ان پھلوں کو چن لے اور اپنے قبضہ میں لے لے تو کیا عمرو کو یہ حق ہے کہ زید سے پھلوں کو چھین لے؟ جبکہ کچھ فاصلہ پر ایک دوسرا درخت بھی موجود ہے جس کے پھل سے وہ اپنی ضرورت کو پوری کر سکتا ہے۔

ہماری گفتگو کی روش، تقاضائے فطرت ہے، کیا فطرت انسان، زید کے چنے ہوئے سیب میں عمرو کو حصہ دار سمجھتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سیب اور زید کے درمیان کس قسم کا رابطہ ایجاد ہوا ہے؟ عمرو کے حصہ دار نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟ کیا زید نے کوئی پیداواری عمل انجام دیا ہے؟ کوئی نئی قدر مصرف ایجاد کی ہے؟ یقیناً زید نے ان سیبوں کو چن کر کوئی پیداواری عمل انجام نہیں دیا ہے بلکہ اس نے

قدرت کے خزانۂ عامرہ سے اپنی ضرورت کے مطابق کچھ پھل چن لیے ہیں، فقہی اصطلاح میں اس عمل کو "حیازت" کہا جاتا ہے۔

حیازت اور مالکیت

کیا انسان، کائنات میں پہلے سے موجود معرفی اقدار کے تصرف سے اس کا مالک بن جائیگا؟ وضاحت کے لیے اس مثال پر غور کیجیے۔

اگر چند افراد مل کر ایک پیٹی پھل خریدیں تو سب بطور مشاع اس کے مالک ہوں گے، جب پھل کی تقسیم ہو جائے اور تمام حصہ داروں کو اپنا اپنا حصہ مل جائے اس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زیدؓ اپنا حصہ لینے کے بعد اس کا مالک سمجھا جائے گا یا پیسہ ادا کرنے اور خریدنے کے بعد سے ہی مالک تصور کیا جائے گا؟

زید حصہ لینے سے پہلے بھی بطور مشاع اس کا مالک تھا، عمل تصرف، صرف اس کی مشاع شکل کو معین و مشخص شکل میں تبدیل کرتا ہے۔

اب رہا سوال کہ حیازت، سبب مالکیت ہے یا حیازت سے پہلے بھی انسان اس چیز کا مالک تھا؟ کیا حیازت سے پہلے انسان اور کائنات میں موجود اشیاء کے درمیان کوئی رابطہ نہیں؟ کیا حیازت سے پہلے کائنات میں موجود اشیاء اور انسان کے درمیان مشاعی مالکیت کا رابطہ نہیں ہے؟

کچھ لوگ اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ چونکہ انسان اپنی بقاء کے لیے کائنات میں موجود قدرتی اشیاء کا محتاج ہے لہٰذا صحیح الفکر انسان اس احتیاج کے باعث تمام انسانوں کو پوری کائنات کا مالک تصور کرتا ہے، ہر انسان بطور مشاع اس کائنات میں حصہ دار ہے اور عمل حیازت اس کے حصہ کو معین کر دیتا ہے۔ لہٰذا اگر کائنات میں اشیاء کی فراوانی ہو اور دوسروں کے لیے بھی اپنی احتیاجات کا پورا کرنا ممکن ہو اور زید اپنی ضرورت کے مطابق تصرف کرے تو فطرت انسان اس عمل کی تائید کرتی ہے۔

اگر اشیاء کی فراوانی نہ ہو، لوگوں کو قلت کا سامنا ہو اور زید بھی صرف بقدر ضرورت

تصرف کرے، جب عمرو یہ دیکھتا ہے کہ زید کے پاس موجود سیب کے سوا کچھ بھی نہیں تو شاید عمرو کو زید سے اپنے حصہ کے مطالبہ میں حق بجانب قرار دیا جائے۔ ہماری انسانی فطرت عمرو کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کیا یہ اس بات کی علامت نہیں ہے کہ اس فطری نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ زید، عمرو، بکر، خالد وغیرہ، سب کے سب اس کائنات میں شریک و حصہ دار ہیں۔ لہٰذا دوسرے شرکاء کے حصہ کو مدنظر رکھنا ضروری ہے[۲]۔

لیکن پھل کی مشترکہ خریداری کی مثال میں اگرچہ ممکن ہے کہ ہر شخص کو دو عدد سیب سے زیادہ نہ ملیں اور یہ مقدار ان کے کنبہ کی ضروریات کیلئے ناکافی ہو، لیکن تقسیم کے موقعہ پر کسی شخص کو اپنے حصہ سے زیادہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔

بنابریں فطری تقاضوں کے مطابق حیازت، سبب مالکیت ضرور ہے مگر مشروط و محدود۔

لہٰذا یہ نظریہ کہ کائنات میں موجود قدرتی مواد کی جانب انسانوں کی حاجت، کائنات میں موجود عمومی ثروت و انفال کی نسبت انسانوں کی عمومی مالکیت کے اعتبار کا سبب ہے اور ہر انسان اپنی ضرورت اور اشیاء کی کمی و فراوانی کے مطابق اس عمومی مالکیت میں حصہ دار ہے۔ کچھ غلط نظریہ نہیں ہے۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی نصوص میں اس مسئلہ کی جانب اشارے ملتے ہیں یا نہیں[۳]۔

ایک روایت ہے جو پیغمبر اکرمؐ سے عامہ و خاصہ نے نقل کی ہے اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ امام موسیٰ کاظمؑ سے بھی منقول ہوئی ہے:

"الناس شرکاء فی ثلاثۃ: النار والماء والکلا"

عوام تین چیزوں میں شریک ہیں، آگ (یعنی ایندھن اور جن چیزوں سے آگ جلائی جاسکے) پانی اور چراگاہ (یعنی سرسبز گھاس اور سبزیجات جو انسان یا حیوان کے لیے مفید ہو۔)

امام موسیٰ کاظمؑ سے جو روایت منقول ہے اسمیں ہے کہ:

ان المسلمین شرکاء فی الماء والنار والکلا [۴]

مسلمین پانی، ایندھن اور چراگاہ میں شریک ہیں۔

لہٰذا اگر روس کے اساسی آئین کے باب اقتصاد میں یہ کہا گیا ہے کہ:

"پانی، معادن، جنگلات، چراگاہیں وغیرہ عام مال ہیں اور ان کی مالکیت عمومی ہے" یہ مارکسزم کی ایجاد نہیں، اسی آئین میں کہا گیا ہے ان چیزوں کی مالکیت "عمومی" و "حکومتی" ہے۔ آئیے دیکھیں

اس سلسلہ میں ہماری اسلامی روایات کیا کہتی ہیں:

عن ابی بصیر عن ابی جعفرؑ: قال لنا الانفال۔ قلت وما الانفال قال منها المعادن والآجام وکل ارض لا رب لها وکل ارض باد اهلها فهو لنا۔ (۶)

دوسری روایتوں میں ہے: "او بطون الاودیۃ" اور "یا رؤس الجبال و بطون الاودیۃ والآجام ۔ (۸)"

معادن، نیستان، جنگلات، بیشے، بلا مالک زمینیں، وہ زمینیں جسے اس کے مالکوں نے ترک کر دیا ہو، پہاڑ کی چوٹیاں اور وادیاں امام کی ملکیت ہیں (یعنی قوم وحکومت کی ملکیت ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی ملکیت عام اور عوام اس میں شریک وحصہ دار ہیں۔ حتی وہ معدنی مواد جو قدرتی طور پر تیار شدہ موجود ہیں۔ اور ہماری فقہی اصطلاح میں انھیں "معادن ظاہرہ" کہا جاتا ہے ان کے بارے میں بھی فقہا کے فتوے موجود ہیں:

فی المعادن الظاهرة وهی التی لا تفتقر الی اظهاره کالملح والنفط والقار لا تملك بالاحیاء ولا یختص بها المحجر وفی جواز اقطاع السلطان المعادن والمیاه تردد وکذا فی اختصاص المقطع بها ومن سبق الیها فله اخذ حاجته (۹)

بحث ظاہر معادن اور ان چیزوں کے بارے میں ہے جن کے حصول کے لیے مزید محنت ومشقت کی ضرورت نہیں، جیسے نمک، تیل اور ڈامر، یہ معادن عمل کے ذریعہ قابل ملکیت نہیں ہیں، کیونکہ یہ قابل احیا نہیں ہے اور انسان "تحجیر" کے ذریعہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کان اس کی ملکیت ہے، کیونکہ حق تحجیر مقدمہ احیاء کے طور پر اولویت ایجاد کرتا ہے، لیکن جس جگہ احیاء ممکن نہ ہو وہاں تحجیر بھی بے فائدہ ہے۔

کیا حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ ان چیزوں کو کسی شخص کے سپرد کر دے؟ اس مسئلہ میں شک ہے اور اگر حکومت کو یہ حق حاصل ہو اور وہ سپرد کر بھی دے تو کیا وہ چیز اس شخص کی ملکیت ہو جائے گی؟ یہ بھی محل تردید ہے۔

مذکورہ فتوی میں ہے کہ ہر شخص بقدر ضرورت معادن سے استفادہ کر سکتا ہے، "بقدر ضرورت" سے کیا مراد ہے؟ چونکہ ضرورت سے زیادہ استفادہ کا داعی نہیں ہے؟ یا یہ کہ اگر داعی موجود ہو پھر بھی اسے ضرورت سے زیادہ استفادہ کا حق نہیں ہے؟

بہر کیف حیازت سبب مالکیت ہے اور اس کی فقہی دلیل یہ ہے کہ تمام فقہی متنوں میں اس مسئلہ پر فقہا کا اتفاق ہے۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام کی حدیث ہے کہ:

من سبق الی مالم یسبق الیہ مسلم فھولہ

اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کو حاصل کرلے جسے اس سے پہلے کسی مسلمان نے تصرف نہ کیا ہو تو وہ اس کی ملکیت ہے۔

بنابریں حیازت سبب مالکیت ہے جسے فطرت بھی تسلیم کرتی ہے اور دین فطرت بھی اس کی تعلیم دیتا ہے۔

خدمات

مالکیت کا تیسرا سبب خدمات ہے، کچھ ایسے کام ہیں جنھیں پیداواری کام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اصطلاحاً پیداواری کام ان کاموں کو کہا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں مادہ میں مفید تبدیلی واقع ہو۔

مثلاً:۔ جب آپ لوہے کے ایک ٹکڑے سے کیل، آری، گھوڑے کے نعل، نٹ بولٹ وغیرہ بناتے ہیں، یا سنگ آہن کو بھٹی میں پگھلا کر لوہا بناتے ہیں تو یہ عمل پیداواری عمل ہے۔

لیکن کچھ ایسے کام ہیں جو عینیت خارجی کی ایجاد کے باعث نہیں بنتے لیکن اس کام کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے۔

مثلاً: جب ڈاکٹر آپ کا علاج کرتا ہے، کمپوڈر انجکشن لگاتا ہے، مرہم پٹی کرتا ہے، اس عمل کو کیا کہا جائے گا۔؟

جب انسان اپنے کام کو پیش کرتا ہے اور ہماری کسی ضرورت کو پورا کرتا ہے تو اس قسم کے کاموں کو خدمات کہا جاتا ہے۔

خدمات اور مالکیت

انسان اپنے کام کا مالک ہے۔ اگر اس کے کام کے نتیجہ میں جسم خارجی ایک نئی حالت اور

شی قدر معرف کے ساتھ وجود میں آئے تو وہ اس جسم خارجی کا بھی مالک ہوگا۔ جملہ پیداواری کاموں کی یہی کیفیت ہے۔

لیکن اگر انسان کے کام اور محنت کے نتیجہ میں کوئی مادی جسم وجود میں نہ آئے اس کا ماحصل غیر مادی ہو تو ایسی صورت میں انسان کس چیز کا مالک ہوگا؟

ڈاکٹر مریض کا علاج اور اس میں صحت و تندرستی ایجاد کرتا ہے، کیا ڈاکٹر اس کی صحت و تندرستی کا مالک ہو سکتا ہے؟ جس طرح سے درزی آپ کے کپڑے کو سی کر اس میں حصہ دار بن جاتا تھا کیا ڈاکٹر بھی اسی طرح آپ کے فرزند کا علاج کر کے اس کی صحت و تندرستی میں شریک اور اپنے حصہ کا مطالبہ کر سکتا ہے؟

استاد اپنے شاگردوں کو زیور علم سے آراستہ کرتا ہے، کیا وہ شاگردوں کی معلومات کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے[11]؟

چنانچہ خدماتی کاموں میں پیداواری کاموں کی طرح انسان اپنی محنت کے ماحصل کے طور پر کسی جسم خارجی کا مالک نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے خدمات، سبب مالکیت ہیں، چونکہ انسان اپنے کام کا مالک ہے لہذا وہ اپنے کام کے تبادلہ کے طور پر قابل تملک جسم خارجی حاصل کر سکتا ہے۔ اسے فطرت بھی تسلیم کرتی ہے اور دین بھی، نیز فقہی نقطہ نظر سے بھی خدمات سبب اعتبار مالکیت ہے۔

گذشتہ مباحث کی روشنی میں تین قسم کے کام سبب مالکیت ہو سکتے ہیں:

۱۔ پیداواری کام۔
۲۔ حیازتی کام۔
۳۔ خدماتی کام۔

دیگر اسباب

جن تین اسباب کا ذکر ہوا ہے وہ "ابتدائی" مالکیت کے اسباب ہیں لیکن ان کے علاوہ تین اسباب ہیں جو "انتقالی" مالکیت کے باعث ہوتے ہیں۔

تبادلہ

ایک قدر معرف کے بدلے میں دوسری قدر معرف کے حصول کو تبادلہ کہا جاتا ہے۔ انسان ایک قدر معرف دے کر دوسری قدر معرف حاصل کرتا ہے، اس طرح مالکیت کا ایک نیا سبب ایجاد ہوتا ہے۔

آپ ایک چیز کے مالک ہیں، دوسرا انسان کسی اور چیز کا مالک ہے جس کی آپ کو ضرورت ہے اور آپ اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ فطرت انسان آپ کو تبادلہ کی اجازت دیتی ہے، یعنی جو چیز آپ کے پاس موجود ہے اور دوسرے انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ اس کے بدلے میں آپ اس شخص سے اس چیز کو حاصل کر سکتے ہیں جس کی آپ کو ضرورت ہے۔ اس طرح آپ اس کی چیز کے مالک ہو جائیں گے اور وہ آپ کی چیز کا مالک ہو جائیگا۔

مثلاً آپ کے پاس چار روٹیاں ہیں مگر پنیر نہیں۔ آپ کے دوست کے پاس پنیر ہے روٹیاں نہیں، آپ روٹی دے کر پنیر اور وہ پنیر کے بدلے روٹی حاصل کرتا ہے۔ تبادلہ سے پہلے آپ روٹی کے مالک تھے اور وہ پنیر کا لیکن تبادلہ کے بعد مالکیت میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ آپ پنیر کے مالک ہو جائیں گے اور وہ روٹی کا۔ خواہ روٹی اور پنیر کی ابتدائی مالکیت کا سبب کچھ بھی رہا ہو، پیداواری کام ہو یا حیازتی و خدماتی، کیونکہ طرفین بہرحال تبادلہ ہونے والی چیز کے مالک ہیں۔

البتہ تبادلہ دوسرے درجے سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب تک آپ گذشتہ تین طریقوں سے کسی چیز کے مالک نہ ہوں کسی دوسری چیز کے مالک نہیں بن سکتے۔ بعض اوقات تبادلہ میں ایک طرف خدماتی کام ہوتا ہے اور دوسری طرف پیداواری کام، ایک شخص اپنے پیداواری کام کا مالک ہوتا ہے اور دوسرا شخص خدماتی کام کا۔

مثلاً گذشتہ زمانے میں ڈاکٹر دیہاتوں میں جا کر علاج و معالجہ کرتے اور اس کے بدلے میں غلہ اور مویشی وغیرہ حاصل کرتے تھے اور کبھی انسان خدمت کا تبادلہ خدمت سے کرتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر کسی آرٹسٹ کا علاج اس شرط پر کرتا ہے کہ وہ اس کے مطب میں پینٹنگ کرے یہ خدمت کا خدمت سے تبادلہ ہے۔

ترقی یافتہ انسان ، اقتصادی میدان میں اپنی تمام ضروریات کو براہ راست خود پورا نہیں کرسکتا ،لہذا وہ اپنی اور اپنے کنبے کی ضرورت سے زیادہ ایک یا دو قدر معرف کو ایجاد کرتا ہے یا حیازت کے ذریعہ حاصل کرتا ہے یا اپنے خدماتی کام کو پیش کرتا ہے اور اس کے بدلے میں دوسری قسم کی معرفی اقدار کو حاصل کرتا ہے جن کی اسے ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے لوگ انہیں پیش کرتے ہیں۔[۱۲]

تبادلے کے سلسلہ میں دو نکتوں کی یاد دہانی ضروری ہے :

۱۔ تبادلہ ظلم و استحصال کا باعث ہوسکتا ہے ،مثلاً ممکن ہے کہ کوئی شخص آسان حیازت کے ذریعہ کافی مقدار میں معرفی اقدار کو ذخیرہ کرلے اور دوسروں کو سخت اور کٹھن خدمات پر مجبور کرے اور اس سخت کام کے بدلے میں آسان حیازت کے ذریعہ اکٹھا کی ہوئی دولت کا ایک حصہ بطور مزدوری ادا کرے۔[۱۳]

۲۔ تبادلہ کا عمل کبھی اپنے اسی فطری انداز میں انجام پاتا ہے جیسا کہ انسان کی ابتدائی سادی زندگی کے دوران تھا یعنی مثلاً ایک دیہاتی کے پاس انڈے ہیں لیکن اسے گوشت کی ضرورت ہے ، وہ پڑوسی کو انڈے دے کر اس سے گوشت لے لیتا ہے ،ایسی صورت میں تبادلہ زندگی کا ایک عام اور فطری معمول ہے ،لیکن یہی تبادلہ انسان کے ترقی یافتہ اقتصادی مراحل اور وسیع تر زندگی میں ایک پیشے کی شکل اختیار کرچکا ہے۔

مال سے مال کے تبادلے کے دور میں پھیری لگانے والے سوداگروں کا کام یہ تھا کہ وہ شہر سے مال خرید کر دیہات میں فروخت کرتے تھے اور دیہات سے لاکر شہر میں بیچتے تھے ۔ یہ تبادلہ ان سوداگروں کا پیشہ تھا، اور اس خدمت کے بدلے میں کچھ اجرت اور حق الزحمہ طلب کرتے تھے۔

مثلاً؛ دیہات میں دو میٹر کپڑا دے کر ۲۰ انڈے وصول کرتے تھے اور شہر میں یہی بیس انڈے بزاز کو دے کر اس سے سوا دو میٹر کپڑا لیتے تھے ۔ یہ پاؤ میٹر کپڑا اس کی خدماتی محنت کا بدلہ ہوتا تھا، دوبارہ سوا دو میٹر کپڑا ۲۵ انڈوں کے عوض فروخت کرتا اور یہ ۵ انڈے اس کے کنبے کی خوراک بن جاتے اور اس طرح اس کی زندگی کا نظام چلتا رہتا۔

بنابریں تبادلہ ایک مرحلہ میں پیشہ بن جاتا ہے البتہ اس وقت تبادلہ ، خدمات کا ایک شعبہ قرار پائے گا ۔اس قسم کے تبادلہ میں ظلم و استحصال کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔

مثلاً ایک دوکاندار روزانہ ۸ گھنٹے محنت کرتا ہے اور تقریبا ۸۵ روپیہ آمدنی ہوتی ہے لیکن ممکن ہے یہی شخص رات کے وقت ۳۰۰۰ روپیے منافع حاصل کرلے، یہ ظلم و ناانصافی ہے، اور اسی چیز نے قیمتوں کے مسئلہ کو جنم دیا ہے جو اقتصاد کا اہم مسئلہ ہے۔

تجارت

تجارتی تبادلہ ایک طرح کا خدماتی عمل ہے اور تاجر اپنے خدمات کے بدلے میں اجرت وصول کرتا ہے، اس طرح تاجر بھی ایک قسم کا مزدور ہے[۱۴]۔

البتہ تاجر کے منافع اور اجرت کی مقدار کے سلسلہ میں غور و فکر سے کام لیا جائے تاکہ اس کا منافع منصفانہ ہو اور سرمایہ داری نظام کے مانند ظالمانہ منافع حاصل نہ کرسکے کہ ایک دستخط ایک ٹیلی فون یا ٹیلکس کے ذریعہ لاکھوں ڈالر منافع کما لیا جاتا ہے۔ آج کے دور میں غالبا ایک ملک سے دوسرے ملک کو اشیاء برآمد کی جاتی ہیں، کمرشل ایڈمنسٹریٹر کا اپنے کام میں ماہر اور باخبر ہونا ضروری ہے، لیکن وہ اپنی اس مہارت کے بدلے میں عوام کا خون چوسنے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ وہ صرف ایک معقول تنخواہ کا مستحق ہے اور یہ تنخواہ بھی اس شخص کے لئے ہے جس کا وجود موثر ہو، لیکن اگر کسی شخص کا وجود بے اثر ہو، اس کا ہونا یا نہ ہونا تجارت کے لئے برابر ہو تو وہ کسی قسم کی اجرت و تنخواہ کا بھی حقدار نہ ہوگا۔

ہبہ

انتقال مالکیت کا دوسرا سبب ھبہ ہے تبادلہ اور ہبہ میں فرق یہ ہے کہ تبادلہ میں طرفین ایک چیز دے کر دوسری چیز حاصل کرتے ہیں لیکن ھبہ میں ایسا نہیں ہے۔ صرف ایک شخص دیتا ہے اور دوسرا شخص لیتا ہے۔ آپ کسی چیز کے مالک ہیں، اپنی ملکیت دوسرے شخص کو بخش دیتے ہیں آپ کی بخشش سے وہ اس کا مالک ہوجاتا ہے لیکن اس بخشش کے بدلے میں خود آپ کو کچھ نہیں ملتا۔

جس طرح انسان اپنی کمائی ہوئی روزی کو خود مصرف کرسکتا ہے اسی طرح فطرت انسانی

اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ وہ اپنی ملک کو جسے چاہے بخش دے۔ اس صورت میں مالکیت، ہبہ و بخشش کے ذریعہ منتقل ہو جائے گی۔

قدرتی انتقال مالکیت:

بعض اوقات قدرتی طور پر مالکیت منتقل ہو جاتی ہے جیسے میراث وغیرہ۔ پیداواری کام کے باب میں کہا جا چکا ہے کہ انسان جس قدر مصرفی اقدار پیدا کرے وہ اس کا مالک قرار پائے گا یہاں مالکیت کی کوئی حد معین نہیں۔ مگر یہ کہ پیداوار کے لیے خام مواد محدود ہو کہ اس وقت قدرتی طور پر مالکیت بھی محدود ہو جائے گی۔ حیازتی کاموں میں بھی کہا جا چکا ہے کہ انسان اپنی اور اپنے کنبہ کی ضرورت بھر خزانۂ قدرت سے استفادہ کر سکتا ہے۔

ماں باپ یا اولاد جب پیداواری، حیازتی یا خدماتی کام انجام دیتے ہیں تو ان کا مقصد صرف اپنے ضروریات کو پورا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ بال بچوں، ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی بھائی بہن اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کی ضروریات بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ گویا فطری طور پر پیداواری، خدماتی اور حیازتی کام کے لیے انسان کا مادی محرک اپنے اور اپنے قرابت داروں کی ضروریات کو پورا کرنا اور انھیں نفع پہنچانا ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص پیداوار حیازت، خدمات، تبادلہ یا ہبہ و تحفے کے ذریعہ کسی چیز کا مالک اور اس کو مصرف کرنے سے پہلے ہی فوت ہو جائے تو انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی چھوڑی ہوئی چیزوں کے مالک وہی لوگ ہوں گے جنھیں فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی زندگی میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کی ملکیت اب ان ہی قرابتداروں کی ملکیت قرار پائے گی۔ یہ انسان کا فطری تقاضا ہے۔[۱۵]

اس قسم کی مالکیت کو انتقالی مالکیت کہا جاتا ہے، یعنی پہلے مورث کسی چیز کا مالک تھا اب اس کے انتقال کے بعد یہ ملکیت بطور میراث اس کے وارثوں کی جانب منتقل ہو جائے گی۔[۱۶]

اقتصادیات میں میراث کے علاوہ بھی کچھ مقامات ہیں جہاں مالکیت کے نقل و انتقال کا عمل قدرتی اور غیر اختیاری طور پر انجام پاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ ۵۰ من گیہوں کے مالک ہوں اور آپ کا پڑوسی ۲۵ من گیہوں کا، اگر دونوں کے حصہ کو آپس میں ملا دیا جائے تو اس

۵ من گیہوں کے ایک تہائی حصہ کا مالک آپ کا پڑوسی ہے، اور دو تہائی کے مالک آپ ہیں، لیکن جب تک اپنے اپنے حصہ کو الگ نہ کریں۔ آپ دونوں، گیہوں کے ہر ہر دانہ کے ایک تہائی اور دو تہائی کے مالک ہوں گے، اسلامی فقہ کی نظر سے اس مقام پر ایک قسم کا قہری نقل و انتقال انجام پایا ہے۔

مذکورہ توضیحات کی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ مالکیت کا سرچشمہ و بنیاد کام اور محنت ہے تو یہ قول مطابق اسلام ہوگا۔

حاشیے

(۱) زید بھی اس گروپ کا ایک فرد ہے جس نے مشترکہ طور پر پھل خریدا ہے۔ ۲۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کی ضرورت ہے:

ایک دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ زید قلت و کمی کے باوجود ان چند سیبوں کا مالک ہے لیکن جب عمرو، خالد اور بکر کو ضرورت ہو تو زید پر واجب ہے کہ وہ ان لوگوں کی ضرورت کو پورا کرے یعنی حیازت قلت و کمی کے باوجود سبب مالکیت ہے۔ لیکن مالک پر واجب ہے کہ ایسے حالات میں اپنے مال سے دوسروں کی ضرورت پورا کرے۔ لیکن ایک دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ قلت و کمی کی صورت میں زید ایک سیب سے زیادہ کا مالک نہ ہوگا۔ بلکہ ممکن ہے کہ ایسی صورت میں اصلا زید مالک ہی نہ ہو۔ لیکن کم از کم وہ تمام سیبوں کا مالک نہیں ہوسکتا اور قلت و کمی کے وقت فطرت انسانی تمام سیبوں کی مالکیت تسلیم نہیں کرتی۔

۳۔ اگر ہم نص کا دعویٰ نہ کریں تو کم از کم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلہ میں کچھ اشارے موجود ہیں۔

۴۔ تہذیب شیخ طوسی جلد ۷: احمد بن محمد عن محمد بن سنان عن ابی الحسن ع: ان المسلمین شرکاء فی الماء والنار والکلا۔

۵۔ ابو بصیر، معنی انفال کے سلسلہ میں امام جعفر صادق ؑ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ؑ نے فرمایا: معادن، بیشے، افتادہ بے مالک زمینیں اور وہ زمینیں جنھیں ان کے مالکوں نے ترک کر دیا ہو جزء انفال ہیں۔

۶۔ وسائل الشیعہ۔ جلد ۴۔ ص ۲۷۳ ۸۔ وسائل الشیعہ جلد ۴ ص ۲۶۵

۷۔ " " " ص ۲۶۴ ۹۔ شرائع الاسلام ج ۳۔ کتاب احیاء الموات ص ۲۷۸

۱۰۔ تحجیر ایک فقہی اصطلاح ہے، بنجر زمینوں کی آبادکاری کے لیے، مقصود نظر زمین کو پتھروں سے محصور و معین کیا جاتا ہے تاکہ دوسرا شخص اس کو آباد نہ کرسکے۔ اسے تحجیر کہا جاتا ہے۔

۱۱۔ تعلیم و تدریس جیسے کاموں کے بارے میں ایک بحث یہ ہے کہ یہ پیداواری کام ہیں یا غیر پیداواری؟ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ ان کاموں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات تعلیم و تدریس کا مقصد صرف سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ علم برائے علم۔ کچھ ایسے افراد ہیں جو زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطالعے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تشنہ علم ہیں، اس قسم کی تعلیم و تدریس یقیناً خدماتی اور غیر پیداواری ہے۔ لیکن اگر تعلیم و تدریس کا مقصد پیداوار ہے، جیسے کہ کارخانوں میں معمولی مزدور کو ماہر بنانے کے لئے کلاسیں قائم کی جاتی ہیں کہ اس کا مقصد پیداوار میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ لہذا یہ تعلیم بھی پیداواری تعلیم ہے۔ لہذا اگر اس قسم کی تعلیمات کو بالواسطہ پیداواری کام کہا جائے

تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ کیونکہ پیداواری کام ہر اس عمل سے عبارت ہے جو براہ راست یا بالواسطہ انسان کی موردِ احتیاج اشیاء کو ایجاد کرے۔

قدر مسلّم یہ ہے کہ کچھ ایسے کام ہیں جن کا ماحصل مادی جسم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے مفید کام بھی ہیں جن کا ماحصل مادی جسم نہیں ہوتا۔ اس سے استفادہ کے بعد خارج میں کوئی چیز باقی نہیں رہتی جسے اس کام کا ماحصل کہا جا سکے۔ اس طرح کے کاموں کو خدمات کہا جاتا ہے۔

۱۲۔ یہاں پر "قدر تبادلہ" کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، ہم ابھی تک قدر مصرف کا ذکر کر رہے تھے، لیکن انسان کی اقتصادی زندگی میں "تبادلہ" شروع ہونے کے بعد، قدر مبادلہ کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ قدر تبادلہ، اس نسبت سے عبارت ہے جو تبادلہ ہونے والی دو قدر مصرف کے مابین پائی جاتی ہے، اور مختلف معاشروں میں یہ نسبت اتنی زیادہ پیچیدہ ہے کہ اس کے لئے کافی مفصّل بحث و گفتگو کی ضرورت ہے۔ یہی نسبت ہے جو منصفانہ بھی ہو سکتی ہے اور ظالمانہ بھی، یہ خود ایک مفصل بحث ہے کہ اس نسبت کو کس معیار سے تعیّن کیا جائے تا کہ نسبت منصفانہ ہو، کیا عمل تبادلہ میں مصرف ہونے والی انرجی کے جبران کے لیے مزدوری کام کی مقدار کو معیار بنایا جائے یا اوقات کار کو اور خود اوقات کار پیداواری آلات کو مدنظر رکھتے ہوئے معیار ہیں؟ یا اوقات کار پیداواری آلات اور کیفیت و مرغوبیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے معیار ہے؟ اقتصادی محاسبات، علم اقتصاد کی پیچیدگیوں اور بہت سے اقتصادی فلسفوں کی بنیاد یہی قدر تبادلہ اور نرخ تبادلہ۔

۱۳۔ اس نکتہ پر توجہ ضروری ہے کہ اگر یہی قدر مصرف جو اس شخص نے ذخیرہ کر رکھی ہے۔ کائنات میں وافر مقدار میں موجود ہو اور ہر شخص آسانی کے ساتھ اسے حاصل کر سکتا ہو تو پھر کوئی شخص یہ طاقت فرسا خدمات کے لیے آمادہ نہ ہوگا، بلکہ اس کے بجائے وہ خود ہی خزانہ قدرت سے استفادہ کی کوشش کرے گا اور دوسرے کے اوامر و نواہی سے آسودہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ قدر مصرف جسے اس شخص نے ذخیرہ کر رکھا ہے، کمیاب ہو تو پھر اس شخص کو ذخیرہ اندوزی کا حق نہیں ہے۔

۱۴۔ سماجی نظام میں مزدور کے معنی بہت وسیع ہیں، دوکاندار بھی ایک طرح کا مزدور اور تجارت ایک طرح کا کام ہے، کام صرف جسمانی کاموں پر منحصر نہیں ہے، بلکہ فکری و ذہنی عمل بھی کام ہے۔ انتظامی امور یا حسابداری میں انسان اپنی ذہانت اور معاشی معلومات سے کام لیتا ہے، یہ بھی ایک طرح کے مزدور ہیں، کیونکہ اگر یہ ڈائریکٹر اور منتظم اپنی ذہانت سے کام نہ لیں اسے اقتصادی معلومات حاصل نہ ہوں تو تجارت میں منافع کے بجائے نقصان ہوگا۔ لیکن بحث یہ ہے کہ ان کے عمل کی قیمت کیا ہے۔ ان کی اجرت کس طرح معیّن کی جائے کہ ظلم و ناانصافی کے لئے میدان ہموار نہ ہو سکے۔

۱۵۔ حتی روس کے آئین میں بھی مکان اور ضروریات زندگی کی مالکیت کے ہمراہ میراث کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے، چین میں بھی ایسا ہی ہے۔

۱۶۔ یہاں خود میراث کی بحث درپیش ہے۔ کروڑوں اور اربوں کی میراث ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔ یہ دولت و ثروت اس کی زندگی میں بھی قابل اعتراض تھی اور مرنے کے بعد بھی۔

شہید مرتضٰی مطہری

ترجمہ: جناب خادم حسین ایم۔ اے

قرآن اور حیات

گذشتہ مقالے میں ہم نے روح اور حیات کے بارے میں ایک فلسفیانہ بحث پیش کی تھی، جس کا مرکزی نکتۂ بحث یہ تھا کہ آیا مادّے میں موجود تمام خصوصیات کی طرح روح اور حیات بھی مادّے ہی کا نتیجہ ہے؟ یا مادّہ بذاتِ خود حیات اور اس کے آثار سے عاری ہے اور صرف حیات ہی ایک ایسی حقیقت ہے جو خاص قسم کے آثار و خواص رکھتی ہے اور جب تک مادّے سے اس کا تعلق قائم نہ ہو اس وقت تک وہ تمام آثار جنھیں ہم حیاتی آثار کے نام سے جانتے ہیں ظاہر نہیں ہوتے؟

ایک فلسفیانہ بحث تھی اور فلسفہ ہی کی نظر سے اسے پیش کیا گیا تھا۔ فی الحال حیات کے بارے میں ایک قرآنی مطالعہ کر کے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن مجید کی نظر حکمت حیات کے بارے میں کیا ہے اور خاص طور پر یہ معلوم کرنا ہے کہ حیات کا فوق فطرت اور خداوندی ارادے کے ساتھ تعلق کے بارے میں انداز و معنا ئے بیان کیا ہے؟

زندگی اور حیات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار مختلف مقامات پر ہوا ہے۔ بہت سی آیتوں میں، موجودات کے زندہ ہونے، جان داروں کی سلسلے وار پیدائش، حیات کے تغیرات، نظام خلقت، فہم، شعور، ادراک، بینائی، شنوائی، ہدایت، الہام، فطرت اور اسی طرح کے دوسرے حیاتی آثار کو "آیت" اور حکمت و تقدیر الٰہی کی نشانی سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک عمدہ موضوع ہے مگر فی الحال اس کے متعلق کچھ بیان کرنے کا وقت نہیں۔

حیات سے متعلق مسائل جو قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ ہے

"حیات خدا کے ہاتھ ہے"۔ خدا ہی جان بخشتا ہے اور وہی جان لیتا ہے۔ قرآن مجید اپنے خاص انداز میں سمجھاتا ہے کہ خدا کے سوا حیات کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں دوسرا نہ جان بخش سکتا ہے اور نہ جان لے سکتا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر ہم بحث کریں گے۔

سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے ظالم و جابر فرد کو مخاطب قرار دیتے ہوئے فرمایا: "رَبِّی الَّذِی یُحْیِی وَیُمِیتُ" میرا خدا ہی جان بخشتا اور لیتا ہے، جان کا بخشنا اور لینا اسی کے ہاتھ ہے۔ سورۂ ملک میں اللہ عزاسمہ کی توصیف ہے: "اَلَّذِی خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ" وہ خدا جس نے زندگی اور موت کو خلق کیا ہے۔ ایسی متعدد آیتیں ہیں جو محض خدا کو زندہ اور مردہ کرنے والا بتاتی ہیں اور جان بخشنے اور جان لینے کو خدا کے قبضۂ قدرت میں بتاتی ہیں۔ یعنی خدا کے ماسوا کو اس عمل کے دائرے سے خارج کرتی ہیں۔ ایسی آیتیں بھی ہیں جو مردوں کو زندہ کرنے کے واقعات کو پیغمبروں سے اس قید و شرط کے ساتھ منسوب کرتی ہیں کہ یہ عمل خدا کے حکم سے ہوا تھا (سورۂ آل عمران - آیت ۴۸)

ورسولا الی بنی اسرائیل انی قد جئتکم بآیۃ من ربکم انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیراً باذن اللّٰہ وابرء الاکمہ والابرص واحی الموتی باذن اللّٰہ۔"
(سورۂ آل عمران - آیت ۴۸)

اور بنی اسرائیل کی طرف رسول (بنا کر بھیجے گا اور وہ یہ کہے گا) کہ میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لیے گندھی مٹی سے پرندے کی سی صورت پیدا کروں گا پھر اس میں پھونک ماروں گا پھر وہ حکم خدا سے پرندہ بن جائے گا اور میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کروں گا اور میں حکم خدا سے مردوں کو زندہ کروں گا۔

مجموعی اعتبار سے عارف باللہ اور مادہ پرست اشخاص کے درمیان اسی مسئلہ پر اختلاف ہے، کہ عارف باللہ اشخاص حیات کے مبدا و منشا اور حیات کے پیدا کرنے والے کو مافوق

سے خارج اور مادہ پرست خود مادّے کو خالق حیات مانتے ہیں۔

"حیات کا پیدا کرنے والا خدا کے سوا اور کوئی نہیں" اس مسئلے پر قرآن مجید کے لہجے اور عارف باللہ کی منطق کے درمیان جزئی اختلاف ہونے کے باوجود ایک بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن معجزہ اور حیرت انگیز کتاب آسمانی ہے۔ اور ہمارے خیال میں اگر عارفین خدا اس منطق سے آشنا ہو جائیں تو ہمیشہ کے لیے مادہ پرست افراد کی نکتہ چینی سے بھی محفوظ رہیں اور خود ان معذور (مادہ پرستوں) کو بھی ان کی غلطی اور وہم و گمان سے نکال لیں۔

عام طور سے دانشور اور علماء جب بھی حیات کو توحید اور ارادہ خداوندی سے ربط دینے کی کوشش کرتے ہیں تو زمین پر حیات کی پیدائش کے مسئلہ کو بیچ میں لے آتے ہیں اور اس سوال میں الجھ جاتے ہیں کہ حیات اور زندگی سب سے پہلے کس ذریعے سے پیدا ہوئی؟ مسلّمہ علمی قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ زمین پر حیات و زندگی کا کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ہے، یعنی حیوانات و نباتات میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جو ہمیشہ سے موجود ہو ــ خود زمین ہی کی عمر کیا ہے۔ چند محدود، چند کرور سال سے زیادہ نہیں۔ اور وہ بھی ہمیشہ سے جاندار موجودات کا مسکن نہ تھی۔ پھر یہ کہنا کہ پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ: یہ موجودات سب سے پہلے کس طرح پیدا ہوئے؟ کس قدر عجیب ہے۔

ہمارا مشاہدہ تو صرف اتنا ہی بتا سکتا ہے کہ ہر شے اپنی نوع کی دوسری فرد کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے، یعنی گیہوں ــ گیہوں سے، جو ــ جو سے، گھوڑا گھوڑے سے، اونٹ اونٹ سے اور انسان انسان سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات فطرت کے خلاف ہے کہ کسی مٹی کے ڈھیر سے کوئی جانور یا درخت خود بخود پیدا ہو جائے۔ اس لیے کہ بہرحال کسی جاندار موجود کی خلقت کا باعث دوسرا جاندار ہی ہوتا ہے خواہ جامد ہو جیسے: بیج یا تخم کہ مادۂ سیال ــ جو ایک جاندار سے خارج ہو کر کسی مناسب جگہ پر پرورش پاتا ہے۔

اب یہ کہ یہ عمل کس طریقے اور کس ذریعے سے ہوا ہے، آیا ان تمام انواع کا تعلق ایک معین فرد سے ہے جو اس نوع کا نقطۂ آغاز ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ خود کس طرح اور کس چیز کے ذریعے پیدا ہوا ہے؟ کیونکہ اس سے پہلے ہم کہہ چکے ہیں کہ کسی جاندار موجود سے

تخم یا بیج علیحدہ ہوئے بغیر اگر دوسرے جاندار کی پیدائش ہو جائے تو خلاف فطرت ہوگا اور مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ یہ سب استثنائی طور پر ہوا ہے یا بقول معروف یہ ایک معجزہ تھا جس میں اس فرد کو خلق کر کے الٰہی قدرت نے اپنا کرشمہ دکھایا ہے۔

یا پھر ان تمام انواع کی جڑ ایک ہے اور ان سب کے درمیان قرابت کا رشتہ موجود ہے؟ اس مفروضہ کے مطابق پھر وہی سوال سامنے آتا ہے، کہ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ تمام انواع کا تعلق ایک جڑ یا کئی جڑوں سے ہے اور یہ بھی مان لیں کہ تمام موجودات کی خلقت کا انحصار ایک زندہ سیل پر ہے، تو یہ زندہ سیل کہاں سے آیا اور کیسے پیدا ہوا؟ آیا علم نے یہ ثابت کر نہیں دکھایا ہے کہ کوئی بھی زندہ موجود کسی ہمنوع زندہ موجود کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا؟ تو پھر آیا کوئی استثنائی واقعہ پیش آیا ہے، کوئی معجزہ ہوا ہے یا خدا وند کا ارادہ شامل حال ہو گیا ہے جو اچانک ایک زندہ سیل پیدا ہو گیا؟ (۱)

یہاں مادہ پرستی کے قائل افراد خود کو ان مفروضوں کے وضع کرنے پر مجبور پاتے ہیں جو خود ان کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہوتے، اس کے برعکس عارف باللہ اسی کو خالق کے وجود کا ثبوت جانتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جاندار موجود کی خلقت میں مافوق فطرت قدرت نے یقینی طور پر دخل دیا اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوا، جس کے نتیجہ میں اس موجود نے ظہور پایا۔ ڈارون جو ذاتی طور پر عارف ہے، جب انواع کے اشتقاقات کو کسی نہ کسی طریقے سے اپنے تئیں حل کر لیتا ہے تو ایک یا چند ایسے موجودات تک بھی اس کی رسائی ہوتی ہے جو پہلی بار زمین پر کسی جاندار موجود سے مشتق ہوئے بغیر پیدا ہوئے ہوتے ہیں، تو کہتا ہے۔" ان سب کو تو اللہ تعالیٰ کے دم سے حیات ملی ہے۔"

"کرسی مورسین" اپنی کتاب " راز آفرینش انسان" میں کہتا ہے: " کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حیاتی مادہ کسی نہ کسی سیارے سے جدا ہو کر خلاء میں ایک طویل مدت تک سرگرداں رہنے کے بعد زمین پر اترا ہے"۔ یہ خیال قابل قبول ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ حیاتی مادہ فضا کی

(۱) تاریخ علوم ص ۱۰۷

مطلق برودت میں زندہ نہیں رہ سکتا، اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ زندہ رہ گیا ہے تو فضا میں پھیلی ہوئی شعاعوں سے بچنا محال ہے وہ ہر حالت میں اُسے تباہ کردیں گی، لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ شعاعوں سے بھی بچ نکلا ہے، تو اس وقت یہ کہنا پڑے گا کہ ضرور دریا میں جہاں اس کے لیے مساعد ماحول فراہم ہے وہاں اترا ہوگا۔ ان تمام مرحلوں سے گذرنے کے بعد بھی سؤال باقی رہتا ہے کہ حیات کی حقیقت کیا ہے؟ اور دوسرے سیاروں میں وہ کہاں سے آئی؟ آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حیات کے لیے خواہ کتنا ہی مساعد ماحول کیوں نہ ہو، پھر بھی حیات، حیات کو وجود میں لانے سے قاصر ہے۔ کیمیاوی مواد کا بھی یہی حال ہے کہ اسے کسی طرح سے ہی کیوں نہ ترکیب دی جائے پھر بھی وہ حیاتی مادے کی تشکیل نہیں کرسکتا۔ حیات کا مسئلہ ان علمی مسائل میں سے ہے جس کا ابھی تک کوئی حل نہیں نکلا ہے۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ کسی مادے سے ایک ایسا ذرّہ جو مائیکروسکوپ سے بھی دیکھا نہیں جاسکتا، جدا ہوکر ایٹم کے بہت سارے ذرّوں سے یوں جا ملا کہ ان ذرّوں کا توازن بگڑ گیا۔ اور ان کے اجزا کی جمع و تفریق کے نتیجہ میں اس نے حیاتی شکل اختیار کی۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ اس ذرّے کے فعل و انفعال کے نتیجہ میں حیات کی تشکیل ہوئی ہو۔

اس بیان سے "کرسی موریسن" یہ بات ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حیات کی پیدائش میں ضرور کسی نہ کسی خالق کا ہاتھ ہے، اس لیے کہ مادّی اور فطری اسباب کی مدد سے اس مسئلہ کی توضیح نہیں کی جاسکتی، وہ "انسان کی پیدائش کے آغاز اور اس عظیم تحوّل کے بارے میں کہ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا موجود وجود میں آئے جو صاحب فکر ہو اور تمام علوم کا موجد بن سکے" کہتا ہے "صاحب فکر و شعور انسان کی خلقت کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ نزاکت کا حامل ہے کہ ہم یہ تصور کرلیں کہ خلقت مادّے کی تغیّرات کا نتیجہ ہے اور اس میں کسی خالق کا ہاتھ نہیں رہا ہے۔"

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا وہ حیات اور خداوندی ارادے کے تعلق کے بارے میں اس گروہ کے طرز فکر اور استدلال کا ایک نمونہ تھا، اس کے بعد ان فلاسفہ کی رائے

نقل کرنے کی ضرورت نہیں جو اسی سے ملتے خیالات کے حامل ہیں ۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ انسان نے علمی وسائل اور تجربوں کی مدد سے حیاتی مادہ بنانے کی جتنی بھی کوشش کی ہے اس میں ناکام رہا ہے ، یعنی وہ کیمیادی مواد سے ایسا گیہوں نہیں بنا سکا جسے اگر بویا جائے تو سبز ہو کر دانہ دے سکے ، یا انسان اور جانور کا ایسا نطفہ تیار نہیں کر سکا ہے جو کسی انسان یا حیوان میں بدل جانے کے قابل ہو ۔ لیکن دانشور اور علما اپنی کوششوں میں تھکے نہیں مگر ان پر یہ بات واضح نہیں ہو سکی ہے کہ وہ اس کے بنانے پر قادر ہیں یا یہ مسئلہ انسان کی علمی اور صنعتی قدرت کے دائرے سے باہر ہے ۔

چونکہ اس مسئلہ کا تعلق مستقبل سے ہے لہٰذا اس نے بھی پیدائش حیات کے مسئلہ کی طرح دنیا میں ایک غلغلہ برپا کر دیا ہے اور عارفین باللہ کا وہ گروہ جس کا اعتقاد ہے کہ حیات و زندگی کا تعلق خدا کے سوا اور کسی سے نہیں اور جن کی منطق حیات اور خداوندی ارادے سے تعلق کے بارے میں وہی تھی جسے ہم بیان کر چکے ہیں ، ان کی بھی رائے یہی ہے کہ انسان کی اس راہ میں کوشش بے سود ہے ۔ اس لیے کہ حیات خداوندی ارادے سے منسلک ہے انسان کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے ، انسان اپنے ارادے اور علمی و صنعتی وسائل کی مدد سے جب چاہے حیات اور زندگی ایجاد نہیں کر سکتا ۔ یہاں تک کہ جن پیغمبروں نے مردوں میں جان ڈالی ہے ، وہ بھی خدا کے حکم سے ڈالی ہے اور اگر کوئی شخص خدا کے حکم کے بغیر اس طرح کا کام کرنا چاہے بھی تو نہ صرف محال بلکہ ممتنع بھی تھا اور ممتنع ہے ، اور اگر کوئی شخص خدا کے حکم سے اس عمل کو انجام دینا چاہے تو اُسے اللہ کے ان پیام رسان اولیا کی صف میں ہونا چاہیے جنھوں نے محبوبیت خدا حاصل کی ہے ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سوائے پیغمبروں اور اولیاء کرام کے کسی دوسرے کو قدرت اعجاز عطا نہیں کی ہے ، اس کے معجزے انھیں لوگوں کے ذریعے جاری ہوتے ہیں ۔

ان لوگوں نے انسان کی موجودہ ناتوانی کو اپنے مدعا کی دلیل مان لیا ہے ۔ انسان ایسا گیہوں بنا لیتا ہے جو کیمیاوی ترکیب کے لحاظ سے ہو بہو عام گیہوں کی طرح ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن حیاتی آثار سے عاری ہے ، یہ اس لیے ہے کہ حیات کا تعلق خداوندی ارادے سے ہے اور پیغمبروں کے سوا اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے کو یہ اجازت نہیں دی ہے ۔

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ حیات خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کی ایجاد میں کسی دوسرے کے دخل کی تردید کرتا ہے ۔ لیکن ساتھ ساتھ قرآن مجید میں اس مسئلہ کو ثابت کرنے کی غرض سے انسانی حیات یا کسی جاندار کی حیات کے آغاز کے بارے میں اشارہ نظر نہیں آتا ۔ اس کے برعکس یہی نظام جس کے ہم شاھد ہیں اس کی گواہی دے رہا ہے اور اسی نظام حیات کو نظام خلقت وارتقا تسلیم کرتا ہے ۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ حیات خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے ، لیکن جہاں حیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت کو بیان کرتا ہے وہاں وہ روز اوّل کی طرف رجوع نہیں کرتا اور اس لحاظ سے روز اوّل یا بعد کے دنوں کے درمیان کسی قسم کے فرق کا قائل نہیں ہوتا ، بلکہ اس کا بیان یہ ہے کہ حیات کا منظم ارتقا خلقت کا ارتقا ہے ، سورۂ مومنون میں ہے :

"ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين، ثم جعلناه نطفة فى قرار مكين ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاما فكسونا العظام لحماً ثم انشأناه خلقا آخر فتبارك الله احسن الخالقين ." (سورۂ مومنون ۔ آیت ۱۲-۱۴)

اور ضرور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ۔ پھر ہم نے اس کو ایک ٹھہری ہوئی جگہ میں نطفہ قرار دے دیا ۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو ایک بستہ بوند بنا دیا پس ہم نے اس بستہ بوند کو ایک لوتھڑا پھر اس لوتھڑے کو ہم نے ہڈیاں بنا دیا پس ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت کی پوشش پہنائی ۔ پھر اس کے بعد ہم نے اس کی ایک دوسری صورت بنا دی ۔ تو کیا برکت والا ہے جو سب بنانے والوں سے اچھا ہے ۔

آیۂ شریفہ نطفے کے مختلف مراحل طے کرنے کو ایک خاص اور معین نظام کے تحت بیان کرتی ہے اور انھیں تبدیلیوں کو خلقت اور سلسلے وار پیدائش کے ارتقا کا نام دیتی ہے ۔ سورۂ نوح میں ارشاد ہوتا ہے ۔

"مالكم لا ترجون لله وقارا وقد خلقكم اطوارا ."

تمھیں ہو کیا گیا ہے کہ تم خدا کی عزت نہیں کرتے ۔ حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح کا پیدا کیا ہے ۔ (سورہ نوح ۔ آیت ۱۳ - ۱۴)

سورۂ زمر میں ہے :

"یخلقکم فی بطون امھاتکم خلقاً من بعد خلق فی ظلمات ثلٰث" (سورہ زمر - آیت ۹)

وہ تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تین اندھیریوں میں اس طرح پیدا کرتا ہے کہ ایک حالت کے بعد دوسری حالت بدلتی چلی جاتی ہے۔

کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون (سورۂ بقرہ - آیت ۲۸)

تم لوگ خدا کا انکار کیونکر کرتے ہو۔ حالانکہ تم بے حیات تھے تم کو زندہ کیا پھر تم کو موت دے گا پھر دوبارہ زندہ کرے گا پھر تم اس کے حضور میں حاضر کیے جاؤ گے۔

"وھوالذی احیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم" (سورہ حج - آیت ۶۵)

اور وہی ہے جس نے تم کو زندہ کیا پھر وہ تم کو موت دے گا پھر وہ تم کو زندہ کرے گا

اس مضمون و عبارت کی متعدد آیات ہیں اور سب میں اسی نظام حیات کو جس کے ہم شاہد ہیں نظام خلقت بتایا گیا ہے۔ گٹھلی اور بیج کا زمین میں کھلنا، پودوں کا بڑھنا در رشد و نمو، اور موسم بہار میں درختوں کا سرسبز و شاداب ہونا سب چیزیں خدا کی قدرت نمائی کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور یہ بات کہیں نظر نہیں آتی کہ حیات کی ایجاد میں خلقت اور خداوندی ارادے کو اس انسان یا حیوان اوّل پر ہی منحصر بتایا ہو جو سب سے پہلے زمین پر نمودار ہوا، اور ایسا کبھی نہیں کیا کہ محض کسی ایک مخلوق کو خدا کا مخلوق یا اس کے ارادے کے تحت پیدا ہونے والا تسلیم کیا ہو۔

قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کا ذکر پہلے ضرور ہوا ہے لیکن یہ اس بات کی دلیل ہرگز نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلے میں ہی اللہ تعالیٰ نے یہ کرشمہ دکھایا ہے، اس کا کرشمہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

قرآن مجید کا یہ خاص انداز ہے کہ جہاں وہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے وہاں اخلاقی اور تربیتی مسائل کی طرف توجہ ضرور مبذول کراتا ہے، بعنوان مثال

نیابت الٰہی کے مقام تک پہونچنے کے لیے انسان کی صلاحیت، انسان کی بے انتہا علمی صلاحیت، علم کے سامنے فرشتوں کا سر تسلیم خم کرنا، فرشتوں پر فوقیت حاصل کرنے میں اعلیٰ انسانی صلاحیتیں، طمع کے نقصانات، تکبر کے مضرات، بلند و بالا درجوں سے گرانے میں گناہ کا اثر، انسان کو نجات دلانے اور اللہ تعالیٰ سے قربت کے لیے توبہ کی اہمیت، شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے پرہیز کرنے کی تلقین۔ لیکن آدم علیہ السلام کی خاص اور استثنائی تخلیق کو توحید اور خالق کی معرفت سے نہیں جوڑا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ اخلاقی و تربیتی تعلیم کے لیے بیان کرنا تھا، اس لیے دوسرے افراد و اشیا کی تخلیق کا یہ پہلو اس بیان سے محروم رہا اور اس میں بھی توحید کے مسائل پر بحث نہیں کی گئی۔

عارفین کا دستور ہے کہ جب وہ جاندار موجود کی خلقت کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے تو کہتے ہیں کہ "وہ تو اللہ کی پھونک سے پیدا ہوا ہے۔" لیکن قرآن مجید جس طرح سے آدم اوّل کو نفخۂ الٰہی مانتا ہے اسی طرح سے تمام انسانوں کی زندگی جو موجودہ نظام کے تحت جاری و ساری ہے اسے بھی نفخۂ الٰہی تسلیم کرتا ہے۔

ایک مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کے سلسلے میں فرشتوں کو مخاطب قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعوا له ساجدین۔ (سورۂ حجر۔ آیت ۲۸)

پھر جب میں اس کو بنا چکوں اور اپنی (پیدا کی ہوئی) روح اس میں پھونک چکوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔

دوسری جگہ سورۂ اعراف میں فرماتا ہے:

"ولقد خلقناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملائکة اسجدوا لآدم" (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۱)

اور بے شک ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمھاری صورت بنا دی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں خلقت، روح پھونکنے اور فرشتوں کے خضوع و خشوع کو

تمام انسانوں کے لیے رہنما نمونہ قرار دیا ہے۔

سورۃ السجدہ (سجدہ) میں فرماتا ہے:

"الذی احسن کل شئ خلقہ وبدأ خلق الانسان من طین ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون۔" (آیت ۔ ۷ - ۹)

جس نے ہر چیز کو جسے پیدا کیا بہت ہی اچھا پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کی ابتدا مٹی سے کی پھر اس کی نسل کو ایک ذلیل پانی کے خلاصے سے قرار دیا پھر اس کو درست وخوشنما بنا دیا اور اپنی پیدا کی ہوئی روح اس میں پھونک دی اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے تم شکر ہی تھوڑا ادا کرتے ہو۔

جس طرح مفسرین قرآن نے بیان کیا ہے اور اس آیت کے اوّل اور آخر کا سیاق وسباق بھی نشاندہی کرتا ہے، ضمیر "سواہ" کا تعلق "انسان" سے نہیں بلکہ "نسل" سے ہے۔

یہاں پر اس بات کے اسباب معلوم کرنا ضروری ہیں کہ عام طور پر عارف باللہ جب کبھی حیات کو خداوندی ارادے سے ربط دینا چاہتے ہیں تو کیوں پیدائش حیات کی ابتدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور کیوں قرآن مجید اپنے توحیدی طریقے میں یہ راستہ اختیار نہیں کرتا اور حیات کو براہ راست آغاز حیات اور دوام حیات کے درمیان کسی طرح کے فرق کو تسلیم کیے بغیر خداوندی ارادے کا نتیجہ بتاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی منطق کا اختلاف دوسری منطقوں سے ایک بڑے بنیادی اختلاف سے مأخوذ ہے اور وہ یہ کہ عارفین کا وہ گروہ جو اپنی معلومات کے مثبت پہلو کے بجائے منفی پہلو سے خدا کو پہچاننا چاہتے ہیں، یعنی جہاں کہیں وہ کسی مسئلہ میں اٹک جاتے ہیں وہاں خدا کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کو ہمیشہ مجہولات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً ایسی چیزوں کے بارے میں ہمیشہ تحقیق کرتے ہیں جن کے فطری

اسباب ان پر پوشیدہ ہوں اور جہاں کہیں کسی چیز کے فطری اسباب ان پر واضح نہیں ہوئے وہاں فوراً کہتے ہیں کہ "یہ تو اللہ تعالےٰ کے ارادے سے وجود میں آئی ہے۔" اور فطری طور پر چیزوں کے فطری اسباب معلوم کرنے میں جتنا ان کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اتنا ہی توحید کے بارے میں ان کی دلیلیں زیادہ ہوتی ہیں، اور جیسے جیسے ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، ان کی بصیرت توحید میں کمی آتی جاتی ہے۔ عارفین اور مکتب توحید سے تعلق رکھنے والوں میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جن کے نزدیک ماوراء الطبیعہ ان کے مجہولات کے لیے ایک گدام کے مانند ہے، جس چیز کے فطری اسباب نہیں جان سکے۔ اس چیز کو نہیں سمجھ سکے اور پہچاننے سے قاصر رہے تو فوراً اسے ماوراء الطبیعہ سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ماوراء الطبیعہ کی تاثیر کو ان حالات کے تحت سمجھتے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق استثنائی طور پر یا نظم و نسق بگڑنے کے نتیجہ میں ظاہر ہوئے ہوں۔ اور کیونکہ یہ لوگ فطری سبب کو نہ پانے کی وجہ سے ماوراء الطبیعہ کے سبب کو جانشین قرار دیتے ہیں لہذا یہ اس بات سے غافل رہتے ہیں، کہ ماوراء الطبیعہ کا بھی ذاتی طور پر کوئی نظام ہے، دوسرے یہ کہ اگر کوئی سبب مادی اور فطری سبب کی جگہ لیتا ہے تو وہ خود مادی و فطری اور مادہ و فطرت کے برابر ہوتا ہے پھر اس کا تعلق ماوراء الطبیعہ سے نہیں رہتا؛

> "فطرت اور ماوراء الطبیعہ عرض میں نہیں ایک دوسرے کی موازات میں قرار پاتے ہیں، فطری سبب، ماوراء الطبیعہ کے سبب کا جانشین نہیں ہو سکتا اور نہ ماوراء الطبیعہ کا سبب فطری سبب کے درجہ پر فائز ہو سکتا ہے۔"

قرآن جہاں دیکھتا ہے کہ یہاں نظم عبارت میں ناہمواری ہو رہی ہے وہاں توحید کے دلائل کی بات نہیں کرتا، وہ یہ استدلال وہاں کرتا ہے جہاں طبیعی علل و مقدمات عام آدمی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ قرآن ایسے معاملات کو سند و دلیل میں پیش کرتا ہے۔ خاص طور سے حیات کے بارے میں قرآن کی منطق اس بنیاد کا قائم نظر آتی ہے کہ حیات بطور مطلق ایک فیض ہے جو محسوس ہونے والے جسم کی سطح سے کہیں بلند و بالا ہے، یہ

فیض خواہ کسی بھی قاعدے قانون کے تحت ہی کیوں نہ پہنچے، محسوس ہونے والے جسم کی سطح سے کہیں بلند تر مقام سے مأخوذ ہے، لہٰذا حیات کی ارتقا، ایجاد، تکوین، پیدائش اور تکمیل کی ارتقا ہے۔

البتہ اس منطق کے مطابق زمین پر حیات کا وجود میں آنا خواہ کسی خاص موقعہ پر یا رفتہ رفتہ اور ارتقائی صورت میں ہو، کوئی فرق نہیں۔

اس منطق کی بنیاد یہ ہے کہ مادہ بذات خود فاقد حیات ہے اور حیات وہ نور یا فیض ہے جسے بلند تر مقام سے فیض یاب ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس اعتبار سے قانون حیات خواہ کسی بھی شکل و صورت میں ہو، وہی قانون خلقت ہے۔

مادّہ اور حیات کا وجودی حیثیت سے اختلاف ایک ثابت شدہ علمی موضوع ہے، ہم اگر مادّے اور حیات کے وجودی اختلاف کے ذریعے حیات کے ماوراء الطبیعہ مأخذ کے بارے میں جاننا چاہیں تو ہم نے اپنی معلومات کے منفی نہیں مثبت پہلو کے ذریعے جانا ہے، خدا کو اپنی معلومات میں پایا ہے، مجہولات میں نہیں۔ اب ہم اس کے محتاج نہیں کہ جہاں کہیں کسی فطری سبب تلاش کرنے میں قاصر رہے وہاں ماوراء الطبیعہ کو اپنی منزل سے اتار کر فطرت کا جانشین بنا دیا ہو، بلکہ یقینی طور پر ہمارا گمان یہ ہونا چاہیے کہ کوئی نہ کوئی فطری سبب ضرور موجود ہے، اگرچہ ہمارے علم نے اب تک اس تک رسائی حاصل نہیں کی ہے۔

صدر المتألہین، سفر نفس (اسفار) میں، اسی نکتہ پر امام فخر رازی کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں" مجھے اس آدمی اور اس کے جیسے آدمیوں پر حیرت ہوتی ہے کہ جب کبھی یہ لوگ توحید یا اصول دین کے کسی جزء کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ایسے گوشے کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں فطری اسباب مجہول ہوں، اور ان کے خیال کے مطابق اس کا نظم و نسق اور حساب کتاب بگڑ چکا ہو [۲]۔

اب تک جتنی آیتیں پیش کی گئیں۔ ان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآنی نقطہ نظر سے خلقت کوئی آنی مسئلہ نہیں ہے، کوئی انسان یا حیوان جب ارتقا کی منزلیں طے کرتا

۲۔ اصول و فلسفہ و روش ریالیسم ج ۳ ص ۲۲۰

ہوتا ہے تو ہر لمحہ اور ہر حال میں پیدائش کے مرحلے سے گذرتا ہے، بلکہ بنیادی طور پر ساری دنیا ہمیشہ حدوث اور پیدائش کی حالت میں رہتی ہے۔

اس گروہ کے طرز فکر کے مقابل دوسرے گروہ کا طرز فکر یہ ہے کہ وہ خلقت کو "اس" پر منحصر سمجھتے ہیں، ہر وقت وہ دنیا کی تخلیق کے بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں اور ہمیشہ انکی زبان پر یہی ورد رہتا ہے کہ دنیا نیستی سے عالم وجود میں آئی، گویا اگر وہ اس طرح فرض نہ کریں تو دنیا کا وجود ہی نہیں اور اسی طرح جب کبھی حیات کے مخلوق ہونے کے بارے میں بحث کرنا چاہتے ہیں تو "اس" پہلی حیات کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ابتدا میں ظاہر ہوئی۔

یہ طرز فکر یہودیوں کا طرز فکر ہے، وقالت الیھود ید اللہ مغلولۃ غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا" وہ طرز فکر جو حیات اور خداوندی ارادے سے تعلق کے بارے میں آغاز حیات کی طرف رجوع کرتا ہے، یہودیوں کے طرز فکر کا نتیجہ ہے، اس یہودی طرز فکر نے رفتہ رفتہ پھیلنا شروع کیا یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اسلامی متکلمین بھی اس کے زیر اثر نظر آنے لگے۔

جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں، قرآنی طرز تعلیم میں "اس" کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے زمانے میں مسئلہ درپیش ہے کہ آیا انسان اس پر قادر ہے کہ کوئی جاندار موجود کی تخلیق کر سکے؟ آیا وہ اس پر قادر ہو سکتا ہے کہ کوئی مصنوعی نطفہ تیار کرے جسے رحم یا مناسب جگہ پر اگر رکھا جائے تو مکمل انسان کی شکل میں پیدا ہو؟ ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ عارف باللہ افراد کے درمیان جو لوگ حیات اور خداوندی ارادے کے تعلق کو استثنائی حالات اور حیات کی ابتدائی خلقت میں ڈھونڈتے ہیں، وہ مذکورہ باتوں کے سخت منکر ہیں۔ لیکن اس تعلیم کی بنا پر جو ہم قرآن سے لیتے ہیں، ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، یہ مسئلہ توضیح طلب ہے اور دو لحاظ سے اسے مورد غور و فکر ہونا چاہیے۔

ایک تو اس لحاظ سے کہ جاندار موجود کی ساخت کس حد تک پیچیدہ ہے اور آیا انسان کسی نہ کسی روز جاندار موجود کی بناوٹ میں جو جاندار سیل ہیں اس کے مادی اجزاء کی ترکیب کے بارے میں نیز جاندار سیل کے وجود میں آنے کے اسرار کو معلوم کر سکے گا

تو ۔ ھ

نہیں؟ اس لحاظ سے ہم اظہار رائے نہیں کرسکتے کہ سردست ہماری صلاحیت معلومات کے دائرے سے باہر ہے۔ لیکن جو کچھ ارباب فن نے کہا ہے اور کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ " وہ چیز جو زمین سیاروں اور شمسی نظام کی پیدائش نیز تمام کائنات سے بھی بلند و بالا اور اہم ہے وہ پروٹو پلازم ہے"۔

دوسرے اس لحاظ سے کہ انسان اگر کسی نہ کسی دن جس طرح سے دوسرے موجودات کے بہت سے قوانین تخلیق کا انکشاف کر چکا ہے اسی طرح جانداروں کے قوانین خلقت کو جاننے میں کامیاب ہو جائے، اور جاندار موجود کی ترکیب میں مادی اجزاء اور اس کے تمام شرائط بھی معلوم و مہیا کرلے اور اس کے بعد ہو بہو فطری جاندار موجود کی طرح ایک موجود بھی بنالے تو آیا وہ مصنوعی موجود صاحب حیات ہوگا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یقیناً صاحب حیات ہوگا، اس لیے کہ کسی افاضہ کے شرائط وجود پورے طور پر فراہم ہو جائیں اور وہ افاضہ عملی جامہ اختیار نہ کرے، محال ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ذات احدیت، صمد، کامل اور فیاض مطلق ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ واجب الوجود بالذات ہر پہلو اور ہر حیثیت سے واجب ہے؟

یہاں پر پھر بھی ذہن میں شبہ پیدا ہونے کا امکان ہے کہ اس مسئلہ کا کیا ہوگا جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حیات محض خدا کے ہاتھ ہے اور خدا کے ماسوا حیات دینے اور لینے کا عمل انجام نہیں دے سکتا اور اس سے پہلے ہم بیان کر چکے کہ قرآن مجید نے خود بھی اسے تسلیم کیا ہے، گذشتہ معروضات پر رجوع کرنے کے بعد اس سؤال کا جواب واضح ہے۔ بالفرض انسان اگر اس میں کسی نہ کسی دن کامیاب بھی ہو جائے تو محض اتنا ہی کرسکتا ہے کہ شرائط حیات فراہم کرلے نہ کہ حیات کی تخلیق کرے۔ انسان حیات نہیں دیتا، مادّے کی قابلیت کو افاضۂ حیات کے لیے پورا کرتا ہے یا دوسرے معنوں میں انسان فاعل حرکت تو ہے مگر وجود کو فیض پہنچانے والا نہیں۔

انسان اگر کسی دن یہ توفیق حاصل کر بھی لے تو یقیناً علمی اکتشاف کے لحاظ سے ایک کارنامہ انجام دیا ہے لیکن حیات کے ایجاد میں جہاں تک دخالت کی بات ہے تو اس کی

دخالت محض اتنی ہی ہے جتنی والدین کو اپنے فرزند کی حیات ایجاد کرنے میں تناسل کے ذریعہ ہوتی ہے یا اتنی جتنی کسان کو گیہوں کے دانے تیار ہونے تک ہوتی ہے ۔ مذکورہ صورتوں میں کسی بھی صورت سے انسان حیات پیدا کرنے والا نہیں صرف قابلیت مادہ کے شرائط کو حیات کے لیے فراہم کرتا ہے ۔ قرآن مجید نے سورۂ واقعہ میں اس مسئلہ کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے:۔

"افرأیتم ما تحرثون أانتم تزرعونها ام نحن الزارعون"

آیا تم نے اس میں بھی غور کیا کہ جو بیج تم بوتے ہو ۔ کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں؟

"افرأیتم ما تمنون اانتم تخلقونه ام نحن الخالقون"

آیا تم نے غور کیا کہ جو منی تم (رحم میں) پہنچاتے ہو ۔ کیا تم اس سے آدمی کو پیدا کر دیتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟

رہی بات پیغمبروں کے اعجاز کی تو وہ اس لیے ہے کہ انسان اپنی معمولی طاقت اور علم کے سہارے اس طرح کے کام انجام نہیں دے سکتا اور پیغمبروں نے بھی اس معمولی طریقے کے ذریعے اس علم وقدرت تک رسائی حاصل نہیں کی ہے ۔ ان کے ساتھ ایک زبردست علم واقتدار رہا ہے جو ان کو طبیعت سے بالاتر سطح کی طرف انہیں لے گیا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اس طرح کے عظیم کارنامے انجام دے سکے ہیں، اگر انسان کسی دن اس مقصد میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ اس نے اس کام کو انجام دے دیا جسے پیغمبر خدا کے حکم سے انجام دیتے تھے ۔ خدا کے حکم سے پیغمبر جان لیتے اور بخشتے بھی تھے، لیکن اگر انسان کسی نہ کسی دن یہ قدرت حاصل کر بھی لے تو صرف شرائط حیات فراہم کر سکتا ہے، جس طرح سے آج کل شرائط حیات تباہ کرنے کی قدرت موت کے لحاظ سے تو رکھتا ہے لیکن روح قبض کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔ زندگی دینا اور لینا خدا کے ہاتھ میں ہے، اگرچہ انسان حیات اور موت کے قوانین سے آگاہ ہونے کے بعد کسی مادے کی حیات کے لئے قابلیت کے اسباب فراہم یا تباہ کر سکتا ہے ۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ حیات نہ صرف انسانی فعل نہیں بلکہ اس کے دائرۂ عمل سے

باہر ہے۔ زندگی دینا اور لینا خدا کے ہاتھ ہے اور شرائط حیات فراہم کرنا انسان کا کام ہے۔

اس سے یہ مراد نہیں لینا چاہیے کہ کام بٹ گئے ہیں، یعنی کچھ کام انسان کے ہیں اور خدا کے نہیں اور کچھ خدا کے ہیں انسان کے نہیں، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ انسان کے اعمال کو محدود کیا جائے یہ نہیں کہ خدا کے اعمال پر پابندی اور قید لگائی جائے۔ خدا کے اعمال مطلق اور غیر محدود ہیں اور انسان جو عمل انجام دیتا ہے وہ محدود ہے موضوع کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مزید تشریح و توضیح کے لیے ہم "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کی پانچویں جلد مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

جناب سیّد سجاد رضوی

اسلامی معاشرے کی اساسی قدر

ہر معاشرے اور تہذیب کی اساس کسی نہ کسی قدر یا نظام پر ہوتی ہے اور اگر معاشری ارتقار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشرے کی ترقی یا زوال اس نظام اقدار سے متعلق ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنے قدری نظام کو درخور اعتنا نہ جانے تو اس کا زوال لابدی امر ہوتا ہے۔ لہذا ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی معاشرے کی ترقی یا زوال کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے نظام اقدار کی کیفیت کیسی ہے اور دو یا دو سے زیادہ معاشروں کا تقابلی جائزہ لے کر بہتر یا کم تر کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ ان کے نظام ہائے اقدار کی قدر و قیمت کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی معاشرے کی اساسی قدر عارضی اور قابل زوال ہو تو وہ معاشرہ اس معاشرے کے مقابلے میں کم وقعت ہوگا جس کی اساسی قدر نسبتاً کم عارضی یا زیادہ دیرپا ہو۔

گذشتہ تہذیبوں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں بعض کی اساسی قدر عسکری توسیع تھی یعنی معاشرے میں وہ شخص زیادہ قابل قدر ہوتا تھا جس میں عسکری توسیع میں مد و معاون ہونے کی زیادہ قابلیت ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر یونان یا روم کی تہذیبوں کا نظام اسی قدر پر استوار ہوا۔ بعض اور معاشروں میں اساسی قدر خون یا نسل تھی۔ ہندو تہذیب کی بنیاد ہی اسی خون کے رشتے پر تھی۔ ذات پات کا نظام برہمن کو دوسری ذاتوں پر فوقیت دیتا ہے۔ اسی طرح یورپ کے بیشتر ممالک میں کسی شخص کی پیدائش اصلی اہمیت کی مالک تھی اور بعض میں اب بھی ہے۔ جو شخص شاہی خاندان میں پیدا ہوتا اسکی اہمیت دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد اس نظام اقدار کو شکست ہوئی اور شاہی خاندان یا جاگیرداروں کے گھرانے کے بجائے تاجر اور صنعتکار طبقے نے اپنا لوہا منوانا شروع کیا اور وہ تمام روایات فرسودہ قرار پائی گئیں جن کو

قدیم نظام نے جنم دیا تھا۔ امریکی معاشرے میں اسی نظام نے ترویج حاصل کی اور آج کے دور میں امریکی معاشرے کی بنیادی قدر پیسہ ہے اور اس کی خاطر امریکی حکومت اور امریکی سرمایہ دار انسانیت کا خون چوسنے پر مصر ہیں۔ قدیم عرب میں اسلام سے قبل انسان کی قدر و قیمت اونٹوں اور گھوڑوں کی تعداد پر منحصر تھی۔ اسی طرح مختلف معاشروں کا جائزہ لیں تو ان کی اساسی اقدار کا سراغ مل سکتا ہے۔

اس جائزہ کے نتائج سے جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان تمام معاشروں کی بنیادی اقدار زوال پذیر اور عارضی نوعیت کی حامل ہیں۔ اسی لیے جب یونانی اور رومن تہذیبوں میں عسکری توسیع کا دم خم نہ رہا تو وہ زوال کے اندھیروں میں گم ہوگئیں۔ ہندو معاشرے پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس معاشرے نے تمام بیرونی اثرات سے اپنے آپ کو بچایا ہے اور ایک ہزار سال کی غلامی کے باوصف ہندو اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قادر رہے اس صورت حال میں جس بات کو اہمیت حاصل ہے وہ ہندوؤں کے ہاں ذات پات کے نظام کی برقراری اور چھوت چھات کے رویے کا استمرار ہے۔

اس بات کو ذہن میں رکھ کر اسلام پر نظر ڈالیں تو پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ اسلام آفاقیت کا دعویدار ہے یعنی اسلام قیامت تک کے لیے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اسلام آفاقی دین ہے تو اس کی اساس پر تشکیل پانے والے معاشرے کی بنیادی قدر بھی ایسی ہونا چاہیے جو دائمی اور ثابت نوعیت کی ہو اور جس پر مرور ایام کا اثر نہ ہو۔ اور پھر یہ قدر ایسی ہو جس کا دائرہ پوری انسانیت پر محیط ہو۔

اس اساسی قدر کا سراغ لینے کے لیے ہم قرآن مجید کی جانب رجوع کرتے ہیں قرآن کی روشنی میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پوری انسانیت کو بلا تفریق رنگ و نسل و زبان و پیدائش ایک سطح پر لاتا ہے: انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا (ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو قبائل و اقوام کی شکل دی تاکہ تم پہچانے جاؤ) لیکن اس کے ساتھ اسلام اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے ابنائے جنس پر سبقت لے جائے

چونکہ اسلام اپنے آپ کو دین فطرت گردانتا ہے، اس لیے اس کے تصورات فطرت کی نفی نہیں کرتے۔ تمام انسانوں کو باعتبار پیدائش یکساں گردانتا اور بات ہے اور ان سے یہ تقاضا کرنا کہ وہ تمام عمر یکساں سطح پر زندہ رہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش نہ کریں دوسری بات ہے اور بالکل غیر فطری بات ہے۔ بعض دوسرے نظاموں نے بھی تمام انسانوں کو یکساں گردانا لیکن اس کے ساتھ وہ نظام انسان سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ تمام عمر یکساں سطح پر رہیں لیکن اسلام نے انسانوں کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسری تہذیبوں اور معاشروں کے برخلاف اسلام نے اپنے معاشرے میں سبقت لیجانے کے جو قدر معین کی ہے وہ نہ تو ہندو مت کے مانند اس کے بس سے باہر ہے، یعنی انسان اپنی پیدائش پر تو اختیار نہیں رکھتا، اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی معاشرے میں اہمیت حاصل کرنے اور دوسروں پر سبقت لے جانے کا طریقۂ کار اور معیار عارضی اور غیر ثابت نہیں جیسا کہ یونانی اور رومن تہذیبوں میں تھا، بلکہ اسلام نے انسانوں سے کہا کہ اگر سبقت لے جانا چاہو تو پھر متقی بن جاو ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (تم میں بزرگ تر وہ ہے جو زیادہ متقی ہے)۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ متقی کیونکر بنا جائے؟ دیگر ادیان اور معاشروں میں متقی بننے کا طریقہ کار بنیادی طور پر معاشرے کی نفی ہے یعنی متقی وہ ہے جو اپنے آپ کو معاشرتی قید سے آزاد کرلے، راہب اور تارک الدنیا بن جائے۔ اگر سب افرادِ معاشرہ متقی بن جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ معاشرہ بکھر جائے۔ لہذا لازم آئے گا کہ سب افراد متقی نہ بنیں اسی لیے ان معاشروں میں زہد کا لباس اوڑھنے والوں نے دوسروں کو اس منزل پر پہنچنے سے روکا ہے۔ اس قسم کے تقویٰ میں ایک تو انانیت کی پرورش کے جراثیم ملتے ہیں کہ متقی اپنی انا کی پرورش اور اپنی ذات کی ترقی کے لیے دوسروں پر بوجھ بن جائے اور اس کے ساتھ ہی اس قسم کا تقویٰ اوروں کی محرومیت کا سبب بھی بنتا ہے۔ لیکن اسلام میں تقویٰ کے معانی بالکل مختلف ہیں اسلام میں تقویٰ ترک دنیا کا نام نہیں اور زہد معاشرے کی نفی نہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ لیس الزھد الا تملک الشئ ولکن الزھد الا یملک الشئ یعنی زہد یہ نہیں کہ کوئی چیز تمھاری ملکیت نہ ہو بلکہ یہ کوئی چیز تمھاری مالک نہ بن جائے۔ اسلام تو انسان

کو معاشرے کا کار آمد فرد بن کر رہنے کی تلقین کرتا ہے لہذا قرآن نے لوگوں کو دوسروں پر سبقت لے جانے کے لیے جو تقوی کا طریقہ بتایا ہے وہ اس تقوی سے مختلف ہونا چاہیے جو دوسرے معاشروں میں موجود ہے۔ اب قرآن مجید ہی سے ہمیں اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ منزل تقویٰ پر پہنچنے کا راستہ کون سا ہے: "اعدلوا هو اقرب للتقوى" یعنی عدل کرو کہ وہ تقوی سے نزدیک تر ہے۔ یعنی متقی بننے کے لیے عدل کرنا لازم ہے۔ یہ عدل وہ نہیں جس سے ہم متعارف ہیں یعنی عدالتوں میں دیا جانے والا عدل بلکہ وہ عدل ہے جو عربی میں مراد لیا گیا ہے یعنی العدل هو وضع الشئ بمحلہ (عدل کسی چیز کو اس کے مناسب مقام پر رکھنا ہے) ظاہر ہے کہ اس صفت کے حصول کے لیے دو باتیں لازم ہوں گی ایک تو یہ کہ انسان کو معلوم ہو کہ اشیاء کیا ہیں اور دوسرے یہ کہ اسے ہر شے کے مناسب محل اور مقام کا پتہ ہو، جب یہ دونوں باتیں یکجا ہو جائیں گی اور انسان ان کے مطابق عمل پیرا ہو گا تو وہ عادل کہلائے گا۔ اب دونوں باتوں کے لیے علم درکار ہے اور اس کے ساتھ اس بات کا شعور کہ اشیاء کا آپس کا اختلاف کس نوعیت کا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا محل مناسب کیا ہے، اس شعور کے لیے عقل لازم ہے۔ گویا جب تک عقل اور علم یکجا نہ ہوں عدل کا حصول ممکن نہیں۔ اس مختصر مضمون میں یہ بحث اٹھانا ممکن نہیں کہ عقل اور علم میں فرق کیا ہے، البتہ یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ عقل باطن سے ظاہر اور داخل سے خارج کا سفر ہے اور علم خارج سے داخل اور ظاہر سے باطن کا سفر ہے۔ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، کبھی عقل علم کی محتاج ہوتی ہے اور کبھی علم عقل کا۔ ویسے تو پاگل کے پاس بھی علم ہوتا ہے لیکن اپنی بے عقلی کی بنا پر وہ اپنے علم کو عقل کی مدد سے اپنی ذات کا جزو نہیں بنا سکتا اسی طرح عقل انسان کو جوہر شعور سے آراستہ نہیں کر سکتی جب اس کے ساتھ علم کا تعاون نہ ہو۔ اسی لیے جناب امیر علیہ السلام نے علم کو علم مسموع اور علم مطبوع میں تقسیم کیا ہے اور فرمایا ہے کہ علم مطبوع ہی کار آمد ہوتا ہے اور اسی مطبوع کا مالک عالم با عمل کہلاتا ہے۔

اس مختصر بحث کی بنیاد پر ہم اس نتیجے پر وارد ہوتے ہیں کہ اسلام میں فضیلت اور تقوی کے حصول کے لیے تقویٰ لازم اور تقویٰ کے لیے عدل ضروری ہے اور عدل کے لیے علم اور عقل

لازم ہیں اور پھر یہ کہ علم کا رآمد وہی ہے جس کے ساتھ عقل کا تضامن ہو تو ثابت ہوا کہ بغیر علم تقویٰ ممکن نہیں، اسی لیے جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے: اول الدین معرفتہ (دین کی ابتدا اس کی معرفت سے ہے) اور من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو جان لیا)۔ اسی طرح جناب امیر علیہ السلام ہی کا ارشاد ہے: اصطفیٰ اللہ تعالیٰ منہجہ وبین حججہ من ظاھر علم و باطن حکم ....
لا تفتح الخیرات الا بمفاتیحہ ولا تکشف الظلمات الا بمصابیحہ

اس لحاظ سے ہم اس نتیجے پر وارد ہوتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کی قدر اساسی اور اس کا معیار فضیلت ایسا علم ہے جو عمل پر منتج ہو۔ اسی طرح حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علما کی توصیف میں متعدد بار اپنے ارشادات سے نوازا۔ انہوں نے اپنی امت کے علما کو بنی اسرائیل کے انبیاء کے مشابہ قرار دیا ہے۔ اور اپنی امت کے افراد کے لیے حصول علم کو فریضہ گردانا ہے۔ انھوں نے آخری حج کے موقع پر تمام قسم کے امتیازات کی نفی فرمائی اور رنگ، نسل، وغیرہ کی بنا پر فضیلت حاصل کرنے کو غیر اسلامی قرار دیا صرف اہل تقویٰ کو اہل فضیلت گردانا۔

مزید برآں قرآن مجید میں وظائف رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں چار فرائض کا ذکر ملتا ہے: لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ اس آیۂ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چار فرائض سونپے گئے (۱) تعلیم تلاوت آیات (۲) تزکیہ نفوس (۳) تعلیم کتاب اور (۴) تعلیم حکمت، ان چاروں فرائض کا تعلق علم سے ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں بطور تحدی ارشاد باری ہوا، ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون یعنی کیا علم والے ان کے برابر ہیں جو علم نہیں رکھتے؟ اس کا جواب ہی یہ ہے کہ یہ برابر نہیں۔

ان امور پر غور کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلام شعور و آگاہی اور علم و دانش کا دین ہے اور یہی اسلامی معاشرے کی اساس ہے۔ دوسرے معاشروں کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کا امتیازی نشان ہی یہ ہے کہ اس میں مال و دولت، جاہ و حشمت رنگ و روپ، جسم و جسمانیت

اور مادی وسائل کی فراوانی باعث امتیاز نہیں ہے۔ اس معاشرے میں فضیلت و تقویٰ حاصل کرنے کے لیے حصول علم لازم ہے۔ اسی بات کو جناب امیر علیہ السلام نے ایک اور انداز میں یوں ارشاد فرمایا ہے :

اذا ارذل اللّٰہ عبدا حظر علیہ العلم (جب خدا کسی بندے کو رذیل بنا دیتا ہے تو اس پر علم کے دروازے بند کر دیتا ہے) اس اصول کا اطلاق ہم معاشروں پر بھی کر سکتے ہیں۔ معاشری ارتقاء مال و دولت اور جاہ و حشمت پر منحصر نہیں بلکہ علم پر۔ جب معاشرے علم کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو زوال پذیر ہو جاتے ہیں

اب علم ایک ایسی قدر ہے جو دائمی اور آفاقی ہے دوسری اقدار تمام کی تمام عارضی اور فنا پذیر ہیں لہذا جس معاشرے کی اساس علم ہو وہ آفاقیت سے ہمکنار ہوگا اور دوام اس کا نصیب بنے گا۔ اس اعتبار سے اسلام کا معاشری نظام آفاقیت کا آئینہ دار ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اپنے معاشرے کی اس قدر اساسی کا خیال رکھا اس وقت تک ترقی کرتے رہے اور جب اس کو نظر انداز کر دیا گیا تو پھر حکومتوں، ان کی افواج اور ان کی مادی طاقتوں کے بس میں یہ بات نہ رہی کہ مسلمانوں کو زوال کے چنگل سے نجات دلا سکیں۔ اس اساسی معاشری قدر کا شعور اہل مغرب نے اسلام ہی سے لیا اور اسی کے بل بوتے پر مغربی اقوام نے ہر قسم کی ترقیاں حاصل کیں۔ آج مسلمان اس بات کا رونا روتے ہیں کہ وہ اپنی تعداد کے باوصف شکست خوردگی کا شکار ہیں لیکن اس بات کا احساس بہت کم ہے کہ اس شکست خوردگی اور زوال آمادگی کا اصلی سبب اسلام کے معاشری نظام کی قدر اساسی کو فراموش کر دینا ہے۔ آج بھی اگر مسلمان اس بات کا شعور حاصل کریں اور اپنے نظام کی قدر اساسی یعنی علم کی جانب متوجہ ہوں تو ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور انھیں دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

اسلام کی اس قدر اساسی کی ایک خصوصیت قابل ذکر ہے کہ اس کے دائرے میں تمام انسان آ سکتے ہیں اور اسلامی معاشرے کا کوئی فرد حصول فضیلت سے محروم نہیں رہ سکتا ہے۔ یہاں تمام مادی اسباب فضیلت و تفوق ہیچ ہیں اور کسی انسان کو رنگ نسل وغیرہ کی اساس پر حصول کمال سے محروم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی معاشرہ ہر انسان کی بشری طاقت کو ظاہر ہونے میں مدد معاون ہے یہ بات اسے دوسرے معاشروں پر تفوق دیتی ہے اور اسے زمانی اور مکانی قیود سے بلند کر دیتی ہے۔

جناب محمد علی تسخیری
مترجم: خادم حسین ام اے

انقلاب اسلامی بداخلاقی کے خلاف مہم

اس وقیع مقالہ کی پہلی قسط گذشتہ شمارے میں چھپ چکی ہے۔ مقالہ نگار نے گذشتہ رژیم کے مفسدانہ منصوبوں، ان پر اخراجات، ان کے گمراہ کن اور فساد انگیز نتائج و شماریات کا ذکر کیا ہے۔
مقالہ کا یہ آخری حصہ انقلاب کے اقدامات اور نتائج سے بحث کرتا ہے۔
— ادارہ —

فساد انگیز حملوں کی ناکامی

ایک طرف سرکاری مہم کی خطرناک نوعیت، اس کی وسعت و ہمہ گیری اور اس کے برعکس یہ صورتحال (جس میں ایران کے مسلمان عوام نے امام خمینی مدظلہ کی قیادت میں ایک لاکھ قربانیاں پیش کر کے شاہی نظام کا تختہ پلٹنے میں کامیابی حاصل کی) دیکھتے ہیں تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ حملہ اپنے اغراض و مقاصد میں ناکام کیسے ہوا؟

اس سوال کے جواب کو دو وجوہات پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اوّل:۔ اسلامی اعتقاد اور اس کی خصوصیات ہی ان منصوبوں سے انحراف اور اس کے اثرات کو روکنے کے لیے ایک اہم وجہ تھی۔ اس لیے کہ اعتقاد کا فطری عمل یہ ہے کہ انسان کے نفس اور دل کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ کر اسے قوت و ثبات بخشتا ہے۔ اعتقاد ہی انسان کو نیک اعمال، عبادت اور

ترقی کی طرف لے جاتا اور اسے ہر حال میں برائی اور بد اخلاقی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس بارے میں محض اشارہ ہی کافی ہے کہ نماز "انّ الصلاۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر" اور روزہ عبادت کے ان ارکان میں شمار کئے جاتے ہیں جو مسلمان کو برے کاموں سے مقابلہ کرنے کی قوت و طاقت عطا کرتے ہیں۔

دوّم: ان اسباب و عوامل کی فراوانی جو نفس میں اعتقادی رجحان کو قوت دیتے ہیں اور شاید اس ملک کے عوام میں یہ عوامل دوسرے ملکوں کے مقابل زیادہ ہیں۔ اس لیے کہ یہاں پر منحرفین میں بھی ایسا جذبہ پایا جاتا ہے جو انہیں انحراف سے روکتا ہی نہیں بلکہ صحیح راہ پر آمادہ کرتا ہے۔
اس قسم کے مانع عوامل بہت زیادہ ہیں، ہم ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں: فساد، استکباری سازشیں اور کفر کے حملوں پر قابو پانے کی غرض سے اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم اور تاریخ ساز واقعات کی طرف عوام کا رجحان۔

سرچشمۂ اسلام سے آب حیات لینے والی ائمہ علیہم السلام کی تعلیمات بعض اہم امتیازی خصوصیات ہیں۔

۱۔ یہ تعالیم زندگی کے تمام شعبوں میں اثر رکھتی ہیں، مختلف انداز میں انسان کی اخلاقی حسیٰ اور اعتقادی تربیت کرتی ہیں اور انسان کی انفرادی اور سماجی مشکلوں کا حل پیش کرتی ہیں۔
درحقیقت ان ہی تعالیم کی بنا پر ہمارے عوام نے فساد پر غلبہ حاصل کیا۔

۲۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کے فکری دبستان میں اجتہاد کے دروازے کھلے رہنے کے نتیجہ میں زبردست علمی اور فقہی سرمایہ کی فراہمی ایک طرف، دوسری طرف علماء کی تقلید نے دینی علماء اور عوام کے درمیان ایک ایسا رابطہ قائم کر دیا، جس کے نتیجے میں عوام کے اندر ایسی بیداری پیدا ہوئی جسے روکنے کے لیے کوئی بھی طاقت دیوار کھڑی نہیں کر سکتی تھی اور یہی وجہ تھی جو شاہ کی کوششوں کے باوجود لوگ امام خمینی کی تقلید چھوڑنے کے بجائے گروہ در گروہ مقلد ہوتے گئے یہ بات اس کے لیے خوفناک تھی۔

۳۔ دبستان اہل بیتؑ کی طرف سے زکات و خمس کی ادائیگی واجب ہے، پھر اس کے لینے والوں کی عدالت کو لازمی قرار دینے کی وجہ سے بہت سے لوگ خمس و زکات دینے کی طرف راغب ہوئے

جس کے نتیجہ میں بہت سے علمی حوزے اور مدرسے قائم ہوئے اور درس دینے والے علماء کے مصارف اس سے پورے ہونے لگے۔ اگر یہ نہ ہوتا اور حکومت کی امداد پر بھروسہ کیا جاتا تو علماء دین اپنی حکومتوں کے محض نوکر بن کے رہ جاتے۔ اس طرح کی مالی امداد ملنے سے نہ صرف حوزے اور علماء کو استقلال حاصل ہوا بلکہ ان کا اثر لوگوں کے نفسیات پر ہوا، عوام ان کے کردار سے گرویدہ ہوئے۔

۴۔ قرآن، حدیث اور ائمہ علیہم السلام سے منقول اُن روایات اور دعاؤں پر تاکید جو انسان کی انقلابی شخصیت کو ابھارتی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے کی ترغیب دلاتی ہیں۔

۵۔ اہل بیت اطہار علیہم السلام کی تاریخ قربانیوں اور انقلابات سے بھری پڑی ہے، لیکن ان انقلابات میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا انقلاب یزید کی مخالفت میں سرفہرست ہے، اس انقلاب اور دوسرے اس قسم کے انقلابات کے اثرات کی بقا نے انسانی شخصیت کے انقلابی پہلو کو سنوارنے میں بہت مدد دی۔

ان عوامل کے علاوہ اور بھی بہت سے معاون عوامل ہیں، جن میں سے ہر ایک اسلامی عقیدے کو مستحکم بنانے میں مؤثر ہے۔

فساد کے اثرات سماج میں عام ہونے کے باوجود، اسلامی تحریک کو ان عوامل کی بدولت کامیابی نصیب ہوئی۔

فساد اس حد تک پھیل چکا تھا کہ ہر دیکھنے والا ظاہری صورت حال دیکھ کر یہی تصور کرتا تھا کہ ایران کے سارے مسلمان اس رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ لیکن در حقیقت ایسا نہ تھا، گہرائی اور باطن میں مضمر حقیقت نے نہ صرف اس کی مخالفت کی بلکہ ہر حال میں جنگ جاری رکھی، ایک طرح سے یہی حقیقت تھی جس نے اس مبارک انقلاب کو نہ صرف کامیابی کا شرف بخشا بلکہ فساد کی تمام جڑیں کاٹنے میں بھی مددگار رہی۔

دراصل توفیق الٰہی اور عنایت ربانی مذکورہ عوامل سے کہیں بلند و بالا تر ہے۔ اسی طرح کامیابی کا اصلی راز وہ ایمان ہے، جو تمام ہتھیاروں، ٹینکوں اور فوجوں پر بھاری ہے۔

اسلامی انقلاب :

ایران کے مسلمان عوام انقلاب لائے لیکن یہ جانتے ہوئے کہ انھیں اسلامی حکومت قائم کرنا ہے اور ان تمام غیر اسلامی حرکات و اعمال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے جو ان کی اسلامی شخصیت اور وجود کی منافی اور قاتل ہیں۔ یعنی ایران کے مسلمان عوام نے مجموعی اعتبار سے اسلامی نظام کو حکومت اور زندگی کے لیے اساسی طور پر ضروری تسلیم کیا ہے اور اُن تمام منصوبوں کی مخالفت کی ہے جو اسلام میں نئی چیزوں کا اضافہ کرکے اس کا اصلی چہرہ بگاڑنا اور انحراف کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالی کا شکر ہے کہ مسلمانوں کا خواب پورا ہوا اور مسلمانوں کی امیدیں برآئیں۔ اب فساد اور انحراف کے عوامل کی بنیادیں اکھیڑنے کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر بھروسہ کرتے ہوئے اسلامی حکومت قائم ہوئی۔

(الف) اللہ تعالیٰ کی جانب سے توفیق اور مدد۔
(ب) امام خمینی مدظلہ کی حکیمانہ قیادت کی بیداری اور مسائل کے تشخیص کی خصوصیت۔
(ج) نظام حیات کے سلسلے میں عوام کا اسلام پر بھروسہ اور ایمان۔
(د) اللہ تعالیٰ کے حکم سے منحرف اور فاسد لوگوں کے دلوں میں خوف کا پیدا ہونا۔

سماجی تطہیر

سماج میں پاک سازی کا عمل بنیادی طور پر دو مرحلوں پر مبنی تھا۔

۱۔ مختلف علمی اور ثقافتی طریقوں کی مدد سے نفسیات میں تبدیلی اور لوگوں کے ایمان و اعتقاد میں عمق اور گہرائی پیدا کرنا۔

۲۔ انحراف کی طرف لے جانے والی تمام چیزوں کا خاتمہ اور باقیماندہ اثرات اور پھیلے ہوئے نقائص سے پلاننگ کے تحت مقابلہ۔

پہلا مرحلہ : علمی اور ثقافتی طریقوں کی مدد سے لوگوں میں بیداری پیدا کرنا۔ یہ ایک طرح سے سنت الٰہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے :

ان اللہ لا یغیّر ما بقوم حتیٰ یغیّروا ما بانفسھم (الرعد: ۱۱)

"بے شک خدائے تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے حال کو نہ بدلیں۔"

"ذٰلك بان الله لم يك مغيرا نعمة انعمها على قوم حتى يغيروا ما بانفسهم." (الانفال: ۵۳)

"اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی نعمت کا جو کسی قوم کو عنایت کی ہو بدلنے والا نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنے نفسوں کی حالت خود نہ بدل ڈالیں۔"

انسانی ضمیر میں تبدیلی آتی ضرور ہے، لیکن جب تربیتی عناصر خاص طور پر خلوص نیت اور بیداری اعتقاد کے مطابق ہوں۔

اسلامی انقلاب نے لوگوں کے ضمیر میں خلوص نیت کو جلا بخشی۔ اس عنصر نے لوگوں کی مسلسل قربانیوں کے بعد (جو اسلام اور اس پر اعتماد کے نتیجہ میں دی گئی تھیں) عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔ لیکن بیداری کی بات جہاں تک ہے، وہ یہ ہے کہ بیداری عوام میں پہلے سے موجود تھی اور محض اس میں گہرائی اور وسعت پیدا کرنے کی ضرورت تھی، جس کے لیے اسلامی انقلاب نے تمام معاون طور طریق بھی فراہم کر دیے۔ انھی ثقافتی طریقوں سے اسلامی تبلیغ کا دائرہ وسیع ہوا، اور یہی ہمہ گیری اس بات کا باعث بنی کہ اسلامی احکام و قوانین زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوں اور اسی غرض سے ایک وزارت "وزارت ارشاد اسلامی کے نام سے" قائم ہوئی تاکہ قانونی طور پر تبلیغات کا کام انجام پاسکے۔ اس کے بعد تبلیغات اسلامی آرگنائزیشن وجود میں آئی، اس کا مقصد عوامی اور دوسرے حلقوں میں تبلیغ کرنا ہے۔ اس تنظیم کی طرف سے، کارخانوں، سرکاری اداروں اسکولوں، کالجوں اور یہاں تک کہ فوج اور پولیس کے محکموں میں بھی تبلیغ اور فسق و فجور کا خاتمہ کرنے کے لیے مبلغوں کو بھیجا گیا۔

تمام علاقائی ریڈیو اسٹیشنوں کے علاوہ دو جنرل سروسوں اور ٹیلی ویژن کی دونوں چینلز نے عوام میں بیداری پیدا کرنے اور اس عمل کو مزید فروغ دینے کی غرض سے اپنا کام شروع کر دیا۔ الحمد للہ، آج ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہمارے مخلص و مؤمن عوام کے لیے

دو بڑے تعلیمی اور مذہبی اداروں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان دو اداروں کا کام بھی حتی الامکان اسی مقصد کو پورا کرنا ہے۔

دانش گاہوں میں ثقافتی انقلاب عمل میں آیا، تاکہ ان تمام قدروں کو مٹا دے جو اسلام اور اس کے مزاج کے مخالف اور منافی ہیں اور ان تمام اصولوں کو توڑ دے جو سامراج نے اپنے خطرناک ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار کیے تھے۔ پھر ان اصولوں کو وضع کرے جن کی مدد سے اسلامی، علمی اور بیدار شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔

مسجدوں نے اپنے مؤثر تربیتی عمل کو مزید فروغ بخشا اور آج کی مسجدیں بیک وقت سماجی اور تربیتی عمل کے لحاظ سے بہترین مراکز میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کا دیرینہ تشخص واپس لوٹ آیا ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے علمی اور فکری اجتماعات اور سیمناروں کی رپورٹ نشر ہونے لگی تاکہ لاکھوں افراد اس سے مستفید ہوں، اور یہ محسوس کریں کہ ان کے معلومات میں کس حد تک اضافہ ہوتا ہے۔

اس طرح ملک بھر میں تمام مجامع و محافل اور مراکز اجتماعات نے بھی اسلامی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے اپنا کام تیزی سے شروع کر دیا ہے۔

ایک طرف سے اس سلسلے میں اسلامی اخبارات عوام تک حقیقت رسانی کا بہترین ذریعہ ثابت ہو رہے ہیں، دوسری طرف مختلف اسلامی علوم کے سلسلے میں نشر شدہ تعمیری مقالوں نے بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔

معاشرتی سطح پر حزب جمہوری اسلامی نے لوگوں میں بیداری اور آگاہی پیدا کرنے اور ان کے احساسات میں انقلابی شعور کو وسعت و عمق بخشنے کی رو سے اہم کردار ادا کیا۔

عوام میں بیداری، اور سیاسی و دینی شعور پیدا کرنے والے عوامل میں سب سے اہم عامل امام خمینی مدظلہ العالی کی ہدایات ہیں۔ ان کے پیام اور تقریروں کا اثر جو براہ راست عوام کے دلوں میں داخل ہو کر احساسات کو سینچتا، آدمی کو بصیرت بخشتا اور ہم سب کے لئے معرفت و آگاہی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ ایران میں مقیم حضرات اس بات کو بخوبی سمجھ

سکتے ہیں کہ امام خمینی مدظلہ العالی کی تقریروں اور باتوں کا اس فدا کار قوم پر کس قدر اثر ہوتا ہے۔
مرحوم علامہ طباطبائی ، آیت اللہ شہید باقر صدر، آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری اور آیت اللہ شہید بہشتی جیسے عظیم اسلامی مفکرین کی تحریروں نے عوام میں بیداری اور آگاہی پیدا کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اسے ہرگز بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان عظیم مفکرین کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں طبع ہوتی تھیں اور فکر انگیز ان میں سے بہترین فقہی مسائل کا انتخاب کرتی تھیں اور کرتی ہیں۔
ان باتوں کے علاوہ وسیع پیمانے پر دو اور تحریکیں اس انداز سے میدان عمل میں آئیں، جن سے نئی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔
(الف) عربی زبان کی تعلیم اور تمام تعلیمی مرحلوں نیز عوام میں ریڈیو، ٹیلویژن کے ذریعے اس کا رواج۔
سابق شاہی حکومت کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں عربی زبان کی مخالفت میں جو کچھ بھرا جاچکا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کی اہمیت کیا ہے اور یہ مسئلہ کس قدر اعتماد کا حامل ہے۔ فارسی زبان کو اجنبی الفاظ سے پاک کرنے کے بہانے سے شاہی حکومت نے عربی زبان کو ختم کرنے کا منصوبہ تیار کیا، جس کے نتیجہ میں انگریزی اور فرانسیسی اصطلاحیں فارسی زبان میں آئے دن بڑھتی چلی گئیں۔
اسی ضمن میں ایک کوشش یہ بھی تھی کہ جو فارسی الفاظ عربی زبان سے ماخوذ تھے ان کو فارسی رسم الخط کے بجائے لاتینی حروف میں لکھا جائے۔ لیکن اس منصوبے کی علمی اور عوامی سطح پر شدید مخالفت کی گئی اور کوششیں ناکام ہوگئیں۔ یہ سب خاکے ان لوگوں کے ذریعے بنے تھے جو اپنے آپ کو پڑھے لکھے طبقے کا نام دیتے تھے اور اکثر و بیشتر مغربی طرز فکر سے متاثر تھے۔ اس گروہ کی فعالیت اگر کچھ دن اور جاری رہتی اور ان کے زہریلے پروپیگنڈے عوام میں اثر و رسوخ پیدا کر لیتے تو اسلامی تہذیب کا نام و نشان ختم ہوجاتا۔ حالانکہ اسلامی انقلاب کی مکمل کامیابی کے بعد بھی اس گروہ سے کافی حد تک مقابلہ جاری رہا۔ آخرکار اسلامی انقلاب کو ان کے مزاج بدلنے اور بدمزاج افراد سے عوام کو چھٹکارا دلانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔
اسی طرح ایسے لوگ بھی قابو میں آگئے جو اس لیے بہت خطرناک تھے کہ مسلمان ہوتے ہوئے فکری

دبستانوں و دشمن اسلام دبستانوں سے متاثر تھے کہ ان کا بھانڈا اب تک نہیں پھوٹا تھا یہ لوگ اسلام اور دوسرے مکاتیب فکر سے یکساں متاثر تھے۔

(ب) قرآن باترجمہ کا درس عام کرنا اور معنوں کو سمجھے اور عمل کیے بغیر محض الفاظ پر اکتفا کرنے کی ممانعت، یہ تجربہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوا۔ کلاسز کے شروع ہوتے ہی جوق در جوق طلبہ شرکت کے لیے آنے لگے اور آئے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، اس عمل کو مزید فروغ دینے میں ملک کا عام اسلامی ماحول اور ریڈیو، ٹیلی ویژن بہت مدد کر رہے ہیں۔

دوسرا مرحلہ

انحراف کی طرف لے جانے والی تمام چیزوں کا خاتمہ اور اس کے اثرات و نتائج سے مقابلے کی عزیمت ہے۔

اس مرحلے میں بابرکت انقلاب کے اصلی و اسلامی جوہر کی جلا ہوئی۔ سب سے پہلے اس انقلاب نے انحراف پھیلانے والوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی مہم چلا کر عباس ہویدا جیسے افراد (جن کے ہاتھ ہزاروں بے گناہ مومنوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے) پر قابو پایا۔ جو فرار ہو سکے وہ فرار ہو گئے اور جو فرار نہ ہو سکے انھوں نے کوئی نہ کوئی گوشہ تلاش کر کے پناہ اختیار کی۔ اس طرح سرکاری ادارے ان جیسے افراد سے پاک ہو گئے۔ اس موقع پر یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ ایسے بھی بہت سے افراد موجود تھے جو مکمل طور پر انحراف کی راہ پر گامزن نہیں ہوئے تھے۔ یہ لوگ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مہربانی سے توبہ کر کے دوبارہ صحیح راہ پر لوٹ آئے

انقلاب نے ان لوگوں کا پیچھا بھی کیا جنھوں نے اپنی عیش و عشرت اور بے جا اخراجات کو پورا کرنے کی غرض سے حرام کی دولت اکٹھا کر رکھی تھی، ان میں سے جو سزا کے مستحق تھے انھیں سزا ملی۔ کچھ لوگ بھاگ گئے اور جن لوگوں کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو سکا اور انھوں نے توبہ کر لی، انھیں معاف کر دیا گیا۔ اس طرح یہ لوگ اسلامی معاشرے کے اچھے ساتھی بن گئے

جنسی بے راہ روی شائع کرنے والے رسالے میدان عمل سے نکل گئے اور ان کی جگہ ان رسالوں نے لے لی جن کا اسلوب و انداز صحیح تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار و اصول پر جھوٹی تہمت اور حملوں کو روکنے کے لیے قانون صحافت کا نفاذ ہوا جبکہ قانون

نے مشرق اور مغرب سے وابستہ عناصر کو اس زمانے میں کھلی چھوٹ دے رکھی تھی لیکن اس کے باوجود ان میں یہ جرأت پیدا نہ ہوسکی کہ وہ اپنے اخبارات و رسائل میں اسلامی اقدار و اصولوں کے خلاف بیانات شائع کریں۔ اور اگر یہ جسرأت پیدا ہوجاتی تو وہ ضرور آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اسلامی حکومت کا تختہ پلٹنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، جیسا کہ انہوں نے اواخر میں کی اور عوام نے انھیں سزا دی۔

اب اخباروں اور رسالوں میں ننگی تصویروں کی گنجائش نہ رہی اور اس کے بدلے علماء و اکابر ملت کی تحریریں اور صحیح خبریں نیز اسلامی ماحول کے مطابق مواد شائع ہونے لگا۔ آج کل جمہوریہ اسلامیہ ایران کے اخبار و رسائل اپنے اصل تبلیغی فریضہ کو انجام دے رہے ہیں اور صحیح معنوں میں فاسدوں کے چنگل سے آزاد ہوکر عام مسلمانوں کی آراء و افکار کے ترجمان ہیں۔

آج کل ایران میں ایسے بہت سے اخبار یا رسالے نکلتے ہیں جو حکومت کے دائرہ سے خارج رہتے ہوئے بھی آزادی کے ساتھ عوام کی نمایندگی کرتے ہیں اور بھائی چارگی کے ماحول میں برائیوں اور برے لوگوں پر تنقید کرتے ہوئے دعوت حق دیتے ہیں۔

ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن صحتمند تفریحی پروگراموں کو چھوڑے بغیر توجہ طلب کالج اور یونیورسٹی میں بدل گئے، اسکے پروگرام انفرادی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تربیتی تقاضوں کے تحت مرتب ہونے لگے۔ لچر اور بیہودہ قسم کی موسیقی، گانے اور جنسی فلمیں، جو انسانیت کے اعلیٰ اقدار و مقاصد سے کوسوں دور ہیں، اب ان پروگراموں سے نکالی جاچکی ہیں۔ اس عمل سے اطلاعات و نشریات کا یہ ادارہ اسلامی درسگاہ میں بدل رہا ہے اور اسی طرح کا کارنامہ سینما، تھیٹر اور ڈراموں کے میدانوں میں انجام دیا گیا، جو فن کار خوف و ہراس کے نتیجہ میں بھاگ گئے تھے، انھیں صحیح تربیت دینے کی غرض سے انقلاب نے دوبارہ اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کردیا ہے، تاکہ ان کے فن کو معاشرے کی صحیح خدمت کے لیے کمربستہ کرسکے اس کے علاوہ اس انقلاب نے حزب اللٰہی افراد کے درمیان سے فنکاروں کو انتخاب کرنے کے لیے بھی مؤثر اقدام کیے ہیں۔

سینما اور ڈرامے کے میدانوں میں مسلمان ادیبوں نے اپنی تخلیقات پیش کرنا شروع کردیں اور رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کے فن کا مظاہرہ ہونے لگا اور فلموں کا انحرافی رویہ راہ راست سے ہمکنار ہوگیا جس کے نتیجہ میں انحراف کے بہت سے دروازے بند ہوگئے

عصمت اور جسم فروشی کی جہاں تک بات ہے ، ان تمام اڈوں کا محاصرہ کرکے اس کے لئے بھی مناسب حل نکالا اور وہ اس طرح سے کہ ہر عصمت فروش عورت کے کیس میں سنجیدگی سے مطالعہ عمل میں آیا ، اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ زیادہ تر ان میں سے دھوکے اور فریب کا شکار بنائی گئیں تھیں ، البتہ یہ کام ان کے ماضی کو مدنظر رکھتے ہوئے شروع کیا گیا تھا، تاکہ اندازہ ہوسکے کہ کس حد تک ان میں اصلاح پذیری کا مادہ ہے اور کس حد تک اصلاح ممکن ہے۔

جن لوگوں کے بارے میں انقلاب نے یہ محسوس کیا کہ راہ راست پر لوٹ آنے کے لیے عطا کردہ مہلت فکر و نظر کے بعد بھی اپنے اڈے خالی نہیں کرتے اور ان کے واپس ہونے کے امکانات نظر نہیں آتے ، ان کا واحد علاج اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے تھا اس لیے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق مہلت و فہمائش کے بعد مفسدوں پر کسی طرح کا رحم و کرم روا نہیں ہے۔

معاشرے میں پاکسازی کی غرض کو پورا کرنے کے لیے ، اسلامی اصولوں کے مطابق صاف ستھرے گھریلو تعلقات کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی گئی ، اور اسلامی نقطۂ نظر سے پردے کی ضرورت اور برہنگی کے نقصانات کی وضاحت کی گئی ۔ پھر اس حکم کو نافذ کرنے کے لیے تمام دفاتر میں کام کرنے والی خواتین سے پردے کی نگہداشت کی درخواست کی گئی اور رفتہ رفتہ یہ حکم عام خواتین کے لیے نافذ کردیا ۔ یہاں تک کہ آج ایران کے مسلمان عوام اس عمل پر فخر محسوس کرتے ہیں ۔ البتہ یہ بات ایسی ہے کہ انقلاب موافق افراد کے دلوں میں ٹھنڈک اور مخالفین کے دلوں میں بغض اور جلن پیدا کرتی ہے ۔

ایران میں آج کی خواتین نے سماج اور معاشرے میں اپنی گم شدہ حیثیت حاصل کرلی ہے آج وہ دوسروں کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں ہیں ۔

آج وہ اسلامی انقلاب کی پشتیبانی ، اپنے نفس کی صحیح تربیت اور انسانی اہداف و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہیں ۔

آج وہ پردے کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اسلامی مجلس شوریٰ اور دوسرے سرکاری اداروں میں مصروف خدمت ہیں۔

جنسی بے راہ روی اور عریانیت کی بدولت پیدا ہونے والے امراض جو معاشرے میں پھیل چکے تھے، آج کل کے اعداد و شمار کے مطابق نہ صرف نہ ہونے کے برابر ہیں بلکہ قریب قریب ان کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور یہی بات تقریباً غیر قانونی اڈوں یعنی نائٹ کلب اور ڈانسنگ ہالوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ انقلاب نے ان تمام اڈوں کا رنگ بدل دیا، ان کو بند کر کے ان کی آگ کو مکمل طور پر ٹھنڈا کر دیا۔

عیش و عشرت، رقص و سرود اور اسراف میں ڈوبی ہوئی محفلوں کی آج کے اسلامی ماحول میں کوئی گنجائش نہیں رہی۔ آج ان تقریبات کے بجائے ایسی محفلیں دیکھتے ہیں جو رسولؐ اور آلِ رسول علیہم السلام اور شہداء کی یاد میں برپا کی جاتی ہیں۔ معاشرتی سطح پر جو اجتماعات ہوتے ہیں۔ ان کی بہترین مثال نماز جمعہ ہے جس میں لاکھوں کی تعداد میں افراد یکجا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اجتماعات نیکی کی ہدایت اور صحیح اسلامی تربیت کے سوا اور کسی دوسری چیز پر مشتمل نہیں ہوتے۔

غیر ملکی سفارت خانوں میں جس طرح پہلے جشن وغیرہ منعقد ہوتے تھے اب وہ حال نہیں رہا فی الحال ظاہر تو ظاہر، اندرونی طور پر بھی تمام سفارت خانے اسلامی قدروں کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور یہی حال تقریباً مذہبی اقلیتوں کا ہے کہ وہ ہر طرح سے اسلامی معاشرے کا خیال رکھتی ہیں۔

غرض یہ کہ معاشرتی سطح پر عیش و عشرت کی محفلوں کی بساط اٹھ چکی ہے اور قدروں طریقوں اور معیاروں میں تبدیلی آچکی ہے اور لوگ خیالی منصوبوں کو چھوڑ کر تعمیری کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ شاہی محل اور عمارتیں، ہسپتالوں، میوزیم اور مستضعفین کی رہائش گاہوں میں بدل چکی ہیں۔

نوجوانوں کو تباہی کی طرف لے جانے والی تنظیمیں اور تمام ادارے (خواہ وہ کالجوں اسکولوں، بازاروں، کارخانوں اور حکومتی دفتروں ہی میں کیوں نہ ہوں) اسلامی انجمنوں

اور تنظیموں میں بدل گئے اور فی الحال یہ انجمنیں مذکورہ جگہوں پر اسلامی ماحول برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے انحرافات ابھرنے کا سدباب کر رہی ہیں۔ ان انجمنوں نے ثقافتی تربیت ماحول میں سدھار، اسلامی انقلاب کی حمایت، اس کے کارناموں کی حفاظت اور منافقین کا سامنا کرنے کے لحاظ سے اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح سپاہ پاسداران (انقلاب محافظ فوج)، جہاد سازندگی (تنظیم تعمیر نو) اور بسیج (رضاکار فوج) جیسی انقلابی تنظیموں کا وجود میں آنا بذات خود ایک بہترین کارنامہ شمار کیا جاتا ہے ان تنظیموں میں اکثریت اُن جوانوں کی ہے جو خود کو اس تنظیم سے وابستہ کرکے اپنے عوام اور امام امت کی مسلسل خدمت کرنے میں نہ صرف فخر بلکہ تزکیۂ نفس محسوس کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ایسی تنظیمیں ہیں جو نہ صرف انقلاب کی رکن اساسی ہیں بلکہ انقلاب کے دوام اور انقلاب مخالف عناصر کا سامنا کرنے میں نہایت اہم حیثیت رکھتی ہیں۔ عراق کی بعثی حکومت نے جس جنگ کو ایران کے سر تھوپا ہے، اس میں بھی یہی تنظیمیں تھیں جنہوں نے اسلامی فوجوں کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی سرزمین اور امت مسلمہ کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ہے۔

ظاہر ہے کہ پورے ملک میں اسلامی نظام پھیلنے کے بعد دریاؤں کے کنارے پر یا سوئمنگ پول میں برہنہ عورتیں اور مرد دکھائی نہیں دیتے۔ جو لوگ اس پرانے رویّہ کو خواہ وہ کم سے کم تر ہی کیوں نہ اپنانا چاہتے ہیں عوام حکمران کا سامنا کرتے ہیں۔ آج کل یہ تمام تفریحی مقامات موجود ہیں لیکن عورتوں کے علاقے یا سوئمنگ پول الگ ہیں اور مردوں کے الگ۔ حال ہی میں دریا کے ساحلوں اور فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے حکومت وقت نے ایسے مزید وسائل مہیا کئے ہیں جو صحت مند تفریح کا سبب ہیں۔ یہی حال ورزشی سوئمنگ پولز اور سواحل دریا کا ہے۔

عالمی سطح پر ورزش اور کھیل کود کو فروغ دینے کی غرض سے ورزش کو جوئے اور عریانیت کے دائرے سے نکال کر اسلامی اصولوں کے تحت صحت مند جسم سازی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اور ان کھیلوں پر پابندی لگا دی ہے جو انسانیت اور اسلامی اصولوں کے منافی ہیں (مثلاً مکہ بازی اور شطرنج) یا جن کے ذریعے جوئے اور شرط بازی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

آج ورزش اور کھیل، روز افزوں ترقی اور پیش رفت کے ساتھ ساتھ صحیح تربیت اور اکابر ملت

و حکومت کی جانب سے حوصلہ افزائی سے ہمکنار ہو رہے ہیں۔

شراب اور شراب نوشی کی جہاں تک بات ہے وہ "تھی" کا صیغہ اختیار کر چکی ہے۔ البتہ اس صیغہ کے امکانات اسی وقت سے پیدا ہوئے، جب کہ شراب پینے یا بیچنے والوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی اور اسلامی احکام و قوانین کے مطابق انہیں سزائیں ملیں۔ اس طرح سے ایران کے مسلمانوں کو نہ صرف شراب سے بلکہ اس کے تباہ کن نتائج سے بھی چھٹکارا ملا۔

معاشرتی سطح پر لوگوں کی سادہ زندگی اور اعلیٰ مقاصد کی طرف توجہ، قربانی کا جذبہ اور کاسمیٹک کی عدم فراوانی نے لوگوں کو فالتو وقت ضائع کرنے اور بناوٹی خوبصورتی سے کافی حد تک چھٹکارا دلایا۔

جہاں تک جرائم کی بات ہے تو اس کی تعداد میں بڑی حد تک کمی آچکی ہے۔ اگر ان جرائم کو مدنظر نہ رکھا جائے جو انقلاب دشمن، منافقین اور کمیونسٹوں کے ذریعے بینک میں لوٹ مار، بازاروں میں دھماکوں اور ہزاروں مومنین کے قتل و غارتگری کی شکل میں رونما ہوئے تھے اور اب عوام کے ذریعے ان سب پر قابو پایا جا چکا۔ تو یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ مندرجۂ ذیل اسباب کی مدد سے جرائم میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔

(الف) معاشرے میں اس جذبے کا سرایت کر جانا جو اس کی روحانی اور دینی ترقی کا باعث ہے۔

ب) جرائم سے پاک سماجی ماحول کا وجود۔

ج) ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اخلاقی تربیت کا اہتمام۔

د) قوانین سزا کا نفاذ۔

ھ) معاشرے سے فقر و جہل کو دور کرنے کے لئے حکومت کا اہتمام۔

منشیات کے استعمال کو روکنے میں اسلامی انقلاب کو مکمل کامیابی اس طرح حاصل ہوئی کہ سب سے پہلے ان اشیاء کو خرید و فروخت کرنے والے تاجروں اور اس کے عادی افراد کو گرفتار کیا گیا اور جو لوگ کسی کے ترغیب دلانے یا خوف سے عادی بن چکے تھے۔ حکومت نے انہیں اس بیماری سے نجات دلانے کے لئے کچھ جزیرے ایسے انتخاب کئے جس میں اس بری بلا سے چھٹکارا ملنے کے امکانات اور وسائل فراہم کئے جا چکے تھے۔

گذشتہ رژیم کے ہاتھوں جو لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس قسم کی بری عادتوں میں مبتلا تھے انھیں اصلاحی انداز سے نجات دلا کر ان کی صحت اور صحیح تربیت کے وسائل فراہم کیے گئے۔

منشیات کے خلاف اسلامی انقلاب کی جنگ اور تحریک کا اثر بے شک ایران کے گوشے گوشے میں نمایاں ہے۔

لیکن قارئین گرامی کو یہ بات یاد دلانی ضروری ہے کہ یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا، البتہ جو جنگ اس کے خلاف لڑی گئی وہ اور اس کے نتائج اتنی عظمت کے حامل تھے کہ انھیں اعجازِ انقلاب اسلامی کہنا غلط نہ ہوگا۔

اس اسلامی اور انقلابی طرز عمل کے ساتھ انقلاب نے اس قسم کے دوسرے مفاسد سے بھی نپٹنے کے لیے صحیح سمت میں مورچے قائم کئے۔

وہ فنون جو پہلے انحرافی افکار و خیالات پھیلانے کا ایک ذریعہ تھے، فی الحال انہیں فنون کو صحیح ڈھنگ سے کام میں لانے اور ان کے معیار کو بلند و بالا کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

یہی حال ادبی قصے، افسانے، ناولوں، ڈراموں اور کہانیوں کا ہے کہ اب فاسد الاخلاق اور منحرف ادیبوں کے قدم اس مبارک اسلامی سرزمین سے نکل چکے ہیں۔ اسی طرح ویڈیو کے ذریعے ننگی اور جنسی فلموں کو دیکھنے کے رجحانات پر بند باندھے جاچکے ہیں اب یہ وسائل لوگوں میں ثقافتی شعور کو بیدار کرنے اور حقیقت کی نشر و اشاعت کے کام میں لائے جارہے ہیں۔

اقتصادی لحاظ سے دیکھا جائے تو سامراج کے ذریعے عائد شدہ اقتصادی پابندیوں کے باوجود اسلامی انقلاب نے اقتصادی صورت حال کو بہتر بنانے میں اپنی قدرت و توانائی کا ثبوت پیش کیا ہے، اسی طرح مستضعفین اور پسماندہ افراد کی حالت میں بہتری لانے کی غرض سے بینکوں میں جو سود جاری تھا اسے ختم کرکے، اسلامی اصولوں کے تحت (مضاربہ، مساقات، مزارعہ اور اشتراک) بینکوں میں معاملات جاری رکھنے کی پیشکش منظور و نافذ ہوچکی ہے۔

تعلیمی نصاب کو زہریلے افکار و خیالات سے پاک کرتے نیز اس میں تبدیلی لانے کی غرض سے خواہ وہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ہی نصاب کیوں نہ ہو عملی اقدامات کیے گئے، اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو مختصر اور طویل المدت پروگرام مرتب کیے گئے، جن کی مدد سے

اچھے اور مؤمن اساتذہ کا انتخاب، درسی مضامین میں اصلاح و تبدیلی اور طریقۂ تعلیم کو اعلیٰ اہداف کے ہم پلہ قرار دینے میں کافی حد تک آسانی ہوئی۔

مذکورہ اقدامات اتنے زیادہ ابعاد پر مشتمل ہیں کہ ہر بعد کے لحاظ سے گفتگو کرنا ممکن نہ سہی لیکن وقت کے محتاج ہیں۔

انحراف اور فساد کے خلاف جنگ اور تحریک کا حال یہ ہے کہ اب ہماری قومی زبان کی لغت میں ان الفاظ کا وجود ہی باقی نہ رہا۔ ان الفاظ کا نام ونشان مٹنا ہمارے مسلمان عوام کی بیداری اور ہمت وعزم کا بہترین ثبوت ہے۔

ایران کے خلاف سامراجی ممالک کی سازشیں ہر اعتبار سے مسلّم ہیں، لیکن ساتھ ساتھ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ انقلاب نے ان تمام سازشوں کو ناکام بنا کر، ترقی کی۔ آیا قارئین گرامی کی نظر میں انقلاب کے مذکورہ نتائج الٰہی قدرت کا اعجاز نہیں؟ مکار اور غدار افراد کا فوج میں اسلامی حکومت کا تختہ پلٹنے کے لئے شامل ہونا، داخلی صورت حال کو بگاڑنے کی غرض سے منافقین کا سرگرم عمل ہونا، فوج میں خلفشار پیدا کر کے انقلاب در انقلاب کی کوششیں کرنا، دہشت گردی اور انتہا پسندی کے نتیجہ میں لوگوں کو جگہ جگہ پر ڈرانا دھمکانا اور قتل کرنا، طبس میں امریکی حکومت کی فوجی دخالت، اقتصادی صورت حال کو ابتر کرنے کی غرض سے اقتصادی پابندیاں عاید کرنا اور سامراجی آلۂ کار صدام کا ایران کے خلاف جنگ تھوپنا وغیرہ یہ تمام سازشیں انقلاب نے بے نقاب کر دیں۔

ان تمام باتوں کے علاوہ انقلاب کو ان تباہ کن روایات کا بھی سامنا کرنا پڑا جو شاہ خائن اپنے وارثین کے درمیان چھوڑ گیا تھا اور وہ یہ کہ ایک طرف مکمل غریبی اور دوسری طرف امیری کی انتہا، زراعت وصنعت میں سامراجی ممالک پر بھروسہ، جس کے نتیجہ میں مطلوب ترقی نہ ہو سکی، دفتروں میں انسانیت سے دور افراد کی موجودگی، فوج میں فاسد اور خراب کار افسروں کا ہونا اور تعلیم کا زہرآلود ہونا وغیرہ۔

البتہ ان تمام سازشوں کے ساتھ جو شخص انقلاب کے مثمر نتائج کو ملاحظہ کرے گا وہ اعجاز ربانی کا قائل ہو جائے گا۔

ایک طرف سے سامراجی سازشوں سے مقابلہ، دوسری طرف سابق رژیم کی پیدا وار اقتصادی اور اداری خراب صورت حال سے جنگ، تیسری طرف پھیلے ہوئے فساد کی روک تھام......

ان تمام باتوں کو جب ہم مدنظر رکھتے ہوئے انقلاب کے نتائج کو دیکھتے ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کو نہ صرف ایران بلکہ امت مسلمہ کے شامل حال رہتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ ایران کو امام خمینی جیسا فدا کار رہبر و قائد ملا، جس نے دشمنوں کے دلوں میں حس تقویٰ پیدا کر کے، قرآنی احکام و قوانین کے نفاذ کی راہ ہموار کی۔

جناب رئیس امروہوی

ترانۂ انقلاب

در جہانِ مادی تحریکِ روحانی خوش است
انقلابِ ملّتِ اسلامِ ایرانی خوش است

خاکِ ایران است از خونِ شہیدان لالہ زار
از جراحت ہائے اعدا قلبِ مومن پُر بہار
تکیہ کن بر نصرتِ حق درمیانِ کارزار
لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

اے خوشا ایثارِ جان و عزمِ قربانی خوش است
در جہانِ مادی تحریکِ روحانی خوش است
انقلابِ ملّتِ اسلامِ ایرانی خوش است

ما ز استعمارِ شرق و غرب کے داریم باک؟
ہست جولان گاہِ اہلِ حق ز گردون تا بخاک
ما نمی باشیم از تزویرِ باطل سہم ناک

از برائے خدمت دین فدیہ باشد جانِ پاک
ذوقِ عرفانی مبارک جذبِ ایمانی خوش است

جہد بہر حفظ دین باشد جہاد مومنین
ما مسلمانیم و می جنگیم بہر حفظ دین
نصرتِ عزم آز ما و عزمِ نصرت آفرین
عشقِ حق آغاز ما انجامِ ما فتح مبین !

در جہاد کفر و دین ، تائید سبحانی خوش است
انقلابِ ملتِ اسلامِ ایرانی خوش است
در جہانِ مادی تحریک روحانی خوش است

انقلابِ ماست اسلامی ز روے اعتقاد
بہر مظلومین عالم مژدۂ صد عدل و داد
انقلابِ ما زگیتی دفعِ شر رفعِ فساد
پاسدارانِ غیور انقلابی زندہ باد

نصرت اقوامِ اسلامی و ایرانی خوش است
در جہانِ مادی تحریک روحانی خوش است
انقلابِ ملتِ اسلامِ ایرانی خوش است

از پیِ رفعِ فسادِ کافران، پیکارِ ما:
قاطعِ افرنگ و استعمار باشد کارِ ما
در نبردِ حق و باطل سیّد و سالارِ ما
حیدرِ کرّارِ ما و احمدِ مختارِ ما

این جهاد و انقلاب از فضلِ ربانی خوش است
در جهانِ مادی تحریکِ روحانی خوش است
انقلابِ ملتِ اسلامِ ایرانی خوش است

این ندا آمد ز رئیس از غازیانِ حق پناه
می گریزد از سرِ میدان عدوی روسیاه
انقلابِ ما مظفّر گشت از فضلِ اِله
ردِّ کفر است از خدا، فتحِ مبین است از خدا

مژدهٔ فتحِ مبین با جشنِ ایمانی خوش است
در جهانِ مادی تحریکِ روحانی خوش است
انقلابِ ملتِ اسلامِ ایرانی خوش است

●

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۶ - ۵۱

جمہوری اسلامی ایران – تہران

فارم ممبری

براہ مہربانی درج ذیل پتے پر مجلۂ توحید اردو ارسال فرمادیا کریں۔

از .... تا ....

نام .... کوچہ .... روڈ ....

شہر .... صوبہ .... ملک ....

تاریخ ....   دستخط

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ	سالانہ
اسلامی جمہوریہ ایران	۱۵۰ ریال	۵۰۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے	۵۰ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم	۳۲ درہم
سعودی عرب	۸ ریال	۳۲ ریال
قطر	۸ ریال	۳۲ ریال
کویت	۶۵۰ فلس	۲½ دینار
افریقہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ	۸ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
کینیڈا	۴½	۱۸ ڈالر

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

توحید

جلد ۱ شمارہ ۳ ذی قعدہ - ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ و محرم ۱۴۰۵ھ - اگست تا اکتوبر ۱۹۸۴ء

مقاصد

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمہ

قرآن وسنت وسیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی وعملی پہلوؤں کی تلاش۔

علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔

اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔

فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔

عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی فکری وسماجی انقلاب ونتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر وصاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلادیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۳ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۳۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی نبش فرصت
تہران - اسلامی جمہوریہ ایران

توحید

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد ۱، شمارہ ۳

ترتیب

جمہوری اسلامی ایران
مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۳۱۹۵
فون ۲۵-۸۲۵۰۲۲ ایران تہران

ذی قعدہ۔ ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ و محرم ۱۴۰۵ھ ۔ اگست تا اکتوبر ۱۹۸۴ء

اقتصادیات

فکر و فلسفہ

شعر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نوٹ: ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ

(۱)

استحصالی قوتیں، اسلام اور مسلمانوں کو اپنی راہ میں سنگ گراں سمجھتی تھیں اور آج بھی ان کا عقیدہ یہی ہے۔ اسلام اپنے اقدامات میں پہلے عفو و درگذر سے کام لیتا، پھر اپنا دفاع کرتا ہے اس کے بعد حفظ مقاصد کے لیے حملے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جس کا اسے قطعاً حق حاصل ہے، ان تینوں مرحلہ وار مقابلوں کے لیے۔

پانچ وقت کی نماز، جمعہ کا اجتماع ہفتہ وار۔ اور عید کے دو اجتماعی مظاہرے، ہمارے رشتۂ اخوت اور حب فی اللہ کو مضبوط کرنے کا فائدہ دیتے ہیں۔ پھر "تربیت گاہِ" وحدت و تقویٰ خانۂ کعبہ میں سب کا جماؤ سب توحید پرستوں کے لیے عظیم ترین عبادت و سیاست ہے۔ رمضان المبارک میں روزے رکھے گئے، قرآن مجید کی تلاوت کا دور دورہ رہا، اور عید الفطر کے بعد مکہ مکرمہ کی یاد اور حج کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کعبۃ اللہ کا حج اور مدینۂ منورہ میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ کی زیارت، دنیا میں مسلمانوں کی منتہاءِ تمنا ہے۔

و للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا

مولانا محمود حسن، شیخ الہند نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا۔ جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف

راہ چلنے کی ۔ (آل عمران ۹۷)

توحید کے ماننے والے اس حق کو ادا کرنے کے لیے دل وجان سے تیار تھے ہی کہ خود اس معبود برحق نے حضرت ابراہیمؑ بت شکن کے ذریعے دعوتِ عام کا اعلان بھی کروا دیا :

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق لیشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللہ ...... (الحج:۲۷)

اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چل کر اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آئیں راہوں دور سے تاکہ پہنچیں اپنے فائدہ کی جگہوں پر اور پڑھیں اللہ کا نام ....

افریقہ، امریکہ، چین اور روس، ہند و یورپ سے حج کے لیے قافلہ در قافلہ آنے والوں کے دعوت ناموں میں لکھا ہے کہ حج ایک تو ان کا فرض بندگی ہے دوسرے انھیں منافع بھی حاصل ہوں گے۔

شیخ الہند نے "منافع لہم" کے حاشیے میں لکھا ہے :

"اصل مقصد تو دینی و اخروی فوائد کی تحصیل ہے، مثلاً حج وعمرہ اور دوسری عبادات کے ذریعے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا اور روحانی ترقیات کے بلند مقامات پر فائز ہونا ۔ لیکن اس عظیم الشان اجتماع کے ضمن میں بہت سے سیاسی تمدنی، اور اقتصادی فوائد بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں ۔ کما لا یخفیٰ "

حج، ایسی عبادت ہے جس میں جان اور مال راہ خدا میں بے چون وچرا پیش کرنا ہوتا ہے ۔ اونٹ کا سفر ہو یا ہوائی جہاز، موٹر ہو یا ریل کا بستر، لمبے سفر کی تکان، منزل پر قافلوں کا پڑاؤ، آسانیوں کی کمی اور مشقت کی زیادتی، حرم کے اندر کعبہ مکرمہ کے قریب ترین دائرہ میں طواف، صفا و مروہ کے تنگ راستے میں سعی ۔ جمراتِ ثلاثہ پر سنگریزے مارنا، منیٰ میں قربانی کرنا۔ اتنے سخت مراحل میں جہاں منطق و دولت کام نہیں آتی ۔ دھوپ کی شدت اور جگہ کی قلت، حاجیوں کی کثرت اور بھیڑ میں لوگوں کے دھکے ۔ شاہ و گدا سب کے لیے ہیں، کسی شخص کا اظہار، کسی کو مارنے برا بھلا کہنے کا اختیار کسی کو نہیں ۔ ایک لباس اور ایک جگہ اور ایک وقت اسی لیے تو معین ہوا ہے کہ خدا کے سامنے، خدا کے دنوں اور خدا کے شہر میں سب برابر ہیں ۔ مالک الملک، حاکم و مولیٰ، اللہ

ہے۔ دل سے ہر خیال نکال دیا جائے، نفس کو آئینۂ رضائے الٰہی بنا لیا جائے، خواہشات کچل کر گرم ریت پر پیشانی رکھ کر عرفات کے میدان میں حشر و نشر اور مشعر الحرام میں رات کو دن کرنے کا فریضہ، حساب کتاب قیامت کا نقشہ سامنے رکھنے کے لیے، توبہ، مناجات، طلب مغفرت و امید عطا، خوف خشیت، توجہ الی اللہ، سب سے دوری اور اللہ سے قربت کے جو عملی منازل حج میں ملتے ہیں، وہ اور کہیں نہیں ملتے۔ یہی تزکیہ نفس کی عملی تربیت ہے۔

حج، ایسی عبادت ہے جس کے ضمن میں تجارت و صنعت و اقتصاد کے فوائد حاصل کرنے کے جس قدر مواقع ہیں اس جیسا مسلمانوں کو اور کوئی دوسرا وقت میسر نہیں، پاکیزہ ماحول میں، پاک دل بھائی، خلوص سے کاروبار کریں، کاروبار کے بارے میں منصوبے بنائیں۔ لا ترکنوا الی الذین ظلموا۔ (ظالموں پر بھروسہ نہ کرو) کے اصول پر سوچیں تو قوم و ملت کی دنیا بدل جائے۔

حج، ایسی عبادت ہے جس کے ضمن میں جغرافیائی، علاقائی، لسانیاتی، نسلی رنگینیاں جمع ہوتی ہیں اور پھر ان کے درمیان سے اسلامی تمدن ابھرتا ہے۔ جیسے رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ جیسے کلمۂ توحید کے رشتے میں باندھ دیا گیا ہو، کالے، گورے، چھوٹے بڑے، شہری دیہاتی، مرد، عورت سب موجود مگر ایک دوسرے کو بری نظر سے دیکھنا حرام ہے۔ سب ایک جگہ ہیں یہاں ایک دوسرے سے حقارت کے طور پر الگ رہنا جائز نہیں۔ عرب کو عجم پر، گورے کو کالے پر، عربی بولنے والوں کو دوسری زبان بولنے والوں پر کوئی برتری نہیں۔ جاہلیت کے یہ رسم و رواج سرور دو عالم، نبی خاتم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے موقع پر ختم کر دیے تھے۔ بخاری و مجلسی نے اپنی اپنی کتب حدیث میں آنحضرتؐ کے یہ اعلان محفوظ کر رکھے ہیں۔ آنحضرتؐ بار بار یہ اعلان فرماتے اور موجود لوگ غیر حاضر لوگوں کو اس پیغام رسانی کا ذمہ دار بتاتے رہے۔ مگر آج بڑی طاقتوں سے مرعوب حکمران، قومیت و علاقائیت کا ڈھونگ عین حج میں رچاتے ہیں۔ چو کفر از کعبہ برخیزد ..... ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔

حج، ایسی عبادت ہے جس کے ضمن میں سیاسی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ سنت الٰہی دیکھیے اور سورۂ توبہ پڑھیے۔ حج کے دن حرم میں اللہ کی طرف سے نازل شدہ فرمان حضرت علیؑ پڑھ رہے ہیں:

"اذان من اللہ و رسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین ...."

اذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بریٔ من المشرکین ورسولہ، فان تبتم فھو خیر لکم وان تولیتم فاعلموا انکم غیر معجزی اللہ وبشر الذین کفروا بعذاب الیم ③

"اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تم لوگوں کو منادی کی جاتی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہے۔ تو مشرکو! اگر تم لوگوں نے توبہ کرلی تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر اب بھی منہ موڑ لیا تو یاد رکھو، کہ تم اللہ کو عاجز نہیں بنا سکتے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا۔ ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔"

ہمیں یقین ہے کہ قارئین محترم سورۂ براۃ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبات حج سے ایک مرتبہ پھر مستفید ہوں گے اور یقین کریں گے کہ حج اسلامی برتری اور مسلمانوں کے سیاسی، دینی، فوجی، سماجی اور تجارتی استحکام و آزادی کے حصول کا بہترین موقع ہے۔

بقول سید قطب:

"حج ایک جلسہ، ایک بڑی میٹنگ ہے۔ عوامی اجتماع ہے، اس کی غرض ہے باہمی تعارف، باہمی صلاح مشورے، پروگراموں کا مرتب کرنا۔ طاقت کی یکجائی، تجارتی مال، معلومات اور تجربوں کے تبادلے، کامل و ترقی پذیر عالم اسلامی کی وحدت و اتحاد کو ہر سال از سر نو منظم کرنا۔ اللہ کے حضور، بیت اللہ کے قریب۔ قریب و دور کی عبادتوں کے ساتھ، موجود و غیر حاضر یادوں میں، مناسب ترین جگہ۔ مناسب ترین فضا اور مناسب ترین دنوں میں۔

اسی بات کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا "لیشھدوا منافع لھم...."

ہر قوم اپنے حالات و امکانات، تجربوں اور تقاضوں کے مطابق فائدے اٹھائے۔

جس دن اللہ نے حج مسلمانوں پر فرض کیا اس کے بعض نکات یہ تھے۔ اور ابرہیم علیہ السلام کو اس کے اعلان و دعوت عام کا حکم ہوا تھا۔"

دیکھیے "تفسیر سید قطب" "فی ظلال القرآن" — تفسیر سید محمد حسین طباطبائی "المیزان" اور ترجمہ وحواشی مولانا محمود حسن — نیز ترجمہ وحواشی حافظ فرمان علی۔

۲

حج سنہ ۶۰ھ کا ایک بہت عظیم واقعہ امام حسین علیہ السلام کا حج کو عمرہ سے بدل کر سفر کربلا ہے، جس کا نتیجہ اسلام کی بقا اور دین و سیاست اسلام کا مکمل دستوری و عملی تعارف ہے۔ جس طرح حج ہر سال تربیت فکر و نظر اور راہ کردار و عمل کا تعین کرتا ہے۔ اسی طرح واقعۂ کربلا اس راہ میں نور و حرکت کی ضمانت دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے — اسرار و رموز — میں فکر و پیام کا ایک عنوان لکھا ہے۔

"در معنی حریت اسلامیہ و سرّ حادثۂ کربلا"

ہم محرم کی مناسبت سے اس نظم کے چند شعر اس لیے نقل کرتے ہیں کہ مجلۂ توحید کے بالغ نظر قاری فرزند رسولؐ کی سیاست و عبادت شہادت پر ایک مرتبہ پھر غور کریں اور اس واقعہ سے ہمیشہ عملی فوائد حاصل کرنے کی طرف توجہ رکھیں۔

ہر کہ پیماں با ہو الموجود بست — گردنش از بند ہر معبود رست
آں شنیدستی کہ ہنگام نبرد — عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد
آں امام عاشقاں پور بتولؑ — سرو آزادے ز بستان رسولؐ
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

. . . .

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے "لا الہ" گردیدہ است
مدعایش سلطنت بودے اگر — خود نہ کردے با چنیں ساماں سفر
دشمناں چو ریگ صحرا لا تعد — دوستانِ او بہ "یزداں" ہم عدد
سرّ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود!
عزم او چوں کوہساراں استوار — پائدار و تند سیر و کامگار
تیغ بہر عزت دین است و بس — مقصد او حفظ آئین است و بس
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیر ایں اسرار کرد! — ملت خوابیدہ را بیدار کرد

تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید — از رگ ارباب باطل خون چکید
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت — سطر عنوانِ نجات ما نوشت!
رمز قرآن از حسینؑ آموختیم — ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم
شوکت شام و فر بغداد رفت — سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

اے صبا، اے پیکِ دور افتادگاں
اشک ما بر خاکِ پاک او رساں

شکریہ

مجلہ توحید کی جو پذیرائی ہوئی ہم اس پر اللہ عزّ و جل کی بارگاہ میں شکرگذار ہیں۔ دنیا بھر سے دانشوروں نے تعریفی خطوط لکھے، ہمت افزا پیام بھیجے، توسیعِ رکنیت کا وعدہ کیا۔ اللہ ان دوستوں کو جزائے خیر دے۔ ہم اپنے تمام قدردانوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

- ادارہ -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝

ترجمہ :

اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو کہ میں نے تم کو جہانوں پر فضیلت دی تھی (۴۷) اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی ذات کسی شخص کے کام نہ آسکے گی اور نہ کسی شخص کی اس کے بارے میں سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کوئی "بدلہ" لیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی (۴۸)

۴۷۔ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا ....

دوبارہ پھر اولاد یعقوبؑ کو سابقہ اعزاز یاد دلائے جا رہے ہیں اور خدا کی دین کو جس طرح پامال کیا اس پر ناراضگی و سرزنش کی جا رہی ہے۔ آیت تاکید الذم بما یشبہ المدح ہے۔ دیکھئے ہیں تعریف حقیقت میں مذمت

عالمین پر فضیلت :

کسی قوم کے اتنے پیغمبروں کا تذکرہ قرآن نے نہیں کیا جس قدر بنی اسرائیل کے انبیا کا بیان کیا، اتنی تفصیل کسی قوم کے بارے میں نہیں جتنی روشنی اس قبیلے کے بارے میں موجود ہے لیکن پورے قرآن میں ان کا ماضی داغدار ان کا کردار سیاہ، ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی فساد سے بھرپور ہے، خدا نے زمین اچھی دی، اجداد اچھے دیے لیکن ان لوگوں نے ناقدری و سرکشی کی حد کر دی۔ زمین میں وہ حرکتیں کیں کہ ہمسر قوموں نے رہنے نہ دیا، اپنے انبیا کو ستایا اور قتل کیا دشمنی خدا و رسول و تحریف و توہین کا یہ حال ہے کہ موجودہ توریت، سفر پیدائش کے ۳۲ ویں باب میں ہے ـــ نقل کفر کفر نہ باشد ؛

— خدا نے یعقوبؑ سے کشتی لڑی مگر یعقوبؑ کو زیر نہ کرسکا ۔ کہنے لگا، اب مجھے چھوڑ دو —
جس قوم کو خدا نے وہ عزت دی ہو وہ قوم آج اپنے فکری و عملی زوال (معاذ اللہ) کے ہاتھوں کس قدر ذلیل ہے ۔ اتنی عزت کے بعد اتنی بڑی ذلت خدا کی پناہ ۔ اللہ کا قانون ہے : بانّ اللّٰه لم یك مغیراً نعمة انعمها علی قوم حتی یغیّروا ما بانفسهم ۔ سورۂ انفال کی ترپنویں آیت ہے کہ اللہ جس قوم کو کسی نعمت سے سرفراز کرتا ہے اسے اس وقت تک نہیں چھینتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر سے وہ صلاحیتیں گم نہ کر دے ۔

۴۸۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ ....

اس قیامت سے ڈرو جس کے چار صفات ہیں (الف) ایک دوسرے کے کام نہ آسکے گا ۔ (ب) کسی کی شفاعت قبول نہ ہوگی (ج) کسی کے بدلے کوئی فدیہ و ہدیہ نہیں لیا جائے گا (د) لوگوں کی مدد نہیں کی جاسکے گی ۔

شفاعت :

یہود و نصاریٰ عقیدۂ کفارہ و فدیہ کو اساس مانتے ہیں ۔ یہود کہتے ہیں ہم، انبیا کی اولاد ہونے کی بنا پر بخشے ہوئے ہیں، جزا و سزا کے مرحلے میں ان کے بزرگ کام آئیں گے ۔ نصاریٰ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام قوم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے ۔ ان کا سولی پانا فدیۂ گناہ گاران امت ہے ۔ بت پرست عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے ہدیے اور قربانیاں قیامت کے دن اعمال بد کا عوض بن کر نجات کا سبب بنیں گی ۔ ربی، پوپ، پنڈت مدد پہنچائیں گے ۔

قرآن ان عقائد کی نفی کرتا ہے ۔ ہم جو چاہیں کریں وہ ہماری بخشش کرادیں گے ۔ یہ عقیدہ اسلام کی نفی ہے، انبیاؑ کے تعلیمات کی نفی ہے ۔ دین، ہم سے عقیدہ میں علم و استواری چاہتا ہے ۔ حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا : اول الدین معرفته وکمال معرفته توحیدہٗ ۔ دین کا حرف اول عقیدۂ توحید ہے اور اس عقیدہ کا اعلان نماز ہے ۔ دین کی فکری اساس قیامت ہے اور قیامت یوم دین ہے ۔ وہاں ہر شخص کا عمل تولا جائے گا ۔ جس عمل میں توحید و عدل و نبوت و امامت و قیامت کی فکر قوت آفرین نہ ہوگی وہ عمل سبک اور بے فائدہ ہوگا ۔ لیکن اگر عقیدہ اہی عقیدہ ہے (اگرچہ اسلام بے عمل کے

عقیدہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا) تو نامۂ اعمال سادہ ہوگا۔ اسلام بات کا تو قائل ہی نہیں وہ کہتا ہے "لم تقولون ما لا تفعلون" جس پر عمل نہیں کرتے اسے کہتے کیوں ہو؟ اللہ کو مانتے ہو، اطاعت غیر اللہ کرتے ہو؟ کبر مقتا عند اللہ" قول بلا فعل پر اللہ کا عظیم غضب ہے۔ خدا کے احکام اور قانون شریعت بے مقصد تو نہیں ہیں، ان پر عمل کرنا ہی تکمیل انسانیت ہے۔ البتہ عمل کے درجے ہیں۔ بے جان عمل، جیسے جاہل کا عمل۔ جاندار عمل جیسے عالم کا عمل۔ رضاء خدا کا حامل و نمونہ، جیسے انبیاء و ائمہ علیہم السلام کا عمل۔ ان باعمل افراد کے عمل میں اللہ کی رحمانیت و رحیمیت بارش کرکے شادابی بخشے گی۔ رحمۃ للعالمین کی رافت و رحمت سہارا دے گی، ان کے لیے ان کی توجہ و صلوٰۃ ان کے لیے ملائکہ کی طلب مغفرت اور شافعین علیہم السلام کی شفاعت فائدہ مند ہوگی، مگر بطور قدر یہ نہیں۔

حضرت آیت اللہ خمینی نے "پرواز در ملکوت" میں لکھا ہے:

> اگر کسی کو شفاعت کی خواہش ہے تو اسے دنیا میں کوشش تمام کے ذریعے اپنے شفیعوں سے رابطے کو مضبوط رکھنا چاہیے اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ شافعین محشر عبادت و جفاکشی میں کس بلند درجہ پر فائز تھے۔ فرض کیجیے کہ اگر گناہوں کا بوجھ اور مظالم کا بار لاد کر دنیا سے گئے تو برزخ و قبر کے عذاب میں شفاعت کیسے ہوگی؟"

(مزید بحث آگے ملاحظہ فرمائیں) یعنی شفاعت کے ساتھ استحقاق شفاعت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ
سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ
ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ
وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

ترجمہ:

اور جب ہم نے تم کو فرعونیوں سے چھٹکارا دلایا جو تمہارے ساتھ بدترین اذیت ناک سلوک کرتے تھے، تمہارے (نومولود) لڑکوں کے سر کاٹتے اور

عورتوں (لڑکیوں) کو زندہ چھوڑ دیتے تھے ان حالات میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری سخت ترین آزمائش تھی (۴۹) اور (وہ دن یاد کرو) جب ہم نے سمندر میں تمہارے لیے راستہ بنایا اور تمہیں پار اتارا اور ہم نے فرعونیوں کو اس میں غرق کردیا اور تم دیکھ رہے تھے (۵۰)

۴۹۔ وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ....

یہاں سے انعام شماری کا باب شروع ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں یہودیوں کے کرتوت بیان ہوتے ہیں۔

۱۔ تاریخ کا کتنا بڑا واقعہ ہے کہ خاندانِ فراعنۂ مصر اپنے سیاسی و معاشی عروج پر تھا اور بنی اسرائیل اپنی بدکرداری کی وجہ سے بدترین زندگی گذار رہے تھے۔ انبیا کے ساتھ ان کے ناروا سلوک نے انہیں مبتلائے بلا کر رکھا تھا۔ ان کے مرد قتل اور ان کی عورتیں لونڈیاں ہو چکی تھیں۔ قبطی ان کے دشمن اور حکمران ان کے خون بہا رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو آزادی و نجات کی نوید دی اور فرعونیوں سے بچا کر انہیں مصر سے لے گئے۔ (سورۂ ابراہیم آیت ۶ نیز سورۂ قصص آیت ۴ میں مزید گفتگو آئے گی) اس نجات کو نعمت عظیم کہا گیا ہے۔

اس موقع پر توجہ طلب بات یہ ہے کہ دعویدارانِ خدائی فرعون نما افراد جب بھی عروج پاتے ہیں، دین کے قائد عوام کو ظلم سے نجات دلاتے ہیں۔ اور مثل ہے "ہر فرعونے را موسٰی" فرعون کے مقابل فرعون نہیں آتے۔ موسیٰ صفت ہی لوگ سامنے آتے ہیں۔

۵۰۔ وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ ....

بنی اسرائیل پر ایک اور تاریخی انعام یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر مصر سے چلے، رات آدھی ہو چکی تھی، حکومت سے بات چیت کے بعد کوئی خطرہ باقی نہ تھا چلتے چلتے صبح ہو گئی، روشنی جو ہوئی تو اسرائیلیوں کے حواس جاتے رہے ان کے پیچھے فرعون

بذاتِ خود فوج لیے تعاقب کر رہا تھا، سامنے سمندر پیچھے دشمن۔ یہ سمجھے کہ اب خیر نہیں، وہ سمجھا کہ اب بھاگیں گے کیسے؟ ادھر موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی پشت پناہی حاصل تھی، اشارۂ قدرت ہوا کہ بحرِ قلزم کی سطح پر عصا مارو، راستہ ہم دیں گے۔ پانی کی دیواروں کے درمیان قوم اتری تو زمین خشک تھی۔ سب کے سب سمندر پار ہو گئے۔ فرعون نے بھی ساتھیوں سے کہا انھی راہوں میں اتر چلو وہ اترے تو سب غرق ہو گئے۔

اے بنی اسرائیل اگر موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہو، اور اتنے بڑے فضل و انعام خدا کو نہیں بھولے تو محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ توریت میں تو ان کی بشارت پڑھ چکے ہو۔ قرآن مجید پر غور کرنے والے کم از کم یہ تو محسوس کر سکتے ہیں کہ دین کی راہ میں سامنے آنے والے مشکلات سے وہ نہیں ڈرتے جو انبیا کے دستور پر چلتے ہیں خدا ایسے لوگوں کی مدد اس عالم میں کرتا ہے جب نہ راہ رفتن ہو نہ پائے ماندن۔

سورۂ اعراف، آیت ۱۳۶ ــ انفال ۵۴۔ اسرا ؛ ۱۰۳، شعراء ؛ ۶۳ و ۶۶ زخرف ۵۵، دخان ؛ ۱۷ اور بعد میں یہ واقعہ آرہا ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ :

اور (وہ وقت) جب ہم نے موسیٰ ؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، اور تم نے

ان کی غیر حاضری میں بچھڑے کو خدا بنا لیا حالانکہ تم اپنے اوپر ستم ڈھا رہے تھے (۵۱) ہم نے اس کے بعد بھی تم کو معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو (۵۲) اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان (حق کو باطل سے جدا کرنے والی کتاب) سے نوازا تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ (۵۳) اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا، اے قوم! تم نے بچھڑے کو خدا بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا، اب تم لوگ اپنے خالق سے توبہ کرو اس کے بعد اپنے لوگوں کو قتل کرو۔ تمہارے پیدا کرنے والے کی بارگاہ میں تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ پھر اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے (۵۴)

۵۱۔ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰی ....

۵۲۔ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ....

۵۳۔ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ ....

۵۴۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ....

گائے کی پوجا اور اس کی سزا

خدا کے عظیم احسانات میں ایک تورات بھی ہے۔ لیکن بدنصیب قوم نے آمدِ توریت سے آج تک اس کا احترام نہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے لیے طلبِ خدا سے طور پر جانے لگے تو ہارون کو اپنا وزیر و جانشین بنا گئے حضرت موسیٰ کے جاتے ہی قوم خوب کھل کھیلی، کسی نے جناب ہارون کی نہ سنی۔ لوگوں نے سونا چاندی جمع کر کے ایک شخص کو دیا۔ اس نے گائے کا بچہ بنایا اور ترکیب ایسی رکھی کہ وہ مجسمہ آواز بھی دیتا تھا۔ کسی نے کہا اسے پوجو! معاصر قومیں پوجتی ہی تھیں یہ بھی لگے پوجا کرنے۔

طور پر چالیس دن رات گذرنے کے بعد جناب کلیم اللہ کو توریت عطا ہوئی جس کا نام "الکتاب" اور "الفرقان" بھی تھا۔ یہ کتاب حق و باطل کے امتیازات اور حلال و حرام، احکام و عقائد پر مشتمل تھی، حضرت جب تورات لے کر واپس آئے تو جس قوم کو پہلے سے سب کچھ سمجھا گئے تھے اسے معروفِ بت پرستی دیکھ کر سخت ناراض ہوئے۔ لوگ گھبرائے، معذرت کی تو اس ارتداد اور جرم کی سزا یہ سنائی

کہ سب لوگ غسل کریں کفن پہنیں اور گنہ گار صف بستہ ہوں اور اپنے ہاتھوں سے اپنے عزیزوں کو قتل کریں۔ مجبوراً ایک نے دوسرے پر مدجاری کرنا شروع کردی۔ کچھ دیر کے بعد فرمایا: جاؤ، توبہ قبول ہوئی۔ اب نعمتوں کی ناشکری نہ کرنا۔

نبیؑ کے سامنے وصی نبی کے منع کرنے پر اہل توحید کا بت پرست ہونا قابل گردن زدنی فعل ہے اور جب قوم فکری و اعتقادی وعملی گمراہی میں اس حد تک اتر جائے تو گنہ گار اور خاموش تماشائی دونوں کو ایک ہی سزا دینا، اللہ کی حکمت کے مطابق ہے۔ (مزید گفتگو سورۂ اعراف و سورۂ طٰہٰ میں آئے گی۔

وَاِذْ قُلْتُمْ

يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہم ہرگز تم پر ایمان نہ لائیں گے مگر یہ کہ اللہ کو عیاں دیکھ لیں۔ عین اسی حالت میں ایک کوندے نے تمہیں آ لیا اور تم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے ﴿۵۵﴾ پھر ہم نے تمہیں موت کے بعد زندگی بخشی کہ تم اس نعمت ہی پر شکر خدا بجا لاؤ ﴿۵۶﴾

۵۵۔ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ ....

۵۶۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ....

رؤیتِ باری تعالیٰ

یہودیوں کی گستاخی اور اللہ کی سزا، گناہِ عظیم، پھر تباہی۔ اس کے بعد دوبارہ رحمت کا نزول دیکھیے، جو لوگ کلیم اللہ کے ساتھ میقات میں گئے تھے انھوں نے طور کے قریب پہنچ کر خدا کو بچشم خود دیکھنے کا مطالبہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جسم و ترکیب و محدودیت سے پاک ذات کو کوئی

کیسے دیکھ سکتا ہے اور وہ کیسے نشانۂ نگاہ بن سکتا ہے، اگر نظر کی شعاعیں کسی کو مس کرلیں تو وہ اللہ کیسے کہا جا سکتا ہے، ایک محال خیال اور باطل تصور اور مہمل مطالبہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے سمجھایا وہ نہ مانے، آخر اس کی سزا یہ ملی کہ ایک زبردست کڑک ہوئی اور ایک شعلہ نے سب کو بھسم کردیا تاکہ آئندہ یہ سوال زبانوں پر نہ آئے۔ پھر دوبارہ انھیں زندگی بخشی، کہ دوسروں کو آپ بیتی سنائیں اور پیغمبروں کے حکم سے سرتابی چھوڑ دیں۔

رجعت:

جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کا مرنا اور دوبارہ مبعوث ہونا، اسی زمین وزمان کی بات ہے اور قرآن اس کا ترجمان ہے، جس کا انکار مسلمان کے لیے دشوار ہے۔ فخر کلیم کے زمانے میں اگر یہی عمل رجعت ہو تو انکار پر اصرار بے معنی ضد ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ رویت باری اور اللہ عز اسمہ کو دیکھنا محال ہے مگر سب کا مرنے کے بعد جی اٹھنا محال نہیں ہے۔

(سورۂ نساء کی آیت ۱۵۳ بھی ملاحظہ کریں)

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ
اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا
حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ ڈالا اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ اتارا (کہ تمھاری پذیرائی کرنا تھی) پاکیزہ روزی جو تمھیں دی ہے اسے کھاؤ۔ اور ان لوگوں

نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ خود اپنی جانوں پر ستم ڈھایا (۵۷) اور جب ہم نے کہا اس بستی میں داخل ہو اور اس میں جہاں سے چاہو، جو چاہو خوب کھاؤ پیو اور دروازے میں سجدہ کرکے (جھک کر) جاؤ اور "حِطَّۃٌ" کہنا۔ ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور نیک عمل لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دیں گے۔ (۵۸) جو بات ان سے کہی گئی تھی ظلم کرنے والوں (بدکرداروں) نے اسے بدل دیا۔ پھر جیسی وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے اس کے بدلے ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا (۵۹)

۵۷ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ ....

بنی اسرائیل فرعون کی مملکت سے نکل کر فلسطین کی طرف چلے تو حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا، فلسطینیوں سے جنگ کرنا ہوگی، ان لوگوں نے بڑی بے ادبی و گستاخی کے جواب دیے، (سورۂ المائدہ ۲۰، ۲۱، ۲۲) خدا نے اس گستاخی پر صحرائے سینا میں انھیں سرگردانی کی سزا دی چالیس سال کے بعد ان کے رونے گڑگڑانے پر معافی ملی۔ اس آیت میں اس وقت کے دو انعام یاد دلائے گئے ہیں ۱۔ لگاتار سرگردانی، صحرا، دھوپ اور مجبوری کے عالم میں اچانک بادلوں کا سایہ دیا گیا۔ ۲۔ بے سروسامانی میں "من وسلویٰ" سے نوازا، بہترین غذا مرحمت ہوئی۔

من: خاص انعام و احسان، وہ شہد جو پہاڑیوں میں چھتہ لگانے والی مکھیوں نے جمع کیا انہیں اچانک ملا۔ یا شبنم کی طرح فضا سے برسنے والا مادہ جو روٹی کی طرح جمتا تھا۔

سلویٰ: بھنے ہوئے پرندے۔ یا حبشہ و افریقہ سے بھاگ کر آنے والے طائر جو اس وقت بنی اسرائیل کے لیے نعمت غیر مترقبہ بنے۔

اللہ نے جو سزا دی تھی وہ خود ان کے کرتوت اور ان کے ناروا سلوک کی وجہ سے تھی، انہوں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔

---

[1] سورۂ مائدہ میں اس کی تفصیل آئے گی، سردست "دائرۂ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے "تیہ یا فحص التیہ" کی جغرافیائی حیثیت نقل ہے: "جزیرہ نمائے سینا کے اندرونی حصے میں ایک صحرا کا نام جو ملک شام و مصر کے درمیان حد فاصل ہے۔ یہ صحرا فلسطین کا انتہائی جنوبی علاقہ ہے جبکہ مشرق میں یروشلم ہے پتھریلی اور ریتلی زمینیں ہیں۔ نمک کی دلدلیں بھی ہیں اور سنگ سرخ کی پہاڑیاں بھی چشمے بھی ہیں اور کھجور کے درخت بھی۔

۵۸۔ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا . . . .

۵۹۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا . . . .

ایک اور نعمت کا تذکرہ ہے۔ سفر کی ایک بڑی منزل آئی، تھکی ہوئی قوم کو بستی تک پہنچایا اور ان سے کہا: بستی میں داخل ہو، مگر جب سرحد اور دروازے پر پہنچنا تو سجدہ کرکے اور حِطَّۃٌ کہہ کر اندر جانا، وہاں اسباب زندگی مہیا ہیں خوب کھانا پینا، راحت آرام سے رہنا سہنا مگر قوم کا مزاج ہی ٹیڑھا تھا، جو ان سے کہا گیا تھا اس کے بجائے کچھ اور ہی بکنے لگے وہ جملہ ہی بدل دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کی بدکرداری کی سزا دی اور آسمان سے رجز برسا، ذلت و خواری مقدر ہوئی۔

قریہ: اریحا۔ یا اس سے پہلے کی کوئی منزل جس کا نام لینا قرآن نے ضروری نہیں سمجھا کیونکہ قرآن حکایات و واقعات کے بجائے صرف وہ اجزا بیان کرتا ہے جس سے فکری، اخلاقی، معاشرتی اور دینی نکتہ روشن ہو۔

حطّۃ: اترنا، بوجھ کا نیچے آنا۔ گناہوں کا دور ہونا۔ سر جھکانا۔ نئے مفسر کہتے ہیں کہ مراد شہری اور معاشرتی قوانین کو تسلیم کرنا ہے۔ اب تک جنگلوں صحراؤں میں رہتے تھے آزادہ روی کا دور ختم ہوا، اب قانون کی حد بندی میں داخلہ ہے تو اقرار احترام قانون کرو۔

معصوم نے فرمایا ہے "ہم بابِ حطّہ" ہیں۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہم شہر قانون اسلام و شریعت کا دروازہ اور سر تسلیم خم کرنے کی جگہ ہیں۔ "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" سے مراد چوکھٹ بازو اور دو پٹوں سے کھلنے والا دروازہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے نعمت دی انھوں نے شرطِ نعمت کو ٹھکرایا تو انھیں اللہ نے عزتوں سے محروم کردیا۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ

مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ كُلُوا
وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ وَإِذْ
قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ
بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ
اللَّهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ
النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝

اور (وہ وقت بھی یادگار تھا) جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے حکم دیا کہ (خاص) پتھر پر اپنا عصا مارو۔ اس کے بعد ہی بارہ چشمے اس پتھر سے پھوٹ بہے، ہر ایک (قبیلے) نے اپنا چشمہ پہچان لیا۔ اللہ کی روزی سے کھاؤ، پیو (مگر) زمین میں تباہ کاری نہ پھیلاؤ (۶۰) اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی خوراک پر تو ہرگز اکتفا نہیں کر سکتے۔ آپ اپنے خدا سے کہیے کہ زمین سے اگنے والی سبزیاں جیسے ساگ پات، ترکاری (گیہوں)، لہسن، مسور، پیاز۔ (ہمیں دے)۔ موسیٰؑ نے کہا: گھٹیا درجے کی چیز سے بہتر کو بدلنا چاہتے ہو؟ (تو پھر) کسی شہر میں پڑاؤ کرو وہیں تمہاری طلب کی چیزیں ملیں گی۔ اور ان پر رسوائی اور محتاجی کی پھٹکار پڑی۔ اور وہ سب خدا کے غضب کی زد پر آ گئے۔ کیونکہ وہ آیاتِ الٰہی کو مانتے نہ تھے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ سبب یہی تھا کہ نافرمانی اور تجاوز کاری کو پیشہ بنا چکے تھے (۶۱)

۶۰۔ وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ ....

یہ دسواں احسان ہے جو امت موسیٰؑ پر ہوا۔ کہ صحرا نوردی میں قافلے پیاس سے تڑپنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ سے طلب آب میں اصرار بڑھا یعنی صبر نہ کر سکے، جناب موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی حکم ہوا اپنا معجز نما عصا فلاں پتھر پر مارو! خدا نے بارہ اسباط کے لیے بارہ چشمے بہا دیے۔ تاکہ ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمے سے پانی پیے اور راستے میں جھگڑا نہ کریں، بفراغت کھائیں، پییں۔ فساد میں مبتلا نہ ہوں۔ اللہ فساد کو بہت ناپسند فرماتا ہے۔

دریائے نیل عبور کرتے وقت عصا نے سطح آب میں بارہ راستے بنائے اور یہاں پتھر سے بارہ چشمے۔ منکرین معجزہ نے بنی اسرائیل کی طرح وہاں جھگڑا کیا کہ صاحب وہ آبنائے تھی، دڑے سے نالے گذرتے تھے۔ ان نالوں میں راستے تھے۔ اب یہاں بھی کہا کہ موسیٰؑ لکڑی ٹیکتے پہاڑ پر چڑھے نیچے اترے تو پانی کے چشمے رواں تھے۔ قرآن مجید کا اسلوب اور انعام شماری کا طریقہ بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ نے خاص انعام اور خرق عادت احسان کے طور پر کیا تھا، آخر خدا کے قادر ماننے میں پس و پیش کیوں کیا جائے۔

۶۱۔ وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ ....

ایک مرتبہ پانی نہ ملنے پر احتجاج تھا، اب وہ موقع آیا کہ بہترین غذا ملنے سے دل تنگ ہیں۔ "لن نؤمن" اور "لن نصبر" لہجے کی درشتی پر دلیل ہے۔ ہم من و سلوی پر ہرگز اکتفا نہیں کر سکتے، لہسن پیاز، چاہیے، چنا، مسور کھانے کو دل چاہتا ہے (فوم کے معنی لہسن گیہوں، چنا ہر وہ دانہ جس سے روٹی پکائی جا سکے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا صبر و تحمل، درس ہدایت ہے کہ رہنما کو قوم کی سرکشی کے باوجود کس حد تک صابر و متحمل ہونا چاہیے۔

حضرت موسیٰؑ نے سمجھایا، ارے اتنی عمدہ نعمتوں کو چھوڑ کر کیا مانگ رہے ہو؟ سوچو تو ذرا۔ مگر نہ مانے۔ تو کہا اچھا پھر شہر میں رہو، وہاں روز نئی چیز ملے گی۔ مگر آزادی کے بجائے پابندی اور خود مختاری کے بجائے غلامی نصیب ہوگی اور بنی اسرائیل تھے بھی اسی قابل۔ انبیا کو ستانا، انھیں قتل کرنا خدا کی نافرمانی کے بعد ان کا نام زشت و زبوں ہونا ہی چاہیے تھا۔

جناب احمد حسنی

نظام دفاع وجہاد قرآن کریم کی روشنی میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ ناصر المظلومین، مبیر الظالمین، مدرک الهاربین، ولی المؤمنین وصلّی اللہ علی رسولہ رحمۃ للعالمین القائم بالسیف والسنان لاعلاء الدین:

کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبّوا شیئاً وھو شرّ لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون (بقرہ - ۲۱۶)

اس مقالے کا موضوع ہے "نظام دفاع وجہاد قرآن کی روشنی میں"۔ جہاد و دفاع سے متعلق مسائل کے بارے میں گفتگو سے پہلے خود ان دو لفظوں کی تشریح وتفسیر ضروری ہے۔ دفاع سے مراد ہر اس چیز کی حفاظت کی خاطر جارح کو پیچھے ڈھکیلنا ہے جس کی حفاظت ضروری ہو، خواہ وہ چیز جان ہو یا مال، عقیدہ ہو یا آزادی، ناموس ہو یا شرف۔

قانونی (حقوقی) نقطہ نظر سے دفاع ایک حق ہے جو انسان کو عطا کیا گیا ہے تاکہ قانون کو پس پشت ڈال کر تجاوز کرنے والے جارح کے شر سے اپنا دفاع کر سکے، اور شر پسند افراد حکومت کی غیر حاضری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قانون شکنی کر کے عوام کی جان ومال اور عزت وآبرو سے نہ کھیل سکیں۔

دفاع فطری حق ہے۔

اپنے جائز حق کا دفاع ایک ایسا فطری امر ہے جس سے صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر

ذی روح بہرہ مند ہے، کیونکہ ہر ذی روح اپنی بقا کی خاطر مجبور ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کو دوسری مخلوقات میں پائے جانے والے امکانات سے پورا کرے اور ان تمام مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرے جن سے اس کی زندگی و بقا خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کا دارو مدار ان افعال و انفعالات (عمل و ردعمل) اور تاثیر و تاثر پر ہے جو نظام خلقت میں انجام پاتے ہیں۔ ایسے میں اختلاف اور ٹکراؤ قدرتی بات ہے۔ اگر کوئی ذی روح مخلوق دفاعی طاقت سے محروم ہو تو اس کی موت و تباہی یقینی ہے۔ اسی لیے خداوند عالم نے ہر مخلوق کو اس کی مناسبت سے دفاعی ہتھیار عطا کیے ہیں، تاکہ اپنے جائز حق کا دفاع کر سکے، ہر حق کے ہمراہ حق دفاع بھی ضروری ہے، ورنہ جس حق کی کوئی ضمانت نہیں وہ بے اثر و بے معنی ہو جائے گا۔ حق دفاع کا فطری ہونا اس کی عام مقبولیت کا باعث ہے۔ ہر انسان اس فطری حق کو تسلیم کرتا ہے، ہر فرد، ہر معاشرہ، ہر دبستان اور ہر قانون، جارح سے مقابلہ جائز قرار دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون مسلّمہ حقوق سے دفاع کو جرم نہیں سمجھتا۔ اسلام نے بھی انسانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے، اس کے استعمال کو مذاہب توحیدی نیز انسانوں کی بقا کا ضامن قرار دیا ہے اور اس کے فطری ہونے کا اعلان کیا ہے:

ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض (بقرہ - ۲۵۱)

یہ آیت انسانوں کو شرپسندوں کے شر کی سرکوبی کی ہدایت کرتی ہے اور فساد زمین یعنی روئے زمین پر انسانوں کے برپا کیے ہوئے فتنہ و فساد کی روک تھام کا حکم دیتی ہے۔ ایک دوسری آیت میں ہے۔

ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللّٰہ کثیرا (حج - ۴۰)

قرآن مجید اس دفاع کو دینی مظاہر اور عبادتی مراکز کی بقا اور نتیجتاً بقائے توحید کا باعث سمجھتا ہے۔

معنی جہاد

لفظ جہاد کے لغوی معنی ہیں طاقت و اختیار کے ساتھ جد و جہد ، قرآن مجید

ں بھی لفظ جہاد اسی معنی میں متعدد بار استعمال ہوا ہے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا (عنکبوت - ۶۹)

لیکن ثانوی طور پر اس سے مراد اسلام دشمنوں سے جنگ اور راہ خدا میں مال وجان کو قربان
ردینا ہے۔

ان الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ (انفال - ۷۲)

فقہ میں جہاد کبھی دفاع کے بجائے استعمال ہوتا ہے یعنی کفار سے وہ ابتدائی جنگ ہے جس کا مقصد
ہے کہ وہ کفر کو چھوڑ کر خدائے واحد پر ایمان لائیں اور نظام الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔
لفظ کبھی کفار سے مطلق جنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں دفاع بھی شامل ہے۔ قرآن مجید میں جہاد
ے یہی عمومی معنی مراد ہیں اگرچہ اس کا اہم ترین مصداق دفاع ہے یا اس کے تمام مصداق دفاع پر ہی دلالت
رتے ہیں۔

قسام جہاد

جہاد کی متعدد قسمیں ہیں جو غالباً دفاع ہی کی حیثیت رکھتی ہیں اور قرآن مجید میں قتال وجہاد کے عنوان
ے بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ ان دشمنوں کے مقابلے میں اسلام کے عزّ و وقار اور حیثیت و آبرو کا دفاع جو دین کی بنیادوں
و منہدم کر کے الحاد و مجوسیت و نصرانیت و یہودیت وغیرہ کی شکل میں کفر و لادینی پھیلانا چاہتے ہیں۔ جیساکہ
سپین میں رونما ہوا۔

۲۔ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو یا اسلامی سرزمین پر اس حملہ آور دشمن کے مقابلے
ں دفاع جس کا مقصد اسلام کی تباہی تو نہیں لیکن جن کا ہدف مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال ہو۔

۳۔ ان مسلمان بھائیوں کا دفاع جو کسی علاقے میں کافروں سے برسر پیکار ہوں اور یہ خطرہ
و کہ کفار ان پر غلبہ پالیں گے۔ ایسے موقع پر اتحاد و اخوت اسلامی کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے دفاع کی
اطر دشمنوں سے جنگ کی جائے۔

۴۔ اسلامی علاقوں پر قابض یا مسلمانوں کے عقائد پر مسلط غاصب دشمنوں کی پسپائی اور
راج کے لیے جہاد، کیونکہ غیروں کے اقتدار سے نجات اور مسلمانوں کی عزت و آزادی کی بحالی تمام مسلمانوں

کا فریضہ ہے۔

۵۔ کفار سے جہاد تاکہ باطل عقائد سے چھٹکارا دلا کر انھیں اسلامی تعلیمات سے آراستہ کیا جائے۔ اسے اصطلاحاً جہاد ابتدائی بھی کہا جاتا ہے۔ اس جہاد کے لئے کچھ خاص شرائط ہیں جن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

اہمیت جہاد

میری مختصر تحقیق کے مطابق قرآن مجید میں ۱۷ سورتوں میں جہاد کا ذکر آیا ہے اور یہ سورے غالباً مدنی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ بقرہ ۲۔ آل عمران ۳۔ نساء ۴۔ مائدہ ۵۔ انفال ۶۔ توبہ ۷۔ نحل ۸۔ حج ۹۔ نمل ۱۰۔ احزاب ۱۱۔ شوریٰ ۱۲۔ محمدؐ ۱۳۔ فتح ۱۴۔ حدید ۱۵۔ حشر ۱۶۔ ممتحنہ ۱۷۔ صف

تقریباً ۴۰۴ آیتیں جہاد سے مخصوص ہیں (البتہ بعض دیگر موضوعات کی طرح آیات جہاد کا مکمل احصاء مشکل ہے، کیونکہ یہ عام طریقہ ہے کہ جب قرآن مجید کسی موضوع کو چھیڑتا ہے تو کچھ باتیں بطور مقدمہ بیان کرتا ہے اور کبھی کسی مناسبت سے بیچ میں کچھ دوسری باتیں بھی بیان ہو جاتی ہیں اور پھر تتمۂ کلام میں بھی موضوع کی مناسبت سے کچھ دوسرے مسائل کا ذکر آجاتا ہے جیسا کہ جہاد و انفاق و ولایت سے متعلق آیتوں میں ابتدا، یا وسط یا آخر میں کچھ دوسرے مسائل کا بھی تذکرہ ہوا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں مسائل کے لحاظ سے آیات کی صحیح تدوین اور موضوعات کی مناسبت سے جداگانہ عنوانوں کے تحت اُن کی تقسیم و اصناف بندی مشکل ہے)

آیتوں کی یہ کثیر تعداد اور ان میں انتہائی سخت، ولولہ انگیز اور حتمی گفتگو، سزا و جزا کے وعدے اور دھمکیاں اور طرح طرح کی تاکیدیں جہاد کی عظمت و اہمیت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ بطور نمونہ حسب ذیل آیتوں کو ملاحظہ فرمایئے:

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون (بقرہ ۔ ۱۵۴) ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول

والذین آمنوا معه متیٰ نصر الله (بقرہ - ۲۱۴) ولا تھنوا ولا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین - ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ (آل عمران ۱۳۹-۱۴۰) ولا تھنوا فی ابتغاء القوم ان تکونوا تالمون فانھم یالمون کما تألمون (نساء - ۱۰۴) یا ایھا الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم (مائدہ - ۵۴) الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم (توبہ - ۳۹)

جہاد کی تشریعی اور فطری حیثیت

جہاد کی مذکورہ بالا پانچ قسموں میں سے چار دفاعی حیثیت کی حامل ہیں اور قدرتی طور پر دفاع فطری حق ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، دنیا کی کوئی منطق مسلمانوں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتی، قرآن کریم بھی اس کی پرزور حمایت کرتا ہے، جہاد سے متعلق پہلی آیتیں جو نازل ہوئیں وہ سورۂ حج کی آیتیں ہیں، جو اس تعبیر سے شروع ہوتی ہیں:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا (حج - ۳۹ - ۴۰)

اس آیت میں مظلوم کو حملہ آور دشمن سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے تاکہ وہ دشمن کو دفع کر کے توحید کے مظاہر اور آثارِ شریعت کی حفاظت کر سکے۔ اسی طرح ایک دوسری آیت ہے، جسے جہاد سے متعلق اولین آیتوں میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ بعض مفسرین اسے جہاد کے سلسلے کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں، وہ یہ ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (بقرہ - ۱۹۰)

اس آیۂ کریمہ میں جنگ کی آگ بھڑکانے والوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاد سے متعلق تقریباً تمام آیتیں اسی دفاعی جنگ کے بارے میں ہیں، صرف ایک ایسی آیت ہے جو مطلق ہے۔ اور اس سے ابتدائی جہاد مراد لیا جاسکتا ہے (شاید بعض دوسری آیتوں کو بھی بطور شہادت پیش کیا جاسکے) وہ آیت حسب ذیل ہے:

یا ایھا الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظۃ (توبہ۔۱۲۳)

یہ آیت کافر پڑوسیوں سے جنگ کا حکم دیتی ہے اور قدرتی بات ہے کہ اسلام کی توسیع کا راستہ بھی یہ ہے کہ قریب ترین مقام سے اس کی اشاعت شروع ہو اور تدریجاً پوری دنیا میں پھیل جائے ہم آئندہ بحث میں مقاصد جہاد کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے جہاد ابتدائی کے فطری ہونے پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

مقاصد جہاد

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر، جہاد کے جو مقاصد بیان فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دفاع: قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (بقرہ۔ ۱۹۰)

۲۔ دفع فتنہ، یہ عام معنی میں مستعمل ہے۔ اس میں دفاع بھی شامل ہے: وقاتلوھم حتّٰی لاتکون فتنۃ (بقرہ۔ ۱۹۳)

۳۔ حکومت الٰہی کا قیام و اثبات اور سرکشوں کی سرکوبی و اصلاح: وقاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للّٰہ (انفال ۳۹) الذین عاھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ وھم لا یتقون (انفال ۵۶) فقاتلوا ائمۃ الکفر انّھم لاایمان لھم لعلھم ینتھون (توبہ ۱۲)

۴۔ الٰہی نظام کی برقراری اور ممکنہ آئندہ دشمنوں کے حملے کی پیش بندی: قاتلوا الذین لایؤمنون باللّٰہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ما حرم اللّٰہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون (توبہ ۔ ۲۹)

توحید ۳۰

۵۔ روئے زمین پر فتنہ و فساد کی روک تھام: ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض (بقرہ۔ ۲۵۱)

۶۔ مراکز عبادت اور دینی مظاہر کا تحفظ: ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد (حج ۔ ۴۰)

۷۔ احقاقِ حق و ابطالِ باطل: لیحق الحق ویبطل الباطل ولوکرہ المجرمون (انفال ۔ ۸)

۸۔ انسدادِ ظلم وحمایتِ مستضعفین: انما السبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق (شوری ۔ ۴۲) وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان (نساء ۔ ۷۵)

ان عنوانات کے تحت جہاد کے اغراض و مقاصد قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ البتہ ان میں کچھ ایسے مقاصد بھی ہیں جو دوسرے مقاصد کے ضمن میں پورے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی جہاد کا مقصد انسان کے فطری اور مسلمہ حقوق کا دفاع ہے۔ یعنی مسلمانوں کی عزت و آبرو، جان و مال اور اسلامی سرزمین کا تحفظ و دفاع۔

اس طرح دفاع کے عنوان سے ابتدائی جہاد کی بھی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ عظیم محقق و مفسر علامہ طباطبائی مرحوم کے بقول: توحید اور توحیدی نظام فطری بنیادوں پر استوار ہے اور اصلاح بشریت کا واحد راستہ ہے فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا، لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم (روم ۔ ۳۰) اس کے بعد کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ اسی اساس توحید اور نظام توحید کے لئے تمام انسان مل کر سعی کریں کیونکہ یہ مقصد سب سے بڑا فطری حق ہے

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسی وعیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (شوری ۔ ۱۳)

عقلائے عالم کے نقطہ نظر سے عظیم ترین فطری حق حق حیات ہے یعنی معاشرے پر حاکم قوانین کے زیر سایہ زندگی گذارنا، ایسے قوانین جو افراد کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس حق کا دفاع بھی فطری حق اور اس کے تحفظ و بقاء کا ضامن ہے، اگر حق دفاع نہ ہو تو حق حیات بھی مستکبروں کے ہاتھوں پامال ہو جائے گا۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع (حج - ۴۰)

اگر خدائی نظاموں پر مستکبرین کی جارحانہ دست درازی کو روکنے کے لئے دفاعی طاقت
نہ ہو تو دین یعنی وہی فطری حق جس کے سماجی مظاہر، مسجد و کلیسا جیسے عبادتی مراکز ہیں، نیست
و نابود ہو جائیں گے اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

سورہ انفال کی آیتیں واضح الفاظ میں بتاتی ہیں کہ اگر موحدوں کا دفاع نہ ہو تو حق پرستوں
تاک میں کمین گاہوں میں بیٹھے ہوئے مجرم، حق کی جگہ باطل کو رائج کر دیں گے۔ یہ جہاد ہے جو
کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔

لیحق الحق ویبطل الباطل ولو کرہ المجرمون (انفال - ۸)

اسی طرح حاملان توحید کے عنوان سے مسلمانوں کی حیات جو درحقیقت حیات توحید ہے جہ
فی سبیل اللہ کی رہین منت ہے۔

استجیبوا اللہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (انفال ۲۴)

جہاد ایک فطری حق ہے خواہ تحفظ مسلمین کی خاطر ہو یا دفاع اسلام کے عنوان سے ہو
ابتدائی جہاد کی صورت میں کہ یہ ان ملکوں میں جہاں جابروں کے دباؤ کی وجہ سے فطرت الٰہی کا دم گھ
رہا ہو، اسے زندہ اور اس شرک کو نابود کرنا چاہتا ہے جو فطرت کی موت اور توحید کے حسین چ
کے ماند پڑ جانے کا باعث ہے (ویبطل الباطل)

اس مقدمے کی بنا پر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اپنے پیرؤوں کو حق دیا ہے ک
، دنیا کو شرک اور اس کی تمام نشانیوں سے چاہے وہ جس روپ میں ہوں پاک کریں اور فطر
توحید کو زندہ کریں۔ قرآن مجید نے بھی مسلمانوں سے اس کا وعدہ کیا ہے۔

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (انبیاء

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض
کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی
لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً یعبدوننی لا یشرکون
بی شیئاً (نور - ۵۵)

جملہ" یعبدونني لایشرکون بي شیئا" بہترین دلیل ہے کہ شرک اور اس کے تمام مظاہر کی تباہی ضروری ہے تاکہ توحید کا اخلاص دلوں میں جاگزین ہو۔

یا ایها الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یاتی الله بقوم یحبهم ویحبونه اذ لة علی المومنین اعزة علی الکافرین یجاهدون فی سبیل الله ولا یخافون لومة لائم (مائدہ - ۵۴)

یہ آیت ان مجاہدوں کا تذکرہ کر رہی ہے جو ہر طرح کی سرزنش و ملامت سے بے پرواہ کامل خلوص کے ساتھ شرک سے روئے زمین کو پاک کرتے اور سارے عالم میں کلمۂ حق کا پرچم بلند اور ایفائے وعدۂ الٰہی کا فرض ادا کرتے ہیں۔

ان مقدمات سے اس بات کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ مشرکوں کو دعوت توحید دینے کے لئے جہاد ابتدائی ایک مشروع اور فطری حق ہے جب رسالت کی طرف سے پیغام رسانی اور دعوت، تنبیہ اور بشارت، اتمام حجت اور دعوت حسنہ، روشن آیات حق کی پیش کش اور حق و باطل میں امتیاز وغیرہ کی تمام عقلی و منطقی کوششیں ناکام ہو جائیں تو ظالموں اور مستکبروں کی سرکشی نافرمانی کو کچلنے کے لئے اسی حق کا مجبوراً استعمال کیا جاتا ہے، یہ حق صرف دین سے مخصوص نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا فطری امر ہے جسے تمام قومیں تسلیم کرتی ہیں، جب عوام کسی نظام کو مان لیتے ہیں اور معاشرے کی اصلاح و ترقی کے لئے کوئی نظام قبول کر لیا جاتا ہے تو ایسے سرکش و نافرمان افراد کے لیے جو ارشاد و ہدایت کے بعد بھی اپنی سرکشی و نافرمانی سے باز نہیں آتے۔ اس حق کا استعمال جائز سمجھا جاتا ہے تاکہ وہ قانون کی برتری تسلیم کریں جب ہر نظام کو یہ حق حاصل ہے تو پھر توحید کی بنیادوں پر استوار الٰہی نظام کو اس فطری حق سے کیوں محروم کیا جائے؟

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے آیت قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظة (توبہ - ۱۲۳) جہاد دفاعی سے مختص نہیں ہے۔ اسی طرح سورۂ نمل میں ملکۂ سبا کو حضرت سلیمانؑ کی دھمکی: فلنأتینهم بجنود لا قبل لهم بها ولنخرجنهم منها اذلة وهم صاغرون (نمل - ۳۷) حالانکہ اس سے پہلے ملکۂ سبا کی طرف سے کوئی حملہ ہوا تھا نہ حملے کی دھمکی دی گئی تھی۔ حضرت سلیمان کی دھمکی صرف اسی بنا پر تھی کہ ملکۂ سبا نے حضرت سلیمانؑ کی

دعوت کو قبول نہیں کیا تھا " الا تعلوا علی و اتونی مسلمین (نمل ۔ ۳۰) یہ واقعہ جہاد ابتدا
کے شرعی جواز کی بہترین توضیح ہے ۔

جہاد ، تاریخ انبیا میں

قرآن کی آیتیں گواہ ہیں کہ انبیا کی سیرت یہ رہی ہے کہ وہ تنبیہ و بشارت ، روشن آیات
اور گذشتہ و آیندہ انسانوں کے تذکرے سے انسانی عقل و فطرت کو نہایت نرمی اور دلسوزی کے
بیدار کرنے کی کوشش سے اپنی دعوت کا آغاز کرتے تھے ۔ قدرتی بات ہے کہ پاک و صاف دل اور
خداخواہ ضمیر نہایت خندہ پیشانی سے ان کی دعوت کو قبول کرتے تھے ، لیکن مردہ دل ، آلودہ
اور سرکش نفس رکھنے والے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیتے اور نورِ خدا کو خاموش کرنے کے لیے
کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے ۔ جہاں کہیں محاذِ حق کمزور ہوتا اور اس میں مقابلے کی طاقت نہ
تو وہ اپنی اور اپنے اصحاب و انصار کی جان کی حفاظت اور محدود پیمانے پر چراغِ توحید کو جلائے
رکھنے پر اکتفا کرتے ہوئے مشرکوں پر عذابِ الٰہی کے نازل ہونے کا انتظار کرتے تھے ۔ جب پیمانہ
لبریز ہو جاتا اور اہلِ حق امتحان کی کٹھن منزلوں کو طے کرتے ہوئے موت و حیات کے دوراہے
پہنچ جاتے ، اس وقت وعدۂ الٰہی پورا ہوتا ، بجلی ، زلزلہ ، آندھی ، سنگ باری ، طوفان اور ایسی
ہی دوسری شکلوں میں عذابِ الٰہی نازل ہوتا ، اور مومنوں کو ان سرکش طاغوتوں سے چھٹکارا مل جا
تھا جیسا کہ حضرت نوحؑ ، حضرت ہودؑ ، حضرت شعیبؑ ، حضرت صالحؑ ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مو
کے قصوں میں بیان کیا گیا ہے : فدعا ربہ انی مغلوب فانتصر ، ففتحنا ابواب السماء
منھمر (قمر ۱۱) قال لو ان لی بکم قوۃ او اوی الی رکن شدید ..... فلما جا
امرنا جعلنا عالیہا سافلہا (ہود ۔ ۸۰ ۔ ۸۲) قالوا حرقوہ و انصروا الھتکم ا
کنتم فاعلین . قلنا یا نار کونی بردا و سلاما علی ابراھیم ، و ارادوا بہ کید
فجعلناھم الاخسرین (انبیاء ۔ ۶۸ ۔ ۷۰) قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون ق
کلا ان معی ربی سیھدین ..... ثم اغرقنا الآخرین (شعراء ۔ ۶۱ ۔ ۶۶) ایک
مقام پر بطورِ کلی ارشاد ہوتا ہے : فکلا اخذنا بذنبہ فمنھم من ارسلنا علیہ حاصب

ومنھم من اخذتہ الصیحۃ ومنھم من خسفنا بہ الارض ومنھم من اغرقنا

(عنکبوت ــ ۴۰)

لیکن جب توحیدی طاقتیں خود کو طاقتور محسوس کرتیں، اور دشمن پر غلبہ پانے کا امکان ہوتا تو وہ مقاصدِ رسالت کی تکمیل، خداخواہوں کے راستے کو ہموار اور ان کے سامنے سے رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ہتھیار اٹھانے میں پس و پیش نہیں کرتی تھیں، ایسے موقع پر شرک و ائمۂ شرک کے وجود کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا، جیسا کہ طالوت و جالوت، سلیمان و ملکۂ سبا، موسیٰؑ و عمالقہ کے واقعات میں تفصیل سے موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے مقابلے میں ہتھیار نہیں اٹھایا وہ عالم مجبوری میں مصر سے ہجرت کے ارادے سے اپنی قوم کو لے کر دریائے نیل کا رخ کرتے ہیں، لیکن جب عمالقہ شام کے مقابلے میں اپنے کو طاقتور محسوس کیا تو ان پر حملہ کرنے سے گریز نہ کیا، مختصر یہ کہ یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ انبیاء ماسلف کی زندگی میں جنگ و جہاد دونوں کی سنت موجود تھی، وکأین من نبی قاتل معہ ربیون کثیر (آل عمران ــ ۱۴۷)

ہمیشگیِ جہاد

اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جہاد بمعنی عام جس میں اسلام اور مسلمانوں کا دفاع شامل ہے قرآن مجید میں عظیم ترین فریضہ ہے، اسے پورے الٰہی نظام۔ اور توحید کی اساس کا محافظ قرار دیا گیا ہے عقل، تاریخی تجربہ اور خارجی واقعات بھی ضرورتِ جہاد کی قطعی تائید کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فریضہ صرف صدر اسلام اور عصر رسولؐ اکرم سے مختص نہیں ہو سکتا، جہاد کے لئے مسلمانوں کی طاقت و قوت کے سوا کوئی شرط نہیں۔

جہاد۔ بمعنی عام ــ کے کسی خاص زمانے یا عام شرائط (جس میں طاقت و قدرت بھی شامل ہے) کے سوا دوسری شرائط سے مختص ہونے کا تصور، آرام پسندی حقائقِ قرآن سے ناواقفیت، فقہی جمود و جمود مصالح اسلام و مسلمین سے لاپروائی، خوف، اخلاقی کمزوری، معاشرے اور اس کے مسائل سے صدیوں کی دوری و گوشہ نشینی اور صوفیانہ افکار کے غلبے کے سوا کچھ نہیں۔

اگر یہ کمزوریاں اور نارسائیاں نہ ہوتیں تو کس طرح ایک اسلام شناس یا محقق فقیہ چار سو سے

زائد تاکیدی اور سخت لہجہ آیتوں کو صرف چند برسوں سے مخصوص سمجھتا اور راسخ طرز فکر سے دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے اسلام کو جس کے لئے دفاع ایک اہم ضرورت ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہتا بنا کر مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو، اسلامی اقدار اور اسلامی سرزمین پر دشمنوں کے غلبے کا راستہ ہموار کرتا؟ کیا آیہ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ . . . . جو مسلمانوں کی عزت و قوت کی ضمانت ہے کسی ایک زمانے سے محدود ہو سکتی ہے؟ کیا دشمنوں نے ہم سے معاہدے کرنے کے بعد اس کی خلاف ورزی نہیں کی؟ پھر ہم نے اس آیت وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم پر عمل کیوں نہ کیا؟ خداوند عالم کا یہ وعدہ لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین کیا صرف چند برسوں کے لئے تھا؟ اگر جہاد ابتدائی میں شک و شبہ ہو سکتا ہو تو کیا دفاع میں بھی شک کیا جا سکتا ہے؟ تمام زمانوں میں مسلمانوں کو دفاع کی ضرورت رہی ہے اور آج دشمن ہر زمانے سے زیادہ، اسلام و مسلمین کے مقابلے میں صف آرا ہے۔ اسے کسی مکر و حیلے سے عار نہیں، آج اپنی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے ہر زمانہ سے زیادہ امداد باہمی، تعاون اسلحے کی فراہمی، طاقت میں اضافہ اور جہاد کی ضرورت ہے۔

اگر نعوذ باللہ ہم مسلمان نہ ہوتے پھر بھی تقاضائے عقل و فطرت یہ تھا کہ ہم اپنے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، اور اتنی زیادہ ذلت و خواری برداشت نہ کرتے، ایک ارب مسلمانوں کے لیے یہی ذلت کافی ہے کہ تیس لاکھ یہودیوں کے سامنے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ سر ذلت جھکائے ہوئے ہیں، روز بروز ان کے لئے میدان ہموار کرتے جا رہے ہیں اور دست بستہ ان کے احکام و فرامین کی بجا آوری کے لئے تیار ہیں۔ کیا اس ذلت کو برداشت کرنے کے لئے محض یہ بہانہ کافی ہے کہ امریکہ اسرائیل کا حامی ہے؟ کیا خدا ہمارا حامی و مددگار نہیں؟ پھر یہ ذلت کیوں؟ خدا کی نصرت و حمایت کے وعدے برحق ہیں، لیکن ہمارا اس پر ایمان نہیں، ہم شرط ایمان (ان کنتم مومنین) سے کورے ہیں۔ ہم اس آیت کے مصداق بن گئے ہیں کہ ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الآخرۃ . . . . . الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم (توبہ۔ ۳۸۔ ۳۹)

لیکن آج جمہوری اسلامی ایران یہ بتانا چاہتا ہے کہ جہاد ایسا اہم فریضہ ہے جس پر تمام فرائض

کا دارومدار ہے، جہاد کو زندہ کرکے تمام دینی شعائر کو حیاتِ نو عطا کی جا سکتی ہے۔ آج ایران یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس چیز نے صدرِ اسلام میں مسلمانوں کو تمام بڑی طاقتوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ بخشا تھا۔ وہ ایمان ہے اور صرف ایمان، یہ ایسی عظیم طاقت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی، آج ایران کی اسلامی حکومت دنیا کو جس حقیقت سے روشناس کرانا چاہتی ہے، وہ ہے انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ وہ یہ سمجھانا چاہتی ہے کہ اگر آج بھی سنتِ ایثار و شہادت زندہ ہو جائے تو ہمارے ماضی کی عظمتِ رفتہ واپس آسکتی ہے۔ جمہوری اسلامی ایسے انسان بنانا چاہتی ہے جو اس آیت کے مصداق اوصاف سے متصف ہوں: فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم۔

تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے اسی نظام سے تعاون کریں اور اپنے اسلامی فریضے کے پیش نظر قومیت، نسل، زبان اور جغرافیائی اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے وحدت اسلامی کے جھنڈے تلے متحد و ہم آہنگ ہو کر اسلام و مسلمین کے ظالم و جابر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کو اٹھ کھڑے ہوں، عزت کی موت کو ذلت کی زندگی سے بہتر سمجھیں، تاکہ جہاد کے شیریں ثمرات سے لطف اندوز ہوں اور خداوند عالم کے دستِ شفقت و محبت کے سایے میں اپنے دشمن پر وار کریں اور خود اس لمس ربانی کی تصدیق کریں: ید اللہ فوق ایدیھم

(ختم کرتا ہوں) اس دن کی آرزوؤں کے ساتھ جب کہ پوری دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہوگی، اور خداوند عالم کا یہ وعدہ پورا ہوگا۔

لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔

جناب محمد تقی رہبر
مترجم: جناب خادم حسین ایم اے ملنگ

قرآن کا سیاسی نظام

گذشتہ شمارہ موضوع "قرآن کا سیاسی نظام" کے تحت سیاست کا مفہوم، دو طرح کے سربراہ، حقیقی سربراہوں کی خصوصیات، اصولی بحثیں، فرمانروائی، ولایت، امامت، قرآنی نقطہ نظر سے سیاسی نظام کے بنیادی مقاصد و نتائج، سیاست کے اصول، خلافتِ الٰہی، وراثت زمین اور امامت مستضعفین کے بارے میں بحث و گفتگو ہو چکی بقیہ مضمون پیش خدمت ہے۔

— ادارہ —

عدل اور اس کے نفاذ کی ضمانت:

(۲) لقد ارسلنا رسلنا بالبینات..... ان اللہ قوی عزیز" (سورہ حدید آیت ۲۵)

بے شک ہم نے اپنے رسول کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت پر قائم ہو جائیں اور ہم نے (خاص) لوہا نازل کیا جس میں سخت خوف (بھی) ہے اور لوگوں کے لئے نفعے (بھی) اور یہ غرض (بھی) کہ اللہ یہ جان لے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی بغیر دیکھے کون (کون) مدد کرتا ہے، بے شک اللہ صاحب قوت و غلبہ ہے۔

یہ آیت انبیا کی بعثت کا اصل مقصد واضح کرنے کے علاوہ ہمیں چند اصول اور بتاتی ہے، مثلاً:

(الف) ـــ تمام پیغمبر عدل و مساوات قائم کرنے کے ذمہ دار ہیں اور یہ کام معاشرے کی باگ ڈور سنبھالے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا ملک و ملت کی تدبیر و سیاست کی ذمہ داری پیغمبروں کا فرض اولین ہے۔

(ب) ـــ اس ہدف کا عملی ہونا اس قانون کی بنیاد پر ہے جو آسمان سے انسانوں کے لیے نازل ہوا ہے۔ یعنی وہ قانون جو حق و انصاف اور حکمت کے اصولوں پر قائم ہو اور سیاست مداروں کی افراط و تفریط اور تحریف سے دور ہے۔

(ج) ـــ اگر حکمت و نصیحت کا کوئی اثر نہ ہو، اور حملہ آور افراد اسی طرح اپنے حملوں کو جاری رکھیں تو آس لوہے سے بنے ہوئے ہتھیاروں سے انھیں کچل دینا چاہیئے کہ فتنہ و فساد "تھا" کا صیغہ بن جائے۔

(د) ـــ اس آیت میں جہاں سیاست کے بنیادی اصول، حکمراں، قانون اور نفاذ کا ذکر ہوا ہے، وہاں ان کا مبدأ غیب اور خالق کائنات سے تعلق کا ذکر بھی موجود ہے۔ اسی طرح عوام کو حکومت سے فکری و اعتقادی تعلق بھی ہونا چاہیے۔ یہ مرحلہ افراد و معاشرہ انسانی کے لیے آزمائش کا مرحلہ ہے۔ آیت کا آخری حصہ جو اللہ تعالیٰ کی قدرت و عزت کی نشاندہی کرتا ہے، اسی کے ساتھ یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ چونکہ قدرت، عزت، مالکیت اور ملوکیت صرف خدا کو زیب دیتی ہے، لہٰذا انسان کسی اور ذریعے سے عزت و طاقت حاصل کرنا چاہے تو وہ ایک غلط اور نازیبا بات کرتا ہے تکبر و غرور کا راستہ اختیار کرکے ظالم اور جابر افراد کی طرح مجرم قرار پاتا ہے۔ جبکہ انبیاء و رسل کی راہ اور الٰہی سیاست کی روش یہ نہیں ہے۔

عدل و مساوات قائم کرنے کے بارے میں تاکید اگرچہ انبیاء و رسل کے عام پروگراموں میں شامل رہی ہے لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر خاص توجہ فرمائی ہے۔

قرآن مجید میں ان فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے :

"وامرت لاعدل بینکم" (سورہ شوریٰ ۔ آیت ۱۵)

مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں ۔

"فاحکم بینھم بالقسط" (سورہ مائدہ ۔ آیت ۴۲)

ان کے مابین انصاف سے فیصلہ کرو ۔

مومنین سے خطاب ہے :

کونوا قوامین للّٰہ شھدآء بالقسط (سورہ مائدہ ۔ آیت ۸)

خدا کے لیے انصاف کے ساتھ گواہ بننے کے لیے تیار رہو!

عدل و انصاف قائم کرنا الٰہی حکومت کا مقدس فریضہ ہے اور یہ فرض انبیاءؑ و ائمہ علیہم السلام اور امت مسلمہ کے ہر فرد پر عاید ہوتا ہے کہ اپنی طاقت و توانائی کے مطابق اسے پورا کرنے کی جدوجہد کرے ۔ ظلم کا خاتمہ اور ظالموں کو ان کے اصلی ٹھکانے تک پہنچانے میں ذرہ بھر تامل نہیں کرنا چاہیے ۔ ظالموں کا ٹھکانا جہنم ہے ۔

"واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبا" (سورہ جن آیت ۱۵)

اور رہے نافرمان، تو وہی جہنم کے کندے بنے ۔

مکتب فکر اور قیادت کے تحت اتحاد :

اسلامی حکومت کے دوسرے مقاصد و فرائض میں امت مسلمہ کے اتحاد کو مستحکم کرنا اور اس کی حفاظت ہے ۔

(۲) "کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللّٰہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ۔ ..." (سورہ بقرہ ۔ آیت ۲۱۳)

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی حال پر تھے ۔ پھر خدا نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے انبیا بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی

تاکہ لوگوں کے درمیان جس بارے میں اختلاف ہے اس کا فیصلہ کریں۔
اختلاف وانتشار کے خطرے کو بشریت کے اتحاد سے دو چیزیں دور کرسکتی ہیں ایک ایک مکتب فکر اور دوسری قیادت ۔ اور ان دونوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے ۔مکتب فکر سے مراد وہ دبستان و اسلوب فکر و عمل ہے جس کا ماخذ قرآن مجید اور وحی الٰہی ہے۔ اور قیادت سے مراد پیغمبروں اور صالح افراد کی قیادت ہے ۔امت مسلمہ کے درمیان اختلاف پیدا کرنے میں غیر صالح رہبروں کا دخل رہا ہے اور آج بھی امت مسلمہ کو اس افسوسناک المیہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ۔ حالانکہ اس وقت ایک ارب مسلمان دنیا میں موجود ہیں یہ افراد متحد ہو کر، دنیا کے خونخوار دشمنوں کے مقابلے میں ایک عظیم الشان طاقت بن سکتے ہیں ۔ یہ امت اپنی افرادی قوت اپنی اسٹراٹیجکی حیثیت اور سیاسی و جغرافیائی علاقے، سونے، تیل کے زیر زمینی ذخائر اور اسلام پر بھروسہ کر کے دنیا کے تمام کاروبار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے ۔اس راہ میں ایک مشکل حکمران ہیں جو انسانی معاشرے میں فساد کی جڑ اور ممالک کے لیے کینسر بن چکے ہیں ۔قرآن کے حکم کے مطابق اس طرح کی حکومتوں کی بیخ کنی کرنا چاہیے تاکہ امت، متحد ہو کر ایک صالح قیادت کے تحت اپنی منزل مقصود تک رسائی حاصل کر سکے ۔ یہ ہے قرآن کی ہدایت ۔
"فقاتلوا ائمۃ الکفر ۔ وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ"

ارتقائے انسانیت :

زندگی کا اصلی غایت انسان کی ارتقا ہے ،جب شریعت کی تشریع اور پیغمبروں کی بعثت اسی مقصود کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شروع ہوئی ہے تو یقینی طور پر اس غرض کو پورا کرنے میں حکومت کا کردار ناقابل انکار ہے۔
ملکوں کی تباہی اور انسانوں کی گمراہی زیادہ تر ظالم و جابر حکام کے زیر نگرانی ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بار بار ان کا ذکر کرتا ہے ۔
(۴) ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا وسلطان مبین الیٰ فرعون وملائہ

فاتبعوا امر فرعون وما امر فرعون برشید، یقدم قومه یوم القیامة فأوردهم النار وبئس الورد المورود۔" (سورہ ہود آیت ۹۸،۹۷)

اور بے شک ہم نے موسیٰؑ کو اپنے احکام اور کھلی دلیلوں کے ساتھ فرعون کے سرداروں کے پاس بھیجا پھر ان سب نے فرعون ہی کے حکم کی تعمیل کی۔ حالانکہ فرعون کا حکم راستی کے موافق نہ تھا۔ قیامت کے دن فرعون اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان سب کو جہنم میں پہنچا دے گا اور وہ کیسی بری اتارے کی جگہ ہوگی جہاں اتریں گے۔

طاغوتی حکام انسانی ارتقا میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، انھیں روکنا ٹوکنا چاہیے۔

"فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لها۔"

طاغوتی افراد کو کافر سمجھنا چاہیے اور ان سے دور اور اللہ کی رسی سے قربت حاصل کرنا چاہیے کیونکہ یہ رسی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

خدا پر ایمان اور طاغوت کو کافر سمجھنا، مکتب توحید کی پہلی شق ہے:

"ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت"

اور ہم نے ہر قوم کے لیے ایک رسول بھیجا، جو ان سے کہے اللہ کی عبادت اور طاغوت (شیطان) سے دوری اختیار کرو۔

دراصل حقیقی ارتقا و وحدت، صالح افراد کی حاکمیت (قانون، سیاست اور دینی ثبات ہی) کے زیر سایہ ممکن ہے۔ اور کفر، ضلالت اور تباہی طاغوتی سربراہوں کا وہ پیشہ ہے جس سے وہ باز نہیں آسکتے۔ لھٰذا اصلاح خواہ افراد کا ایمانی و انسانی فرض ہے کہ انسانی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے عناصر کو فنا کے حوالے کر دیں، تاکہ انسانیت بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی منزل مقصود تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس طرح سے حضرت ابراہیمؑ، موسیٰؑ، حضرت محمد مصطفےٰ علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء اور اولیاء نے عمل کیا اسی طرح عمل کیا جائے۔ خاتم انبیا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی علانیہ دعوت کے دوران تمام ممالک کے سربراہوں کو پیغام روانہ کیے تھے

کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر ظلم وستم ڈھانے سے باز آکر تسلیم حق ہو جائیں یا مکّے کے قبائلی سرداروں، ثروت مندوں اور سود خواروں کو تنبیہ کی تھی کہ وہ محروم افراد کے استحصال سے باز آجائیں۔ وہ پیشقدمی کرتے رہے یہاں تک کہ فساد کی جڑیں جو اُن علاقوں، حکومتوں اور قبائلی سرداروں کے افکار و خیالات میں موجود تھیں، انھیں ریشہ کن کر کے ایسی اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا جو خدا پر ایمان اور انسان کی قدر و قیمت کی قائل ہے۔

"کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم آیاتنا
ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمۃ ویعلمکم
مالم تکونوا تعلمون۔" (سورہ بقرہ آیت - ۱۵۱)

جیسے، ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سناتا ہے اور (ظاہر و باطن) تم کو پاکیزہ کرتا ہے اور تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو کچھ تم نہیں جانتے تھے۔

قرآن مجید تربیت اور تزکیہ کے لحاظ سے رہبروں کی ذمّہ داری کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

الذین ان مکنّاھم فی الارض ...... وللہ
عاقبۃ الامور۔ (سورہ حج - آیت ۴۱)

وہ، وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار دیں گے تو وہ (باقاعدہ) نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے اور نیک کاموں کا حکم دیں گے اور بدی سے مانع ہوں گے۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

اس لحاظ سے سیاسی رہبروں کی ذمّہ داری محض یہی نہیں کہ ملک کے اقتصادیات، سیاست اور امن وامان ہی کو بحال کریں، بلکہ بحالیِ اخلاق، ایمان، عمل، تقویٰ، احسان اور فساد و منکر کو اپنی حکومت کے دائرے سے ختم کرنے کی ذمّہ داری اس سے بڑھ کر ہے، درحقیقت یہ بڑی خصوصیت ہے جو اسلام کے سیاسی نظام کو دوسرے سیاسی نظاموں پر فوقیت عطا کرتی ہے۔

سلامی نظام میں حقوق :

حقوق بھی اسلامی سیاست کا ایک حصہ ہیں اور اس مفروضہ کی بنا پر حقوق سے وابستہ وانین کا تعین اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسی طرح قانونی حیثیت کا حامل ہے، جس طرح سے دین حنیف سلام کی بنیاد پر مبنی اسلامی عدالتوں کے قوانین و مقررات کو رسمیت حاصل ہے۔

قرآن مجید میں غیر شرعی اور غیر قانونی عدالتوں کا ذکر طاغوت کے عنوان سے کیا گیا ہے اور ان کی اطاعت قبول کرنا طاغوت کی اطاعت قبول کرنے کے برابر بتائی گئی ہے، جبکہ عدالت اور انصاف کا تعلق صرف اللہ، اس کے رسولوں اور ان کی پیروی کرنے اور نقش قدم پر چلنے والوں سے ہے۔

(۵) "یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ ..... و احسن تأویلا"

"الم تر الی الذین یزعمون ...... ان یضلھم ضلالا بعیدا۔"

(سورہ نساء۔ آیت ۵۹ سے ۶۰ تک)

اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس رسول اور ان والیان امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہیں پھر اگر کسی معاملے میں تم میں آپس میں جھگڑا ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو بشرطیکہ تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی سب سے بہتر اور عمدہ تاویل ہے۔

کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ جو کچھ تم پر نازل کیا گیا اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا وہ سب پر ایمان لائے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا جا چکا ہے کہ اس کے منکر ہوں اور شیطان یہ ارادہ رکھتا ہے کہ ان کو بھٹکا کر بڑی گمراہی میں ڈال دے۔

ان آیتوں میں ان لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے، جنھوں نے غیر شرعی اور غیر قانونی

عدالتوں کے فیصلوں کو ماننا اور ان پر عمل کیا، حالانکہ اسلام کے سیاسی، قانونی اور سماجی نظام میں حاکمیت اور قضا کے قانونی مقام کا تعین اللہ، اس کے رسولؐ اور والیان حق کے ذریعے ہونا لازمی ہے۔ جو حکم ان کی جانب سے صادر ہو اس پر عمل کرنا بھی ضروری قرار پایا ہے۔

"وما کان لمؤمن ولا مؤمنة .... فقد ضل ضلالا مبینا" (سورۂ احزاب۔ آیت ۳۶)

مومن مرد کے لئے یہ بات مناسب ہے، نہ کسی مؤمن عورت کے لیے کہ جب خدا اور اس کے رسول نے ایک بات طے کر دی تو پھر انھیں اپنے اس معاملہ میں کچھ بھی اختیار (باقی) رہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا۔ یقیناً وہی تو کھلی گمراہی میں پڑے گا۔

افراد اور اسلامی معاشرے سے وابستہ قوانین کی ضمانت شرع مقدس اور اس کے قوانین و مقررات کی روشنی میں، ان شرعی حاکموں کے ذریعے ہوتی ہے، جو اسلامی نظام میں والیان صالح کے ذریعے مقرر کیے جاتے ہیں۔

قرآنی آیات کی بنا پر اب تک اسلام کے سیاسی نظام میں حکومت کے اغراض و مقاصد اور فرائض کے بارے میں جو کچھ معروضات پیش کیے جا چکے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہوا:

۱۔ مکتب حق "اسلام" کی حفاظت جو تمام فضیلتوں کی اساس ہے۔
۲۔ طاغوت سے جنگ، جو تمام خباثت اور تباہیوں کی جڑ ہے۔
۳۔ مستضعفین کی حمایت اور غریبوں کی مدد جو دستور قرآن کی بجا آوری ہے۔
۴۔ محروموں کے حقوق چھیننے اور غصب کرنے والوں کو کچلنا۔
۵۔ حق، انصاف اور مساوات کی بنا پر انفرادی اور سماجی حقوق کو محفوظ رکھنا۔
۶۔ ملک کے اقتصادیات کو فروغ دینے کی غرض سے تبعیض اور استحصال پر قابو پانا۔
۷۔ اتحاد کو محفوظ رکھتے ہوئے اختلافات کو ختم کرنا۔
۸۔ انسان کی دنیوی اور آخروی سعادت کی ارتقا کے لیے شائستہ مکتب فکر اور رہبری کی بنیاد پر لوگوں کو تربیت دینا۔

اسلام میں نظام حکومت :

دوسرا قابل بحث موضوع اسلام میں سیاسی نظام کا ہے۔ نظریات، فلسفوں، عرف عام اور رسم و رواج کے نقطۂ نظر سے سیاسی نظام اور حکومت کی قسمیں مختلف ہیں حضرت عیسیٰ مسیح کی ولادت سے چار صدی پہلے یونانی معاشرے میں ارسطو نے "سیاست" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں تین طرح کی حکومتوں کی طرف اشارہ کیا ہے: استبدادی (شخصی)، اشرافی (بالا طبقے کی حکومت) اور ڈیموکریسی۔ تاریخ علم سیاسیات کی طویل مدت میں ڈیموکریسی حکومت سب سے بہتر سمجھی گئی ہے، اس سے قطع نظر کہ مفاہیم میں کس قسم کے اختلافات موجود ہیں، لوگ اس سے کیا مراد لیتے ہیں اور کس حد تک یہ لفظ صحت و سقم پر مبنی ہے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ اسلامی سیاست و حکومت مذکورہ حکومتوں میں سے کس حکومت سے مماثلت رکھتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں قرآنی آیتوں پر غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں سیاست کا مفہوم ڈیموکریسی کے اس مفہوم سے قریب ہے جس میں کسی قسم کا دھوکہ اور فریب شامل نہ ہو، لیکن ان دونوں کے درمیان وہ بنیادی اختلاف بھی موجود ہے جو اسلامی نظام میں روح سیاست کے تشخص کا باعث ہوتا ہے اور وہ ہے حاکمیت خدائے لایزال۔

اس موضوع کو مزید واضح کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی روشنی میں ان اصولوں کو پیش کر رہے ہیں، جن سے حکومت کو قانونی حیثیت ملتی ہے اور اس کے بعد مذکورہ خصوصیت کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

حکومت کے بروئے کار آنے کی صورتیں :

۱) **نص :** یعنی خدا اور رسولؐ کی طرف سے تعین۔ یہ امتیاز دراصل پیغمبر و امام کو حاصل ہوتا ہے، پھر نتیجۃً "ولی فقیہہ" کو۔ بشرطیکہ اس میں نبی و اوصیاء نبی کے بیان کردہ اساسی

صفات پائے جاتے ہوں۔ جیسا کہ آیۂ ذیل سے واضح ہے۔

"اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم" (سورہ نساء۔ آیت ۵۹)

اے ایمان لانے والو، اللہ، رسولؐ اور ان والیان امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہیں۔

۲۔ **شوریٰ**: اس بنیادی نکتہ کی بنا پر شخصی حکومت کے لیے کوئی امتیازی قانون نہیں ہے۔ ارباب حل و عقد جو عوام کی نظر میں مقبول ہوں وہی آپس میں مشورہ کرکے نیک اور صالح ترین شخص کو انتخاب کر سکتے ہیں۔

۳۔ **رائے عامہ**: نص صریح کی عدم موجودگی میں عوام، اسلام میں مذکورہ صفات و خصوصیات کے حامل شخص کو حکمرانی کے لیے انتخاب کرکے، اسلامی معاشرے کو سیاست کرنے کی ذمہ داری سونپ سکتے ہیں۔

لیکن انتخاب ہو یا شوریٰ ان دونوں کے نتیجہ میں ایک بنیادی نکتہ جو لوگوں کی فکر و توجہ کا مرکز اور جس کے ذریعے اسلامی نظام دوسرے نظاموں سے ممتاز قرار پایا ہے، اسلامی سیاست کے معاملوں پر ولیِ امر کی نظارت کا مسئلہ ہے، جسے ہر حالت میں ہونا چاہیے۔ اس بات کی وضاحت کہ ہماری نظر میں ولایت امر کا تعلق صرف پیغمبر و امامؑ سے ہے اور ہمارے جیسے زمانے میں جبکہ پیغمبر و امام تک رسائی ممکن نہیں، فقیہہ جامع شرائط اور مسائل وقت سے آگاہ ہوتا ہے، ولی امر لوگوں سے مشورہ اور رائے طلب کرنے کے بعد منظور ہونے والی قراردادوں پر غور و فکر کرکے ان کو منظور یا نامنظور کر سکتا ہے اور یہ حق ولی امر کے لیے ہمیشہ سے محفوظ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ"

آیت میں مشورہ کرنے پر زور ضرور ہے لیکن آخری فیصلہ کرنا پیغمبر کے ذمے ہے وہ بھی خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے۔

لہذا اسلام کے سیاسی نظام میں شوریٰ اور رائے عامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے سیاسی نظام صرف شوریٰ اور رائے عامہ پر ہی زور دیتے ہیں اور خدا و پیغمبر سے

ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا جبکہ اسلامی سیاست کا زور زیادہ تر خدا اور بندوں کے درمیان حکومت میں پیغمبر کی نظارت پر ہوتا ہے۔

جو حاکمیت ولی امر کے ذریعے عملی تشکل اختیار کرتی ہے، درحقیقت اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، البتہ لوگ بھی فکر و نظر کے مالک ہیں لیکن یہ فکر و نظر بطور مطلق نہیں بلکہ اس شرط پر ہے کہ ان کے افکار و خیالات احکام و قوانین الٰہی سے مطابقت اور ولایت امر سے موافقت رکھتے ہوں۔ (لتحکم بین الناس بما اراك الله)

اسلام کے سیاسی نظام میں قوانین کے مآخذ:

گذشتہ بحثوں کے دوران اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں احکام و قوانین وحی سے مأخوذ ہیں جو عالم غیب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے اور بعد میں ان کے قول و فعل سے اس کی تعبیر کی گئی۔ امت مسلمہ کے اعتقاد کے مطابق، قرآن مجید ان تمام اصولوں اور احکام و قوانین پر مشتمل ہے جو ہر دور اور ہر زمانے کے لحاظ سے انسانوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ لھٰذا ہر زمانے میں رونما ہوتے والے مسائل اور جزئیات کو اس کلیہ پر منطبق کرکے ہر وقت نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فقہ میں اجتہاد کا مسئلہ جو خاص مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہر زمانے میں احکام و قوانین کا نفاذ ممکن ہے۔ کیونکہ اس کا سرچشمہ "قرآن وحدیث" ہے۔ قرآن و سنت سے ہر مسئلہ، ہر تقاضے اور ہر مشکل کا حل ملتا ہے۔ لہذا اسلام، سیاست و ریاست قانون و آئین میں کبھی خاموش نظر نہیں آتا۔ اجتہاد انفرادی، اجتماعی قومی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات میں معقول حل دریافت کرسکتا ہے۔
(لتحکم بین الناس بما اراك الله)

قوانین کے نفاذ کی ضمانت:

اسلام کے سیاسی نظام میں اگرچہ احکام الٰہی کے نفاذ کی زیادہ تر ذمہ داری ملک کے سربراہ پر عاید ہوتی ہے، لیکن امت کا ہر فرد بھی اس بات کا پابند ہے کہ وہ نفاذ

ذمہ داریوں میں خود کو ذمہ دار سمجھے، کیونکہ اسلامی نظام میں قوانین محض خشک و جبری ضوابط نہیں ہیں جس سے لوگ اکتا کر بھاگ جائیں بلکہ ان کا شمار ان فرائض میں ہوتا ہے جن کو ایک مسلمان خدا سے لگاؤ اور اس کی خوشنودی اور سعادت حاصل کرنے کے لئے انجام دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے نظام میں قوانین کا نفاذ اسلامی حکومت کے لیے زحمت پیدا نہیں کرتا، اگرچہ ہر معاشرے میں کچھ ایسے افراد ضرور ہوتے ہیں جو قانون شکنی پر کمر بستہ رہتے ہیں، اسلامی حکومت ایسے افراد سے نپٹنے کے لیے قانونی اور شرعی سزائیں دینے کی مجاز ہے اور اسلام کا قانون سزا ایسے ہی افراد کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں معاشرے کے وہ افراد بہت نمایاں ہیں جو فکری و عملی طور پر خوشی خوشی اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں:

"انما كان قول المومنين اذا دعوا الى الله ورسوله ليحكم بينهم ان يقولوا سمعنا واطعنا واولئك هم المفلحون۔" (سورۂ نور۔ آیت ۵۱)

مؤمنوں کا قول تو جس وقت بھی وہ خدا اور اس کے رسول کی طرف اس غرض سے بلائے جائیں کہ رسول ان کے مابین فیصلہ کرے۔ اس کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم۔

خدا کی قسم وہ ایمان ہی نہیں لائیں گے جب تک کہ اپنے ذاتی اختلافات میں تمہیں حَکَم نہ نالیں۔

اسلامی معاشرے میں تو یہاں تک ہے کہ اگر کوئی مسلمان گروہ جھگڑتا ہے تو تمام مسلمان اس گروہ کی اصلاح کرنے کے پابند ہیں اور اگر اصلاح طلب کوششیں کرنے کے باوجود بھی فریق مخالف نہ مانے تو ان کے ساتھ وہ رویہ اختیار کریں جس سے ان کے

فساد کا خاتمہ ہو جائے اور تمام اسلامی خطوں میں حق پھیل جائے ۔

"وان طائفتان من المومنین .... ان اللہ

یحب المقسطین (سورۂ حجرات ۔ آیت ۹)

اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان کے مابین صلح کرادو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو تا آنکہ وہ اللہ کے فیصلے کی طرف رجوع کرے، تو انصاف سے ان دونوں کے مابین صلح کردو اور انصاف برتو۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔

انصاف کے ساتھ صلح کرانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہتھیار ڈال دیے جائیں اور مظلوم وظالم کی پہچان نہ ہو سکے، بلکہ اگر کسی مسلمان کی عزت و آبرو یا مال پر حملہ ہوتا ہے تو ظالم کو سزا ملنا چاہیئے اور ہر صاحب حق کو اس کا حق ملنا چاہیے ۔عدل و انصاف کا مطلب غصب شدہ حقوق واپس دلانے کے ہیں اور ان دونوں کا تعلق ناقابل تفکیک ہے، لہٰذا صلح و انصاف کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے تاکہ ظالموں کو سزا ملنے کی جگہ حوصلہ افزائی نہ ہو ۔ ۲۷

بہرحال اسلام کے سیاسی نظام سے وابستہ تمام امور میں قوانین کا ہونا لازمی ہے خواہ داخلی ہوں یا خارجی، تاکہ اسلامی نظام افراتفری سے بچ سکے اور امن و امان باقی رہے نیز لوگوں کے فردی و سماجی حقوق پامال نہ ہوں ۔

اب تک جن نکات پر بحث ہوئی ان کی مدد سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تین ادارے (مقننہ، قضائیہ اور مجریہ) ہر نظام کے ارکان شمار کیے جاتے ہیں، اسلام کے سیاسی نظام میں ان اداروں کو قانونی حیثیت کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ ان کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ ان کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے؟ اور اس کے مدمقابل عوام کا فرض کیا ہے؟ اس بحث میں آج کل کی سیاست میں منصوبوں اور پروگراموں کے نفاذ پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کی جزئیات پر بحث سردست مطلوب نہیں ہے ۔

عوام اور حکومت کا ایک دوسرے سے تعلق

اسلام کے سیاسی نظام میں عوام اور حکومت کا ایک دوسرے سے تعلق حاکم ومحکوم ظالم ومظلوم اور طاقتور و کمزور جیسا نہیں ہے بلکہ یہ تعلق اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، عوام کے عزم و استقلال، محبت تعاون اور ایمان و صداقت پر مبنی ہے۔ یعنی وہی طرز عمل جو پیغمبر اسلامؐ اور اللہ کے دیگر انبیاء و رسل نے اختیار کیا تھا۔

قرآن کریم نے پیغمبر اکرمؐ کے مقصد بعثت کی وضاحت کرتے ہوئے اس نکتہ پر خاص توجہ دلائی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی تحریک کا سارا دارومدار اس پر تھا کہ وہ ان زنجیروں کو توڑ دیں جو اس زمانے کے لوگوں کو غلامی کے بندھن میں جکڑی ہوئی تھیں۔

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (سورۂ اعراف آیت ۱۵۷)

یہی ولایت ہے جس کی بنیاد پر پیغمبر اور اولی الامر لوگوں پر حکومت کرتے ہیں۔

"النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم"

نبی مومنین کی جانوں کا خود ان سے زیادہ اختیار رکھنے والا ہے۔

اور لوگوں نے حسن نیت کے ساتھ اسے قبول بھی کیا ہے۔

فلا وربک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم
ثم لایجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا
تسلیما" (سورہ نساء۔ آیت ۶۵)

ایسا نہیں ہے، تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہ ہوں گے جب تک کہ ان جھگڑوں میں جو ان کے مابین پڑے ہیں تم کو حاکم نہ بنالیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو اس طرح تسلیم کرلیں جیسا کہ تسلیم کرنے کا حق ہے۔

اس طرح کے نظام میں جس کی بنیاد ولایت، ہمبستگی اور مشترکہ معاہدہ پر استوار ومحکم ہے، نہ صرف عوام اور حکومت ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ عوام حکومت سے

غافل نہیں رہتے۔ نتیجتاً نظام کی حفاظت اصلی اعتبار سے عوام و امام اور حکومت کے اتحاد پر منحصر ہو گی (۳)

سیاسی مسائل میں علماء و عوام کی ذمہ داری:

علماء دین جو اسلامی معاشرے میں صاحب فکر و نظر اور ہدایت و رہبری کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں، سیاسی مسائل میں بھی ان کی ذمہ داری عظیم و مؤثر ہے۔ قرآن کریم نے اہل کتاب مذہبی پیشواؤں میں سے ان افراد کی سخت مذمت کی ہے، جنھوں نے مظالم دیکھ کر بھی ظلم کو روکنے کی کوشش نہیں کی، جبکہ قرآن مجید امت مسلمہ کے ہر فرد اور خاص طور پر علماء دین کو امر بہ معروف اور نہی عن المنکر اور ظلم و ستم و بدعت ختم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

"لولا ینھٰھم الربانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۶۳)

کیوں نہیں منع کرتے اللہ والے لوگ اور علما اُن کو جھوٹی بات کہنے سے اور حرام خوری سے یقیناً بہت بدی ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد وعیسیٰ ابن مریم ذالک بما عصوا وکانوا یعتدون کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون" (سورہ مائدہ - آیت ۷۹)

بنی اسرائیل میں سے جو کافر ہو گئے ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور زیادتی کیا کرتے تھے اس سے وہ باز نہ آتے تھے، ضرور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ بہت ہی برا تھا۔

مذکورہ آیتیں، ظلم سے مفاہمت کرنے والوں اور ان علماء دین کو جو ظلم

کے سامنے سکوت اختیار کرتے ہیں، کافروں میں شمار کرتی ہیں اور خدا و پیغمبر کی لعنت کا مستحق سمجھتی ہیں۔

مذہبی علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری اُن جابر و ظالم حکمرانوں کے اعمال پر نظارت اور اُن پر قابو پانا ہے۔ مسند اقتدار پر بیٹھ کر دینی مقدسات اور لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلنے والوں کے سامنے سکوت اختیار کرنا ناقابل معافی جرم اور سخت عذاب کا باعث ہے۔

عوام کی ذمہ داری :

اس اہم مسئلہ میں عوام کی ذمہ داریوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ الٰہی عذابوں میں سے ایک عذاب لوگوں پر فاسد افراد کی حکومت کا ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید کا بیان ہے۔

اذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميراً " (سورۂ اسراء۔ آیت ۱۶)

اور ہم جب کسی بستی کے ہلاک کردینے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس میں مالداروں کو زیادہ کردیتے ہیں پس وہ اس بستی میں (ہمارے احکام کے بارے میں) نافرمانی کرنے لگتے ہیں پھر وہ بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے اور ہم اسے پورا پورا تباہ کردیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انصاف اور حکمت کی بنا پر یہ "ہلاکت" جو صاحب اقتدار ظالم و جابر افراد کے ذریعے عملی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اقدام نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ ایک طرح کا عذاب ہے جس کا سامنا لوگوں کو، ظلم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور سکوت اختیار کرنے کی وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے۔ جیسا کہ اور آیتیں بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہیں :

ذالك ان لم يكن ربك مهلك القرى بظلم واهلها غافلون (سورۂ انعام۔ آیت ۱۳۱)

(یہ رسولوں کا بھیجنا) اس لیے ہے کہ تمہارا رب بستیوں کو ناحق برباد نہیں کرتا

جس حال میں کہ ان کے باشندے (احکام سے) بے خبر ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا طریقۂ کار یہ ہے کہ شروع میں خبردار کرتا ہے اور لوگوں کی سیاسی، عبادی، سماجی، اخلاقی، ثقافتی اور فوجی و دفاعی وغیرہ ذمہ داریوں کو معین کرتا ہے، پھر کہیں نیک حکمران کو ان پر حکومت کے لیے معین کرتا ہے، اب اگر لوگ ایسے حکمراں کی اطاعت نہیں کرتے تو پھر اللہ تعالیٰ ظالم حکمرانوں کو ڈھیل دیتا ہے، اس طریقے سے اللہ تعالیٰ کا عذاب ظالم و جابر افراد کے ذریعے لوگوں پر نازل ہوتا ہے۔

لہذا، لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنا مقدر سنواریں [illegible] رہبروں کی قیادت میں استکباری طاقتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں [illegible] اللہ تعالیٰ کی حاکمیت جو ایسے ہی نیک افراد کی حاکمیت ہے، عملی جامہ پہن سکے۔ اس لیے [illegible]

"وان الارض یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین"

زمین خدا کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہے وارث بنا سکتا ہے، لیکن کامیاب وہی لوگ ہوں گے جو پرہیزگار اور متقی ہوں۔

حاشیے

① "دائرۃ المعارف بستانی" میں سیاست کے معنی انگریزی مفہوم کے تحت (POLITICS) بیان ہوئے ہیں۔ جبکہ ہماری فارسی لغت میں (POLITICS) کے معنی، ان اعمال کے مطابق قرار پاتے ہیں، جن میں دھوکے، فریب سے کام لیا جائے اور وہ آجکل کے سیاسی کارکنوں کے اعمال کو دیکھتے ہوئے حسب حال اترتے ہیں اور جہاں تک میکیاولی ازم کی بات ہے، وہ سیاست کا ایک خاص مجرمانہ طریقہ ہے جس کی طرف اپنے سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ساری حکومتیں گھوڑے دوڑا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ طریقۂ اسلامی سیاست کی ماہیت و اصول کے اعتبار سے منافی ہے۔

② ایران و عراق جنگ کے متعلق جو لوگ ظالم و جابر عراقی حکومت کی درخواست پر اسلامی جمہوریہ ایران سے مثبت جواب مانگتے ہیں آیا انہوں نے مذکورہ بالا آیت پر کبھی توجہ کی ہے؟ جس طرح عراق پر حاکم بعثی حکومت کی ایران کے خلاف جارحانہ کاروائی دنیا کے کسی بھی فرد پر پوشیدہ نہیں اسی طرح اس حکومت کے استکباری طاقتوں سے تعلقات سب پر واضح ہیں۔ اس آیت کے مطابق دنیا کے تمام مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ ایران کا ساتھ دیں اور ظالم و جابر بعثی حکومت کے خلاف جنگ لڑیں تاکہ تعدی کرنے والے کو سزا ملے اور حق و انصاف کے ساتھ صلح برقرار ہو، ورنہ اس کی دوسری صورت یعنی محض صلح و امن کا پروپیگنڈا کرنا استکباری طاقتوں کی غلامی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

③ ــــ جمہوری اسلامی ایران میں آج ہم اس اثر کو بخوبی محسوس کرتے ہیں۔

جناب محمد باقر انصاری

قرآن میں

(آخری قسط)

اسماء وصفات قرآن

۲۰۔ **قول** : قرآن مجید کا ایک دوسرا نام قول ہے جو حسب ذیل آیتوں میں آیا ہے:

افلم یدبروا "القول" (مومنون ۔ ۶۸) ولقد وصلنا لھم "القول" (قصص ۔ ۵۱)

لقد حق القول علی اکثرھم (یس ۷) ویحق "القول" علی الکافرین (یس ۔ ۷۰) انہ

"لقول" رسول کریم (حاقہ ۔ ۴۰ ۔ تکویر ۔ ۱۹) انا سنلقی علیک "قولاً" "ثقیلا" (مزمل ۔ ۵)

انہ لقول فصل (طارق ۔ ۱۳)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید پیغمبر کا اپنا ذاتی قول نہیں ہے بلکہ کلام وحی ہے جو آنحضرتؐ اپنی زبان مبارک سے ادا فرماتے تھے۔ اس کے ثبوت میں یہ آیت ہے:

ولو تقول علینا بعض الاقاویل ، لاخذنا ہ بالیمین۔

(حاقہ ۔ ۴۴)

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ان ھو الا وحی یوحیٰ (نجم ۔ ۴) لہٰذا ان لوگوں کا قول جنھوں نے کہا: ان ھذا الا قول البشر (مدثر ۔ ۲۵) غلط اور غیر منصفانہ ہے۔ قرآن مجید کو قول خدا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیت سنلقی علیک قولا" ثقیلا بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے اور قرآن مجید میں خدا کے سلسلہ میں لفظ قول استعمال بھی ہوا ہے، جیسے: ومن اصدق من اللہ "قیلا" (نساء ۔ ۱۲۲) مذکورہ آیت میں صفت "ثقیل" اس لحاظ سے ذکر ہوئی ہے کہ قرآن ہر شخص کے لئے قابل تحمل نہیں، صرف پاک دل اور قلب مصفیٰ رکھنے والے افراد ہی حمل کرسکتے ہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں

ارشاد ہوتا ہے : لوانزلنا ھذا القران علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ (حجرات ۲۱) وہ پتھر دل افراد جن کے بارے میں قرآن مجید "کالحجارۃ اواشد قسوۃ (بقرہ - ۷۴) کی تعبیر استعمال کرتا ہے ، تحمل قرآن سے محروم ہیں ۔

۲۱۔ کتاب : کتاب ، کتب یکتب کا مصدر ہے ، اس کی جمع کتب" بروزن "قرص" ہے ۔ کتاب اس مجموعے کو کہتے ہیں جس میں کچھ لکھا ہوا ہو ۔ اس کے علاوہ کتاب کے کچھ اور بھی معانی ہیں ، جیسے ، مکتوب ، صحیفہ ، حکم ، وجوب ، فرض اور قدر ، قرآن مجید میں لفظ کتاب تقریباً ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے ۔

بقول راغب قرآن کو کتاب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ گو اصولی طور پر کتاب نوشتوں کے مجموعے کو کہا جاتا ہے لیکن بطور استعارہ غیر مکتوب مگر مرتبط کلموں ، جملوں اور فصلوں کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے ، لہٰذا لفظ کتاب ، ذالک الکتاب لاریب فیہ (بقرہ - ۲) اور اسی طرح کی دوسری آیتوں میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے ، یعنی ایک ایسا مجموعہ جو پیغمبر پر نازل ہوا ہے ، نہ کہ یہ اوراق و جلد و تحریر کیونکہ یہ چیزیں قابل تغییر و تحریف ہیں ۔ لفظ کتاب جب بھی قرآن کے لئے استعمال ہوتا ہے اس سے مراد ان آیتوں اور سوروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو مرسل اعظمؐ پر نازل ہوئے اور لوگوں کے سینوں ، حافظوں ، پتیوں ، درخت کی چھالوں اور کاغذوں پر محفوظ ہو کر نسلاً بہ نسل منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں ، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قرآن کے دو وجود ہیں ۔ وجود نفسی و وجود کتبی ۔ وجود نفسی ، ذہن و کتابت کا محتاج نہیں ، خواہ ذہن و کتابت کا وجود ہو یا نہ ہو ۔ قرآن کا وجود نفسی موجود ہے ۔ لیکن وجود ذہنی یا کتبی اس صورت سے عبارت ہے جو ذہن یا کتاب میں منقوش ہوتی ہے ۔ قرآن کی حقانیت ، اس میں ریب و شبہ کا نہ ہونا اور اس طرح کے اکثر مباحث کا تعلق قرآن کے وجود نفسی سے ہے کیونکہ آیات قرآن کے تدریجی نزول کے وقت قرآن مجید کا مکتوبی مجموعہ وجود نہیں رکھتا تھا ۔ خود قرآن مجید بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے ۔

ولو نزلنا علیک کتابا فی قرطاس فلمسوہ بایدیھم لقال الذین کفروا ان ھذا الا سحر مبین (انعام - ۷)

اب ہم ان آیات کو پیش کر رہے ہیں جن میں قرآن مجید کو "کتاب" کے نام سے یاد کیا گیا ہے : ذالک "الکتاب" لاریب فیہ (بقرہ - ۲) ولما جاءھم "کتاب" من عند اللہ (بقرہ - ۸۹) کتاب اللہ وراء ظھورھم (بقرہ ۱۰۱) آتیناھم الکتاب (بقرہ ۱۲۱) یعلمھم "الکتاب" (بقرہ - ۱۲۹) یعلمکم الکتاب (بقرہ - ۱۵۱) بیناہ للناس فی "الکتاب" (بقرہ - ۱۵۹) نزل "الکتاب" بالحق (بقرہ - ۱۷۶) اختلفوا فی الکتاب (بقرہ - ۱۷۶) من "الکتاب" والحکمہ (بقرہ - ۲۳۱) نزل علیک "الکتاب" بالحق (آل عمران - ۳) انزل علیک "الکتاب" (آل عمران - ۷) ھن ام "الکتاب" (آل عمران - ۷) یعلمھم "الکتاب" (آل عمران - ۱۶۴) انزلنا الیک "الکتاب" بالحق (نساء - ۱۰۵) انزل اللہ علیک "الکتاب" (نساء - ۱۱۳) مایتلی علیکم فی "الکتاب" (نساء - ۱۲۷) و"الکتاب" الذی نزل علی رسولہ (نساء - ۱۳۶) نزل علیکم فی الکتاب (نساء - ۱۴۰) نور و"کتاب" مبین (مائدہ - ۱۵) انزلنا الیک "الکتاب" بالحق (مائدہ - ۴۸) الذین آتیناھم "الکتاب" (انعام - ۲۰) ما فرطنا فی "الکتاب" من شئ (انعام - ۳۸) ھذا کتاب انزلناہ مبارک (انعام - ۹۲) انزل الیکم "الکتاب" مفصلاً (انعام - ۱۱۴) آتیناھم "الکتاب" (انعام - ۱۱۴) ھذا "کتاب" انزلناہ مبارک (انعام - ۱۵۵) انزل الکتاب (انعام - ۱۵۶) انزل علینا "الکتاب" (انعام - ۱۵۷) "کتاب" انزل الیک (اعراف ۲) جئناھم بکتاب" فصلناہ (اعراف - ۵۲) اللہ الذی نزل "الکتاب" (اعراف - ۱۹۶) تلک آیات الکتاب الحکیم (یونس - ۱) وتفصیل "الکتاب" (یونس - ۳۷) "کتاب" احکمت آیاتہ (ہود - ۱) تلک آیات الکتاب المبین (یوسف - ۱) تلک آیات "الکتاب" (رعد - ۱) "کتاب" انزلناہ الیک (ابراہیم - ۱) تلک آیات "الکتاب" و قرآن مبین (حجر - ۱) وما انزلنا علیک "الکتاب" الا لتبین لھم (نحل - ۶۴) ونزلنا علیک الکتاب (نحل - ۸۹) انزل علی عبدہ "الکتاب" (کہف - ۱) من

"کتاب" ربك (کہف - ۲۷) واذکر فی "الکتاب" (مریم -۱۶- ۴۱- ۵۱ - ۵۴ - ۵۶) انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم (انبیاء - ۱۰) تلك آیات الکتاب المبین (شعراء - ۲) تلك آیات القرآن "وکتاب" مبین (نمل - ۱) تلك آیات "الکتاب" المبین (قصص ۲) فأتوا "بکتاب" من عند اللہ (قصص - ۴۹) ان یلقی الیك "الکتاب" (قصص - ۸۶) اتل ما اوحی الیك من الکتاب (عنکبوت - ۴۵) انزلنا الیك "الکتاب" (عنکبوت - ۴۷) انزلنا علیك "الکتاب" (عنکبوت - ۵۱) تلك آیات "الکتاب" الحکیم (لقمان - ۲) تنزیل "الکتاب" لا ریب فیہ (سجدہ - ۲) فی "الکتاب" مسطورا (احزاب - ٦) الذین یتلون کتاب اللہ (فاطر - ۲۹) اوحینا الیك من الکتاب (فاطر - ۳۱) ثم اورثنا "الکتاب" (فاطر - ۳۲) "کتاب" انزلناہ الیك مبارك (ص - ۲۹) تنزیل "الکتاب" من اللہ (زمر - ۱) انزلنا الیك "الکتاب" (زمر - ۲) نزل احسن الحدیث "کتابا" (زمر - ۲۳) انزلنا علیك "الکتاب" للناس (زمر - ۴۱) تنزیل الکتاب من اللہ (مومن - ۲) الذین کذبوا "بالکتاب" (مومن - ۷۰) "کتاب" فصلت آیاتہ (فصلت - ۳) وانہ "لکتاب" عزیز (فصلت - ۴۱) اورثوا الکتاب" (شوری - ۱۴) انزل "الکتاب" بالحق (شوری - ۱۷) والکتاب المبین (زخرف - ۲) تنزیل الکتاب من اللہ (جاثیہ - ۲) تنزیل الکتاب من اللہ (احقاف - ۲) ھذا کتاب مصدق (احقاف - ۱۲) سمعنا کتابا "انزل من بعد موسی (احقاف - ۳۰) وکتاب مسطور (طور - ۲) یعلمھم الکتاب والحکمۃ (جمعہ - ۲)

پورے قرآن میں صرف یہی آیتیں ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے لئے لفظ کتاب استعمال ہوا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں کچھ ایسی بھی آیتیں ہیں جن میں لفظ کتاب کا اطلاق قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں پر ہوا ہے، جیسے: لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان (حدید - ۲۵)

۲۲۔ **کلام اللہ**: قرآن مجید میں تعبیر "کلام اللہ" تین مقامات پر استعمال ہوئی ہے ان میں سے ایک آیت میں اس سے مراد قرآن مجید ہے: وان احد من المشرکین استجارك

فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ" (توبہ - ۶)
اس آیت میں کلام خدا سے مراد قرآن ہے، گو سارے کا سارا قرآن کلام الٰہی ہے لیکن ظاہراً اس آیت میں کلام اللہ سے مراد پورا قرآن نہیں اور بعنوان اسم بیان نہیں ہوا ہے۔
ایک اور آیت میں "کلمۃ ربک" (انعام - ۱۱۵) استعمال ہوا ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے۔

۲۳- **مثانی** : اس لفظ کا مادّہ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک عدد دو ۲، اور دوسرا معنی مدح و ثنا ہے، قرآن مجید کے لئے دو آیتوں میں اس کا استعمال ہوا ہے: اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا "مثانی" (زمر - ۲۳) ولقد آتیناک سبعامن "المثانی" والقرآن العظیم (حجر - ۸۷) ان دو آیتوں میں لفظ مثانی قرآن مجید کے لئے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اگر بمعنی عدد ہو تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کا اعادہ ہوتا رہتا ہے، زمانے کے گذرنے سے وہ کہنہ و فرسودہ نہیں ہوتا۔
راغب اصفہانی المفردات میں کہتے ہیں: (یصح انہ قیل للقرآن مثانی لما ثینی ویتجدد حالا فحالا من فوائدہ کما روی فی الخبر فی صفتہ لا یعوج فیقوم ولا یزیغ فیستعتب ولا تنقضی عجائبہ۔
اور اگر بمعنی مدح و ثناء ہو تو مراد یہ ہے کہ اہل فکر و نظر ہمیشہ قرآن مجید کی مدح و ثناء کرتے رہتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں ہمیشہ تعجب خیز آثار کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور خود قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا بھی مستحق مدح و ثنا ہے۔
دوسری آیت کے سلسلہ میں یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ معتبر روایات کے مطابق سبع من المثانی سے مراد سورہ فاتحہ ہے، کیونکہ اس سورہ میں سات آیتیں ہیں اور ہر نماز میں دو مرتبہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔
علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت کے ذیل میں قرآن مجید کے مثانی ہونے کے بارے میں عمدہ تحقیق فرمائی ہے، ہم یہاں اس کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

مثانی جمع مثنیہ، بمعنی عطف و اعادہ ہے اور لفظ "متشابھا" قرینہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیتیں ایک دوسرے پر عطف ہوتی ہیں اور ایک آیت دوسری آیت کے ذریعہ تفسیر ہوتی ہے۔ علامہ طباطبائی نے اپنے موقف کی تائید میں کچھ روایات بھی پیش کئے ہیں، من جملہ پیغمبرؐ کی یہ حدیث کہ یصدّق بعضہ بعضا"

۲۴۔ **موعظہ** : وعظ، یعظ وعظا سے مشتق اور نصیحت کرنے کے معنی میں ہے، اس کی جمع مواعظ ہے۔ چونکہ قرآن مجید انسانوں کے لئے پند و نصیحت ہے لہذا اسے موعظہ کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا یہ نام پانچ آیتوں میں ذکر ہوا ہے:

ھٰذا بیان للناس وھدی وموعظۃ للمتقین (آل عمران - ۱۳۸) وموعظۃ للمتقین (مائدہ - ۴۶) قد جاءتکم "موعظۃ" من ربکم (یونس - ۵۷) و"موعظۃ" وذکری للمومنین (ہود - ۱۲۰) وموعظۃ للمتقین (نور - ۳۴)

۲۵۔ **نباءعظیم** : ایک قول کے مطابق ایک مقام پر یہ تعبیر، قرآن مجید کے لئے استعمال ہوئی ہے: قل ھو نباءٌ عظیم (ص - ۶۷)۔ نباء بمعنی خبر ہے، چونکہ قرآن مجید توحید، معاد، حلال، حرام، قصص اور امثال وغیرہ کی خبر دیتا ہے، لہذا اسے نباء عظیم کا نام دیا گیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ: عما یتساءلون عن النباء العظیم (نباء - ۱-۲) سے بھی مراد قرآن مجید ہے۔

۲۶۔ **نجم و نجوم** : نجم کے اصل معنی ستارہ و کوکب طالع ہیں۔ اس کی جمع نجوم ہے۔ مختلف مقامات پر یہ لفظ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے لیکن بیشتر مقامات پر تخلیق یا قدرت کے موضوع سے متعلق ہے۔ صرف دو آیتوں کے بارے میں مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ "والنجم" اذا ھوی (نجم - ۱) یعنی قرآن کی قسم جس وقت وہ نازل ہوا، فلا اقسم بمواقع "النجوم" (واقعہ - ۷۵)

مواقع بمعنی محل وقوع ہے۔ لہذا مواقع نجوم سے مراد محل نزول قرآن ہے۔ قرآن مجید کو نجم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید تدریجا اور معینہ اوقات میں نازل ہوا ہے۔ راغب اصفہانی نے بھی اسی وجہ کو بیان کیا ہے۔

۲۷۔ **نور** : نور کے معنی روشنی ہے، چونکہ قرآن مجید ہدایت انسان کے لئے روشن چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اسے نور کہا گیا ہے۔ حسب ذیل آیتوں میں یہ لفظ قرآن مجید کے لئے استعمال ہوا ہے: وانزلنا الیکم نورا مبینا (نساء - ۱۷۴) قد جاءکم من اللہ "نور" وکتاب مبین (مائدہ ۱۵) واتبعوا النور الذی انزل معہ (اعراف - ۱۵۷) ولکن جعلناہ نورا (شوریٰ - ۵۲) فامنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا (تغابن ۸)

۲۸۔ **ھدیٰ** : ھدیٰ بھی قرآن مجید کا نام ہے، البتہ کبھی بطور اسم استعمال ہوا ہے اور کبھی بطور صفت، ہدایت کے معنی معلوم اور اس کی وجہ تسمیہ بھی واضح ہے، آیات حسب ذیل ہیں:

"ھدی" للمتقین (بقرہ - ۲) "ھدی" وبشری للمومنین (بقرہ - ۹۷) "ھدی" للناس وبینات من الھدی (بقرہ - ۱۸۵) ھذا بیان للناس و "ھدی" وموعظۃ للمتقین (آل عمران - ۱۳۸) و "ھدی" وموعظۃ للمتقین (مائدہ ۴۶) فقد جاءکم بینۃ من ربکم و "ھدی" ورحمۃ (انعام ۱۵۷) "ھدی" ورحمۃ لقوم یومنون (اعراف - ۵۲) ھذا بصائر من ربکم و "ھدی" ورحمۃ (اعراف - ۲۰۳) و "ھدی" ورحمۃ للمومنین (یونس - ۵۷) و "ھدی" ورحمۃ لقوم یؤمنون (یوسف - ۱۱۱ - نحل - ۶۴) وھدی ورحمۃ وبشری للمسلمین (نحل - ۸۹) و "ھدی" وبشری للمسلمین (نحل - ۱۰۲) "ھدی" وبشری للمؤمنین (نمل - ۲) وانہ "لھدی" ورحمۃ للمومنین (نمل - ۷۷) "ھدی" ورحمۃ للمحسنین (لقمان - ۳) "قل ھو للذین آمنوا "ھدی" وشفاء (فصلت - ۴۴) ھذا "ھدی" (جاثیہ - ۱۱) ھدی ورحمۃ لقوم یوقنون (جاثیہ ۲۰)

بعض آیتوں میں قرآن مجید کی خاصیت ہدایت، فعل کی شکل میں بیان ہوئی ہے جیسے:

ان ھذا القرآن "یھدی" للتی ھی اقوم (اسراء - ۹)

۳۹۔ **وحی**: لغت میں وحی ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے، جسے انسان کسی کو تعلیم دینے کے لئے القاء کرتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ پیغمبروں پر خدا کے القائات کے لئے شایع ہو گیا (المنجد) قرآن مجید میں وحی کی مختلف قسمیں ہیں، شلاً:

وَ"اَوحیٰ" ربّکَ الی النحل ان اتخذی من الجبال (نحل - ۶۸) اس آیت میں وحی سے مراد الہام اور ایک قسم کی وحی ہے، پس پردہ سے یا درخت وغیرہ کے ذریعہ وحی، یہ دوسری قسم ہے، لیکن فی الحال اقسام وحی کے بیان کا محل نہیں ہے۔ لفظ وحی قرآن کے لئے چند آیتوں میں استعمال ہوا ہے۔: ان ھو الا "وحی" یوحیٰ (نجم - ۴) قل انما انذرکم "بالوحی" (انبیاء - ۴۵) ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضیٰ الیک "وحیہ" (طہ ۱۱۴) اس آخری آیت میں لفظ وحی، قرآن مجید کے نام کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق بھی وحی قرآن سے تھا، اس لئے اسے ذکر کیا گیا ہے۔

بقیہ آیتوں میں لفظ وحی، بصورتِ فعل استعمال ہوا ہے اور سب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید خداوند عالم کی طرف سے مرسل اعظمؐ پر وحی ہوا ہے:۔ وَ"اوحی" الیَّ ھٰذا القرآن (انعام - ۱۹) بما "اوحینا" الیک ھذا القرآن (یوسف - ۳) تتلوا علیھم الذی اوحینا الیک (رعد - ۳۰) وان کادوا لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک (اسراء - ۷۳) ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک (اسراء - ۸۶) وَاتل ما "اوحیٰ" الیک من کتاب ربک (کہف - ۲۷) اتل ما "اوحی" الیک من الکتاب (عنکبوت - ۴۵) والذی "اوحینا" الیک من الکتاب (فاطر - ۳۱) کذٰلک یوحی الیک والی الذین من قبلک (شوریٰ - ۳) وکذٰلک "اوحینا" الیک قرآناً عربیاً لتنذر ام القریٰ ومن حولھا (شوریٰ - ۷) والذی "اوحینا" الیک (شوریٰ - ۱۳) وکذٰلک "اوحینا" الیک روحاً من امرنا (شوریٰ - ۵۲) فاستمسک بالذی "اوحیٰ" الیک (زخرف - ۴۳) قل "اوحی" الی انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآناً عجباً (جن - ۱)

اوصاف قرآن

قرآن مجید کے جو اسماء بیان ہوئے ہیں گو ان میں سے بعض قرآن مجید کے اسم ہونے کے علاوہ اس کی صفت بھی ہیں۔ لیکن ذیل میں جن عناوین کو پیش کیا جا رہا ہے وہ قرآن مجید کے لئے محض صفت ہیں۔

۳۰۔ **عجب** : ایک مقام پر قرآن مجید کو "عجب" کہا گیا ہے :

سمعنا قرآناً عجبا" (جن - ۱) یعنی ایسا قرآن جس کا مانند پہلے کسی نے دیکھا نہ سنا، جو باعث حیرت و تعجب ہے۔ یہ لفظ بصورت فعل استفہام انکاری کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے، جیسے : افمن هذا الحديث "تعجبون"؟ (نجم - ۵۹) او "عجبتم" ان جاءکم ذکر من ربکم (اعراف - ۶۳ - ۶۹) ان دو آیتوں میں منکرین قرآن کا تعجب بیان کیا گیا ہے، لیکن سورہ جن میں "عجب" قرآن مجید کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے :

اکان للناس عجبا "ان اوحینا الی رجل (یونس - ۲) کانوا من آیاتنا عجبا" (کہف - ۹) ان دونوں آیتوں کا تعلق قسم اول سے ہے۔

۳۱۔ **عربی** : قرآن مجید کی ایک دوسری صفت عربی ہے۔ قرآن مجید کے عربی زبان میں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت اس کے مخاطب اہل عرب تھے، گو بعد میں غیر عرب کے لئے بھی دعوت اسلام تھی اور خود قرآن مجید اپنے کو عالمگیر بتاتا ہے، جیسے : تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین "نذیرا (فرقان - ۱) ان ھو الا ذکر للعالمین (تکویر - ۲۷)

بہرحال چونکہ آغاز بعثت میں " ام القری ومن حولھا " (شوریٰ - ۷) والے مخاطب قرآن تھے لہذا ان کی زبان یعنی عربی میں قرآن کا ہونا قدرتی بات ہے۔

لغت میں عربی کے دو معنی ہیں (۱) زبان عربی (۲) واضح اور فصیح کلام، قرآن مجید کے متعلق یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے، حسب ذیل آیتیں پہلے معنی میں استعمال

ہوئی ہیں : وھذا لسان عربي مبين (نحل - ۱۰۳) بلسان عربي مبين (شعراء ۱۹۵)
وھذا کتاب مصدق لسانا عربیا (احقاف - ۱۲) اور یہ آیتیں دوسرے معنی سے تعلق رکھتی ہیں : "اعجمی و عربي" قل ھو للذین آمنوا ھدی و شفاء (فصلت - ۴۴)
انا انزلناہ قرآنا عربیا" (یوسف - ۲) وکذلک انزلناہ حکما عربیا (رعد - ۳۷)
وکذلک انزلناہ قرآنا عربیا" (طہ - ۱۱۳) قرآنا عربیا "غیر ذی عوج (زمر - ۲۸) کتاب فصلت آیاتہ قرآنا عربیا" (فصلت - ۳) وکذلک اوحینا الیک قرآنا عربیا (شوری - ۷) انا جعلناہ قرآنا عربیا" (زخرف - ۳)

۳۲ - **عزیز** : عزیز بھی قرآن کی ایک صفت ہے اور اس لفظ کے بہت سے معانی ہیں — قوی و طاقت ور، شریف و کریم، نادر و کمیاب، اگر یہ لفظ خداوند عالم کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی وہ قوی و طاقت ور اور ناقابل تسخیر ذات جو کسی لحاظ سے عاجز نہ ہو اور اگر قرآن کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی شریف و کریم ہیں -

یہ لفظ صفت قرآن کے طور پر صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے : ان الذین کفروا بالذکر لما جاءھم وانہ لکتاب "عزیز" (فصلت - ۴۱)

پانچ آیتوں میں نزول قرآن کی نسبت صفت "عزیز" سے متصف خدا کی جانب دی گئی ہے : تنزیل العزیز الرحیم (یس - ۵) تنزیل الکتاب من اللہ "العزیز" العلیم (مومن - ۲) کذلک یوحی الیک والی الذین من قبلک اللہ العزیز الحکیم (شوری - ۳) تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم (جاثیہ - ۲ - احقاف ۱)

۳۳ - **غیر ذی عوج** : عوج یعوج عوجا - باب علم یعلم سے ، بمعنی کجی و انحنا ہے - جب یہ لفظ انسان کے سلسلہ میں استعمال ہو تو اس سے مراد بداخلاقی ہے ، یہ لفظ قرآن مجید کی صفات سلبیہ سے تعلق رکھتا ہے اور دو مرتبہ استعمال ہوا ہے : قرآنا عربیا "غیر ذی عوج" لعلھم یتقون (زمر - ۲۸) انزل علی عبدہ الکتاب

ولم یجعل لہ عوجا " (کہف - ۱)

راغب اصفہانی اس لفظ کی تشریح کے ضمن میں کہتے ہیں : والعوج یقال فیما یدرک بالفکر والبصیرۃ کما یکون فی ارض بسیط یعرف تفاوتہ بالبصیرۃ وکالدین والمعاش "

چونکہ قرآن مجید کو غور و فکر و بصیرت سے ادراک کیا جاتا ہے ، لہذا اس کیلئے اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے ۔ یعنی قرآن مجید میں کسی قسم کی کجی و انحراف نہیں ہے ۔

۳۴۔ قیم : قیم قرآن مجید کی صفت ہے ۔ معنی قیم ، ثابت و مستقیم ہے ، دین کے لئے بھی یہی صفت بیان ہوئی ہے ۔ دینا قیما (انعام - ۱۶۱) یعنی وہ ثابت دین جو امور معاش و معاد کو استوار کرتا ہے ۔

دو آیتوں میں قرآن مجید کی یہ صفت بیان ہوئی ہے : لم یجعل لہ عوجا قیما لینذر باسا شدیدا (کہف - ۱ - ۲) رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرۃ فیہا کتب قیمہ (بینہ - ۲ - ۳)

۳۵۔ کریم : کریم کی جمع کرام و کرماء ہے اور خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ میں شمار ہوتا ہے ۔ کریم اگر انسان کو کہا جاتے تو اس سے مراد سخی و سخا و تمند ہے اور اگر اشیاء کے لئے استعمال ہو تو مراد اس شئی کی فرد اکمل ہے ۔ جیسے رزق کریم ، یعنی بہترین و وافر روزی ، یا قول کریم اس کلام کو کہا جاتا ہے جو لفظ و معنی و قواعد کے لحاظ سے کامل و تام ہو وجہ کریم ، یعنی خوبصورت و دلکش چہرہ (المنجد)

یہ صفت قرآن مجید میں مختلف اسماء و اشیاء کے لئے واقع ہوئی ہے جیسے خدا ، رسول بہشتی نعمتیں ، اجر و پاداش ، قول ، رزق اور قرآن ۔

قرآن مجید کے لئے ایک آیت میں یہ صفت بیان ہوئی ہے ۔ انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون (واقعہ - ۷۷ - ۷۸) ۔ ایک آیت میں صیغہ مکرمہ استعمال ہوا ہے : فی صحف مکرمہ " (عبس - ۱۳)

۳۶۔ مبارک : مبارک برکت (بفتح راء) سے مشتق ہے ، اس کا معنی ، کسی

چیز میں الٰہی خیر و برکت کا ہونا ہے اور مبارک وہ چیز ہے جس میں یہ الٰہی خیر موجود ہو،
قرآن مجید کی یہ صفت چند آیتوں میں ذکر ہوئی ہے:

وھٰذا کتاب انزلناہ مبارک (انعام - ۹۲) وھٰذا ذکر مبارک انزلناہ
(انبیاء - ۵۰) کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ (ص - ۲۹)

ایک آیت میں قرآن مجید کے مبارک زمانہ میں نزول کی طرف اشارہ ہوا ہے:
انا انزلناہ فی "لیلۃ مبارکۃ" انا کنا منذرین (دخان - ۳)

ایک دوسری آیت میں قرآن مجید کے نزول کے سلسلہ میں تقدس و عظمت الٰہی کا ذکر ہے: تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا (فرقان - ۱)

۳۷ - **مجید**: مجید، خداوند متعال کی ایک صفت ہے - معنی مجید، وافر مقدار میں اپنے خصوصی فیض وجود و سخا کا جاری کرنا ہے، یہ صفت قرآن کے لئے دو جگہ بیان ہوئی ہے: ق والقرآن "المجید" (ق - ۱) بل ھو "قرآن مجید" (بروج - ۲۱) مقصد یہ ہے کہ قرآن عظیم اور قابل ستائش ہے کیونکہ اس میں تمام دنیوی و اخروی مکارم موجود ہیں۔

۳۸ - **مرفوعۃ**: مرفوعہ یعنی رفیع القدر والمنزلہ - یہ لفظ ایک آیت میں بیان ہوا ہے: فی صحف مکرمۃ "مرفوعۃ" مطھرۃ (عبس - ۱۳ - ۱۴)

گو اس آیت میں مرفوعہ، براہ راست صفت قرآن نہیں بلکہ صفت صحف ہے لیکن قرآن مجید بھی صحف میں داخل ہے۔

۳۹ - **متشابہ**: ایک آیت میں قرآن کریم کے ایک حصہ کو متشابہ اور دوسرے کو محکم کہا گیا ہے: ھو الذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب و اُخر متشابھات (آل عمران - ۷)

لیکن ایک دوسری آیت میں پورے قرآن کی صفت "متشابہ" بیان ہوئی ہے
اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا (زمر - ۲۳)

یہاں متشابہ سے کیا مراد ہے؟

محکم و متشابہ کی گفتگو اپنے مقام پر درست و صحیح ہے، لیکن یہاں متشابہ سے مراد شباہت ہے۔ یعنی قرآن ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں، نظم، احکام، حکمت اور استقامت وغیرہ میں ایک دوسرے سے شباہت رکھتی ہیں (مفردات راغب) کیونکہ اگر اس آیت میں بھی متشابہ سے مراد مقابل محکم ہو تو اس آیت اور آیت محکم و متشابہ میں تناقض پیدا ہو جائے گا۔

۴۰۔ **مھیمن**: مہیمن بھی صفت قرآن مجید ہے، جو ایک آیت میں ذکر ہوئی ہے "وانزلنا الیك الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیه من الکتاب ومھیمنا علیه" (مائدہ - ۴۸)

علامہ طباطبائی اس لفظ کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں:

ھیمنة الشیٔ علی الشیٔ علی مایتحصل من معناھا کون الشیٔ ذا سلطة علی الشیٔ فی حفظه ومراقبته وانواع التصرف فیه، وھذا حال القرآن الذی وصفه الله تعالیٰ بانه تبیان کل شیٔ بالنسبة الی مابین یدیه من الکتب السماویة یحفظ منھا الاصول الثابتة غیر المتغیرة وینسخ منھا ما ینبغی ان ینسخ من الفروع التی یمکن ان یتطرق الیھا التغیر والتبدل حتی یناسب حال الانسان بحسب سلوکه صراط الترقی والتکامل بمرور الزمان (ج ۶ ص ۳۴۸)

۴۱۔ **نذیر**: باب علم یعلم سے نذر ینذر نذرا ونذورا کسی چیز کے انجام سے آگاہ اور اس کے لئے آمادہ ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی کا متعدی انذار ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے خطرناک انجام سے آگاہ کرنا ہے۔

نذیر پیغمبرؐ کی صفت ہے اور قرآن کی بھی، کیونکہ قرآن انسان کے خطرناک انجام کی خبر دیتا ہے اور اسے اس سے روکتا ہے۔

جن آیتوں میں قرآن مجید کی یہ صفت بیان ہوئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

تبارك الذی نزّل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا" (فرقان - ۱)

چیز میں الہٰی خیر و برکت کا ہونا ہے اور مبارک وہ چیز ہے جس میں یہ الہٰی خیر موجود ہو ،
قرآن مجید کی یہ صفت چند آیتوں میں ذکر ہوئی ہے :
وھٰذا کتاب انزلناہ مبارك (انعام - ۹۲) وھٰذا ذکر مبارك انزلناہ -
(انبیاء - ۵۰) کتاب انزلناہ الیك مبارك لیدبروا آیاتہ (ص - ۲۹)
ایک آیت میں قرآن مجید کے مبارک زمانہ میں نزول کی طرف اشارہ ہوا ہے :
انا انزلناہ فی "لیلۃ مبارکۃ" انا کنا منذرین (دخان - ۳)
ایک دوسری آیت میں قرآن مجید کے نزول کے سلسلہ میں تقدس و عظمت الہٰی کا ذکر
ہے : تبارك الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا (فرقان - ۱)

۳۷ - **مجید** : مجید، خداوند متعال کی ایک صفت ہے - معنی مجید، وافر مقدار میں اپنے خصوصی فیض وجود و سخا کا جاری کرنا ہے ، یہ صفت قرآن کے لئے دو جگہ بیان ہوئی ہے : ق والقرآن "المجید" (ق - ۱) بل ھو قرآن مجید" (بروج - ۲۱) مقصد یہ ہے کہ قرآن عظیم اور قابل ستائش ہے کیونکہ اس میں تمام دنیوی و اخروی مکارم موجود ہیں -

۳۸ - **مرفوعۃ** : مرفوعہ یعنی رفیع القدر و المنزلہ - یہ لفظ ایک آیت میں بیان ہوا ہے : فی صحف مکرمۃ "مرفوعۃ" مطھرۃ (عبس - ۱۳ - ۱۴)
گو اس آیت میں مرفوعہ ، براہ راست صفت قرآن نہیں بلکہ صفت صحف ہے لیکن قرآن مجید بھی صحف میں داخل ہے -

۳۹ - **متشابہ** : ایک آیت میں قرآن کریم کے ایک حصہ کو متشابہ اور دوسرے کو محکم کیا گیا ہے : ھوالذی انزل علیك الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب و اُخر متشابھات (آل عمران - ۷)
لیکن ایک دوسری آیت میں پورے قرآن کی صفت " متشابہ" بیان ہوئی ہے
اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا (زمر - ۲۳)
یہاں متشابہ سے کیا مراد ہے ؟

محکم و متشابہ کی گفتگو اپنے مقام پر درست و صحیح ہے، لیکن یہاں متشابہ سے مراد شباہت ہے۔ یعنی قرآن، ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں، نظم، احکام، حکمت اور استقامت وغیرہ میں ایک دوسرے سے شباہت رکھتی ہیں (مفردات راغب) کیونکہ اگر اس آیت میں بھی متشابہ سے مراد مقابل محکم ہو تو اس آیت اور آیت محکم و متشابہ میں تناقض پیدا ہوجائے گا۔

۴۰۔ **مھیمن**: مھیمن بھی صفت قرآن مجید ہے، جو ایک آیت میں ذکر ہوئی ہے
"وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب ومھیمنا علیہ" (مائدہ ـ ۴۸)

علامہ طباطبائی اس لفظ کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں:

ھیمنۃ الشیء علی الشیء علی مایتحصل من معناھا کون الشیء ذا سلطۃ علی الشیء فی حفظہ ومراقبتہ وانواع التصرف فیہ، وھذا حال القرآن الذی وصفہ اللہ تعالیٰ بانہ تبیان کل شیء بالنسبۃ الی مابین یدیہ من الکتب السماویۃ یحفظ منہا الاصول الثابتۃ غیر المتغیرۃ وینسخ منہا ما ینبغی ان ینسخ من الفروع التی یمکن ان یتطرق الیہا التغیر والتبدل حتی یناسب حال الانسان بحسب سلوکہ صراط الترقی والتکامل بمرور الزمان (ج ۶ ص ۳۴۸)

۴۱۔ **نذیر**: باب علم یعلم سے نذر ینذر نذرا ونذورا کسی چیز کے انجام سے آگاہ اور اس کے لئے آمادہ ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی کا متعدی انذار ہے اور اس کے معنی کسی چیز کے خطرناک انجام سے آگاہ کرنا ہے۔

نذیر پیغمبرؐ کی صفت ہے اور قرآن کی بھی، کیونکہ قرآن انسان کے خطرناک انجام کی خبر دیتا ہے اور اسے اس سے روکتا ہے،

جن آیتوں میں قرآن مجید کی یہ صفت بیان ہوئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

تبارك الذی نزّل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین "نذیرا" (فرقان ـ ۱)

کتاب فصلت آیاتہ قرآناً عربیاً لقوم یعلمون بشیراً و نذیراً (فصلت۔۳،۴)
حکمۃ بالغۃ فما تغن النذر (قمر۔۵) وجاءکم النذیر (فاطر۔۳۷)
ھذا نذیر من النذر الاولی (نجم۔۵۶)
بعض آیتوں میں قرآن مجید کا ہدف و مقصد انذار قرار دیا گیا ہے۔ جیسے:
وھذا کتاب مصدق لساناً عربیاً لینذر الذین ظلموا (احقاف۔۱۲)

نتیجہ

یہ تھے قرآن مجید کے تمام اسماء و اوصاف۔ اگر ان اسماء و اوصاف کا غور سے مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ یہ تمام اسماء و اوصاف مشترک ہیں، صرف قرآن مجید سے مختص نہیں، مثلاً فرقان، قرآن کریم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور بعض دوسری آسمانی کتابوں کے لئے بھی۔ اسی طرح اوصاف مذکورہ بھی قرآن کے مخصوص اوصاف نہیں ہیں بلکہ خداوند عالم اور دیگر اشیاء کے لئے بھی صفت واقع ہوئی ہیں، جیسے کریم، مجید وغیرہ اور بشیر و نذیر و ہادی وغیرہ اوصاف انبیاء بھی ہیں۔

اس مقدس آسمانی کتاب کا خصوصی نام اور علم صرف "قرآن" ہے، جس طرح ذات باری تعالیٰ کا اصل نام اور علم اللہ ہے اور بقیہ تمام اسماء و اوصاف الٰہی فرعی ہیں۔ اور ممکن ہے کہ دوسرے موارد کے لئے بھی استعمال ہو، گو ان عناوین سے مادی لباس اتارنا ضروری ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اس آسمانی کتاب کا خصوصی نام و علم صرف و صرف قرآن ہے اور بقیہ تمام اسماء و اوصاف مشترک ہیں۔

والحمد للہ اولاً و آخراً

محترمہ لمیعہ فاروقی
ترجمہ، تلخیص: جناب خادم حسین ایم. اے علیگ

قرآنی معاشرے میں خواتین کا حصّہ

پیش نظر موضوع کو کانفرنس کے لیے میں نے اس خیال کے تحت انتخاب کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں انسانیت کو کئی زبردست سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان میں سے کچھ کا تعلق صرف خواتین اور کچھ کا معاشرے میں خواتین اور مردوں کے باہمی تعلق سے ہے۔ ممکن ہے یہ مسائل ہم میں سے کچھ کو زیادہ ہی واضح پریشان کن اور سماج کو کمزور کرنے والے معلوم ہوتے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاید ہی دنیا کا ایسا کوئی معاشرہ ہوگا جس میں ان مسائل کی اہمیت اور ان کے عواقب و نتائج کو محسوس نہ کیا جا رہا ہو۔

لھٰذا اس مسئلہ کا عملی حل تلاش کرنا انتہائی ضروری ہے۔ میں اس بات کی معتقد ہوں کہ قرآن مجید موجودہ معاشرے کی اصلاح کا بہترین لائحہ عمل پیش کرتا ہے، اسی بنا پر میں نے خواتین اور معاشرے سے وابستہ موضوع کے لیے قرآنی اصطلاح کو استعمال کرنا مناسب سمجھا۔

ممکن ہے اس مقالے کے عنوان " قرآنی معاشرے میں خواتین کا حصہ" سے آپ حضرات حیرت زدہ ہوں، لیکن آپ حضرات خود سوچیں کہ ہم نے اس مقالے کا عنوان " مسلم معاشرے میں خواتین کا حصّہ " یا اسلامی معاشرے میں خواتین کا حصہ" کیوں نہیں رکھا ؟

آپ حضرات مجھے اجازت دیں کہ مسلم یا اسلامی اصطلاح کام میں نہ لانے اور اس کے بجائے نامانوس و نسبتاً غیر مستعمل اصطلاح " قرآنی معاشرہ " کام میں لانے کی وجہ بیان کروں۔

اس عنوان کے انتخاب میں ہمارے پاس کم سے کم تین دلیلیں ہیں :

پہلی دلیل : ایسے بہت سے اعمال و اعتقادات ہیں جو اسلامی نہ ہوتے ہوئے بھی اسلامی

کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے تقریباً چالیس ایسے ممالک ہیں جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ انکی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے وہ خود کو اسلامی معاشرے کا نمونہ تصور کرتے ہیں ظاہر ہے کہ جب یہ سوال ہوتا ہے کہ ان معاشروں میں سے کونسا معاشرہ سچا اسلامی معاشرہ ہے۔ تو ایسی صورت میں جواب آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن مسلمانوں میں سے ہر ایک کا جواب یہی ہوگا کہ ہمارا معاشرہ اور ہمارے عوام دوسروں سے زیادہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مرضی کی تکمیل کرتے ہیں۔

دوسری طرف غیر مسلم افراد خاص طور پر مغربی محققین اقوام جو مختلف قوموں کے آداب و رسوم جاننے کے لئے دنیا کے چاروں طرف سفر کرتے ہیں وہ عالم اسلام میں موجود تمام اختلافات کو ایک ہی پیمانے سے ناپتے ہیں، جسکی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو چڑیا گھر سمجھتے ہیں اور مختلف اقوام شرقی کو مغربی اقوام سے مختلف نوع مانتے ہیں، میں اسے چڑیا گھر نظریہ (Zoo Theory) کہتی ہوں۔

اس نظریے کے ماننے والے، مسلمانوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف مقامات کا دورہ کرکے ہر عجیب وغریب رسم یا عمل کی تصویر کھینچتے ہیں اور بعد میں حاشیے لگا کر اسے اسلام یا اسلامی معاشرے کا جزو سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اسلامی دنیا کے کسی دوسرے علاقے کا دورہ کرکے یہی عمل دہراتے ہیں اور انہی حربوں کو کام میں لاتے ہیں، اسی طرح تصویریں کھینچتے ہیں اور اس طرح جو کچھ مواد ہاتھ آتا ہے اسے مسلمانوں کے درمیان سطحی اختلافات کو ابھارنے کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بھی اسلام ہے اور وہ بھی۔

مغربی محققین نے شاذونادر ہی اسلام کو پورے طور پر جاننے کی کوشش کی ہے، لھذا اس طرح سے محقق کا ذہن شک وشبہ کی آماجگاہ بن جاتا ہے، نتیجۃً جب وہ اپنے ملک واپس جاتا ہے، تو یہ تصور اس کے ساتھ ہوتا ہے کہ دنیا میں اسلام یکساں نہیں بلکہ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنی تحقیقات میں لکھتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں خواتین کے مقام اور رول کی مختلف تعبیرات و توجیہات ہیں۔ وہ ہر تعریف و تعبیر کو اسلامی کہنے پر اصرار کرتا ہے خواہ ہم مسلمان ان میں سے بعض کو اسلامی تعلیمات کی مسخ شدہ صورتیں اور جہلا کی رسم پرستی ہی کیوں نہ کہیں۔

ظاہر ہے کہ، وہ مسائل جو ہماری زندگی میں اہمیت کے حامل ہیں ان کے متعلق محض ان تحریروں کے ذکر کرنے پر اکتفا نہیں کی جا سکتی جو بظاہر مسلمانوں کے کچھ افراد کے بارے میں لکھی گئی ہیں اور

جن کے آداب و رسوم کو لاعلمی کی بنا پر "اسلامی" قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس صفت کا اطلاق اکثر بعض افراد یا ان کے اعمال پر غلطی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلامی کے مقابلے میں قرآنی معاشرے کی اصطلاح کا انتخاب کیا گیا ہے جو بذات خود غیر متنازع فیہ ہے اور ہماری موجودہ بحث کے حدود متعین کرنے کے لئے مفید مطلب ہے۔

دوسرے، "قرآنی معاشرہ" کی اصطلاح اس لیے زیادہ مناسب نظر آتی ہے کہ اس طرح ان اصولوں تک رہنمائی ہوتی ہے۔ جن کی تعلیم قرآن مجید دیتا ہے اور جن کی بنا پر تمام عالم اسلام میں ہمارے اسلامی معاشرے قائم ہیں۔ ہم سب کا مقصود ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہو۔ لیکن اس کے باوجود ہم میں سے کچھ لوگ ان اصولوں سے نادانستہ منحرف ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم مسلمان عوام کو خوشحال اور باسعادت دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسے اسلامی معاشرے کو قائم کرنا ہوگا جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہو۔ یہ تصور کرنا غلط ہوگا کہ "قرآنی معاشرہ" کی مثال ہمیں انڈونیشیا، مصر، نیجیریا، سعودیہ یا پاکستان سے مل سکتی ہے۔ قرآنی معاشرے کو سو فی صد قرآنی اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے اور یہ اس کا فرض ہے کہ پورے طور پر قرآنی اصولوں کی پیروی کرے صرف ایسے ہی معاشرے میں خواتین کے کردار سے متعلق صحیح رائے معلوم کرنے کا امکان ہو سکتا ہے چونکہ ہمارا مقصد قرآنی اصولوں اور تعلیمات پر بحث کرنا ہے لھٰذا میری نظر میں "قرآنی معاشرے میں خواتین کا حصہ" مقالے کا مناسب ترین عنوان ہے۔

تیسرے، عنوان کے انتخاب سے ہمارا مقصد اس بات پر زور دینا بھی تھا کہ قرآن مجید کو محض اپنے دینی اعمال و فرائض کا بنیادی ماخذ ماننے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اسے حیات کے تمام شعبوں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے تمام مرحلوں میں رہنما اور مرشد کی حیثیت سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ گذشتہ صدیوں کے دوران میں جبکہ مسلمانوں کی طاقت و عظمت اپنے عروج پر تھی تو قرآن مجید کا اثر و رسوخ اسلامی معاشرے کے فنی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی امور میں کارفرما ہوا کرتا تھا، اب اگر ہم اسلامی طرز زندگی کو اپنا کر اسلام کی طاقت و عظمت سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو ہمیں زندگی کے تمام مراحل میں قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ دین، صرف پانچ اصول دین یعنی کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تک محدود نہیں۔ انگریزی لفظ "RELEGION" بھی جو دین کے معنی میں مستعمل

ہے اس کا صحیح مترادف نہیں ، اس لیے کہ مذہب کا مفہوم محدود ہے جبکہ دین انسانی وجود اور اعمال کے ہر نہاں اور عیاں گوشے کا احاطہ کرتا ہے ۔ بے شک ہمارا مقصد یہی ہونا چاہئے کہ ہم اپنے تمام اعمال وافعال کو دین سے مربوط رکھیں ۔ اس کا امکان اسی وقت ہو سکتا ہے ، جب ہم قرآن مجید کو اپنی زندگی کے تمام مراحل میں مبداء علم اور مصدرِ اصلاح کے طور پر قبول کریں ۔

آئیے اس بحث میں ایک قدم مزید آگے بڑھایا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ قرآنی معاشرے کی تشکیل میں قرآن مجید کی تعلیمات ہمارے لیے کیا ہیں اور خواتین کی شخصیت پر ان کے اثرات کیا ہیں اور قرآنی معاشرے کی وہ کونسی امتیازی خصوصیات ہیں جو بطور خاص عورتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔

اس سوال کے جواب میں ہم پانچ اہم اور بنیادی امتیازات کا جائزہ لیں جو قرآنی معاشرے کیلئے لازمی اور غیر متنازع فیہ ہیں ۔ اگرچہ ہم ان امتیازی خصوصیات میں سے ہر ایک کے بارے میں الگ الگ بحث کریں گے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ امتیازی خصوصیات ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ، کیونکہ یہ ایک دوسرے پر مبنی بھی ہیں اور اثر انداز بھی ہوتی ہیں ۔ ان پانچوں امتیازی خصوصیات کا ایک دوسرے سے تعلق اس طرح سے ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔

یہ امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں :

۱۔ دونوں جنسوں کی مساوی قدر و منزلت :

قرآنی معاشرے کا پہلا وصف یہ ہے کہ قدر و منزلت کے لحاظ سے خواتین ، مردوں کے برابر ہیں ، دوسرے الفاظ میں قرآن مجید اس بات کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ خواتین اور مردوں کو پیدا کرنے والا خدائے عزّوجل ہے جو ایک ہے ، اور دونوں قدر و منزلت کے اعتبار سے برابر ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مساوات ہر طرح سے دونوں جنسوں کو یکساں اور متوافق مانتی ہے عورتوں و مردوں کی مساوات کو قرآن کی مدد سے چار پہلوؤں سے سمجھا جا سکتا ہے ۔

(الف) : دینی مسائل :

عورتوں اور مردوں کی مساوات سے متعلق قرآن مجید کے نظریے کو دینی امور میں دو عنوانات کے تحت سمجھا جا سکتا ہے ۱۔ ابتدائے آفرینش انسان ۲۔ احکام عبودیت و سزا و جزا

۱۔ ابتدائے آفرینش انسان : قرآن مجید آن کہانیوں سے عاری ہے، جو تورات میں خواتین کو حقیر ثابت کرنے کے لیے گڑھی گئی تھیں قرآن مجید میں ایسا اشارہ کہیں پر نہیں ملتا کہ باری تعالی نے پہلی عورت کو قدر و منزلت میں پہلے مرد سے کمتر خلق کیا یا یہ کہ عورت مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی، بلکہ اس کے برعکس قرآن مجید اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے :

"یاایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منہا زوجہا وبث منہما رجالاً کثیرا ونساءً واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام إن اللہ کان علیکم رقیبًا"

(سورۃ النساء ۔ آیت ۱)

اے آدمیو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر آپس میں تم سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے بچو اس میں شک نہیں کہ خدا تم پر نگران ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

"ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منہا زوجہا لیسکن الیہا" (الاعراف ۔ آیت ۱۸۹)

وہ وہی تو ہے جس نے تم سب کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا کہ اس سے مانوس ہو۔

موجودہ تورات میں ہم دیکھتے ہیں کہ حوا آدم کو ورغلانے والی ہیں، اور وہی تھیں جنھوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو گمراہ کرنے میں شیطان کی مدد کی تھی۔ جبکہ قرآن مجید حوا اور آدم دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اور دونوں کے متعلق ایک ہی انداز میں گفتگو کرتا ہے، قرآن کے نقطۂ نظر سے حوا اور آدم دونوں ایک ہی درجے کے گناہ گار تھے اور دونوں کی سزا جنت سے دربدری تھی، اور یہ کہ

دونوں ہی کی توبہ اللہ عزوجل نے قبول کی۔

(۲) احکام عبودیت وجزاو سزا : قرآن مجید، عورت مرد کے درمیان جہاں خلقت کے لحاظ سے مساوات کا قائل ہے وہیں دینی فرائض اور جزاء و سزا میں بھی مساوات برتتا ہے۔ ارشادِ ربّ العزت ہے :

"إن المسلمين والمسلمات والمؤمنين والمؤمنات والقانتين والقانتات والصادقين والصادقات والصابرين والصابرات والخاشعين والخاشعات والمتصدقين والمتصدقات والصائمين والصائمات والحافظين فروجهم والحافظات والذاكرين الله كثيراً والذاكرات أعد الله لهم مغفرة وأجراً عظيما" (الاحزاب - آیت - ۳۵)

یقیناً فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، اور ایمان رکھنے والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور دعا کرنے والے مرد اور دعا کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور گڑگڑانے والے مرد اور گڑگڑانے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھنے والے مرد اور محفوظ رکھنے والی عورتیں اور بہت کثرت سے خدا کی یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کیلئے خدائے تعالیٰ نے گناہوں کی بخشش اور بہت بڑا اجر مہیا فرمایا ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے :

"وعد الله المنافقين والمنافقات والكفار نار جهنم خالدين فيها هي حسبهم ولعنهم الله ولهم عذاب مقيم" (التوبہ — آیت ۶۸)

اللہ نے منافق مردوں اور عورتوں نیز کافروں سے جہنم کا وعدہ کرلیا ہے، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، وہی ان کو کافی ہوگا اور اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے پائیدار عذاب ہے۔

(ب) : اخلاقی فرائض اور ثواب

اخلاقی فرائض اور ثواب میں عورت مرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے :

"ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فاُولئك یدخلون الجنة ولا یظلمون نقیرا"

(النساء ۔ آیت ۱۲۴)

اور جو کوئی نیکی کرے گا اس حال میں کہ وہ مؤمن ہو، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، وہی تو جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر تل برابر ظلم نہ کیا جائے گا۔

پھر ارشاد ہے :

"من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینه حیاة طیبة ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون"

(النحل ۔ آیت ۹۷)

مردوں میں سے ہو یا عورتوں میں سے جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرے گا۔ اس حال میں کہ وہ ایمان رکھنے والا ہو تو ضرور ہم اس کی زندگی اچھی گذار دیں گے اور جو عمل وہ کیا کرتے تھے اس کا اس سے کہیں بہتر صلہ ان کو ضرور دے دیں گے۔

مزید ارشاد ہوتا ہے :

"المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض یأمرون بالمنکر وینھون عن المعروف ویقبضون ایدیھم نسوا اللہ فنسیھم إن المنافقین ھم الفاسقون"

(التوبہ ۔ آیت ۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس ہیں برائی کا حکم دیتے رہتے ہیں اور نیکی سے باز رکھتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھول گئے ہیں تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا ہے۔ بیشک منافق لوگ ہی تو نافرمان ہیں۔

اللہ عزّوجل یہ بھی فرماتا ہے:

"وعد اللہ المومنین والمومنت جنّت تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا ومساکن طیبۃ فی جنّت عدن ورضوان من اللہ اکبر ذلک ھو الفوز العظیم۔"

(التوبہ - آیت ۷۲)

اللہ نے مؤمن مرد اور عورتوں سے ایسی جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی اور ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور دائمی بہشتوں میں اچھے اچھے مکانوں کا وعدہ بھی کیا ہے اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑھ کر ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

اگر مرد اور خواتین قدر و منزلت کے لحاظ سے برابر پیدا نہ ہوئے ہوتے تو ان واضح دلیلا کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہوتا کہ عورت اور مرد دونوں جزا و سزا کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

ج): تربیت و تعلیم

اگرچہ تربیت و تعلیم کے لحاظ سے عورت مرد دونوں کے مساوی حقوق کا بیان احادیث ن میں ہوا ہے، لیکن قرآن مجید کی آیتوں سے بھی یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید عورت اور مرد دا ہی کو طلب علم کی دعوت دیتا ہے، بعنوان مثال قرآن مجید سبھی لوگوں کو قرآن کی تلاوت، آیتو غور و فکر کرنے اور عبرت حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے، درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ و پر نازل ہونے والی پہلی آیت کا تعلق علم ہی سے تھا۔ اللہ عزّوجل نے فرمایا:

"اقرأ باسم ربك الذی خلق" (العلق - آیت ۱)

پڑھو اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

قرآنی معاشرے میں علم کا تعلق کسی خاص طبقے یا جنس سے نہیں بلکہ ہر مسلمان مرد و عور کا فرض ہے کہ اسے حاصل کرے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر ا حاصل کرنے کے لیے چین کا سفر بھی درکار ہو تو یہ سفر کرنا چاہئے۔

توحید ۸،

آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:

"اطلب العلم ولو کان فی الصین" (۱)

اسی طرح انہوںؐ نے کنیزوں تک کو تعلیم دینے کا حکم صادر کیا (۲) اور شفیعہ بنت عبداللہ سے اپنی زوجہ (حفصہ (۳)) کو پڑھانے کی درخواست کی اکثر و بیشتر عورت آنحضرتؐ کی باتوں کو سننے کے لیے ہمیشہ جمع ہوا کرتے تھے، آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ایسی بہت سی عورتیں نمایاں ہوئیں جو علم و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھیں۔

(د): "قانونی حیثیت"

قرآن مجید سے عورت مرد کی برابری کو ثابت کرنے کے لیے چوتھی شہادت یہ ہے کہ قرآن مجید آغاز پیدائش سے لیکر موت کے بعد تک ہر انسان کے لئے قانونی حیثیت کا تعین کرتا ہے، حالانکہ مغربی معاشرے میں گذشتہ صدی تک شوہر دار عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی جائیداد شوہر کی اجازت کے بغیر بیچ سکے یا اسے اپنی ملکیت میں شامل کر سکے، جبکہ قرآن مجید ہر عورت کو خرید و فروخت اور نفع حاصل کرنے اور حسب منشا اس کا انتظام کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا تتمنوا ما فضل اللہ بعضکم علیٰ بعض للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن واسألوا اللہ من فضلہ ان اللہ کان بکل شئ علیما۔

(النساء - آیت ۳۲)

اور جو فضیلت تم میں سے خدا نے بعض کو بعض پر دی ہے اس کے بارے میں تمنائیں نہ کرو، مردوں کا حصہ ان کے کیئے میں ہے اور عورتوں کا حصہ ان کے کیے میں اور اللہ سے اس کے فضل کے خواستگار رہو، بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید نے مسئلہ وراثت میں عورت کے حصے کو معین کر دیا ہے۔

اس سلسلے میں ارشاد ہے:

"للرجال نصیب مما ترک الوالدان و الاقربون و للنساء نصیب مما ترک الوالدان و الاقربون مما قلّ منه او کثر نصیبًا مفروضاً"

(النساء - آیت ۷)

ماں باپ اور قریبی رشتہ دار جو ترکہ چھوڑ جائیں اس میں مردوں اور عورتوں، دونوں کا حصہ ہے لیکن عورتوں کا حصّہ، حصّۂ معیّن ہے۔

ارشاد ہے:

"یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین، فان کنّ نساء فوق اثنتین فلھنّ ثلثا ماترک، وان کانت واحدۃ فلھا النصف ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک ان کان لہ ولدٌ فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ فلامہ الثلث، فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس من بعد وصیۃ یوصی بھا او دین، آباؤکم وابناؤکم لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعًا، فریضۃ من اللہ، ان اللہ کان علیماً حکیماً۔"

(سورۂ النساء - آیت ۱۱)

خدا تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے، پھر اگر فقط دو بیٹیاں یا اس سے زائد ہوں، تو متروکہ کا دو تہائی ان کا ہے، اور اگر ایک ہی بیٹی ہو تو اس کا آدھا ہے، اور متوفی کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے اگر متوفی کی کچھ اولاد بھی ہے تو اس کے ترکہ میں سے ایک ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہوئے ہوں تو ماں کے لیے متروکہ کا تہائی ہے اور اگر اس کے بھائی بہنیں بھی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے (یہ تقسیم) بعد تعمیل وصیّت ہوگی جو متوفی کر گیا ہو اور بعد ادائے قرض، تمہارے باپ (دادا) ہوں اور تمہارے بیٹے (پوتے) تم نہیں جانتے کہ باعتبار نفع رسانی کون تم سے زیادہ قریب ہے یہ اللہ کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے، بے شک اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔

ضمناً قرآن مجید عورت کو اس کے حق سے محروم کرنے کا مخالف ہے۔

"وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وآتیتم احدٰهن قنطارا فلا تأخذوا منه شيئًا، أتأخذونه بهتانًا وإثمًا مبينًا"

(النساء۔ آیت ۲۰)

اور اگر تم ایک زوجہ کے بدلے دوسری زوجہ کرنا چاہتے ہو اور ان میں سے ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لینا، کیا تم بہتان لگا کے، یا کھلی نافرمانی کر کے واپس لے لو گے؟

قرآن مجید صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ عورت کا مہر اس کی جائز ملکیت ہے اور شوہر کو اس پر حق جتانے کا کوئی حق نہیں۔

ارشاد ہے:

"الطلاق مرتان، ۔۔۔۔ ومن يتعدّ حدود الله فأولئك هم الظالمون"

(البقرہ۔ آیت ۲۲۹)

طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے، اس کے بعد یا تو نیکی کے ساتھ روک لینا ہے یا سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔ اور یہ تمہارے (مردوں کے) لیے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم انھیں دے چکے ہو۔ اس میں سے کچھ واپس لے لو سوائے اس صورت کے کہ دونوں کو اس بات کا خوف ہو کہ (دونوں) حدود خدا پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ پھر اگر تم کو اس کا خوف ہے کہ طرفین حدود خدا پر قائم نہ رہیں گے تو عورت کچھ فدیہ دے دے تو اس میں دونوں پر کچھ الزام نہیں۔ یہ اللہ کے حدود ہیں پس ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کریں گے وہی لوگ ظالم ہیں۔

اس بات کا ذکر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۹، ۲۱ اور ۲۵ میں بھی ہوا ہے۔ ۲۱ ویں آیت میں وارد ہوا ہے:

"وكيف تأخذونه وقد أفضى بعضكم إلى بعض وأخذن منكم ميثاقًا غليظًا۔" (۶)

اور تم اسے کیوں کر لے لوگے حالانکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو اور وہ (عورتیں) تم سے پکا عہد لے چکی ہیں۔

اور ۱۹ ویں آیت میں یوں بیان ہوا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لایحل لکم اَن ترثوا النساء کرھًا ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما آتیتموھن"

اے ایمان لانے والو! تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کو میراث میں لے لو اور نہ ان کو اس غرض سے قید رکھو کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو ان سے چھین لو۔ سوائے اس صورت کے کہ انہوں نے کھلی بدکاری کی ہو۔ اور ان کے ساتھ نیکی کے ساتھ بسر کرو۔ پھر اگر تم کو ان سے کراہت ہو جائے تو شاید ایک چیز سے تم کراہت رکھتے ہو اور خدا نے اسی میں بہت سی خوبی رکھی ہو۔

اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید صرف عورت اور مرد کے برابر ہونے کی تاکید نہیں کرتا بلکہ جو لوگ یہ دعو کرتے ہیں کہ اسلام عورت کو حقارت آمیز نظر سے دیکھتا ہے، ان کی تردید کرتا ہے، ضمناً یہودیوں ا نصرانیوں کا عورت کے بارے میں جو یہ خیال ہے کہ عورت، مرد سے کمتر درجہ کی مالک ہے۔ اس خیال کے ہونے کو بھی قرآن مجید ثابت کرتا ہے۔

۲۔ جنس واحد کے بجائے دو جنسی معاشرہ:

اور اب قرآنی معاشرے میں خواتین کی قدر و منزلت سے متعلق دوسری خصوصیت پر بحث ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں قرآن مجید عورت اور مرد کی برابری کا قائل ہے، وہاں یہ ذکر ہرگز نہیں کرتا کہ قابلیت اور استعداد کے لحاظ سے بھی دونوں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ دور حاضر کے رجحانات آپ سبھی حضرات باخبر ہیں کہ کپڑوں، جوتوں اور کاروبار کے لحاظ سے دونوں صنفوں میں ایک ہما لانے کی کوششیں متواتر طور پر ہو رہی ہیں۔ خاص طور سے امریکہ میں جب سے اس صورتحال نے زور پک ہے، تب سے عورت مرد کے درمیان فرق کرنا ایک مشکل کام بن گیا ہے۔ اس لئے کہ مغربی معاشرے میں جسم، عقل اور جذبات کے لحاظ سے عورت اور مرد میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے اور اگر ہو

تو بہت ہی کم ہے۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ عورت مرد دونوں کے کردار و سرگرمیوں کے لحاظ سے بھی ان کے خیال کے مطابق معاشرے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس صورتحال نے معاشرے کو جنس مشترک معاشرے کی شکل دی ہے جسمیں مرد کے دولت اکٹھا کرنے اور دوسروں پر حکم چلانے کو بہت اچھا سمجھا جاتا ہے اور جن سرگرمیوں میں خواتین مصروف رہا کرتی تھیں اسے ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرز فکر نے خواتین کو مردوں کی تقلید کرنے پر نہ صرف اکسایا ہے بلکہ اپنی نسوانیت سے چڑھنے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مغربی معاشرے میں مرد بننے کی خواہش خواتین میں آئے دن بڑھتی جا رہی ہے اور خواتین کے اس اصرار و رغبت کے نتیجہ میں مغربی معاشرہ تیزی سے فساد و گمراہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ درحقیقت اس رویے نے خواتین کو ان کا اصلی رول یا بھلا دیا ہے یا پھر انھیں ایسے سرکاری اداروں کے حوالے کر دیا ہے جو مردوں کو عورتوں پر ترجیح نہیں دیتے۔

جہاں تک قرآنی معاشرے کی بات ہے، وہ دو جنسی معاشرہ ہے، جس میں عورت اور مرد، دونوں اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور یہ نظام معاشرے کی فلاح و بہبودی اور سلامتی کا ضامن ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے تمام افراد کے لئے مناسب بھی ہے، فرائض کی تقسیم اس طرح ہے کہ اقتصادی امور کی بحالی میں مردوں کا حصہ اور ذمہ داری خواتین سے زیادہ ہے، لیکن خواتین کی ذمہ داریوں اور کردار کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ حسب ذیل ہے:

والوالدات یرضعن اولادھنّ حولین کاملین .... واتقوا اللّٰہ
بما تعملون بصیر"

(البقرہ - آیت ۲۳۳)

اور مائیں اپنے بچوں کو۔ اس کی خاطر سے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے دو برس دودھ پلائیں۔ اور ان (دودھ پلانے والی عورتوں) کا کھانا، کپڑا دستور کے موافق بچے والے کے ذمے ہے۔ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔ نہ ماں کو اس کے بچے کے سبب سے ضرر پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے ضرر پہنچایا جائے۔ اور باپ کے قائمقام کے ذمے (بھی) اسی طرح ہے۔ پھر اگر دونوں (ماں، باپ) کی مرضی اور آپس کے مشورے سے دودھ چھڑا لینا چاہیں

تو دونوں پر کوئی الزام نہیں ہے، اور اگر تمہارا یہ ارادہ ہو کہ تم اپنے بچوں کو کسی دایہ سے دودھ پلواؤ تو (بھی) تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ بشرطیکہ تم سلوک کے طور پر جو کچھ دایہ کو دیتے ہو اتنا ہی ماں کے حوالے (بھی) کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور یہ جان لو کہ جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔

اور ارشاد ہے:

"والذین یتوفون منکم .... وللمطلقات متاع بالمعروف حقاً علی المتقین"

(البقرہ ۔ آیت ۲۴۰ ۔ ۲۴۱)

اور تم میں سے جو لوگ مرنے کے قریب ہوں اور بیبیاں چھوڑ یں (تو انھیں لازم ہے کہ) ان کو ایک سال تک نان ونفقہ دیتے اور (گھر سے) نہ نکالنے کی (ورثاء کو) وصیت کریں پھر اگر وہ (عورتیں خود بخود) نکل جائیں تو جو کچھ نیکی کے ساتھ اپنے بارے میں کریں۔ اس میں تمہارے ذمے کوئی الزام نہیں ہے۔ اور اللہ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ اور جن کو طلاق دی گئی ہے انھیں (بھی) نیکی کے ساتھ نفع پہنچانا پرہیز گاروں کے ذمے ایک حق ہے۔

اور ارشاد ہے:

"الرجال قوامون علی النساء .... ان اللہ کان علیاً کبیرا"

(النساء ۔ آیت ۳۴)

مرد، عورتوں پر حاکم ہیں (ایک تو) اس فضیلت کے سبب جو خدا نے ایک کو دوسرے پر دی ہے اور (دوسرے) اپنے مال سے خرچ کرنے کے سبب سے۔ پس نیک بخت عورتیں تو اطاعت کرنے والیاں ہیں اور پیٹھ پیچھے ان چیزوں کی حفاظت کرنے والیاں جن کی خدا نے حفاظت چاہی اور جن کی نافرمانی کا تم کو خوف ہو ان کو نصیحت کرو اور ان کے بستروں پر ان کو چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر کسی طرح بے جا زیادتی نہ کرو۔ بیشک اللہ بزرگ و برتر ہے۔

خواتین، بچوں کو تربیت دینے کے نتیجہ میں، معاشرے کے نظم ونسق کو بحال کرنے میں مدد دیتی ہیں

اور اسلام ان کے اس کردار کو سراہتا اور اس کی قدر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۳
اور سورۂ اعراف کی درج ذیل آیت میں ذکر ہوا ہے۔

هو الذی خلقکم من نفس واحدة وجعل منها زوجها یسکن الیها
فلما تغشها حملت حملاً خفیفاً فمرت به فلما اثقلت دعوا اللّٰه
ربنا لئن اتیتنا صالحاً لنکونن من الشاکرین۔

(اعراف ۔ آیت ۱۸۹)

وہ وہی تو ہے جس نے تم سب کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی (کی بچی ہوئی مٹی) سے
اس کا جوڑا بنا دیا کہ اس سے مانوس ہو، پس جس وقت مرد اس سے ہم صحبت ہوا تو
عورت کو ہلکا سا حمل رہا کہ اس سمیت چلتی پھرتی رہے، پھر جب اس حمل کا وزن بڑھا
تو دونوں نے اللہ سے دعا کی کہ اگر تو ہم کو صحیح و سالم بچہ عنایت کرے گا تو ہم ضرور تیرے
شکر گذار ہوں گے۔

احکام الٰہی کا ذکر اسی مسئلہ کی بابت سورۂ شعراء، سورہ نساء کی پہلی آیت، سورۂ اعراف،
سورۂ انفال کی ۱۴ ویں آیت، سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹۰ اور دوسری دیگر آیتوں میں بھی ہوا ہے۔ سورۂ
بقرہ کی حسب ذیل آیت میں یوں بیان ہوا ہے:

"لیس البر ان تولوا وجوهکم قبل المشرق .... واولئك هم المتقون"

(سورۂ بقرہ ۔ آیت ۱۷۷)

یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف کرلو۔ بلکہ حقیقی نیکی اسی کی ہے
جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور انبیاء پر ایمان
لائے اور محبت خدا میں مال۔ رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، سائلوں
کو دے اور گردنیں آزاد کرنے میں لگائے۔ اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے اور
جب معاہدہ کریں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں اور تنگدستی و بیماری میں اور
لڑائی کی سختی کے وقت صبر کرنے والے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے عملاً سچ بولا اور
یہی متقی ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید مسلمانوں کے درمیان ان کے معاشرے کی نسبت احساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے، اور یہ احساس ہرگز کسی مسلمان فرد کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ احساس ذمہ داری کے نتیجہ میں اس کا عکس العمل یہ ہوتا ہے کہ ان میں رغبت بڑھتی ہے اور نتیجتہً ذمہ داری کی روح ان میں ارتقا پاتی ہے۔ اس طرح کے تعلق سے، اقتصادی، سماجی اور نفسیاتی فوائد معاشرے میں شامل تمام افراد کو پہنچتے ہیں اور ہر شخص اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۔ افراد معاشرہ کا ایک دوسرے پر انحصار

عورت کی حیثیت کے ضمن میں قرآنی معاشرے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ معاشرے میں شامل افراد ایک دوسرے کے تابع ہیں۔ یہ بات مغربی معاشرے کے رجحانات کے بالکل برعکس ہے جو کسی ایک فرد کے حقوق کو دوسرے افراد کے حقوق پر تھونپنے کی تائید کرتا ہے۔ قرآن مجید جہاں عورت اور مرد کے تعلق پر زور دیتا ہے وہاں معاشرے میں شامل افراد کے باہمی تعلق میں بھی تاکید کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۷ میں یوں بیان ہوا ہے۔

"احلّ لکم الصیام الرّفث الی نسائکم، ھنّ لباسٌ لکم وانتم لباس لھنّ۔"

(سورہ بقرہ ۔ آیت ۱۸۷)

روزوں کی رات میں تمہارے لیے اپنی ازواج کے پاس جانا جائز کیا گیا ہے، وہ تم سے مخلط ہیں اور تم ان سے۔

ارشاد ہے:

"ھوالذی خلقکم من نفس واحدة وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا"

(اعراف ۔ آیت ۱۸۹)

وہ وہی تو ہے جس نے تم سب کو نفس واحد سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا کہ اس سے مانوس ہو۔

قرآن مجید میں پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسر

برفوقیت نہیں رکھتے بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔
ارشاد ہے:

"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر ويقيمون الصلاة ويؤتون الزكاة ويطيعون الله ورسوله، اولئك سيرحمهم الله ان الله عزيز حكيم."

(توبہ - آیت ۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حامی (اور رہنما) ہوا کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ ان پر رحمت کرے گا، بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

عورت اور مرد، دونوں سے قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے لوگوں کی خدمت کرے۔ وہ تعلق جو عورت و مرد کی جسمانی و نفسیاتی بہتری کے لیے ضروری ہے۔ اس کو باقی رکھنے کے لیے اللہ عزّوجل نے کنبہ کے تمام افراد کے لئے الگ الگ ذمہ داریاں اس تاکید کے ساتھ معیّن کی ہیں کہ عورتوں، مردوں، باپوں، ماؤں، بچوں اور بوڑھوں میں سے ہر ایک کی کچھ خاص ذمّہ داریاں ہیں۔
ارشاد ہے:

وقضىٰ ربّك الّا تعبدوا الّا اياه و بالوالدين احسانا، اما يبلغن عندك الكبر احدهما أو كلاهما فلا تقل لهما افٍّ ولا تنهرهما وقل لهما قولاً كريما۔"

(اسراء - آیت ۲۳)

اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم قطعی دے دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرتے رہو۔ اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمہاری موجودگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے اُف بھی نہ کرو، اور نہ اُن کو جھڑکو اور ان سے ادب و اخلاق کی باتیں کرو۔ اور رحم و مروّت سے سر عجز ان کے

سامنے خم کرو اور یہ کہا کرو کہ اے میرے پروردگار تو ان دونوں پر ایسا ہی رحم فرما
جیسا کہ ان دونوں نے مجھے ننھا سا پالا تھا، تمہارا پروردگار جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے
اس سے خوب واقف ہے، اگر تم نیک رہو گے تو وہ بھی توبہ کرنے والوں کے لیے بڑا ہی
بخشنے والا ہے۔ اور (اے رسول) تم قرابت والے کو اس کا حق دے دو اور مسکین و
مسافر کو اس کا اور بے جا نہ اڑاؤ۔

اللہ عزوجل کا قول ہے:

"للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون ....
...... فلیتقوا اللہ ولیقولوا قولاً سدیدا۔"

(النساء — آیت ۷ - ۹)

ماں، باپ اور قریبی رشتہ دار جو ترکہ چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور
ماں باپ اور رشتہ داروں نے جو ترکہ چھوڑا ہو، وہ تھوڑا ہو یا بہت اس میں عورتوں
کا بھی حصہ، حصۂ واجب ہے اور جب دور کے رشتہ دار اور یتیم و مسکین تقسیم ترکہ کے
وقت حاضر ہوں تو اس میں سے کچھ ان کو بھی دے دو اور ان سے نرمی کی بات کرو
اور ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اگر اپنے پیچھے کمزور بچے چھوڑ جاتے تو ان کے ضائع ہونے
کا کیسا خوف کھاتے، پس لازم ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور نپی تلی بات کہیں۔

حکم خدا ہے:

"واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ......
.... واللہ علیٰ کل شئ قدیر۔"

(انفال — آیت ۴۱)

اور یہ جان لو کہ جب کسی طرح کی غنیمت تمہارے ہاتھ آئے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ
اور رسولؐ کا اور (رسولؐ کے) قرابت داروں کا اور یتیموں اور مسکینوں کا اور
مسافروں کا (حق) ہے بشرطیکہ تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس (مدد) پر جو ہم
نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن نازل کی تھی جس دن دو گروہوں کی مڈ بھیڑ ہو گئی تھی

اور اللہ ہر چیز پر (پوری پوری) قدرت رکھنے والا ہے۔"

ارشاد ہے:

"ولا یأتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمہاجرین فی سبیل اللہ ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم"

(النور — آیت ۲۲)

اور تم میں سے مالدار و صاحبِ مقدور لوگ یہ قسم نہ کھا بیٹھیں کہ وہ رشتہ داروں، مساکین اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہ دیں گے۔ اور ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگذر کریں۔ آیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے اور اللہ بڑا بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔

ایسی اور بھی بہت سی آیتوں میں اللہ عزوجل نے معاشرے میں موجود افراد اور رشتہ داروں کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔

ارشاد ہے:

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ ....
.....ثم تولیتم الا قلیلا منکم وانتم معرضون۔"

(بقرہ — آیت ۸۳)

اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور اپنے ماں باپ سے (خصوصاً) اور رکھنے والوں یتیموں اور مسکینوں سے (عموماً) نیکی کرتے رہنا اور لوگوں سے بہ مدارات بات کرنا اور نماز پڑھتے رہنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا۔ پھر تم اس (حکم) سے روگردان ہو کر سوائے معدودے چند کے سب ہی پھر گئے۔

سورۂ نحل کی حسب ذیل دو آیتیں بھی اسی کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

"ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان .... وقد جعلتم اللہ

علیکم کفیلا، إن اللہ یعلم ما تفعلون۔"

(النحل ۔ آیت ۹۰ ۔ ۹۱)

بالتحقیق اللہ عدل واحسان اور رشتہ داروں کو (ان کے حقوق) دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، بدی اور بغاوت سے منع فرماتا ہے۔ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو اور اللہ کے عہد کو جب تم عہد کر چکے ہو پورا کرو۔ اور قسموں کو ان کے پختہ کر دینے کے بعد نہ توڑو۔ جس حال میں کہ تم اللہ کو ضامن دے چکے ہو۔ بے شک جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے خوب واقف ہے۔

ارث و ترکہ کی تقسیم کا انحصار و تعلق صرف چھوٹے کنبے (ماں باپ اور اولاد) سے نہیں بلکہ بڑے سے بڑے کنبے اور خاندان سے بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ بقرہ کی حسب ذیل تین آیتیں ہدایت دیتی ہیں۔

کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت إن ترك خیراً الوصیۃ للوالدین والأقربین بالمعروف حقاً علی المتقین۔ فمن بدلہ بعد ما سمعہ فانما اثمہ علی الذین یبدلونہ إن اللہ سمیع علیم۔ فمن خاف من موص جنفاً او اثماً فاصلح بینھم فلا اثم علیہ إن اللہ غفور رحیم۔

(البقرہ ۔ آیت ۱۸۰ ۔ ۱۸۲)

تم پر یہ بھی واجب کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت آئے۔ اگر وہ کچھ مال چھوڑے تو اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں مناسب وصیت کر دے خدا سے ڈرنے والوں پر (یہ بھی) ایک حق ہے۔ پھر جو شخص اس (وصیت) کو سننے کے بعد بدل ڈالے تو اس کا گناہ ان ہی کے ذمے ہوگا جو اسے بدلیں گے بیشک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ پھر جس شخص کو وصیت کرنے والے کی طرف سے حق تلفی یا گناہ کا اندیشہ ہو اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بیشک اللہ بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۳۳ اور ۱۷۶ میں بھی ارشاد ہوا ہے:

يستفتونك قل الله يفتيكم فى الكلالة . . . . والله بكل شئ عليم

(النساء - آیت ۱۷۶)

لوگ تم سے فتویٰ دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو کہ اللہ تم کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی مرد ایسا مر جائے کہ جس کی اولاد (یا ماں باپ) نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اس بہن کو اس کے ترکہ کا نصف ملے گا اور اسی طرح وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کے اولاد (یا ماں باپ) نہ ہوں اور اگر بہن دو ہوں تو ان دونوں کو اس کے ترکہ کا دو تہائی ملے گا۔ اور اگر بھائی بہن مرد و عورت (ملے جلے) ہوں تو ہر مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ اللہ تمہارے لیے اس وجہ سے کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم نہ بھٹکو اور اللہ ہر شئے سے آگاہ ہے۔"

سورۂ نساء کی آیت ۷ اور ۱۳ میں بیان ہوا ہے کہ جو شخص احکام قرآن کی پیروی اور معاشرے نیز اپنے کنبے کے حقوق کی ادائیگی درعایت نہیں کرے گا۔ تو اسے جہنم کے سخت سے سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کی پناہ گاہ جہنم ہی ہوگی۔

سورۂ نساء کی دسویں آیت میں حسب ذیل بیان ہوا ہے:۔

"إن الذين يأكلون اموال اليتامىٰ ظلماً انما يأكلون فى بطونهم ناراً وسيصلون سعيرا"

(النساء / آیت ۱۰)

بلاشک جو ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، سوائے اس کے نہیں کہ وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور وہ عنقریب دہکتی ہوئی آگ میں جائیں گے۔

لیکن ارث کے لحاظ سے قرآن مجید نے مرد کے حصے کو عورت کے حصے سے اس لیے زیادہ رکھا ہے کہ اس کی اقتصادی حالت میں ممد ثابت ہو کیوں کہ گھر بار کی ذمہ داری اس پر ہوتی ہے۔ عورت کے لئے امور خانہ داری، شوہرداری اور بچوں کی تربیت میں اس کے فرائض کے لحاظ سے ارث کا حصہ مقرر کیا ہے جو پھر بھی مرد کے حصے سے کم ہی ہوتا ہے۔

جنس کے واحد ہونے کا خیال، عورت اور مرد دونوں کو ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے

کے لئے اکساتا ہے، اور جس معاشرے میں اس کا ذرا سا بھی شائبہ ہو وہ پریشانیوں سے خالی نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں جوان، بوڑھے، بچے، شادی شدہ افراد اور عورت و مرد سبھی پریشان رہتے ہیں اس کے مقابلے میں ہم دو جنسی معاشرے کو دیکھتے ہیں تو اس میں عورت اور مرد کے علیحدہ فرائض نظر آتے ہیں لیکن یہ فرائض عورت اور مرد کے باہمی تعاون کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں یہی وہ مناسب نظام ہے جو تاریخی نقطۂ نظر سے مختلف معاشروں میں کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ وہ نظریہ یا نظام جو ہر مرحلے میں عورت اور مرد کی برابری کا قائل ہے۔ درحقیقت مغربی معاشرے کی تازہ ایجاد ہے

اس سلسلے میں خود مغربی سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ فکری اور جذباتی لحاظ سے عورت اور مرد میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس خیال کی سائنسی شہادت بذات خود جنسِ واحد کے تصور کی نفی کے برابر ہے۔ لیکن مغربی معاشرے میں وحدت جنس کا تصور اب بھی کارفرما ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ افسوسناک صورت حال کب تک باقی رہے اور کب اس خیال کے ماننے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مسلمان ہیں، لیکن یہی کافی نہیں، مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ان مسائل کو سمجھیں اور اپنے معاشرے خصوصاً نوجوانوں کو ان بیہودہ افکار و خیالات کی زد میں آنے سے بچائیں۔

جنسِ واحد کے تصور پر مبنی معاشرے کے وکلا کا خیال ہے کہ دو جنسی معاشرہ عورت کو سعادت و خوشحالی سے محروم رکھتا ہے۔ یہ بات اس وقت درست ہوتی جب معاشرے میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ قرآنی معاشرہ تو ایسا معاشرہ ہے جو کسی ایک جنس کو دوسری جنس پر ترجیح نہیں دیتا، بلکہ ساتھ ساتھ عورت اور مرد کے درمیان فطری فرق اور دونوں کے جداگانہ رول کا قائل ہے۔

قرآن مجید پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں بحیثیت انسان برابر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن اخلاقی اور حقوقی لحاظ سے بھی دونوں کو برابر مانتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ عورت اور مرد ہر اعتبار سے برابر ہیں، قابل تسلیم نہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت اور مرد کی برابری کا خیال، دونوں میں سے کسی کے لئے نہ صرف قابلِ فخر نہیں بلکہ دونوں کے لئے قابل اہانت بھی ہے۔ قرآن مجید جہاں کہیں عورت اور مرد کے فرائض اور وراثت کے لحاظ سے حقوق معین کرتا ہے

وہاں اس کا اصلی مقصد اس فرق کو ثابت کرنا ہوتا ہے جو عورت مرد کے مابین ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر موجود ہے۔

اس طرح سے قرآن مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ سماج میں ان کا ایک ذمہ دارانہ مقام ہے، یہاں فرد پر کوئی جبر نہیں بلکہ قرآن افراد کی آزادی کو بڑھاوا دیتا ہے۔ اس طرح کے تعلق اور ذمہ داری سے افراد کو جو معاشی، سماجی اور نفسیاتی فائدے حاصل ہوتے ہیں وہ اس پر عاید پابندیوں کی بجا طور پر تلافی کر کے اسے اعلی انفرادی مقاصد کے حصول میں مدد دیتے ہیں۔ مغربی معاشرے میں باہمی رشتوں اور ذمہ داریوں کا یہ فقدان بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے۔ احساس تنہائی، بوڑھوں کی ناکافی دیکھ ریکھ نسلی خلیج، خودکشی کی اونچی شرح اور نابالغوں میں جرائم کے رجحان کی جڑیں تلاش کی جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ثمرات ہیں اس معاشرتی ڈھانچے کے ٹوٹ جانے کے جو انسانی ضرورتوں اور ذمہ داریوں کو باہمی اشتراک سے پورا کرنے پر زور دیتا تھا۔

۴۔ بڑا کنبہ (خاندان)[1]:

قرآنی معاشرے کی چوتھی بنیادی خصوصیت بڑے کنبے کی تشکیل ہے اس خصوصیت کا، معاشرے میں شامل افراد کے باہمی تعلق کے مسئلے سے ایک خاص ربط ہے۔ مسلم گھرانوں میں ماں، باپ، بیٹے اور بیٹیوں کے علاوہ دادا، دادی، نانا، نانی، چچا چچیاں، اموں، ممانیاں اور ان کے بچے شامل ہوتے ہیں، اور اکثر و بیشتر ایک ہی مقام پر رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی گھر میں تین یا اس سے زیادہ پشتوں پر مشتمل افراد زندگی گذارتے ہیں۔ اگر کنبے کے افراد مختلف علاقوں میں بھی رہتے ہوں تو بھی اس تعلق کے آثار اقتصادی، سماجی، جذباتی اور یہاں تک کہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

---

[1] اس مقالے میں مقالہ نگار نے بڑے مشترکہ کنبے کے تصور کو اسلامی قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام صلۂ رحم اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی پر زور دیتا ہے۔ لیکن کہیں وضاحت کے ساتھ قرآن یا حدیث میں یہ بات نہیں ملتی کہ خداوند تعالی یا رسول اکرمؐ نے اس بات کی تاکید کی ہو کہ ایک خاندان کے تمام افراد کو جو خون کے رشتے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک ہی چھت کے نیچے یا احاطے کے اندر رہنا چاہیے۔ مشترکہ خاندان کے اپنے فوائد ہیں، لیکن دور حاضر میں خود اسلامی ممالک میں بھی چھوٹے خاندان کا رواج عام ہو گیا ہے۔ مقالہ نگار کے دلایل مضبوط ہیں، لیکن انہیں قرآنی احکامات کے عین مطابق سمجھنے سے بعض مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی اور اسلامی تعلیمات مشترکہ کنبے کے خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ اغلباً اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔

قرآنی احکام، گھریلو زندگی میں باہمی تعاون برقرار رکھنے کی تاکید کرنے کے علاوہ تعلقات کو مزید مستحکم بنانے کی ترغیب دلاتے ہیں۔

لہٰذا، اسلامی مفہوم کی رو سے بڑے کنبے یا خاندان کا وجود معاشرے کے پھیلاؤ سے مربوط نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے احکام الٰہی کے ذریعے ہی اس کا انتظام و استحکام ہوتا ہے ہر بڑا کنبہ یا خاندان اگر قرآنی معاشرے کی صفات سے آراستہ ہو جائے تو عورت مرد دونوں کو سعادت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اس طرح کے کنبے کے فائدے حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ کنبے کے تمام افراد جب خود غرضی اور غرور سے دور رہیں گے، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کی انانیت کو ایک بڑے کنبے کا سامنا کرنا پڑے گا جس میں بڑے، چھوٹے اور ہم عمر بھی شامل ہوں گے

۲۔ اس طرح کے کنبے کی عورتیں، اپنے شوہروں، اولاد اور مسن افراد کو نقصان پہنچائے بغیر گھر سے باہر کام کر سکتی ہیں۔ ایسے گھرانوں میں عموماً کچھ بالغ افراد ہوتے ہیں جو گھر سے باہر کام کرنے والی ماں یا بیوی کی مدد کرتے ہیں۔ ایسے گھرانوں کی عورتیں کام کرنے کے نتیجہ میں کتنی ہی تھکی ماندہ رہتی ہوں لیکن وہ کسی ظلم کے احساس میں مبتلا نہیں ہوتیں، اس لئے ان کے شوہروں یا اولاد پر اس کا برا اثر نہیں پڑتا۔ درحقیقت مغربی معاشرے میں کنبے یا گھرانے کی شکل و ہیئت بدلے بغیر مشکلوں پر قابو نہیں پایا جا سکتا اگرچہ وہاں اکثر عورتیں کام کرتی ہیں لیکن پھر بھی چھوٹا گھرانا (ماں باپ اور اولاد) ضروریات زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا ظاہر ہے کہ جن گھروں میں ماں یا باپ کی کمی ہوتی ہے انکی پریشانیاں اور مشکلات دس گنا ہو جاتی ہیں، اور خاص طور سے چھوٹے گھرانوں میں کام کا جو بار عورت پر پڑتا ہے اس کی حد کبھی کبھی یہاں تک ہوتی ہے کہ عورت نفسیاتی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کے علاوہ گھریلو اور ازدواجی زندگی میں وہ تلخی آتی ہے جس کے نتیجے میں گھر اجڑ جاتے ہیں اور اکثر طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس مسئلہ نے ڈاکٹروں، ماہرین سماج و نفسیات اور وکیلوں کی مشکلات اور پریشانیوں میں بھی خاصا اضافہ کر دیا ہے۔ امریکہ و مغربی ممالک میں خودکشی کے حادثات کی کثرت نے پریشانیوں کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔

۳۔ بڑے کنبوں میں بچوں کی صحیح پرورش اور تربیت کے امکانات بہتر ہوتے ہیں، بچے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ وہ دوسروں کا کتنا احترام کریں، جبکہ چھوٹے کنبے میں کسی ضدی اور شرارتی بچے کو مطیع و فرمانبردار

بنانا نہایت مشکل کام ہے۔ بڑے کنبے میں بچوں کی تربیت کے ذمہ دار افراد کی تعداد چھوٹے کنبے کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ آسانی سے بچوں اور نوجوانوں کی ضدوں اور شرارتوں پر قابو پا سکتے ہیں۔

۴۔ بڑے کنبوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے افراد کے لیے سماجی اور نفسیاتی الجھنوں کا حل فراہم کرتے ہیں خواہ بچے ہوں یا بوڑھے سبھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ زیادہ افراد کی موجودگی کے پیش نظر دوسروں کی نسبت ہر فرد کا تعلق کسی غیر سے نسبتاً کم رہتا ہے اور جذباتی نقطہ نظر سے بھی وہ دوسروں کا کم محتاج رہتا ہے۔ ایسے کنبے میں اگر دو بچوں، دو جوانوں یا بوڑھوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا بھی ہے تو لڑنے والوں کے درمیان کشیدگی اور تناؤ چھوٹے کنبے کے مقابل کم رہتا ہے، اس لیے کہ اس میں اور بھی افراد ہوتے ہیں جو اختلافات کو رفع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ازدواجی تعلقات و روابط بھی بڑے کنبے میں چھوٹے کنبے سے زیادہ مستحکم و استوار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس چھوٹے کنبے میں اگر عورت و مرد کے درمیان اختلافات پیدا ہوتے ہیں تو کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا جو ان کی مادی، نفسیاتی، سماجی اور فکری ضرورتوں کو پورا کرے۔

۵۔ بڑے کنبے نسلوں کے درمیان خلیج پیدا نہیں ہونے دیتے۔ نسلوں کے درمیان فاصلہ تبھی پیدا ہوتا ہے جب مختلف نسلوں کے افراد ایک دوسرے سے جدا رہتے ہوئے زندگی گذارتے ہیں نتیجتاً ایسے افراد کے درمیان محبت کا جذبہ مشکل سے قائم ہوتا ہے لیکن بڑے کنبوں میں دو تین نسلوں کے افراد ساتھ رہتے ہیں اور اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں بچوں کو مفید تجربے حاصل ہوتے ہیں اور ان میں صحیح سماجی زندگی گذارنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی کے ساتھ بڑوں کو سکون و اطمینان اور سہارا ملتا ہے جس کے وہ محتاج رہتے ہیں۔

۶۔ کنبوں کا بڑا ہونا احساسِ تنہائی سے پیدا ہونے والی مشکلات کو زائل کرتا ہے جن کا سامنا دور حاضر کے مغربی معاشرے کو کرنا پڑ رہا ہے۔ اس طرح کے کنبوں میں کنواری لڑکیوں، مطلقہ عورتوں یا بیواؤں کو وہ مشکلیں درپیش نہیں ہوتیں جو مثال کے طور پر امریکہ میں عورتوں کو ہوتی ہیں اور وہ معاشرے جو بڑے کنبوں پر مشتمل ہوتے ہیں، ان میں یتیموں یا معذور افراد کے لیے ٹھکانے قائم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ عورت ہو یا مرد، بوڑھا ہو یا جوان، سب کے لیے نفسیاتی اور سماجی تقاضوں کی تشفی کی ضمانت ہوتی ہے۔ مغربی معاشرے میں ازدواجی زندگی آئے دن بدتر ہوتی

جاتی ہے اور عورت گھریلو مشکلات کے نتیجہ میں قربانی کا بکرا بن گئی ہے۔ اس لیے کہ طلاق کی صورتوں میں عورت کے لیے دوسری شادی کرنے کے امکانات مرد سے کم ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ طلاق کے بُرے اثرات مردوں کی نسبت عورتوں پر زیادہ ہوتے ہیں۔

۷۔ چھوٹے کنبوں کی بہ نسبت بڑے کنبوں میں گھر کے بزرگ افراد کی دیکھ بال نسبتاً وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔ چھوٹے کنبوں میں بوڑھے ماں باپ کی دیکھ بال اکثر و بیشتر شوہر و بیوی میں سے کسی ایک کے ذمّے ہوتی ہے لیکن یہ ذمّہ داری زیادہ تر بیوی کے سر آن پڑتی ہے جسے ان کی دیکھ بال کے علاوہ گھر کے دوسرے افراد کے مادی، اور جذباتی تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس صورت میں عورتوں پر ذمّہ داری کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ اگر بیوی بھی نوکری پیشہ ہو تو ماں، باپ کو معذور افراد کے مخصوص ٹھکانوں میں داخل کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ وہاں اکیلے موت کا انتظار کرتے رہیں۔

ھ۔ پدری نظام

قرآنی معاشرے کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ گھریلو نظام میں باپ کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ قرآنی معاشرہ ایک ایسے معاشرے کو پیش کرتا ہے جس میں گھریلو زندگی سے متعلق آخری فیصلہ کرنے اور اس کے نفاذ کا حق مرد کو حاصل ہوتا ہے اور یہی بات آزادیٔ نسواں تحریکوں کی معارض ہے ہر معاشرہ انسانی جماعتوں، سرکاری اداروں، سیاسی پارٹیوں، دینی و مذہبی تنظیموں، تجارتی کمپنیوں اور چھوٹے بڑے کنبوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن معاشرے میں شامل افراد کے فائدے کی رو سے بہتر یہی ہے کہ سب کے درمیان توافق اور ربط برقرار رہے اس ارتباط کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد یا گروہ کو حاکمانہ حیثیتِ حاصل ہو۔ اس طرح کہ سب کو رائے دینے کا حق حاصل رہے۔ پارلیمنٹ کو قانون بنانے اور انتظامیہ کو اس کے نافذ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اہم اور اساسی فیصلے کرنے کا اختیار صدر مملکت میں مرکوز ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کارخانے میں ہزاروں افراد کام کرتے ہیں لیکن سب کو فیصلے کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، جس طرح سے کام میں کامیابی یا ناکامی کی ذمّہ داری سب پر نہیں بلکہ صرف چند لوگوں پر عائد ہوتی ہے اسی طرح کنبے کا ہر فرد رائے کا حق رکھنے کے باوجود کنبے کے لئے مجموعی حیثیت سے ذمّہ دار نہیں ہوتا۔

جہاں تک کنبے کی بات ہے اس میں بھی ذمہ داری کسی ایک فرد کے ذمے ہونا چاہیے۔ قرآن مجید گھر کے سب سے بڑے فرد کو اصل ذمے قرار دیتا ہے سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ (وللرجال علیھن درجہ) اور ۳۴ (الرجال قوامون علی النساء) کے معنی اختیار اور ذمہ داری سونپنے ہی کے ہیں دشمنانِ اسلام کی تعبیروں کے برخلاف ان دو آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرنا چاہیے جس سے کہ ان کی شان میں کمی آئے جو لوگ قرآنی آیات کی تفسیر میں غلط بیانی سے کام لیتے ہیں اور عورت کی کم تری ثابت کرتے ہیں وہ دراصل ان قرآنی آیات سے چشم پوشی کے مرتکب ہیں جو عورت کے احترام کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ درحقیقت ان آیتوں کا مقصد گھر میں رونما ہونے والے اختلافات اور کشمکش کو روکنا ہے۔ یہ بات کنبے میں شامل سبھی افراد کے لیے فائدہ مند ہے۔

قرآن مجید کنبے کی مجموعی ذمہ داری مرد پر ڈالتا ہے۔ اس کے علاوہ (الرجال قوامون علی النساء) آیت میں لفظ "قوّامون" جو "قوّام" سے مشتق ہے، اس کے معنی زبردستی تسلط کے نہیں بلکہ کسی فرد کے کسی دوسرے فرد کی حمایت و مدد کے لیے آمادہ ہونے کے ہیں اگر باری تعالیٰ کا مقصد مردوں کو عورتوں پر زبردستی مسلط کرنا ہی ہوتا تو لفظ قوّامون کے بجائے دوسرے الفاظ استعمال میں لائے جاسکتے تھے۔

قرآن مجید میں لفظ قوامون مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے معنی حمایت کرنے کے ہیں اور زبردستی تسلط کے نہیں ہیں۔ سورۂ نساء کی آیات ۱۳۵ تا ۱۳۷ اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں لھذا اس لحاظ سے ان آیتوں کے سلسلے میں جو بھی دوسرے معنی لیے جائیں وہ لغوی و اعتقادی نقطۂ نظر سے قابل تردید ہیں۔

کنبے کے نظم و نسق اور دیگر امور کی انجام دہی میں مرد کو ذمہ دار بنانے کے سلسلے میں قرآن مجید کی وضاحت قابل غور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعضٍ و بما انفقوا من اموالھم"

(النساء - آیت - ۳۴)

مرد، عورتوں پر حاکم ہیں (ایک تو) اس فضیلت کے سبب جو خدا نے ایک کو دوسرے پر دی ہے اور (دوسرے) اپنے مال سے خرچ کرنے کے سبب سے۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ مادّی اور مالی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری اکثر و بیشتر مرد کے ذمے رہی ہے، کیونکہ مرد کی جسمانی ساخت بچوں کی تربیت کرنے کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے مرد کو جسمانی طاقت عطا کی تاکہ وہ اپنے کنبے کے لیے نان و نفقہ فراہم کر سکے اس کے علاوہ کوئی مانے یا نہ مانے حیاتیاتی نقطۂ نظر سے عورت اور مرد کے درمیان بین اختلاف ہے۔

موجودہ معاشروں میں مشکلات کے پیش نظر اکثر مغربی افراد اس طرح کے سوالات پیش کرتے ہیں کہ کہاں سے مدد طلب کرنا چاہیے؟ معاشرے میں بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

مغربی معاشرے کو آج کل زبردست بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مشکلات بڑھ رہی ہیں افراد کی شخصیتیں ٹوٹ رہی ہیں، بکھر رہی ہیں، ان کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ موثر حل کی تلاش ہے۔

مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ سب سے پہلے ہمیں دنیا میں قرآنی معاشروں کی تشکیل کی کوشش کرنا چاہئے، اس لیے کہ قرآنی معاشرے کے بغیر ہم عورت مرد کے تعلقات کو صحیح اور فطری طور پر قائم نہیں کر سکتے۔ ضمناً قرآنی معاشرے کے بغیر عادلانہ و برادرانہ تعلقات قائم کرنا ناممکن ہے، لیکن اگر ہم محض آج کے نام نہاد اسلامی معاشرے پر اکتفا کرتے رہے تو کل کو آنے والی نسلوں سے ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ ہمارے معاشروں اور تنظیموں کا احترام کرے اور اس سے وفادار رہے۔

آجکل اکثر و بیشتر تنظیمیں خود کو اسلامی کہتے ہوئے بھی اسلامی نہیں بلکہ اکثر اسلام مخالف ہیں اس لیے کہ وہ اپنے غیر اسلامی اعمال و افعال کو اسلام کے نام پر محترم بنا کر پیش کرتی ہیں اور ان کی غیر اسلامی حرکتیں اسلام کی بدنامی کا سبب بنتی ہیں۔ ایسی تنظیموں کو ناواقف مسلمان اور غیر مسلمان اسلامی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم مسلمانوں اور خاص کر نوجوانوں کو جو آنے والے کل کی امید ہیں، قرآنی احکام و قوانین سے روشناس کریں اور خواتین، کنبے اور معاشرے سے متعلق اسلامی ہدایتوں کی اہمیت سے آگاہ کریں۔ بیشتر مغربی افکار و خیالات بے بنیاد اور مضر ہونے کے باوجود مسلمان افراد کی بڑی تعداد کو اپنے دام میں اسیر کر لیتے ہیں۔ ہمیں ایسے افکار و اعمال اور ان کے نتائج سے باخبر رہنا چاہیے اور ہر طرح سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے ورنہ ہمیں بھی اس مہلک حالت کا سامنا

کرنا پڑے گا جس کا سامنا اکثر و بیشتر ملتوں کو کرنا پڑا، اسلام کا تقاضا ہے کہ ہم موجودہ صورت حال پر قانع نہ رہیں بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کے ناطے افرادِ بشر کو نجات دلانے کی کوشش کرتے رہیں۔ ارشاد ہے:

"واذ قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انى اعلم مالا تعلمون"

(بقرہ - آیت ۳۰)

اور اے (رسول) تمہارے رب نے جس وقت کل فرشتوں سے یہ فرمایا کہ زمین پر خلیفہ (ہمیشہ) میں مقرر کروں گا تو انہوں نے یہ عرض کی کہ کیا تو ایسوں کو (خلیفہ) مقرر کرے گا جو زمین میں فساد اور خونریزی کیا کریں۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کیا کرتے ہیں۔ (پروردگار عالم نے) فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

باری تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس کی تعلیمات کی نشر و اشاعت و تبلیغ کریں، لہٰذا ہم سب کا فرض یہ ہے کہ ان مفید باتوں کو جو ہم نے سیکھی ہیں دوسروں کو بھی سکھائیں۔ اسلام اور مسلمین کے لیے آج وہ وقت آگیا ہے کہ وہ موجودہ معاشروں کی مشکلات حل کرنے کے لیے قرآن کے سکھائے ہوئے طریقوں کی وضاحت کریں اور اس عمل کو صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہ رکھیں، بلکہ غیر مسلم افراد کو بھی ان سے مستفید کریں یہ بات تبھی ممکن ہو سکتی ہے جب ہم نمونہ کے طور پر اس قرآنی معاشرے کی ایک زندہ مثال قائم کریں جس میں عورت و مرد کے مسائل تشفی بخش طریقے پر حل کر دیے گئے ہیں اس کے علاوہ علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ (تقریروں اور مقالوں کے ذریعے) مسلم و غیر مسلم افراد میں بیداری پیدا کریں اور اسلامی احکام و قوانین سے روشناس کر کے قرآنی رویۂ کے مطابق مشکلات حل کرنے کے طریقوں سے دنیا کو آگاہ کرنا چاہیے۔ یہی اللہ عزوجل کی اطاعت اور انسانیت کی خدمت کا بہترین طریقہ ہے۔ موجودہ معاشروں کے راہ گم کردہ اور فساد میں مبتلا افراد کو بہتری و شرف کی راہ کی طرف دعوت دینے سے بہتر نہ آج کوئی دعوت ہے نہ کوئی راستہ۔

حاشیے

۱ــــ حدیث نبویؐ ہے۔ اس کے علاوہ دیکھیے (المرأة فی القرآن والسنة)
تالیف، محمد عزت الدروازة/ص ۴۴، ۴۷، ۵۱۔ مطبوعہ مکتبۂ عصریہ، بیروت، سنہ ۱۹۸۰ء

۲ــــ دیکھیے (اللؤلؤ والمرجان فیما اتفق فیہ الشیخان)۔
تالیف، محمد فؤاد عبدالباقی/جلد ۱، ص ۳۰، ۳۱۔ مطبوعہ دار الکتب۔ الجدید۔ بیروت سنہ ۱۹۷۰ء

۳ــــ دیکھئے مقالہ (المرأة و بناء الدولة) ملقا کے مسلم معاشرے میں خواتین کے رول پر تنقید اور تجزیہ
تالیف، الحاج فیصل بن الحاج عثمان۔ اس مقالے کو کمبل یونیورسٹی میں پیش کیا گیا ہے۔

۴ــــ دیکھئے (المرأة فی الاسلام)
تالیف محمد خیرات ص ۱۰۸، مطبوعہ دائرۃ المعارف۔ قاہرہ سنہ ۱۹۷۵ء

۵ــــ انسائیکلوپیڈیا امریکانا "خواتین اور قانونی حقوق"
تالیف، مونرا دیالیسین، وردان بری، امریکانا کورپ۔ جلد ۲۹/ص ۱۰۸۔ ۱۰۹ مطبوعہ سنہ ۱۹۸۰ء

۶ــــ دیکھیے "المرأة بین الفقہ والقانون"۔ تالیف، مصطفیٰ السباعی ص ۳۸۔ مطبوعہ الکتبہ العربیہ حلب ۱۹۷۶ء،
اور "الدستور القرآنی فی شؤون الحیات/تالیف محمد عزت دروازہ ص ۸۷۔

۷ــــ امریکا میں آزادیٔ خواتین تحریک کے بارے میں "کارولین بردی" کہتی ہے:
"یہ تحریک اس نظریہ کے خلاف چل رہی ہے جو عورت اور مرد کے درمیان فطری فرق کو تسلیم کرتا ہے اور اس طرح کے افکار و خیالات عام طور سے رسم و رواج (بعنوان مثال شادی، کنبے کی تشکیل اور عورت و مرد کے باہمی تعلقات) کی اہمیت بڑھانے کی خاطر پھیلائے جا رہے ہیں۔ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا امریکانا/آزادیٔ نسوان — WOMEN FREEDOM جلد ۲۹۔ ص ۱۱۱

۸ــــ سنہ ۱۹۶۹ء کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ایک سال کے دوران ۲۳,۳۱۰,۰۰۰ شادیوں کے مقابل ۱۱,۸۱۰,۰۰۰ طلاق کے کیس تھے اور آئے دن طلاق کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے۔

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

جناب شیخ محمد قانصوہ

جمعہ کے لیے حاضری

روایات اہل بیت ؑ :

۱ ــ محمد بن يعقوب، عن محمد بن يحيى، عن احمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن نضر بن سويد، عن عبدالله بن سنان، عن حفص بن البختری، عن محمد بن مسلم، عن ابی جعفر عليه السلام، قال: اذا كان يوم الجمعة نزل الملائكة المقربون معهم قراطيس من فضة واقلام من ذهب فيجلسون على ابواب المساجد على كراسی من نور. فيكتبون الناس على منازلهم الاول والثانی حتى يخرج الامام.

فإذا خرج طووا صحفهم، ولا يهبطون في شيء من الأيام إلا يوم الجمعة يعني الملائكة المقربين.[۳۸]

۱۔ ...... حضرت ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کے دن فرشتے چاندی کے کاغذ اور سونے کے قلم لیے اترتے ہیں اور مسجدوں کے دروازوں پر نور کی کرسیاں لگاکر بیٹھتے ہیں، اور آنے والوں کے لیے پہلے اور دوسرے درجے کے آدمیوں کی فہرست بناتے رہتے ہیں یہاں تک کہ امام واپس چلا جاتا ہے۔ جب امام نماز پڑھا کر جاتا ہے تو فرشتے اپنا دفتر سمیٹ لیتے ہیں۔ ملائکہ مقربین جمعہ کے علاوہ اور کسی دن یہ نہیں اترتے۔

٢ ــ عن الباقر (ع) قال: يجلس الملائكة يوم الجمعة على باب المسجد فيكتبون الناس على قدر منازلهم الاول والثاني حتى يخرج الامام.[٣٩]

۲۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: ملائکہ جمعہ کے دن مسجدوں کے دروازوں پر بیٹھ کر لوگوں کے مدارج لکھا کرتے ہیں۔ پہلا اور دوسرا درجہ۔

٣ ــ عن النبي (ص) أنه قال: إذا كان يوم الجمعة كان على كل باب من ابواب المسجد ملائكة يكتبون الاول فالاول فإذا جلس الامام طووا الصحف وجاء وايستمعون الذكر.[٤٠]

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن مسجد کے ہر دروازے پر ملائکہ اوّل و دوم درجے کے لوگوں کے نام لکھتے رہتے ہیں۔ جب امام منبر پر بیٹھتا ہے ملائکہ اپنے دفتر سمیٹ کر حاضر ہو کر اس کا خطبہ سنتے ہیں ...... الخ

اہل سنّت کے روایات:

١ ــ وحدثني ابوالطاهر وحرملة وعمرو بن سوّاد العامري قال ابوالطاهرحدثنا وقال الآخران أخبرنا ابن وهب اخبرني يونس عن ابي شهاب اخبرني ابوعبدالله الاغر أنه سمع ابا هريرة يقول قال رسول الله (ص): إذا كان يوم الجمعة كان على كل باب من

ابواب المسجد ملائكة يكتبون الاول فالاول.فإذا جلس الامام طووا صحفهم وجاء وايستمعون الذكر... الحديث.[41]

۱۔ ...... ابوھریرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا: جمعہ کے دن مسجد کے ہر دروازے پر ملائکہ اوّل و دوم کے نام لکھتے رہتے ہیں۔ جب امام منبر پر بیٹھتا ہے، ملائکہ اپنے دفتر سمیٹ کر حاضر ہو کر اس کا خطبہ سنتے ہیں۔

٢ ــ واخبرنا ابوعبدالله الحافظ انبأ ابوعبدالله محمد بن يعقوب ثنا جعفر بن محمد بن الحسين ومحمد ابن حجاج الوراق قالا ثنا يحيى بن يحيى انبأ سفيان بن عيينة فذكره بنحوه (حديث سابق) إلا أنه قال أن النبي (ص) قال: ويكتبون الناس على منازلهم الاول فالاول فإذا جلس الامام طووا الصحف واستمعوا الخطبة ثم ذكر المهجر بمعناه. ونقله عن مسلم باسناده الى يحيى بن يحيى.[42]

۲۔ ...... سفیان بن عیینہ نے حدیث سابق نقل کرنے کے بعد کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اور وہ لوگوں کو اوّل و دوم درجے میں لکھتے رہتے ہیں، امام کے بیٹھتے ہی وہ دفتر سمیٹتے اور خطبہ سننے لگتے ہیں ......

٣ ــ اخبرنا ابو عبدالله اسحاق بن محمد بن يوسف السوسي انبأ ابوجعفر محمد بن عبدالله البغدادي ثنا اسماعيل بن اسحاق القاضي ثنا حجاج بن المنهال ثنا همام انبأ مطر عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده أن رسول الله (ص) قال: تقعد الملائكه على ابواب المسجد يوم الجمعة يكتبون مجئ الناس حتى يخرج الامام فإذا خرج الامام طويت الصحف ورفعت الاقلام قال فتقول الملائكه بعضهم لبعض ما حبس فلاناً وما حبس فلانا قال فتقول الملائكة اللهم إن كان مريضاً فاشفه وإنكان ضالاً فاهده وإن كان علائلا فاغنه.[43]

۳۔ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن مسجد کے دروازوں پر ملائکہ بیٹھتے اور لوگوں کی آمد لکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ امام چلے جائیں،

جب امام واپس چلے جاتے ہیں تو دفتر لپیٹ کر قلم اٹھا کر ملائکہ آپس میں کہتے ہیں فلاں نام نہیں لکھا گیا، فلاں نہیں لکھا گیا۔ پھر ملائکہ کہیں گے : یا اللہ، اگر وہ شخص بیمار ہو تو شفا دے اور اگر راستہ بھول گیا ہو تو راستہ دکھا دے اور اگر تہی دست ہو تو اسے بے نیاز کر دے۔

وقتِ جمعہ

۶۰. روایات اہل بیتؑ

۱ ــ عدة الداعي قال الباقر (ع): اول وقت يوم الجمعة ساعة نزول الشمس الى أن تمضي ساعة تحافظ عليها فإن رسول الله (ص) قال: لايسأل الله تعالى فيها خيراً إلا اعطاه الله تعالى.[۴۴]
أقول: وهذه الرواية تنفع في باب (الساعة المرجوة).

۱۔ عدۃ الداعی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ: اول وقت روز جمعہ جس ساعت نزول آفتاب ہو اس کا ایک ساعت تک خیال رکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ (اس ساعت میں) خدا سے جو اچھی چیز مانگی جائے گی اللہ وہ عطا کریگا۔
۔ "ساعتِ انتظار" کے ذیل میں بھی یہ روایت قابل حوالہ ہے۔

۲ ــ عن محمد حدثني موسى حدثني أبي عن ابيه عن جده جعفر بن محمد عن ابيه (ع) قال سألت جابر بن عبدالله كيف كان رسول الله (ص) يصلي الجمعة قال: كنا نصلي مع رسول الله (ص) ثم يروح فنروح بنواضحنا.[۴۵]

۲۔ .... امام محمد باقر علیہ السلام نے جابر بن عبد اللہ رضہ سے پوچھا، رسول اللہ[۲] جمعہ کیسے پڑھتے تھے؟ جابر نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جمعہ پڑھتے تھے، پھر حضرت ہمارے (کھیتوں میں پانی دینے والے) چشموں پر تشریف لاتے تھے اور ہم حضرت کے ساتھ ہوتے تھے۔

توحید ۱۰۴

۳ ـــ علي بن ابراهيم عن محمد بن عيسى عن يونس بن عبدالرحمن عن عبدالله بن سنان قال: قال ابوعبدالله (ع) إذا زالت الشمس يوم الجمعة فابدأ بالمكتوبة.[۴۶]

۳۔ ..... حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کے دن جیسے ہی زوال آفتاب ہو فوراً واجب نماز شروع کردو۔

٤ ـــ عن جعفر بن احمد عن العمركي عن العبيدي، عن يونس. عن علي بن جعفر عن أبي ابراهيم (ع) قال: لكل صلاة وقتان وقت يوم الجمعة زوال الشمس.[۴۷]

۴۔ ...... حضرت ابوابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ہر نماز کے دو وقت ہیں۔ وقت نماز جمعہ، زوال آفتاب ہے۔

۵ ـــ عن جعفر بن محمد عن آبائه (ع) قال، قال: علي عليه السلام: تصلّى الجمعة وقت الزوال.[۴۸]

۵۔ ..... حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: نماز جمعہ وقت زوال آفتاب پڑھی جائے۔

٦ ـــ البصائر للصفار عن احمد بن محمد عن محمد بن اسماعيل عن علي ابن النعمان عن ابن مسكان عن عبد الاعلى بن اعين عن أبي عبدالله (ع) قال: إن من الاشياء اشياء ضيقة وليس تجري إلا على وجه واحد منها وقت الجمعة ليس لوقتها إلا حد واحد حين نزول الشمس... الحديث.[۴۹]

۶۔ صفارؒ کی بصائر میں ہے ..... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: کچھ باتیں محدود ہیں، محدود چیزوں میں ایک معین وقت کے علاوہ گنجائش نہیں وہ ہے وقت جمعہ یہ وقت ایک حد میں محدود ہے اور وہ ہے وقت زوال آفتاب .... الخ

اہل سنت کے روایات

۱ ـــ حدثنا ابو بكر بن أبي شيبة واسحاق بن ابراهيم قال ابو بكر

حدثنا يحيى بن آدم حدثنا حسن بن عياش عن جعفر بن محمد عن ابيه (ع) عن جابر بن عبدالله قال: كنا نصلي مع رسول الله (ص) ثم نرجع فنريح نواضحنا قال حسن فقلت لجعفر (ع) في اي ساعة تلك قال زوال الشمس.[50]

۱۔ .... جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآل وسلم کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ کر اپنے کنووں پر جا کر دوپہر گذارتے تھے۔ حسن بن عیاش کہتے ہیں۔ میں نے جعفر (صادق علیہ السلام) سے پوچھا، کس گھڑی؟ فرمایا: وقتِ زوالِ آفتاب۔

۲ ــ حدثنا سريج بن النعمان قال حدثنا فليح بن سليمان عن عثمان بن عبدالرحمٰن بن عثمان التيمي عن أنس بن مالك رضي الله عنها: أن النبي (ص) كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس.[51]

۲۔ .... انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سورج کے جھکتے ہی نماز جمعہ پڑھتے تھے۔

ترک نماز جمعہ کا عقاب

روایات اہل بیتؑ

۱ ــ محمد بن محمد بن النعمان قال: الصادق (ع) من ترك الجمعة ثلاثاً من غير علة طبع الله على قلبه.[52]

۱۔ ...... حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص تین جمعے بلا سبب چھوڑتا ہے اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

۲ ــ روى الشهيد في (رسالة الجمعة) قال: قال (ع): من ترك ثلاث جمع متعمداً من غير علة طبع الله على قلبه بخاتم النفاق.[53]

۲۔ شہیدؒ نے رسالۂ جمعہ میں لکھا ہے کہ معصوم نے فرمایا: جو شخص جان بوجھ کر تین جمعے

چھوڑتا ہے، اللہ اس کے دل پر نفاق کی مہر لگاتا ہے۔

۳ ــ محمد بن يعقوب (عن محمد بن يحيى. عن احمد بن محمد). عن الحسين بن سعيد عن النضر، عن عاصم، عن أبي بصير، ومحمد بن مسلم جميعاً، عن أبي جعفر (ع): من ترك الجمعة ثلاث جمع متوالية طبع الله على قلبه.[۵۴]

ورواه البرقي (في المحاسن) عن أبيه عن النضر بن سويد عن عاصم بن حميد مثله.[۵۵]

۳۔ .... امام ابوجعفر علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص لگاتار تین جمعے چھوڑتا ہے اللہ اس کے قلب پر مہر لگاتا ہے۔

• برقی نے محاسن میں یہی روایت اپنی سند سے نقل کی ہے۔

٤ ــ قال الشهيد الثاني: وقال (ع): لينتهين اقوام من ودعهم الجمعات اوليختمن على قلوبهم ثم ليكونن من الغافلين.[۵۶]

۴۔ شہید ثانیؒ .... معصوم نے فرمایا: لوگوں کو جمعہ ترک کرنے سے بہرحال باز رہنا چاہیئے ورنہ ان کے دلوں پر ضرور بالضرور مہر لگے گی اور وہ غافلوں میں شمار ہوں گے

۵ ــ (عقاب الأعمال) عن محمد بن الحسن الصفار، عن محمد بن عيسى بن عبيد عن النضر ابن سويد عن عاصم بن حميد، عن ابي بصير ومحمد بن مسلم قالا سمعنا ابا جعفر محمد بن علي (ع) يقول: من ترك الجمعة ثلاثاً متواليات بغير علة طبع الله على قلبه.[۵۷]

۵۔ عقاب الاعمال کی روایت ..... ابوجعفر امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص تین جمعے لگاتار چھوڑتا ہے اللہ اس کے دل کو بند کر دیتا ہے۔

٦ ــ وقال (ع): من ترك الجماعة رغبة عنها وعن جماعة المؤمنين من غير علة فلا صلاة له.[۵۸]

۶۔ اور معصومؑ نے فرمایا: جو شخص بلا عذر معقول، جماعت اور گروہ مومنین کو صرف ناپسند ہونے کی وجہ سے چھوڑتا ہے اس کی نماز ہی نہیں۔

٧ ــ قال الشهيد الثاني في (رسالة الجمعة) قال النبي (ص) في خطبة طويلة نقلها المخالف والمؤالف: إن الله تعالى فرض عليكم الجمعة فمن تركها في حياتي اوبعد موتي استخفافا بها اوجحوداً لها فلا جمع الله شمله ولابارك له في امره ألا ولاصلاة ألاولا زكاة له ألاولاحج له ألاولاصوم له ألاولا برله حتى يتوب.[٥٩]

٧۔ شہید ثانی نے رسالۃ الجمعہ میں لکھا ہے کہ شیعہ، سنّی دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ایک طویل خطبہ نقل کیا ہے، جس میں حضورؐ کا ارشاد ہے: اللہ نے تم پر جمعہ فرض کیا ہے۔ اب میری زندگی میں یا میرے بعد جو شخص بھی اسے سبک سمجھ کر یا اس کا انکار کرکے چھوڑے گا، اللہ اس کو یکسوئی سے محروم کردے گا، اس کے کسی کام میں برکت نہ رہے گی۔ یاد رکھو نہ اس کی نماز، نماز نہ اس کی زکاۃ، زکاۃ نہ اس کا حج، حج ہوگا۔ نہ اس کے روزے کا کوئی فائدہ نہ اس کی بھلائی، بھلائی ہے۔ جب تک توبہ نہ کرے۔

٨ ــ عقاب الأعمال، عن الصفار عن يعقوب بن يزيد عن حماد بن عيسى عن حريز وفضيل عن زرارة عن أبى جعفر (ع) قال: صلاة الجمعة فريضة والاجتماع اليها فريضة مع الإمام فإن ترك رجل من غير علة ثلاث جمع فقد ترك ثلاث فرائض ولا يدع ثلاث فرائض من غير علة إلا منافق.[٦٠]

٨۔ عقاب الاعمال .... امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: نماز جمعہ فریضہ ہے، اس میں امام کے ساتھ اجتماع فریضہ ہے، اگر کوئی شخص بلا وجہ تین جمعے چھوڑ دے تو اس نے گویا تین فریضے چھوڑ دیے اور تین فریضے بلا وجہ صرف منافق ہی چھوڑتا ہے۔

٩ ــ المعتبر. قال النبي (ص): إن الله كتب عليكم الجمعة فريضة واجبة الى يوم القيامة.[٦١]

٩۔ المعتبر میں حدیث رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: اللہ نے جمعے کے دن ایک فریضۂ واجبہ معین کیا ہے جو قیامت تک رہے گا۔

روایات اہل سنّت

۱ ــ حدثني الحسن بن علي الحلواني حدثنا ابوتوبة حدثنا معاوية وهوابن سلام عن زيد يعني اخاه أنه سمع ابا سلام قال حدثني الحكم بن ميناء أن عبدالله بن‌عمر، وابا هريرة حدثاه أنهما سمعا رسول الله (ص) يقول على اعواد منبره: لينتهين اقوام عن ودعهم الجمعات اوليختمن الله على قلوبهم ثم ليكونن من الغافلين.[۶۲]

۱۔ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر کے زینے پر فرمایا: لوگوں کو جمعہ ترک کرنے سے بہرحال باز رہنا چاہیئے ورنہ ان کے دلوں پر ضرور بالضرور مہر لگے گی اور وہ غافلوں میں شمار ہوں گے۔

۲ ــ حدثنا ابوبكر احمد بن اسحاق الفقيه انبأ ابوالمثنى ثنا يحيى بن سعيد عن محمد بن عمر وقال حدثني عبيدة ابن سفيان الحضرمي عن ابي الجعد الضمري وكانت له صحبة أن رسول الله (ص) قال: من ترك ثلاث جمع تهاوناً بها طبع الله على قلبه.[۶۳]

۲۔ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص تین ے چھوڑتا ہے، اللہ اس کے قلب پر مہر لگا دیتا ہے۔

۳ ــ اخبرنا ابوالحسين علي بن محمد بن عبدالله بن بشران العدل ببغداد انبأ ابوجعفر محمد بن عمرو ابن البختري ثنا محمد بن عبدالملك الدقيقي ثنا يزيد بن هارون انبأ فضيل بن مرزوق حدثني الوليد بن بكير ثنا عبدالله بن محمد عن علي بن زيد عن سعيد بن المسيب عن جابر بن عبدالله قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم على منبره يقول... الخطبة، حتى يقول... واعلموا أن الله عزوجل قد فرض عليكم الجمعة فريضةً مكتوبة في مقامي هذا في شهري هذا في عامي هذا الى يوم القيامة من وجد اليها سبيلا فمن تركها في حياتي اوبعدى جحودا بها واستخفافا بها وله امام عادل اوجائر فلا جمع الله له شمله. ألا ولا بارك الله له في امره

ألا ولا صلاة له ألا ولا وضوء ألاولا زكاة له ألا ولا حج له ألا ولا وتره له... الخطبة.

وروي ذلك عن جابر وابي سعيد ايضاً۔[64]

۳۔ .... آنحضرتؐ منبر پر خطبہ دے رہے تھے .... فرمایا.... .... جان لو! اللہ عزوجل نے تمھارے اوپر جمعہ فرض کیا ہے یہ حتمی فریضہ ہے میری اس منزل، میرے اس مہینے، میرے اس سال سے قیامت تک بشرطیکہ (نماز جمعہ تک) راہ (وسیلہ) ممکن ہو۔ اب جس نے میری زندگی میں یا میرے بعد بطور سرکشی وسہل انگاری اسے چھوڑا، حالانکہ امام عادل یا فاسق (جائر، ظالم) موجود ہو۔ تو خدا اس کے معاملات کو یکسو نہ رکھے گا۔ اس کے کام میں برکت نہ ہوگی۔ اس کی نماز، اس کا وضو اس کی زکوٰۃ، اس کا حج، اس کی نماز وتر کچھ نہیں .... الخ

٤ ـــ من ترك الجمعة ثلاث مرات متواليات من غير ضرورة طبع الله على قلبه.[65]

۴۔ جو شخص بلا عذر واقعی تین جمعے چھوڑتا ہے، اللہ اس کے قلب پر مہر لگا دیتا ہے

٥ ـــ من ترك الجمعة من غير ضرورة كتب منافقاً في كتاب لايمحى ولا يبدل.[66]

وروى ابن عساكر عن أبي هريرة. من ترك الجمعة ثلاثاً من غير علة طبع الله على قلبه.

۵۔ جو شخص بلا عذر واقعی نماز جمعہ چھوڑتا ہے اس کا نام منافقین کے اس دفتر میں لکھا جاتا ہے جس کی تحریر بدلی یا مٹائی نہیں جائے گی ــــ اور ابن عساکر نے ابو ہریرہ سے روایت کی ہے: جو شخص بلا وجہ تین جمعے ناغہ کرتا ہے۔ اللہ اس کے قلب پر مہر لگاتا ہے۔

٦ ـــ من ترك الجمعة ثلاث مرات من غير علة ولا مرض ولا عذر طبع الله على قلبه.[67]

٦۔ جو شخص بلا وجہ، بلا مرض، بلا عذر تین جمعے چھوڑتا ہے اللہ اس کے قلب پر مہر لگا دیتا ہے۔

فضیلت نماز جمعہ

روایات اہل بیتؑ

۱ــ عن أبيه عن علي بن ابراهيم عن ابيه عن النوفلي عن السكوني عن الصادق عن آبائه قال ــ قال رسول الله (ص): «من أتى الجمعة ايماناً واحتساباً استأنف العمل»[68].

۱ــ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جمعہ میں ایمان و تقرب خدا کے لیے آتا ہے وہ تجدید عمل کرتا ہے۔

۲ــ جمال الاسبوع باسناده الى زرارة قال ــ قال ابوجعفر في حديث: «فاذا زالت الشمس فقم وعليك السكينة والوقار»[69].

۲۔ جمال الاسبوع میں .... حضرت ابوجعفر علیہ السلام نے ایک گفتگو میں فرمایا: جب زوال آفتاب ہو تو سکون و وقار کے ساتھ چلو۔ (جمعہ کے لیے)

۳ــ وفي حديث: «... وليكن عليه في ذلك اليوم السكينة والوقار... الحديث»[70].

۳۔ .... اس دن تمہارے اوپر سکون و وقار ہونا چاہیے ..... الخ

٤ــ وفي رسالة الشهيد الثاني روي عن النبي (ص) أنه قال في حديث: «... واذا اخذ في المشي كتب له بكل خطوة عشرون حسنة»[71].

وقد مرّ طرف من روايات تذكر فضل الخطوات «وأن يكون عليه السكينة والوقار»، ونذكر هنا منها فراجع الهامش[72].

۴۔ رسالۂ شہید ثانی میں ہے: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے..... ...... جب (نمازی) چلنا شروع کرتا ہے تو ہر قدم پر بیس حسنہ لکھے جاتے ہیں۔" قدم بڑھانے کے ثواب کا تذکرہ چند روایات میں پہلے بھی آچکا ہے۔ نیز یہ کہ رفتار

یں وقار و سکون ہونا چاہیے (دیکھیے حواشی)

٥ـ عن الحسين بن ابراهيم بن ناتانه عن علي بن ابراهيم عن ابيه عن محمد بن أبي عمير عن ابي زياد النهدي عن عبدالله بن بكير قال، قال الصادق جعفر بن محمد: «ما من قدم سعت الى الجمعة إلا حرم الله جسدها على النار»[٧٣].

وكذا نقله البحار عن الامالي[٧٤].

چلنے کا ثواب

٥- .... حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو قدم جمعہ کے لیے آگے بڑھتا ہے اس کا جسم آتش جہنم پر حرام ہوجاتا ہے۔

ـــــ بحار میں امالی سے اسی طرح نقل ہوا ہے۔

٦ـ عن جعفر بن محمد بن مسرور عن الحسين بن محمد بن عامر عن عمه عبدالله عن ابن ابي عمير عن حماد عن الحلبي عن أبي عبدالله قال: «اذا قمت الى الصلاة ان شاء الله تعالى فأتها سعياً وليكن عليك السكينة والوقار فما أدركت فصلّ وما سبقت فأتمه فان الله عزّوجلّ يقول: «يا ايها الذين آمنوا اذا نودي للصلاة من يوم الجمعة فاسعوا الى ذكرالله» ومعنى قوله فاسعوا هوالا نكفات[٧٥].

رفتار

٦ .... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی مدد سے جب نماز کی تیاری کرو تو قدم اٹھا کر جاؤ، اس وقت سکون و وقار ہونا چاہیے، جو رکعت ملے اس میں شریک ہو اور جو رکعت تمام ہوچکی ہو اسے بعد میں ادا کرو، کیونکہ خداوند عالم فرماتا ہے: ایمان لانے والو! جمعہ کے دن جب نماز کی اذان دی جائے تو ذکر الٰہی کے لیے تیزی سے جاؤ!"

اہل سنت کے روایات

١ـ علي بن عبدالله، قال: حدثنا الوليد بن مسلم، قال: حدثنا يزيد بن أبي مريم، قال: حدثنا عباية بن رفاعة، قال: أدركني أبو عبس وأنا أذهب الى الجمعة، فقال: سمعت النبي (ص) يقول: «من أغبرت

قدماه في سبيل الله حرمه الله على النار»[٧٦]

۱۔ .... عبایہ بن رفاعہ جمعہ میں جا رہے تھے۔ راستے میں انہیں ابوعبس نے
کا اور کہنے لگے۔ میں نے نبی کریمؐ سے سنا ہے: جس کے قدم راہ خدا میں غبار آلود ہو گئے
راس پر آتش جہنم حرام کر دے گا۔

٢ ــ حدثنا آدم، قال: حدثنا ابن ابي ذئب، قال: الزهري عن سعيد وأبي سلمة، عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن النبي(ص)، وحدثنا ابواليمان، قال: أخبرنا شعيب عن الزهري، قال: أخبرني ابوسلمة بن عبدالرحمن: أن أبا هريرة قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «اذا أقيمت الصلاة فلا تأتوها تسعون وأتوها تمشون عليكم السكينة فما أدركتم فصلوا وما فاتكم فأتموا»[٧٧].

۲۔ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز
ری ہو تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ، سکون و وقار سے چلو۔ جو رکعت مل جائے اس میں شریک ہو، جو
بائے اسے بعد میں تمام کرو۔

٣ــ وقد مرّ فيما تقدم عن فضل أفعال يوم الجمعة ومن جملتها المشي في سكينة ونذكر طرفاً منها راجع الهامش[٧٨].

وذكر البيهقي في سننه في حديث... كان له بكل خطوة عمل سنة اجر صيامها وقيامها[٧٩].

۳۔ اعمال روز جمعہ میں کچھ حدیثیں ہم نقل کر چکے ہیں جن میں سکون و وقار سے چلنے کی
یت ہے۔ باقی کے لیے دیکھئے حاشیہ۔
سنن بیہقی میں ایک حدیث کے ذیل میں .... اس کے ہر قدم کے بدلے ایک
ال کے روزوں اور نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا۔

٤ــ ابوالحسن محمد بن الحسين العلوي املاء، أنبأنا عبدالله بن محمد بن الحسن الشرقي حدثنا محمد بن يحيى الذهلي حدثنا

عبدالرحمن بن مهدي عن عبدالله بن المبارك عن معمر، عن همام بن منبه، عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «الكلمة الطيبة صدقة ومشيك الى المسجد صدقة»[80] .

ونقله عن عبدالرزاق، عن معمر، ونقله عن الصحيحين مسلم والبخاري والبيهقي وان ذكره في باب الجمعة الا أنه أعم.

۴ــ ....

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اچھی بات صدقہ ہے اور تمہارا مسجد جانا صدقہ ہے۔" ــــ یہ روایت عبدالرزاق۔ مسلم وبخاری میں ہے لیکن بیہقی نے اسے باب جمعہ میں لکھا ہے۔ مگر حدیث اعم ہے۔

وجوب جمعہ

دیہاتیوں اور بستی والوں پر

روایات اہل بیت

١ــ محمد بن الحسن، باسناده، عن الحسين بن سعيد، عن صفوان، عن العلاء عن محمد بن مسلم، عن احدهما(ع)، قال: «سألته عن أناس في قرية هل يصلون الجمعة جماعة؟ قال: نعم ويصلون أربعاً اذا لم يكن من يخطب»[81] .

وهذه الرواية فى اشتراط الجمعة بمن يخطب.

١ــ .... امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ سے محمد بن مسلم نے سوال کیا قریے کے رہنے والے نماز جمعہ جماعت سے پڑھیں گے؟ امام نے فرمایا: ہاں، اگر کوئی خطبہ پڑھنے والا نہ ہو تو پھر چار رکعت پڑھیں۔ (یعنی ظہر)

یہ روایت جمعہ میں خطیب کی شرط سے مربوط ہے۔

٢ــ محمد بن الحسن، عن فضالة، عن أبان بن عثمان، عن الفضل بن عبدالملك قال: سمعت أبا عبدالله(ع) يقول: «اذا كان

القوم في قرية صلوا الجمعة أربع ركعات فان كان لهم من يخطب لهم جمعوا اذا كانوا خمس نفر وانما جعلت ركعتين لمكان الخطبتين »[۸۲].

۲۔ .... فضل بن عبدالملک کہتے ہیں، میں نے حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام سے سنا، اگر کوئی گروہ قریے میں ہو تو جمعہ کے دن چار رکعتیں پڑھے، لیکن اگر کوئی خطبہ خوان اور پانچ آدمی موجود ہوں تو وہ لوگ جمعہ پڑھیں، کیونکہ دونوں خطبے دو رکعتوں کی جگہ ہیں۔

روایات اہل سنّت

۱۔ حدثنا محمد بن المثنى، قال: حدثنا ابوعامر العقدي، قال: حدثنا ابراهيم بن طهمان عن ابي جمرة الضبعي، عن ابن عباس أنه قال: «ان اول جمعة جُمعت بعد جمعة في مسجد رسول الله (ص) في مسجد عبدالقيس بجواثي من البحرين»[۸۳].

وجواثي: (قرية من قرى البحرين. قال عثمان: قرية من قرى عبدالقيس)[۸٤].

وروى هذا الحديث البيهقي باسنادين آخرين عن ابراهيم بن طهمان مثله، وفيه بزيادة (قرية من قرى عبدالقيس) من ابن عباس[۸۵].

۱۔ .... ابن عباس کہتے ہیں مسجد نبیؐ کے جمعے کے بعد جو جمعہ پڑھا گیا وہ مسجد عبدالقیس، جوائی بحرین میں ہے۔

۔ جوائی: بحرین کی بستی کا نام ہے۔ عثمان کے بقول: عبدالقیس کی ایک بستی جوائی کہلاتی ہے۔

اس حدیث کو بیہقی نے دو اور سندوں سے ابراہیم بن طہمان سے روایت کیا ہے البتہ اس میں "عبدالقیس کی بستیوں میں سے ایک بستی" کا اضافہ ہے۔

۲۔ اخبرنا ابوالحارث الفقيه أنبأنا علي بن عمر الحافظ حدثنا ابوبكر النيسابوري حدثنا محمد بن يحيى حدثنا محمد بن وهب بن عطية حدثنا بُقيه بن الوليد حدثنا معاوية بن يحيى حدثنا معاوية بن سعيد النجيبي حدثنا الزهري عن أم عبدالله الدوسية، قالت: قال

رسول الله صلى الله عليه وسلم: «الجمعة واجبة على كل قرية وان لم يكن فيها الا أربعة» [٨٦].
وهذا الحديث سنذكره في باب العدد.

۲۔ .... ام عبد اللہ دوسیہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ ہر قریہ پر واجب ہے، اگرچہ اس میں صرف چار ہی آدمی ہوں۔
—— یہ حدیث باب عدد میں آئے گی۔

معذورین

روایات اہل بیت

١ــ محمد بن علي بن الحسين، باسناده عن زرارة بن أعين، عن أبي جعفر الباقر(ع)، قال: «انما فرض الله عزّوجلّ على الناس من الجمعة الى الجمعة خمساً وثلاثين صلاة منها صلاة واحدة فرضها الله عزّوجلّ في جماعة وهي الجمعة. ووضعها عن تسعة عن الصغير والكبير والمجنون والمسافر والعبد والمرأة والمريض والأعمى ومن كان على رأس فرسخين» [٨٧]

و رواه الكليني، عن محمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان، وعن علي بن ابراهيم، عن ابيه، جميعاً، عن حماد بن عيسى، عن حريز، عن زرارة [٨٨].

ورواه الشيخ، عن محمد باسناده، عن محمد بن يعقوب [٨٩].

ورواه الصدوق في (الأمالي)، عن أبيه، عن علي بن ابراهيم [٩٠].

ونقله البحار عن الصدوق في مجالسه باسناد آخر عن حماد نحوه [٩١].

ونقلد ايضاً عن الخصال باسناد آخر ايضاً وبزيادة في آخره [٩٢].

ونقله ايضاً عن مجالس ابن الشيخ باسناده الى الصدوق في الخصال نحوه [٩٣].

ونقل ايضاً نحوه عن كتاب العروس باسناده الى ابي جعفر(ع) [٩٤].

ونقل ايضاً نحوه عن كتاب الهداية [٩٥].

۱۔ .... امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:
اللہ نے جمعہ سے جمعہ تک پینتیس نمازیں فرض کی ہیں۔ ان میں سے ایک نماز باجماعت رکھی ہے اور وہ جمعہ کی نماز ہے۔ یہ نماز نو افراد پر معاف ہے۔ کم سن، بہت بوڑھا، دیوانہ، مسافر، غلام، عورت، مریض، نابینا اور جو شخص دو فرسخ پر ہو۔

- کلینیؒ نے محمد بن اسماعیل .... سے روایت کی ہے۔
- شیخؒ نے محمد سے باسناد .... روایت کی ہے۔
- صدوقؒ نے امالی میں اپنے والد .... روایت کی ہے۔
- بحار الانوار میں صدوق کی المجالس ....
- بحار ہی میں خصال .... آخر حدیث میں ایک اضافہ۔
- بحار ہی میں ابن الشیخ نے اپنے سلسلۂ سند سے صدوق اور صدوق کا سلسلۂ سند خصال سے ہے۔
- بحار ہی میں کتاب العروس سے ......
- بحار ہی میں کتاب الهدایہ سے .....

۲ـ محمد بن يعقوب، عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن النضر بن سويد، عن عاصم بن حميد، عن أبي بصير و محمد بن مسلم، جميعاً، عن أبي عبدالله (ع) قال: «ان الله عزّ وجلّ فرض في كل سبعة ايام خمساً وثلاثين صلاة منها صلاة واجبة على كل مسلم أن يشهدها الا خمسة: المريض والمملوك والمسافر والمرأة والصبي»[٩٦].

ورواه في البحار عن المعتبر نحوه[٩٧].

۲ـ .... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ عزوجل نے سات دنوں میں پینتیس نمازیں واجب کی ہیں ان میں سے ایک نماز میں ہر مسلمان کی حاضری ضروری ہے۔ پانچ آدمی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مریض، غلام، مسافر، عورت، بچہ۔

- بحار میں کتاب معتبر ... سے روایت۔

٣ــ وعنه، عن صفوان، عن منصور، عن أبي عبدالله[98] في حديث قال: «الجمعة واجبة على كل أحد لايعذرالناس فيها الاخمسة: المرأة والمملوك والمسافر والمريض والصبي»[99].

وفي رواية عن أميرالمؤمنين (ع) في خطبة: (الجمعة واجبة على كل مؤمن إلاّ الصبي والمرأة والعبد والمريض... الخطبة).

٣۔ .... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ واجب ہے۔ لوگ اس میں معاف نہیں۔ البتہ پانچ افراد۔ عورت، غلام، مسافر، مریض۔ بچہ۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے ایک خطبے میں ہے: جمعہ ہر مومن پر واجب ہے۔ سوائے بچے، عورت غلام اور مریض کے ...... الخ

روایاتِ اہل سنت:

١ــ اخبرنا ابوبكر بن الحسن القاضي، وابوزكريا بن أبي اسحاق، قالا: حدثنا ابوالعباس الأصم، انبأنا الربيع بن سليمان، انبأ الشافعي، انبأ ابراهيم بن محمد، حدثني سلمة بن عبدالله الخطمي، عن محمد بن كعب، أنه سمع رجلا من بني وائل يقول: قال النبي صلى الله عليه وسلم: «تجب الجمعة على كل مسلم إلاّ إمرأة أوصبي أومملوك»[100]

وروى الهيثمي، عن أبي الدرداء: «يستثنى خمسة بزيادة المريض والمسافر»[101].

وروي مثله عن ابي هريرة: يستثنى «خمسة بجعل أهل البادية مكان المريض»[102]. ونقله عن الطبراني.

١۔ .... نبی خاتم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: عورت، بچہ اور غلام کے علاوہ سب پر جمعہ واجب ہے۔

• ہیثمی نے ابودرداء سے روایت کی ہے، جس میں پانچ کے استثنا کا ذکر ہے۔ مریض اور مسافر کے اضافے سے۔

• اسی قسم کی روایت ابو ہریرہ سے کی ہے کہ پانچ افراد مستثنیٰ ہیں جن میں مریض کی جگہ بادیہ نشین کا تذکرہ ہے۔ طبرانی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔

٢ــ اخبرنا ابوعلي الروذباري، أنبأنا محمد بن بكر، حدثنا ابو داوود، حدثنا عباس بن عبدالعظيم، حدثني اسحاق بن منصور، حدثنا هريم يعني ابن سفيان، عن ابراهيم بن محمد بن المنتشر، عن قيس بن مسلم، عن طارق بن شهاب، عن النبي صلى الله عليه وسلم: قال: «الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة إلاّ أربعة عبد مملوك أو إمرأة أو صبي أو مريض»[١٠٣].

وروى البيهقي باسناد آخر عن طارق بن شهاب عن النبي (ص) بهذا المعنى[١٠٤].

٣۔ .... طارق بن شہاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے روایت کی ہے، حضرتؐ نے فرمایا:

"جمعہ (کی نماز) ہر مسلمان پر جماعت میں پڑھنا فرض ہے، سوائے چار کے، غلام، عورت، بچہ اور مریض"

معذور افراد

٣ــ اخبرنا علي بن احمد بن عبدان، انبأنا احمد بن عبيد الصفار، حدثنا علي بن الحسن بن بيان، حدثنا سعيد بن سليمان، حدثنا محمد بن طلحة بن مصرف (ح واخبرنا) ابوحازم الحافظ، انبأ ابواحمد الحافظ يعني النيسابوري، انبأ ابواحمد محمد بن سليمان بن فارس حدثنا محمد — يعني ابن اسماعيل البخاري، حدثني اسماعيل بن ابان، حدثنا محمد بن طلحة، عن الحكم ابي عمرو، عن ضرار بن عمرو، عن ابي عبدالله الشامي، عن تميم الداري عن النبي صلى الله عليه وسلم: قال: «الجمعة واجبة إلا على صبي أو مملوك أو مسافر»[١٠٥].

وروى البيهق باسناد آخر عن جابر أن رسول الله قال: «من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فعليه الجمعة يوم الجمعة إلا على مريض أو مسافر أو صبي أو مملوك ..... الخ الحديث»[١٠٦].

وروى عبدالرزاق باسناده عن كعب القرظي في حديث نحوه[107]
وراجع في هذه المعاني كنزالعمال فقد نقل احاديث متعددة في المعذورين من صلاة الجمعة منها تذكر الاربعة ومنها تذكر الخمسة كما في الروايات المذكورة ورواها ابوهريرة وابن عباس وجابر فراجع[108].

۳۔ . . . . . . تمیم داری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے، حضرت نے فرمایا: جمعہ واجب ہے۔ بچہ، غلام اور مسافر مستثنیٰ ہیں

بیہقی نے دوسری سند سے بقول جابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث روایت کی ہے ہے ۔ جمعہ واجب ہے۔ مریض، بچہ اور غلام مستثنیٰ ہیں۔ . . . . الخ

عبدالرزاق نے یہی حدیث اپنے اسناد سے کعب قرظی کے ذریعے نقل کی ہے۔ ان معافیوں کے لیے کنزالعمال میں نماز جمعہ سے مستثنیٰ افراد کا ذکر ہے۔ کہیں چار کا ذکر ہے کہیں پانچ کا..... ابوہریرہ اور ابن عباس وجابر کی روایتیں ہیں۔

حاشیہ

۳۸ ــ الوسائل ج ۳ ص ٤٢. والكافي ج ۳ ص ٤١٣. الفقيه ج ١ ص ٢٧٤.

۳۹ ــ البحارج ٨٩ ص ٢١٣.

٤٠ ــ مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٣عن الشهيد في الإكمال.

٤١ ــ مسلم ج ٢ ص ٧ وراجع النسائي ج ٣ ص ٩٨ والام ج ١ ص ١٧٣ وكنزالعمال ج ٧ حديث رقم ٣٣٧٠ و ٣٥٠١ في الأصل والهامش عن احمد والطبراني وابي يعلى والضياء وعن مسلم والبخاري. ومجمع الزوائد ج ٢ ص ١٧٧.

٤٢ ــ سنن البيهقي ج ٣ ص ٢٢٦ وكذا عن سفيان بن عيينة عن ابي هريرة في ابن ماجة ج ١ ص ٣٤٧ ومثله مصابيح السنة للبغوي ج ١ ص ٦٨.

٤٣ ــ سنن البيهقي ج ٣ ص ٢٢٦. وراجع النسائي ج ٣ ص ٩٨ عن ابي هريرة والأم للشافعي ج ١ ص ١٧٣. وكنزالعمال ج ٧ حديث (٣٥٠١) ونقله في هامشه عن البخاري ومسلم.

٤٤ ــ البحار ج ٨٩ ص ٢٠٠ ونقله في الهامش عن عدة الداعي ص ٢٨.

٤٥ ــ الجعفريات ٤٤.

٤٦ ــ الكافي ج ٣ ص ٤٢٠.

٤٧ ــ البحار ج ٩٨ ص ١٧٠. وفي الهامش عن العياشي ج ١ ص ٢٧٤.

٤٨ ــ البحار ج ٨٩ ص ١٧١ وفي الهامش عن دعائم الاسلام ج ١ ص ١٤٠.

٤٩ ــ البحار ج ٨٩ ص ١٧١ وفي الهامش عن البصائر ص ٣٢٨) في حديث.

٥٠ ــ صحيح مسلم ج ٢ ص ٨ ونقله مسلم باسناد آخر عن جعفر (ع) عن ابيه (ع) وروي أيضاً مثله عن أبي سلمة ابن الاكوع فراجع صحيح مسلم ج ٢ ص ٩ ونصب الراية ج ٢ ص ١٩٥.

٥١ ــ البخاري كتاب الجمعة ص ١٠٦ واحمد ج ٣ ص ١٢٨ عن أنس ومثله ص ١٥٠ وص ٢٢٨ وعن الاوسط للطبراني من حديث جابر ص ١٣٤ كما في هامش نصب الراية ج ٣ ص ١٩٥ ونقل ايضاً عن ابي داؤد عن انس مثله ج ١ ص ٢٨٤ ومثله في منحة المعبود ج ١ ص ١٤١.

٥٢ ــ الوسائل ج ٣ ص ٦ ونقل في الهامش عن المقنعة ص ٢٧.

٥٣ ــ الوسائل ج ٣ ص ٦ وفي الهامش عن رسالة الجمعة ص ٥٥.

٥٤ ــ الوسائل ج ٣ ص ٥. التهذيب ج ١ ص ٣٢١.

٥٥ ــ المحاسن ص ٨٥.

٥٦ ــ الوسائل ج ٣ ص ٦ وفي هامشه عن رسالة الجمعة ص ٥٥.

٥٧ ــ الوسائل ج ٣ ص ٤ ــ عقاب الاعمال ص ١٩ ونقل البحار ج ٨٩ ص ١٨٣ عن اصل قديم مرفوعاً عن علي (ع): من ترك الجمعة ثلاثاً متتابعة لغير علة كتب منافقاً: ونقله في ص ١٩٢ عن

عقاب الاعمال والمحاسن.

٥٨ ــ الوسائل ج ٣ ص ٤ وعقاب الاعمال ص ١٩.

٥٩ ــ الوسائل ج ٣ ص٧ وفي هامشه عن رسالة الجمعة ص ٩١.

٦٠ ــ الوسائل ج ٣ ص ٤ وفي هامشه عقاب الاعمال ص ١٩.

٦١ ــ البحار ج ٨٩ ص ١٦٥ وفي الهامش عن المعتبر ص ٢٠٠.

٦٢ ــ مسلم ج ٢ ص ١٠. النسائي ج ٣ ص ٨٨ مثله ومنحة المعبود ج ١ ص ١٤١. كنزالعمال ج ٧ ص ٥١٦ نقله عن أحمد والنسائي عن ابن عباس وابن عمر. ونقل حديثاً آخر مثله ج ٧ ص ٥١٧ ونقل في الهامش عن ابن النجار عن ابن عمر ونقله عبدالرزاق في مصنفه ج ٣ ص ١٦٦ باسناده عن عبدالله بن ميناء، مصابيح السنة للبغوي ج ١ ص ٦٨.

٦٣ــ المستدرك ج ١ ص ٢٨٠ و٢٩٢. وقال حديث صحيح. ومثله البيهقي ج ٣ ص ١٧٢ واحمد ج ٣ ص ٤٢٥ و٤٢٤ وكنزالعمال ج ٧ ص ٥١٨ و٥١٦ ونقله في الهامش عن الشافعي واحمد والبارودي والنسائي وابن ماجة وابي يعلى والطبراني والبغوي وجماعة. وايضاً الترمذي ج ٢ ص ٣٧٣ والمنتقي ج ٢ ص ٧ وسنن ابي داود ج ١ ص ٢٧٧ والام للشافعي ج ٣ ص ٤٢٤ ومصابيح السنة للبغوي ج ١ ص ٦٨.

٦٤ ــ سنن البيهقي ج ٣ ص ١٧١، وكنزالعمال ج ٧ ص ٥١١ عن جابر وحديث ٣٤٠٧ عن ابي سعيد وعن الطيالسي وابن ماجة ج ١ ص ٣٤٣ ومجمع الزوائد ج ٢ ص ١٦٩.

٦٥ ــ كنزالعمال ج ٧ ص ٥١٦ عن أحمد والمستدرك عن أبي قتادة واحمد والنسائي وابن ماجة والمستدرك عن جابر.

٦٦ ــ الشافعي ج ١ ص ١٨٤ وكنزالعمال ج ٧ ص ٥١٨.

٦٧ ــ كنزالعمال ج ٧ ص ٥١٨ ونقله عن المحاملي في الأمالي والخطيب وابن عساكر جميعاً عن عائشة.

(٦٨) البحار ج ٨٩ ص ١٩٢ عن ثواب الاعمال وفي هامشه عنه ص ٣٤.

(٦٩) البحار ج ٨٩ ص ٣٥١ عن جمال الاسبوع ونحوه في الوسائل باسناده الى زرارة ج ٥ ص ٨٧ حديث ٣ ونحوه الكافي ج ٣ ص ٤١٧ الحديث ٤.

(٧٠) الوسائل ج ٥ ص ٧٨ الحديث ٢ والكافي ج ٣ ص ٤١٧ الحديث ١.

(٧١) البحار ج ٨٩ ص ٣٥٧ عن الرسالة المذكورة.

(٧٢) المستدرك: (كان له بكل خطوة عمل سنة صيامها وقيامها الحديث) ج ١ ص ٤١٣ والتهذيب ج ٣ ص ١٠ الحديث ٣٢.

(٧٣) الوسائل ج ٥ ص ٧٠ وفي هامشه عن الامالي ص ٢٢١.

(٧٤) الوسائل ج ٨٩ ص ١٨٣ وفي هامشه عن الامالي ص ٢٢١.

(٧٥) البحار ج ٨٩ ص ١٧٦ عن علل الشرائع وفي هامشه عن العلل ج ٢ ص ٤٦.

(٧٦) البخاري ج ٢ ص ٨ ورواه البيهقي في سننه باسنادين عن عباية عن ابوعبس ج ٣ ص ٢٢٩.

(٧٧) البخاري ج ٢ ص ٩ سنن البيهقي ج ٣ ص ٢٢٨ ونقله عن البخاري ومسلم وروى الحميدي بسنده عن ابي هريرة نحوه ج ٢ ص ٤١٨ حديث ٩٣٥.

(٧٨ - ٧٩) مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٧١ وروى في فضل خطوات الجمعة ص ١٧٢ و١٧٨، المنتقى ج ٢ ص ١٢ عن السكينة في المشي وعن فضل الخطوات، المستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٨٢ بأسانيد متعددة، والترمذي ج ٢ ص ٣٦٨، والنسائي وشرح السيوطي ج ٣ ص ٩٦ و٩٧ والبيهقي في سننه ج ٣ ص ٢٢٩ و٢٢٧ بسند آخر، وكنز العمال نقله عن عدة - راجع ج ٧ ص ٥٣٤ الحديث ٣٥٥٤ و ص ٥٤١ الحديث ٣٦١١ و ٣٦١٢ و ص ٥٤٢ الحديث ٣٦١٣ و ٣٦١٨ وعن السكينة في المشي ج ٧ ص ٥٤٠ الحديث ٣٦٠٨.

(٨٠) سنن البيهقي ج ٣ ص ٢٢٩.

(٨١) وسائل الشيعة ج ٥ ص ١٠ والاستبصار ج ١ ص ٤١٩ لكن بنقصان (نعم) بل فيه في الجواب (يصلون... الخ).

(٨٢) المصدر السابق ج ٥ ص ١٠، والاستبصار ج ١ ص ٤٢٠.

(٨٣) البخاري ج ٢ ص ٥، ورواه ابوداوود باسناده عن وكيع عن ابراهيم مثله ج ١ ص ٢٨٠ والمنتقى ج ٢ ص ١٠ ح ١٥٥٦ نقله عن البخاري وابن داوود.

(٨٤) عمدة القارى ج ٦ ص ١٨٧.

(٨٥) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٧٦.

(٨٦) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٧٩ ورواه الدارقطني ج ٢ ص ٧ أخرجه بثلاثة اسانيد باختلاف يسير وكنز العمال ج ٧ ص ٥١٢ الحديث ٣٤١٥ و ص ٥١٤ الحديث ٣٤٣٢ باختلاف يسيرة ونقله عن عدة كتب منها الديلمي والبيهقي.

(٨٧) الوسائل ج ٥ ص ٢، من لايحضره الفقيه ج ١ ص ٢٦٦، وفي هامشه عن التهذيب ج ١ ص ٢٥١ وفي الكافي جزء ٣ ص ٢١٩، وهو في الكافي ج ٣

ص ٤٢٠ الطبعة الجديدة، والتهذيب الطبعة الجديدة ج ٣ ص ٢١، ومستدرك الوسائل ج ١ ص ٤٠٧.

(٨٨) الوسائل ج ٥ ص ٢ وفي هامشه عن الكافي الجزء ١ ص ١١٦ وفي الطبعة الجديدة في ج ٣ ص ٢١٩.

(٨٩) الوسائل ج ٣ ص ٢ وفي هامشه عن التهذيب ج ١ ص ٢٥١.

(٩٠) الوسائل ج ٥ ص ٢ وفي هامشه عن الامالي ص ٢٢٤.

(٩١) البحار ج ٨٩ ص ١٥٣ وفي هامشه عن المجالس ص ٢٣٤.

(٩٢) البحار ج ٨٩ ص ١٥٣ وفي هامشه عن الخصال ج ٢ ص ٤٦.

(٩٣) البحار ج ٨٩ ص ١٥٣ وفي هامشه عن أمالي الطوسي ج ٢ ص ٤٧.

(٩٤) البحار ج ٨٩ ص ٢٠٨.

(٩٥) البحار ج ٨٩ ص ٢٦٠.

(٩٦) الوسائل ج ٥ ص ٥ وفي هامشه نقله عن المعتبر ص ٢٠٠ والتهذيب ج ١ ص ٢٥٠ ويوجد في الكافي ج ٣ ص ٤١٨ والتهذيب الطبعة الجديدة ج ٣ ص ١٩ ونقل نحوه البحار عن دعائم الاسلام ج ٨٩ ص ٢٥٥.

(٩٧) البحار ج ٨٩ ص ١٦٢ وفي هامشه عن المعتبر ص ٢٠٠.

(٩٨) مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤٠٧ ـ ٤١١ ذكر الخطبة كاملة.

(٩٩) هكذا في الوسائل ج ٥ ص ٥ والضمير في (عنه) قد يظهر أنه لمحمد بن يعقوب ولكن لم اجده في بابه. ورواه الاستبصار ج ١ ص ٤١٩ عن الحسين بن سعيد عن صفوان مما يكشف عن أن الضمير في (عنه) في الوسائل يرجع الى الحسين بن سعيد فقط.

(١٠٠) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٧٣ وراجع في المعذورين ج ٣ ص ١٨٣ و ١٨٤.

(١٠١ ـ ١٠٢) مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٧٠.

(١٠٣) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٧٢ ونحوه سنن الدار قطني ج ٢ ص ٣ وروى البغوي في مصابيح السنة رواية نحوها ج ١ ص ٦٨ ونحوه المستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٢٨ وتلخيص الذهبي في نفس المصدر السابق.

(١٠٤) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٨٣. ورواه ابوداوود ج ١ ص ٢٨٠.

(١٠٥) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٨٣ وروى الدار قطني باسناده عن جابر مثله بزيادة استثناء المرأة ج ٢ ص ٣.

(١٠٦) البيهقي ج ٣ ص ١٨٤ وروى مثله عن ابي هريرة مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٧٠.

(١٠٧) مصنف عبد الرزاق ج ٣ ص ١٧٣ الحديث ٥٢٠٠.

(١٠٨) كنز العمال ج ٧ ص ٥١٢ و ٥١٣ و ٥١٤ و ٥١٥.

تیسری قسط

شہید ڈاکٹر بہشتی

مالکیت ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے

اقسام مالکیت

۱۔ **فردی مالکیت :** اس قسم کی مالکیت میں انسان خود محنت کرتا ہے اور خود ہی اپنی محنت کا مالک ہوتا ہے۔

۲۔ **اجتماعی مالکیت :** اجتماعی مالکیت دو قسم کی ہوتی ہے :

الف ۔ عمومی مالکیت : جو چیزیں تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہیں، ان کی مالکیت عمومی ہوتی ہے جیسے زمین، پانی وغیرہ کہ یہ چیزیں تمام انسانوں کی ملکیت ہیں یا " اراضیِ خراجیہ" جیسی چیزیں جو تمام مسلمانوں کی ملکیت ہیں، حتی وہ مسلمین جو بعد میں اس دنیا میں قدم رکھیں گے یا مستقبل میں اسلام قبول کریں گے، چاہے ان کے ماں باپ مسلمان نہ بھی ہوں، وہ بھی اس ملکیت میں حصہ دار ہوں گے۔

ب ۔ گروہی مالکیت : اس قسم کی مالکیت کی مثال یہ ہے کہ کچھ لوگ مل جل کر کوئی کام انجام دیتے ہیں یا کوئی چیز خریدتے ہیں اور گروہ کی شکل میں اس کے مالک ہوتے ہیں۔

آج دنیا کے تمام نظاموں نے فردی مالکیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اسلام میں فردی و اجتماعی (عمومی اور گروہی) مالکیت دونوں کو جائز مقام حاصل ہے۔ آج دنیا کی اقتصادی اصطلاحات کے مطابق مالکیت چار قسموں پر تقسیم ہوتی ہے :

۱۔ شخصی و ذاتی مالکیت

۲۔ خصوصی مالکیت

۳۔ عمومی مالکیت

۴۔ حکومتی مالکیت

آج کی اقتصادی اصطلاح میں پیداواری آلات کے علاوہ فرد کی مالکیت کو ذاتی و شخصی مالکیت کہا جاتا ہے۔ پیداواری آلات پر کسی فرد (یا گروہ) کی مالکیت کو خصوصی مالکیت کہتے ہیں، زمین، پہاڑ، معدنیات، پانی وغیرہ پر عوام کی مالکیت عمومی مالکیت ہے اور اراضی خراجیہ جیسی چیزیں جو عوام کی ملکیت ہیں لیکن ان میں تصرف کا حق صرف حکومت کو ہے، انھیں حکومتی مالکیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[۳]۔

آثار مالکیت

حق استعمال و استفادہ: انسان جب کسی چیز کا مالک ہو جاتا ہے تو اسے اس میں دخل و تصرف کا بھی حق ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اس حق کی کوئی حد بھی معین ہے یا نہیں؟ مثلاً انسان ایک درخت لگاتا ہے اور اس سے پھل حاصل کرتا ہے۔ کیا اس درخت اور پھل کے مالک کو مالک ہونے کی بنا پر یہ حق حاصل ہے کہ جس قدر جی چاہے اس پھل کو استعمال کرے؟ اس کی کوئی حد بھی ہے اور اگر ہے تو کیا ہے؟ آیا یہ حد ضرورت طبعی ہے[۴] یا حدِ متوسط یا حداقل امکان اجتماعی ہے؟ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مالکیت کے لحاظ سے اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن اخلاقی نقطہ نظر سے ایک حد معین ہے، یعنی مالک باعتبار مالکیت جتنا جی چاہے صرف کرے، کسی قسم کی پابندی نہیں، لیکن اس کا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس حدِ متوسط سے تجاوز نہ کرے جو تمام لوگوں کے لیے ممکن ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مالک باعتبار مالکیت محدود و پابند ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ اس حدِ متوسط سے زیادہ صرف کرے جو تمام افراد کو حاصل ہے تو اس نے غاصبانہ عمل انجام دیا ہے، لیکن اگر اسے صرف اخلاقی فریضہ مانا جائے تو وہ صرف اخلاقی مجرم تصور کیا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر انسان خود اپنے لگائے ہوئے درخت کے پھلوں کو خوب دل بھر کے استعمال کرے جبکہ معاشرے میں عام طور سے لوگوں کو یہ سیری حاصل نہیں ہے تو وہ کس قسم کا مجرم سمجھا جائے گا؟ اس کا یہ جرم قانونی و اقتصادی نوعیت کا ہے یا مالکیت سے تجاوز ہے یا اقتصادی مسائل میں اخلاقی جرم ہے؟

ایک دوسری مثال پر غور کیجیے: آپ لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں، اگر اسی وقت کوئی برہنہ انسان

آپ کے پاس آجائے تو اپنے لباس سے اس کی ستر پوشی آپ کا فریضہ ہے۔ اگر آپ اس فریضہ کو انجام نہ دیں تو آپ قانونی و حقوقی مجرم سمجھے جائیں گے یا سماجی؟ یہاں ایک بہت ہی لطیف نکتہ مضمر ہے جس پر توجہ ضروری ہے موجودہ فقہ، حقوقی و قانونی جرم اور اخلاقی و دینی جرم میں فرق کی قائل ہے۔ اس سلسلے میں دو اسالیب فکر پائے جاتے ہیں۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ آمدنی اصلاً اس کی ملکیت ہی نہیں، اگر اس کے پہلو میں کوئی محتاج و نیازمند شخص موجود ہے تو وہ حاجت مند خود بخود اس کی مالکیت میں شریک ہو جائے گا یعنی اگر وہ (پہلا مالک) خود اس میں تصرف کرنا چاہے تو اس کا یہ عمل دوسرے کے مال میں غاصبانہ تصرف سمجھا جائے گا۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اقتصادی نظر سے یہ مال خود اسی کی ملکیت ہے لیکن دوسرے کو شریک نہ کر کے جو ایک سماجی فرض تھا۔ وہ عمل حرام کا مرتکب ہوا ہے جس کے بدلے میں وہ دنیا و آخرت میں سزا و عقاب کا مستحق ہے۔

اسلام میں مسئلۂ انفاق کو بھی دو طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ شیعہ و سنی فقہا کا عام طور سے یہ نظریہ ہے کہ اگر انسان جائز طریقوں سے کسی چیز کا مالک ہو جائے تو وہ چیز اس کی ملکیت میں باقی رہے گی، مگر انفاق اس پر واجب ہے۔

الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ (۶)

ایسی صورت میں وہ مال خود اس کی اپنی ملکیت ہے، راہ خدا میں انفاق کا واجب ہونا سلب مالکیت کا باعث نہیں ہے، انفاق ایک فریضہ ضرور ہے لیکن مالکیت اپنی جگہ محفوظ ہے۔ اس انفاقِ واجب کے ترک کر دینے سے رابطۂ مالکیت نہیں ٹوٹے گا، بلکہ وہ دینی فریضہ کو ترک کر کے صرف ایک گناہ کا مرتکب ہوگا۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اصولی طور پر جب کبھی کسی شخص پر انفاق واجب ہوتا ہے تو رابطۂ مالکیت بھی متنزلزل ہو جاتا ہے، اس نظریہ کی رو سے اگر ہم کسی چیز کو پیدا کریں اور معاشرے میں انفاقِ واجب کا موقع پیش نہ آئے تو ہم اس کے پورے حصے کے مالک ہوں گے، لیکن اگر انفاقِ واجب کا موقع پیش آجائے تو پوری پیداوار کے مالک نہ ہوں گے بلکہ انفاق واجب سے جو کچھ بچ رہے گا صرف اتنے ہی کے مالک ہوں گے

خمس و زکوٰۃ کے سلسلے میں بھی یہی دو نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ خمس و زکوٰۃ کی واجب مقدار اس شخص کی ملکیت نہیں ہے بلکہ وہ مصارفِ خمس کی ملکیت ہے، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ہر صورت

میں مالک وہی شخص ہے اور اگر خمس و زکوٰۃ ادا نہ کرے تو وہ صرف حکم تکلیفی کا مخالف سمجھا جائے گا۔

خمس و زکوٰۃ جیسے ٹیکسوں کے بارے میں جن کی مقدار شریعت نے معین کر دی ہے، ہمارے فقہا کے نظریات میں اختلاف ہے، بہت سے فقہا کی رائے ہے کہ انسان اس حصے کا مالک ہی نہیں ہوتا جو خمس و زکوٰۃ میں دیا جانا چاہیے وہ حصہ مصارف خمس و زکوٰۃ کی خاص ملکیت ہے۔ اس صورت میں انسان ابتدا ہی سے اپنی پیداوار کے صرف ۴/۵ کا مالک ہے اور اس کی ۱/۵ پیداوار جو اس کی سالانہ ضرورت سے زیادہ ہے اس کی ملکیت نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ فقہا کہتے ہیں کہ اگر وہ اس پورے سرمایے سے دوبارہ اقتصادی کام انجام دے اور اس سے منافع کمائے تو ۱/۵ کا منافع بھی مصارف خمس کی ملکیت ہوگا۔[۹]

بطور کلی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اقتصادی مسائل میں حکم وضعی و قانونی حکم اخلاقی و تکلیفی سے جدا ہو۔ جب کچھ لوگوں سے بہت سی چیزوں کے وجوب کے متعلق کہا جاتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ وجوب تکلیفی ہے نہ کہ حکم حقوقی۔[۱۰]

اسراف و اتلاف[۱۱]

مالکیت انسان کو حق تصرف دیتی ہے لیکن کیا یہ حق اسراف و اتلاف و بربادی کی بھی اجازت دیتا ہے؟ مثلاً اگر کوئی شخص درخت لگائے اور وہ درخت پھل دینے لگے تو یہ شخص اس کے پھل کا مالک ہوگا لیکن اگر وہ شخص پھلوں کو یوں ہی پڑا رہنے دے تاکہ سڑ گل کر تباہ و برباد ہو جائیں تو کیا مالک ہونے کی بنا پر قانونی نقطۂ نظر سے وہ اس عمل کا مجاز ہے؟ اگر پھلوں کی مالکیت اسے اس عمل کی اجازت نہیں دیتی اور دوسروں کو معلوم ہے کہ یہ شخص پھلوں کو برباد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو کیا دوسرے افراد ان پھلوں کو تصرف میں لا سکتے ہیں؟ اس مسئلہ میں بھی دو نظریے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ جس شخص نے درخت لگایا، پھل بھی اسی کی ملکیت ہے، چونکہ وہ مالک ہے، لہٰذا اسے سڑا گلا کر تباہ و برباد کر دینے کا بھی اختیار رکھتا ہے، البتہ ایسی صورت میں وہ بدترین قسم کے اسراف و بربادی کا مرتکب ہوا ہے، باوجودیکہ اس نے گناہ کیا ہے لیکن کوئی شخص اس کی اجازت، ہبہ یا تبادلے کے بغیر ان پھلوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، کیونکہ رابطۂ مالکیت اپنی جگہ برقرار ہے۔

۲۔ مالکیت اس قسم کا حق نہیں دیتی لہٰذا اگر دوسروں کو یہ علم ہے کہ مالک ان پھلوں کو یوں

ہی پھینک دینا چاہتا ہے تو وہ اسے استعمال کر سکتے ہیں ۔

اب تک جو کچھ مالکیت کے منشا اور فطری قانون (و منطق) کے بارے میں کہا گیا ہے اس سے یہ واضح ہے کہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا حق ہے ۔ لیکن اس حق میں اتلاف کا حق شامل نہیں ۔ کیونکہ بہرحال فطرت کی مجموعی منطق کے لحاظ سے اتلاف کی سماجی و اخلاقی ممانعت واضح ہے ۔ اگر مالک اپنے مال کو تباہ کرنا چاہے تو یہ ایک قسم کا "اعراض"[12] سمجھا جائے گا ۔ یعنی وہ مال اس شخص کی ملکیت سے خارج ہو جائیگا اور رابطۂ مالکیت ٹوٹ جائے گا ۔ ایسا کرنے والا شخص گناہگار ہے کیونکہ خداوند عالم نے اسے حق مالکیت ضرور دیا تھا مگر اس میں اتلاف کی گنجائش نہ تھی ۔ اس نے خداوند عالم کی ملکیت میں ناجائز تصرف کیا ہے ۔ مثلاً اگر کوئی شخص گلاس کو توڑنے کے ارادے سے پھینکنا چاہے مگر دوسرا شخص گرنے سے پہلے ہی اس گلاس کو پکڑ لے تو ایسی صورت میں گلاس کا مالک کون ہوگا ؟ یہ ایک قانونی بحث ہے جس کی گفتگو فقہ میں بھی موجود ہے ۔ گلاس کو توڑنے کے قصد سے پھینکتے ہی مالک اور گلاس کے مابین رابطۂ مالکیت منقطع ہو جائے گا ۔ یہی "اعراض" ہے ۔ اگر اسے اپنے مال کو تباہ و برباد کرنے کا حق ہوتا تو یہ رابطہ منقطع نہ ہوتا ، اس عمل کے باعث رابطۂ مالکیت منقطع ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے مال کے تلف کرنے کا حق نہیں ہے ۔

انسان جب اپنے مال کو تلف کرنے کے لیے اقدام کرتا ہے ، فوراً ہی دو مسئلے وجود میں آتے ہیں ایک گناہ تکلیفی ، دوسرا اثر قانونی یعنی قطع مالکیت ، اگر کوئی دوسرا شخص اس چیز کو تلف ہونے سے بچا لے تو وہی اس کا مالک قرار پائے گا ۔

یہ بہت اہم بحث ہے ، کچھ عرصہ قبل ایک ایسے ملک میں یہ صورت حال پیش آ چکی ہے جس کا پیداواری نظام بہت مستحکم ہے ، ان لوگوں نے منڈی میں بعض اشیائے صرف کی رسد (سپلائی) کم کرنے کی غرض سے اس کی ایک بھاری مقدار تلف کر دی ۔ بعض اوقات اس مسئلہ کو پیداوار و مصرف ، پیداوار و تبادلہ ، پیداوار و رسد کے اقتصادی نظام کی تنظیم کے وسیلے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ۔[13]

سرمایہ

آثار مالکیت سے متعلق دوسرا مسئلہ ملکی مال کو بصورت سرمایہ استعمال کرنا ہے یعنی مذکورۂ بالا ذرائع سے حاصل کی ہوئی چیز کو بطور سرمایہ استعمال کرنا ۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے ۔

تعریفِ سرمایہ:

سرمایہ اس حاصل شدہ قدرِ مصرف سے عبارت ہے جو دوسری قدرِ مصرف کے حصول میں مدد کر سکتی ہے، مثلاً کسان اپنے کھیت میں کپاس کی زراعت سے ۵۰۰ کلو روئی حاصل کرتا ہے۔ موسم سرما میں یہ کسان اپنے ہاتھوں سے پچاس کلو کپاس کا دھاگہ بنا کر زیادہ قیمت میں فروخت کر سکتا ہے۔ اختتامِ سال میں وہ ۴۵۰ کلو کپاس اور پچاس کلو دھاگے کا مالک ہے، وہ سوچتا ہے کہ اگر موسم سرما میں کسی طرح پورے پانچ سو کلو کپاس کا دھاگہ بنا سکتا تو اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا۔ اسی مقصد کے تحت اس کی قوتِ ایجاد کام کرتی ہے اور وہ کتائی کا چرخہ ایجاد کرتا ہے، دوسرے سال یہی کسان دوبارہ کپاس کی پیداوار سے ۵۰۰ کلو روئی حاصل کرتا ہے لیکن اس سال چرخے کی مدد سے پوری کپاس کا دھاگہ بنا لیتا ہے۔

کونسی نئی بات رونما ہوئی ہے؟ چرخہ پیداوار میں اضافے کا باعث ہوا ہے۔ کسان ایک نئے وسیلے کا مالک ہو گیا ہے جس نے اس کی محنت کے پھل میں اضافہ کر دیا۔ چرخہ کسان کو سہارا دیتا ہے تاکہ وہ پیداوار کو بڑھا کر زیادہ سے زیادہ مصرفی اقدار حاصل کر سکے۔ اس وقت تمام چیزوں کا وہ خود مالک ہے، حتیٰ کہ چرخہ بھی خود اسی نے ایجاد کیا ہے۔ وہ خزانۂ قدرت سے ملنے والی لکڑی اور دیگر وسائل نیز اپنی "قوتِ ایجاد" طاقت و بازو اور محنت کو کام میں لا کر مصرفی اقدار کی افزائش میں کامیاب ہوا ہے۔ کیا دھاگہ، کپاس اور چرخے پر اس کسان کی مالکیت کے سلسلے میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش ہے؟ یہاں تک اس شخص نے حکمِ فطری و حکمِ قانونی کے خلاف کوئی عمل انجام نہیں دیا ہے۔

اس مثال میں ۵۰۰ کلو کپاس اور چرخہ دونوں ہی پانچ سو کلو دھاگے اور کسان کی محنت کے وسیلے ہیں۔ ان دونوں چیزوں نے کسان کی محنت کو سہارا دیا ہے۔ لیکن چرخے کے کام کی حیثیت مختلف ہے۔ اس نئی اور زائد قدرِ مصرف کی ایجاد میں چرخے کا کردار بہت اہم اور مؤثر ہے لیکن اس اضافے میں کپاس قطعی مؤثر نہیں۔ مزید وضاحت کے لیے نیچے دیے ہوئے جدول پر غور کیجیے۔ اس مثال میں کپاس کی قیمت فی کلو ایک روپیہ اور دھاگے کی قیمت فی کلو دو روپیہ رکھی گئی ہے۔

کپاس	کام کا وقت	وسیلہ	نتیجہ	قیمت (روپیہ)
۵۰۰ کلو	۳۰۰ گھنٹے	ہاتھ	۵۰ کلو دھاگہ + ۴۵۰ کلو روئی	۵۵۰
۵۰۰ کلو	۲۰۰ گھنٹے	چرخہ	۵۰۰ کلو دھاگہ	۱۰۰۰

مقدار اضافہ ۴۵۰ روپیہ ہے (۴۵۰ = ۵۵۰ - ۱۰۰۰) یہ اضافہ چرخہ کا رہین منت ہے کیونکہ وہی پیدوار کی قیمت میں اضافہ کا باعث ہے۔ ۵۰۰ کلو کپاس تو دونوں ہی صورتوں میں موجود تھی

اقسامِ سرمایہ

تین طریقوں سے سرمایہ کاری کی جا سکتی ہے:

۱۔ پیداواری آلات کی صورت میں۔

۲۔ مستغلات کی صورت میں (غیر منقولہ املاک کی صورت میں)

۳۔ تجارتی سرمائے کی صورت میں۔

۱۔ **پیداواری آلات**: اس قسم کی سرمایہ کاری میں دو طریقہ ہائے کار فرض کیے جا سکتے ہیں، اول یہ کہ آلات کا مالک، پیداواری کام بھی خود ہی انجام دے (گذشتہ مثال)۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس شخص کی مالکیت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ پیداواری آلات کی شکل میں سرمایہ کاری کی دوسری صورت یہ ہے کہ آلات کا مالک پیداواری عمل خود انجام نہ دے بلکہ یہ عمل دوسروں کے توسط سے انجام پائے، یہ عمل بھی دو طرح سے انجام پا سکتا ہے۔

الف۔ **اجارہ**: یعنی پیداواری آلات کا مالک کسی شخص کو کرایہ پر یہ آلات فراہم کرتا ہے کہ وہ شخص ان آلات کی مدد سے کام کرے اور مالک اس شخص سے صرف ان آلات کا کرایہ وصول کرے

ب۔ دوسری شکل یہ ہے کہ مالک کسی شخص کو مزدور رکھ کر دھاگہ کتوائے اور اسے مزدوری دے کر دھاگے پر خود قبضہ کرے۔

محنت اور سرمائے کا حصہ

یہی وہ مقام ہے جہاں سوشلسٹوں اور سرمایہ داروں کی منطق ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہے، ہر ایک زائد پیداوار کو دوسرے حصہ دار کا حق قرار دیتا ہے۔

سرمایہ داروں کا کہنا ہے:

پیداواری مشین (مثلاً چرخے) سے کام کرنے والا مزدور اگر صرف اپنے

ہاتھوں سے کاتتا تو وہ آٹھ گھنٹے کی محنت کے بعد صرف ایک کلو
دھاگہ حاصل کرسکتا، لیکن جب اس نے مشین کا سہارا لیا تو اس کی پیداوار
میں مزید آٹھ کلو کا اضافہ ہوگیا۔ لہذا یہ آٹھ کلو زائد پیداوار، اس مشین
کا ثمرہ ہے۔

بظاہر یہ بات منطقی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ حساب صحیح نہیں ہے، اس منطق کی بے معنویت واضح کرنے کے لئے ایک دوسری مثال یوں بھی پیش کی جاسکتی ہے:

یہ چرخہ کل تک جب کہ مزدور نے اسے ہاتھ نہ لگایا تھا بیکار پڑا تھا اور اس کی پیداوار صفر تھی، لیکن آج چرخے اور مزدور کی محنت کا ثمرہ ۹ کلو دھاگہ ہے لہذا مزدور اس پورے نو کلو دھاگے کا مالک ہوگا۔

سوشلسٹوں کا ایک استدلال یہیں آکر ختم ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں:

پیداوار کا حقیقی سرچشمہ زندہ کام ہے اور ساری پیداوار اسی سے
تعلق رکھتی ہے، مردہ کام کسی بچے کو پیدا نہیں کرسکتا جس طرح مری
ہوئی مرغی انڈے نہیں دے سکتی۔ (۱۴)

یہاں یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ ہم ان فارمولوں کے اسیر نہیں، جب ہم غور و فکر سے کام لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ دونوں ہی فارمولے غلط ہیں - ان میں سے ہر ایک دوسرے کے غلط و نادرست ہونے کی دلیل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس نو کلو دھاگے میں پیداواری آلات کا بھی حصہ ہے اور مزدور کی محنت کا بھی شرعی طور پر جائز اولاد کو نہ تو فقط باپ سے منسوب کیا جاسکتا ہے اور نہ صرف ماں سے۔ اسی طرح صحیح بات یہ ہے کہ یہ دھاگہ مزدور کے زندہ کام اور چرخے کے مالک کے مردہ کام کے باہمی میل کا ثمرہ ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ ان دونوں کے حصے کو معین کرنے کے لئے وہ کونسا فارمولا ہے جو منصفانہ نظام کی بنیادوں پر استوار ہو اور خود وہ نظام بھی اسلامی بنیادوں پر قائم ہو۔ جمہوری اسلامی ایران کے اساسی دستور (۱۵) کی دفعہ (آرٹیکل) ۴۳ کی دوسری شق اسی منصفانہ فارمولے کو پیش کرتی ہے جب

معاشرے میں پیداداری آلات کی فراوانی ہو ہر شخص کو اس کی مرضی کے مطابق یہ آلات مفت فراہم کئے جائیں تاکہ استحصال کی گنجائش باقی نہ رہے، لیکن اس منزل تک پہنچنے سے پہلے کیا کیا جائے؟

باب اقتصاد میں اساسی دستور کی دفعہ ۴۹ اسی مقصد کے تحت درج کی گئی ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے:

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ سود، غصب، رشوت، دھوکے بازی، خیانت، چوری، جوے، موقوفہ املاک کے غلط استعمال، سرکاری ٹھیکوں اور سرکاری کاروبار سے ناجائز استفادہ، نفع بخش (مباحات اصلی) اور بنجر زمینوں کی فروخت، ناجائز کاروبار کے مراکز و مکانات اور تمام ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کو ضبط کرکے اسے اس کے اصل مالکوں تک پہنچائے اور اگر اصل مالکوں کا علم نہ ہو تو اسے بیت المال میں داخل کرے۔ لازم ہے کہ اس حکم کا نفاذ باقاعدہ تفتیش، تحقیق، توثیق اور شرعی ثبوت کے بعد ہونا چاہیے۔

حکومت اس قسم کے اموال کو ضبط کرکے انھیں پیداداری کوآپریٹو (تعاونی یا ادارۂ امداد باہمی) کی شکل میں ان بیکار افراد کے سپرد کرے گی جو محنت کے لئے تیار ہیں مگر سرمایہ سے محروم ہیں۔ اسلام میں راستہ کھلا ہوا ہے۔ اگر منصوبہ سازی درست ہو اور اسے صحیح طریقہ سے نافذ کیا جائے تو اسی دفعہ ۴۳ و ۴۹ کے ذریعہ دس سال کے اندر ایران میں پیدادار بڑھ جائے گی اور مزدوروں کے استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا۔

۲۔ **املاک و جائداد (مستغلات)**: یہ سرمایہ جمع شدہ کام کی شکل میں قابل استفادہ ہے، مثلاً کوئی شخص اپنی سکونت کے لئے گھر یا کمرہ بناتا ہے لیکن ایک دو دن کے لئے اسے مسافروں کو یا خاص مدت کے لئے یہ گھر افراد کو کرایہ پر دیتا ہے اور ان سے کرایہ وصول کرتا ہے۔ اس صورت میں سرمایہ قابل استفادہ خارجی چیز کی شکل میں ہے اور خود یہ چیز قابلِ استفادہ ہے۔ اس گھر میں مشغول سرمایہ کی مقدار اس کام سے عبارت ہے جو عمارت کے علاوہ مزدوروں، کاریگروں اور دوسرے افراد نے انجام دیا ہے۔

۳۔ **تجارتی سرمایہ**: یہ سرمایہ نہ پیداوار میں اضافہ کرتا ہے اور نہ خود قابلِ صرف ہے۔ یہ سرمایہ خود کچھ نہیں کرسکتا، مثلاً ایک تاجر دس لاکھ روپیہ مالیت کا سوٹن چاول گودام میں ذخیرہ کرتا ہے اور اسی دس لاکھ روپئے کے بل بوتے پر بیس ہزار روپئے منافع کمانا چاہتا ہے۔

حاشیے

(۱) حتی چین اور روس جیسے کیمونسٹ ملکوں نے بھی اجمالی طور پر انفرادی مالکیت کو مان لیا ہے، ۱۹۷۷ میں پاس ہونے والے روس کے چوتھے اساسی آئین کی تیرھویں دفعہ میں ہے :

سوویت یونین کے شہریوں کی انفرادی مالکیت کی اساس ان کی اپنی محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی ہے، حسب ذیل اشیا انفرادی مالکیت قرار پاسکتی ہیں :

روزمرہ استعمال کی اشیا ، رفاہ اور ذاتی استعمال کی ضروری چیزیں اور ان سے متعلق ثانوی اشیا رہنے کے لئے ایک مکان ، محنت سے حاصل ہونے والی بچت ۔ ان چیزوں میں شہریوں کی انفرادی مالکیت اور حق وراثت کو حکومت تسلیم کرتی ہے ۔

قانونی ذرائع سے جو زمین فرعی استفادہ یعنی ماہی گیری ، باغبانی ، سبزی ترکاری اگانے اور ذاتی مکان بنانے کے لئے جو زمین دی جاتی ہے روسی باشندوں کو اس سے استفادہ کا اختیار حاصل ہے، باشندوں پر لازم ہے کہ حکومت سے ملنے والی زمینوں سے معقول فائدہ اٹھائیں، حکومت اور شہریوں کو فرعی استفادے میں مدد پہنچائیں گے ۔

جائیداد

شہریوں کی جو ذاتی ملکیت ہے یا حکومت کی طرف سے انھیں دی گئی ہے اسے ان منافعوں کے حصول کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے جو خود اس شخص کی محنت کا نتیجہ نہ ہوں، یا جس سے معاشرے کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہو ۔

(۲) ـ اقسام مالکیت کے متعلق مزید معلومات کے لئے کتاب "مواضع ما" باب سیاست اقتصادی ص۶۲ کا مطالعہ کیجیے ۔

(۳) ـ ہمیں اس وقت اسلامی احکام و مصادر سے بحث نہیں ہے بلکہ یہ گفتگو انسان کی جبلت اور طبعی و فطری منطق کے نقطۂ نظر سے ہے ۔

(۴) ـ طبعی ضرورت سے مراد یہ ہے کہ درخت کے مالک کو اپنی ضرورت کے مطابق مصرف کا حق حاصل ہے ، اور یہ ایک قطعی حد ہے ، کیونکہ انسان اپنی فطری ضرورت سے زائد صرف نہیں کرسکتا ۔

۵۔ — متوسط امکان اجتماعی یا اوسط سے مراد یہ ہے کہ، یہ دیکھا جائے کہ اگر اس درخت کے پھل کو معاشرے کے سارے افراد کے درمیان تقسیم کیا جائے تو جتنا پھل ایک شخص کے حصے میں آئے گا اتنا ہی یہ مالک صرف کر سکتا ہے۔

۶۔ — بقرہ۔ ۲۶۳

۷۔ — اسلامی اصطلاحات میں "حکم تکلیفی" و "حکم وضعی" کا رواج ہے، حکم وضعی سے مراد حقوقی یا قانونی رابطہ ہے اور حکم تکلیفی وہی چیز ہے جسے حکم اخلاقی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۸۔ — یہ بحث ان ٹیکسوں کے سلسلے میں ہے جو معین ہیں، لیکن غیر معینہ حقوق کے بارے میں اس قسم کا کوئی نظریہ موجود نہیں ہے۔ وہ غیر محدود انفاق جو وقت اور مقام کے لحاظ سے معین کئے جاتے ہیں، فقہا نے ان کے متعلق اس قسم کی رائے نہیں پیش کی ہے۔

۹۔ — یہ مسئلہ اختیار کی بحث سے تعلق رکھتا ہے، ہم جس اختیار کی بات کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان معصیت و نافرمانی کی حد تک بھی مختار ہے، انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو مرتکب گناہ بھی ہو سکتی ہے اور اگرچہ اس پر کسی عمل کی بجا آوری واجب ہے لیکن وہ اسے ترک بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ وجوب تکلیفی انسان کے فطری و تکوینی اختیارات کو سلب نہیں کرتا۔ لہذا انسان اپنے مال کا مالک ہے اور رابطۂ مالکیت بھی برقرار ہے۔ لیکن ایک واجب تکلیفی یا اخلاقی فرض کا بار بھی اس پر ہے جسے وہ چاہے تو ترک بھی کر سکتا ہے مگر یہ عمل انسان اور مال کے درمیان قانونی رابطۂ مالکیت کے منقطع ہو جانے کا باعث نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اس عمل (ترکِ واجب) کا مستوجب سزا ہونا بھی اس حقوقی رابطے کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ لہذا ممکن ہے کہ اس شخص کو خمس و زکوٰۃ نہ دینے کے جرم میں جیل بھی جانا پڑے لیکن وہ مال خود اس کا اپنا مال ہوگا۔

اقتصادیات میں یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ حکم حقوقی یا بہتر الفاظ میں حکم وضعی و حکم تکلیفی میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ یعنی جہاں کہیں وجوبِ انفاق کے لئے "تکلیفی حکم" آیا ہے کیا زوالِ مالکیت کا وضعی و حقوقی حکم بھی اس کے ہمراہ ہے یا مالکیت اپنی جگہ باقی رہے گی؟ اسی کو یوں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا حکم تکلیفی پر عامل فرد کا عمل اچھا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے والا عملِ بد کا مرتکب ہے؟

۱۰۔ — مکتب یا نظریۂ اقتصاد اور علم اقتصاد دونوں حقوقی تعلقات سے بحث کرتے ہیں۔ مکتب یا نظریہ

اقتصادیات ایسے عمومی اصولوں اور ان مسائل کو بیان کرتا ہے جو (اقدار یا معیارات) "ہونا چاہئے" کے ذیل میں آتے ہیں، علم اقتصادیات انہی اصولوں کی بنیاد پر سائنسی افعال و انفعالات کو بیان کرتا ہے اور جو کچھ (حقیقت یا واقعہ) "ہے" اس کا تجزیہ کرتا ہے یا جو "ہونا چاہیئے" کے سائنسی طور پر تحقق سے بحث کرتا ہے۔ مثلاً مکتب یا نظریہ کہتا ہے کہ سوسائٹی کے ہر فرد کو کم سے کم تر ضروریات سے بہرہ مند ہونا چاہئے یہ ایک نظریاتی اصول ہے جو ابھی تحقق نہیں ہوا ہے، علم ہمیں بتاتا ہے کہ کن منزلوں کو طے کر کے اور کون سی پالیسی اپنا کر اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی جو چیز ابھی وجود میں نہیں آئی ہے لیکن جو کچھ "ہونا چاہئے"، علم اسے جامۂ عمل پہنانے کے لئے علمی (سائنسی) منصوبے پیش کرتا ہے۔ مثلاً آپ اپنے بچے کو چلنا سکھانا چاہتے ہیں، اس کا تعلق مکتب (نظریہ) سے ہے، اس خواہش کی تکمیل علم کا کام ہے یعنی بچوں کو چلنا سکھانے کے سلسلے میں دوسروں کے تجربات سے کس طرح فائدہ اٹھائیں۔ بچے کو فعال و متحرک بنانے کے لئے کیا کرنا بہتر ہے؟ آیا اسے بار بار چلنے کے لئے کہا جائے یا اس کا طریقہ یہ ہے کہ چلنے کے محرکات اس کے سامنے پیش کریں تاکہ وہ خود چلنے کی کوشش کرے؟ یہ ایسے مسائل ہیں جنھیں حل کرنا علم کی ذمہ داری ہے۔

(۱۱)۔ اسراف سے مراد حد سے زیادہ صرف کرنا ہے اور اتلاف کے معنی کسی چیز کو ناقابل استعمال بنانا ہے۔

(۱۲)۔ "اعراض" سلب مالکیت کا ایک سبب ہے اور ایسی صورت میں دوسروں کو حق ہے کہ اس مال کو استعمال کریں۔

(۱۳)۔ امریکہ کے ایک دیہات میں ایک سال پھلوں کی فصل بہت عمدہ ہوئی۔ باغبانوں نے آپس میں یہ عہد کیا کہ آدھے پھل فروخت کریں اور آدھے درختوں پر ہی چھوڑ دیں تاکہ سڑ گل کر کھاد بن جائے وہ لوگ اس عہد کو اخلاقی طور پر بھی واجب الاحترام سمجھتے تھے۔ اگر کوئی شخص اس عہد کی خلاف ورزی کرتا تو کسانوں کی اخلاقی حس کی نظر میں وہ اخلاقی مجرم سمجھا جاتا تھا۔ یہ اصول باغبانوں کی تنظیم اور اس دیہات کی آمدنی دونوں کے لئے موثر ثابت ہوا۔ کبھی کبھی یہ مسائل اس حد تک بھی اہم ہو سکتے ہیں۔

(۱۴)۔ مردہ کام سے مراد وہ عمل ہے جو ماضی میں انجام پا کر آج پیداواری آلات، سامان تجارت یا املاک و جائداد کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ زندہ کام سے مراد وہ عمل ہے جو فی الحال انجام پا رہا ہے اور اس سے فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

(۱۵) — دفعہ ۴۳-ب: ان تمام افراد کے لیے ملازمت اور کام کرنے کے مواقع و امکانات کی ضمانت ہونی چاہیے تاکہ سب لوگوں کو کام مل سکے اور ان تمام اشخاص کو جو کام کرنے کے اہل ہیں۔ لیکن ان کے پاس کام کرنے کے وسائل نہیں ہیں، وسائلِ کار فراہم کیے جانے چاہئیں اس سلسلے میں تعاون و امداد باہمی کے طریقہ کار کو استعمال کیا جائے۔ غیر سودی قرضے کی فراہمی اور دیگر جائز وسائل کو یوں کام میں لایا جائے کہ ان سے نہ تو چند افراد یا گروہوں کے پاس دولت جمع ہو سکے اور نہ حکومت ایک بڑے آجر مطلق کی صورت اختیار کر سکے۔ یہ اقدام ان ضرورتوں اور شرائط کے ماتحت ہونا چاہیے جو ملک کی عام اقتصادی صورت حال کے پیش نظر ترقی کے ہر مرحلے کا تعین کرتی ہیں۔

توحید و ارتقا

شہید مرتضیٰ مطہری
مترجم :- جناب خادم حسین ام اے علیگ

"اصالت روح" اور "قرآن وحیات" پر گذشتہ دو مقالوں میں بحث ہو چکی ہے اب ہم انہیں دو مقالوں کے ضمن میں "توحید وارتقا" کے بارے میں بحث کریں گے چونکہ یہ مقالہ ان دونوں کی تکمیل کرتا ہے۔ اس مقالے کی غرض وغایت کو سمجھنے کے لیے قارئین محترم کو پچھلے دو مقالوں کے مطالب زیر نظر رکھنا ضروری ہیں۔ اس لیے مختصر طور پر ان دونوں کا خلاصہ بطور یاددہانی پیش خدمت ہے۔

ہم اپنے مقالے "اصالت روح" کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ حیات اس حقیقت کا نام ہے جو خاص اور متعین شرائط کے تحت مادّے کے ساتھ تعلق پیدا کرتی ہے، لیکن یہ تعلق اس معنی میں نہیں کہ مادہ اور حیات کے درمیان دوئی (ثنویت) ہے اور یہ دونوں مختلف حقیقتیں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق پیدا کرتی ہیں بلکہ اس معنی میں کہ حیات و مادہ ایک ہی ہستی کے دو مدارج ہیں اور ہر درجے کی اپنی ایک خصوصیت ہے۔ مادہ خاص شرائط و حالات کے تحت اپنے ارتقا کے دوران حیات میں بدل جاتا ہے، جس طرح کوئی ناقص شے اپنے سے کامل تر میں بدلتی ہے۔ اسی طرح بے جان مادّے کا ناقص وجود، جاندار کامل وجود میں بدل جاتا ہے، حیات بے جان مادّے کی معلول، اثر اور نتیجہ نہیں بلکہ وہ کمال و فعلیت ہے جس کا مادّے میں اضافہ ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر مادے میں حیات کے آثار نہ صرف یہ کہ نہیں ہوتے بلکہ وہ انہیں بروز و ظہور عطا کرنے سے بھی عاری ہوتا ہے۔ مادّے میں حیات و زندگی کی نسبت سے یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اسے قبول کر سکتا ہے۔ قبولیت کی یہ صلاحیت بھی خاص اور معین حالات و شرائط میں ظاہر ہوتی ہے۔ مادے میں صلاحیت پیدا ہو

تخلیق نہیں ہوتی ۔ دوسرے الفاظ میں : مادہ ، زندگی کی تخلیق نہیں کرسکتا ۔ اس وقت ذی حیات اشیا کے جس نظام کو ہم محسوس کرتے اور دیکھتے ہیں ۔ وہ مادّے سے وابستہ نظامِ جذب و قبول ہے اس اعتبار سے کہ وہ اپنے سے بالاتر مقام سے وابستہ ہے ، نظام خلق و ایجاد و تکوین کہا جاتا ہے ۔

ہم بیان کرچکے ہیں کہ سائنس نے پہلے سے کہیں زیادہ آج یہ ثابت کردیا ہے کہ حیات مادّے میں تبدیلی لاکر اس پر حکومت کرتی ہے اور اس کو اپنے قوانین کا تابع بناتی ہے ۔ اگر حیات مادّے کا نتیجہ ہوتی تو اس بات کا امکان نہ ہوتا کہ وہ اپنے سبب اور مبدا پر اثر انداز ہوسکے اور بے جان مادّے کے قوانین سے بالاتر قوانین اس پر نافذ کرسکے ۔ گذشتہ مقالے میں ہم نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ نفسیات و حیاتیات کے ماہرین کی تحقیقات کا ہدف اصالت روح و حیات نہ ہونے کے باوجود ، وہ ایسے نتائج تک پہنچے جو اصالتِ روح و حیات کو ثابت کرتے ہیں ، یہاں تک کہ نظریۂ " فطری انتخاب " جو اکثر و بیشتر اصحاب فکر و نظر کے نزدیک مادّی پہلو کا حامل ہے ، اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھی حیات کی برتری و اصالت کو ثابت کرتا ہے ۔

مقالۂ " قرآن و حیات " کے تحت حیات کے ماوراء الطبیعی رشتے اور خداوندی ارادے سے ہم بحث کرچکے ہیں اور اس زبردست منطق کا بھی بیان ہوچکا ہے جو قرآن مجید کی خصوصیت ہے گذشتہ مقالے میں ہم نے دو باتوں پر زیادہ زور دیا ہے ۔

ایک یہ کہ پیدائش و خلقت سے متعلق دنیا میں ایک ایسی بیہودی فکر رائج ہوئی ہے جو خلقت کو کسی " آن " سے مربوط کرتی ہے ۔ یعنی اس فکر کے حامل افراد جب کبھی کائنات یا حیات کی خلقت کا تصور کرتے ہیں تو اس سوچ میں پڑجاتے ہیں کہ یہ کس " آن " سے بطن عدم سے وجود میں آئی اور کب شروع ہوئی ۔

اس سلسلے میں ہم نے کہا تھا کہ اس منطق میں جو قرآن مجید کی ایجاد ہے ۔ " آن " یا زمان کا دخل ہرگز نہیں ہے ۔

دوسرا نکتہ جو پہلے نکتہ کی بنیاد ہے اور جس کے بارے میں ہم نے اس مقالے میں بیان کیا تھا ، یہ ہے کہ توحید و خداشناسی کے سلسلے میں زیادہ تر گروہوں کا طرز عمل یہ ہے کہ خدا کو وہ لوگ مثبت کے بجائے منفی طریقے سے جاننا چاہتے ہیں اور جہاں کہیں

کسی شئ کے اسباب اُن سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں وہاں خدا کو بیچ میں لے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کائنات وحیات کی پیدائش کے سلسلے میں "آن" کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، کیونکہ کائنات وحیات کی پیدائش کا آغاز ان کے لیے ہمیشہ دوسرے تمام مسائل سے زیادہ مبہم رہا ہے۔

ایک تو یہودی فکر، دوسرے منفی طرز فکر، دونوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ توحید ایک طرف تو "آن" (یا زمان) اور دوسری طرف حوادث کے "نامعلوم اسباب (علل)" سے وابستہ ہوگیا۔ اس دوگونہ وابستگی کا نتیجہ واضح طور پر یہ ہوا کہ، اگر خلقت حیات کائنات کی "آن" کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش رہے لیکن" حوادث کے نامعلوم اسباب" درجہ بدرجہ معلوم ہوجائیں تو توحید وخدا شناسی کے سلسلے میں بھی رفتہ رفتہ شک وشبہ کی گنجائش پیدا ہوجائے گی۔

"قرآن وحیات" کے عنوان سے اپنے مقالے میں ہم یہ واضح کرچکے ہیں کہ اس کتاب کریم کا اہم ترین اعجاز یہ ہے کہ اس میں یہودی یا منفی طرز فکر موجود نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ تاریخ فکر انسانی میں دونوں تباہ کن انحراف اس قدر عام ہیں کہ شاید قرآن مجید سے مستفیض ہونے والوں کے سوا اور کوئی اُن سے بچ نہیں سکا۔

ماقبل اسلام فلاسفہ، مسلم متکلمین کی اکثریت نیز یورپ کے موجودہ دانشوروں کی فکری تاریخ پر ایک گہری نظر ڈالنے سے یہ مسئلہ خود بخود واضح ہوجاتا ہے۔ تحقیق کے طور پر ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ قرآن مجید وہ واحد معلم و راہنما ہے جو خدا کو نہ تو آغاز آفرینش کے حوالے سے پہنچواتا ہے نہ موجود ومشہود، علت ومعلول اور خلقت کے جاری وساری نظام میں منفی نامعلوم علل کے ذریعے پہچنواتا ہے، بلکہ مثبت طریقے اور معلوم اسباب کے وسیلے سے خدا کا عرفان عطا کرتا ہے۔

یہ آن دو مقالوں کا نچوڑ تھا جنہیں ہم پہلے پیش کرچکے ہیں، لہٰذا جو کوئی ان مفاہیم ومعانی کو سمجھنے کا خواہاں ہو اسے ان باتوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اب ہم اپنے اصل موضوع بحث یعنی "توحید وارتقا" پر گفتگو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ہم یہاں توحید یا اس کے متعلق فلسفیانہ ومتکلمانہ کتب میں مذکورہ دلائل سے مستقل طور پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ ہر چند یہ بحث دلچسپ ہے اور ہر شخص جو ان کا خلاصہ جاننا چاہتا ہے، ان کتابوں کو پڑھ سکتا ہے۔ پھر وہ یہ دیکھے کہ آسمانی کتابوں میں اس کے متعلق کیا بیان ہوا ہے اور ان کا

طرز بیان کیسا ہے؟ ساتھ ہی یہ بھی دیکھے کہ فلاسفہ و متکلمین کا طرز بیان اس کے بارے میں کیسا ہے؟ اور یہ کہ مغربی و مشرقی مفکرین نے اس کے متعلق کس انداز سے یا سوچتے ہیں؟ وغیرہ، پھر بھی ان مسائل سے قطع نظر فی الحال جس عنوان کو ہم نے موضوع بحث قرار دیا ہے اسی پر بات شروع کرنا ہے۔ لہٰذا توحید کے سلسلے میں مستقل طور پر اسوقت بحث کرنے کا امکان نہیں۔ اگر توفیق نے ساتھ دیا تو اس بحث کے اختتام پر جداگانہ عنوان کے تحت اس مسئلے سے تفصیلی بحث کریں گے۔ ذی روح عناصر کے ارتقا کے بارے میں بھی ہمیں فی الحال تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے۔ ہم اس غلطی سے بھی بچنا چاہتے ہیں جس میں دوسرے لوگ پھنس چکے ہیں۔ کچھ لوگ تو تحفظِ حرمت توحید کے نام پر ارتقا کے اصول و قوانین کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ہیں کچھ لوگ فلسفۂ مادی کے معتقد ہیں، اور مسئلہ ارتقا کو نظریۂ "وجود خالق" کے خلاف ایک حربے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ارتقا کے غیر قابلِ قبول اصولوں کو زبردستی قطعی و مسلّم مان کر ایک ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اوّلاً توحید و ارتقا کے اصول اپنے تمام اشکال کے باوجود یہاں تک کہ حیوانات کے ارتقا میں بھی ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی تکمیل و تائید کرتے ہیں نہ کہ نفی و مخالفت۔ ان دونوں اصولوں کو ایک دوسرے کے خلاف فرض کرنا جہالت و بے خبری کی علامت ہے ثانیاً اس سلسلے میں تحقیق کا تعلق نہ اِس گروہ سے ہے اور نہ اُس گروہ سے اس کا تعلق صرف ان علماء و ماہرین سے ہے جنہوں نے اس مسئلہ پر صحیح سائنسی طریقوں سے تحقیق و تدقیق کرنے میں ایک عمر صرف کی ہے، اور انہیں لوگوں کو صحیح معنوں میں اظہار رائے کا حق اسی حد تک حاصل ہے جس حد تک علم کے شعلۂ لرزاں نے نشاندہی کی ہے۔

سائنسی نقطۂ نظر سے ہمارے زمانے میں "ارتقاء انواع" کو مسلّمہ امور میں شامل کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ "تدریجی ارتقا" کا اصول جسے اولاً قدیم یونانی فلسفیوں نے پیش کیا اور پھر "لامارک" اور "ڈارون" نے سائنسی دلائل کی مدد سے ثابت بھی کرنا چاہا اب مسلّم نہیں۔ اس نظریے کے ماننے والے گھوڑوں اور آدمیوں کے اجداد کی تلاش و جستجو میں مصروف رہے اور یہ تسلیم کر لیا کہ انسان بندر کی نسل سے ہے اس اصول کے رد ہو جانے کے بعد اب اس کی جگہ اتفاقی ارتقا کے اصول نے لے لی ہے۔

بہرحال اس مسئلہ میں بحث و تحقیق کا کام ماہرین حیاتیات کے ذمے ہے۔ فلسفۂ الٰہی یا فلسفہ مادیت کے پیرو کاروں کا کام صرف یہ دیکھنا ہے کہ سائنسی بیانات فلسفیانہ اصولوں سے جن کی وہ پیروی کرتے ہیں مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔

لہٰذا اس مقالے میں نہ صرف توحید موضوعِ بحث ہے نہ فقط "ارتقا" بلکہ موضوعِ بحث "رابطۂ توحید وارتقا" ہے جو گذشتہ دو بحثوں کا تتمہ اور تکملہ ہے۔ یعنی اس مقالے میں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا دونوں طریقہ ہائے فکر ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں یا نفی؟ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص عقلی دلائل کی بنا پر توحید کا قائل ہو جائے تو کیا اسے ارتقا اور اشتقاقِ انواع کا منکر ہونا چاہیے اور اگر اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ حیوانات کسی نہ کسی طریقے سے ایک دوسرے سے مشتق ہیں تو کیا اس کے لئے توحید کا منکر اور مادیت کا قائل ہونا لازمی ہے؟ یہ ہے اس مقالے کی اصلی غرض و غایت جو کچھ بھی توحید یا ارتقا کے بارے میں بیان کیا جائے گا وہ محض اس موضوع کو واضح کرنے کے لیے ہے۔

"تضادِ توحید و ارتقا" کا خیال بھی اسی طرح عام ہو چکا ہے، جس طرح یہ خیال کہ خلقت کا تعلق زمان سے ہے یا یہ خیال کہ خدا کو منفی طریقے سے پہچاننا یا مجہولات میں تلاش کرنا ہی ممکن ہے نتیجتاً اس مسئلے کے متعلق یورپی تاریخِ سائنس و فلسفہ میں عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین نمونے منظر عام پر آئے ہیں جو ایک اسلامی مفکر کے لیے تاسف کا باعث ہیں۔

موجودہ زمانے میں علم حیاتیات اور علوم کی عمومی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تضاد یورپ میں عموماً اور سائنسدانوں کی اکثریت میں کم از کم خاصا عام رہا ہے، جس کے نتیجہ میں عجیب و غریب ابہام و انحراف کو پیدا کرنے میں مادیت پسندوں کا دخل کچھ کم نہیں رہا۔

لہٰذا، اس اعتبار سے ہم پر لازم ہوتا ہے کہ ضمنی طور پر ہم اس فکری میلان پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ کیوں اس جدید روش میں عام طور پر نظریۂ ارتقا کو مادی اور ضد الوہیت پہلو کے ذریعے پہچنوایا گیا ہے؟ کیوں اور کیسے دونوں فکری حریفوں نے نظریۂ ارتقا کو الوہیت پرستی کی ضد تسلیم کیا ہے؟ کیوں توحید، خداشناسی اور نظریۂ تخلیق کو نظریۂ ثباتِ انواع کے مرادف مانا گیا ہے؟ آیا منطقی نقطۂ نظر سے توحید وارتقا میں تضاد ہے؟ یا کوئی خاص وجہ یا اسباب دونوں فکروں میں تضاد پیدا کرنے کا باعث بنے؟

میں نے اس سلسلے میں دانشوروں کی کتابیں اور تالیفات کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے تاکہ ان کی تحریروں کے منشا کے سہارے ان کے افکار و خیالات کی تہہ تک رسائی حاصل کروں اور یہ جان سکوں کہ ان دانشور جہاں کہیں فلسفیانہ استنباط کا طریقہ اختیار کرتا ہے وہاں کونسی چیز باعث ہوتی ہے کہ

وہ ایک خاص طرزِ فکر کو اپناتا ہے؟ وہ کن اصول موضوعہ کو اپنے ذہن میں مان کر اظہار رائے کرتا ہے؟ فلسفیانہ افکار کے اختلاف کی اصلی وجہ ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ہر مفکر کچھ اصولوں کی صداقت کو ذہن میں تسلیم کر کے یہ فرض کر لیتا ہے کہ ان اصولوں کو سب کے لیے قطعی طور پر مسلّم ہونا چاہیے اور یقیناً دوسروں کی نظر میں بھی یہی اصل یا اصول مسلّم ہیں، جبکہ وہ اصل یا اصول موضوعہ انحراف و مغالطہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتے۔

میں نے اب تک اس مسئلے پر دانشوروں کی کتابوں کا جائزہ لے کر جو کچھ سیکھا وہ یہ ہے کہ جس چیز نے توحید وارتقا کے درمیان تصورِ تضاد پیدا کیا وہ یہودی اور منفی طرزِ فکر کا قبول عام ہے، اگر سائنس کی تاریخ پر مشتمل کتابوں یا حیاتیات سے متعلق تصانیف یا ان فلسفیانہ کتب پر ایک گہری نظر ڈالی جائے جو توحید کی موافقت اور ارتقا کی مخالفت یا مادی مکتبِ خیال کی حمایت اور اس کی مدافعت میں لکھی جا چکی ہیں، تو مخصوص یہودی فکر کا سایہ ہمیں ہر جگہ نظر آئے گا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "منفی طریقے سے خدا کو جاننے" کا خیال "تخلیق کے زمان، سے متعلق ہونے پر مبنی ہے اور تخلیق کی زمان سے نسبت" کا خیال "تضادِ توحید وارتقا" کا باعث بنا ہے۔

البتہ بہت سے افراد جو یورپی فلسفہ کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اس مقالے یا مقالہ نگار کی زبانی ایک عظیم فکری انحراف کا اعلان خاص طور سے اس کی عظمت و بلندی اور راقم الحروف کی نارسا آواز کے پیشِ نظر ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ "ولکن الحق احق أن یتبع" لیکن حق کی حقیقت و قوت و شان ان تمام سے کہیں بلند و بالاتر ہے۔

ضروری ہے کہ قارئین کو اس قبیل کی تحریروں سے آشنا کرنے کی غرض سے کچھ نمونے نقل کیے جائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں نے اس موضوع کے متعلق بحث و گفتگو کی ہے، ان کے افکار و خیالات کس حد تک یہودی فکر سے متاثر ہیں، اور ان کی تحریروں میں کس قدر اس کی جھلک ملتی ہے۔

برا نہ ہوگا اگر محترم قاری حسب ذیل باتوں کو پیش نظر رکھیں:

مدتوں سے دانشور اور علماء اس پہلو پر بحث و تحقیق کرتے رہے ہیں کہ آیا ہر ذی روح اپنے تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ، پہلے سے عورت کے بیضے یا مرد کے نطفے میں اسی طرح کی چھوٹی شکل میں ہوتا ہے؟ اور پھر وہ اعضاء و جوارح اپنی حالت کے تناسب سے نشو و نما پاتے ہیں یا اعضاء و جوارح

کو تشکیل دینے والا مادہ پہلے سادہ اور متجانس ہوتا ہے اور بعد میں مختلف اعضاء و جوارح کی شکل اختیار کرکے معرض وجود میں آتا ہے؟

تعجب نہ ہونا چاہیے اگر یہ کہا جائے کہ قرون وسطی کی بات نہیں، جدید زمانے میں قریب قریب دو صدیوں تک دانشوروں اور سائنس دانوں کی اکثریت پہلے خیال کی تابع رہی ہے۔

ضمناً یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اختلاف نظر تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ بقراط و ارسطو اور ان کے ماننے والے افراد کے درمیان نطفے کے متعلق زمانہ قدیم میں رہا ہے۔ بقراط کا کہنا تھا کہ منی بدن کے تمام حصوں سے خارج ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کا ہر جز ایک عضو بننے کا سبب ہوتا ہے۔ ارسطو کا خیال تھا کہ نطفہ متشابہ الاجزاء نہیں ہے۔ (اسفار، جلد ۴۔ طبیعیات شفا) لیکن بقراط کی باتوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نے واقعی یہ کہا ہو کہ انسان چھوٹی صورت میں نطفے میں موجود ہوتا ہے۔ دراصل یہ بات بقراط کے مخالفین نے کہی ہے کہ اس طرح کے قول کا نتیجہ مضحکہ خیز ہے۔ لیکن سترھویں صدی اور بعد کے دانشور اور سائنس دان تشکیلِ قبلی اور فعلیتِ قبلی کے اصولی طور پر قائل ہوئے ہیں۔

ہر صاحب نظر قاری جانتا ہے کہ خلقت کے حیرت انگیز شاہکاروں میں سے ایک شاہکار یہی ہے کہ سادہ و متجانس شکل کے مادّے سے ایک ایسا موجود پیدا ہوتا ہے جو مختلف شکلوں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے اعضاء و جوارح رکھتا ہے۔ یہ تنوعات و تشکلاتِ الٰہی ہدایت و قدرت کا بہترین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ایک موجود سادگی سے تنوع و ترکیب کی طرف بڑھتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ عزّوجل فرماتا ہے۔

"هو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء"

وہی ہے جو جس طرح چاہے رحم میں تم کو شکل و صورت بخشتا ہے

بقول سعدی ؎

دہد نطفہ را صورتی چون پری
کہ کردہ است بر آب صورتگری

(اس نے نطفے کو پری کی صورت دی ہے یا پانی پر مصوّری کا کمال دکھایا ہے؟)

سترھویں صدی میں دنیا کے اکثر و بیشتر دانشوروں نے بغیر کسی تجربے اور ثبوت کے "تشکیل قبلی"

نظریئے کو پیش کرکے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آغاز خلقت انسان سے تمام افراد مکمل اعضا و جوارح کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں، لیکن نطفے میں وہ بہت ہی چھوٹی شکل میں موجود تھے۔ یہی انتہائی چھوٹے عضویئے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے ہیں اور ہر نسل میں ایک نہ ایک درجے تک ان کا ظہور اور نشو و نما ہوتا ہے۔
تاریخ علوم (ص ۳۸۸) میں "پی یر روسو" کہتا ہے:

"ولیم ہاروے نے ۱۶۵۱ء میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ہر موجود ایک بیج (تخم) سے پیدا ہوتا ہے، اس بات کی جانچ کے لیے اس نے "وینڈرسور" پارک میں موجود ہرنیوں کا مختلف مقررہ اوقات میں تشریحی (اعضا) مطالعہ کیا، جس کے نتیجے میں وہ ہرنی کے بچوں کے مختلف مراحلِ نشو و نمو پر تحقیق کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی طرح چند سال بعد ۱۶۷۳ء میں ہالینڈ کے سائنسدان "رگنیہ دوگراف" نے بھی بہت سے خرگوش اسی خیال کے تحت ذبح کر دیئے۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے پستاندار موجودات (MAMMAL) کے تخم (بیج) کا راز جان لیا ہے۔ "مالپیغی" جس نے ۱۶۸۹ء میں مرغی کے انڈے پر (مرغی کے انڈے سینے سے پہلے) تحقیق کی تھی، اس بات کا مدعی تھا کہ اس نے جوزہ کو بھی اس میں دیکھا ہے۔ یہ تمام اعمال جاندار موجودات کے فوق العادہ نظریئے "تشکیل قبلی" کے رائج ہونے کا پیش خیمہ تھے، اس وقت سے اس مسئلے میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا، کہ چونکہ تخم میں لقاحی عمل سے پہلے ایک ایسا موجودِ کامل ہوتا ہے جو رشد و نمو کی صلاحیت رکھتا ہے، لہٰذا اس موجود کو ذاتی طور پر ایسے بیجوں کا حامل ہونا چاہیے جس کے ہر بیج میں ایک موجود کامل ہو اور مذکورہ موجودات کے تخم بھی اسی طرح نئے سرے سے دوسرے موجودات پر مشتمل ہوں، غرض یہ کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ یہیں سے "اسوامردام" اس نتیجہ پر پہنچا کہ "حوا" کے جسم میں آیندہ نسلوں کے بیج تمام اعضا سمیت پہلے سے موجود تھے۔ لیکن اسی دوران میں مخالفت کی ایک آواز بلند ہوئی اور وہ آواز "لیوِنہوک" کی تھی جس نے ۱۶۷۹ء میں نطفے (SPERMATOZON) کو دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے بتایا کہ جو شئے بننے والے موجودِ قبلی پر مشتمل ہے وہ تخم یا بیج نہیں بلکہ نطفہ یا سپرمیٹوزون (SPERMATOZON) ہے۔ مون پلے سائنس اکاڈمی

کے سکریٹری" فرانسوا دوپلانتاد" نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ایک نطفے کو جب خوردبین کے ذریعے نظرِ تحقیق سے دیکھا تو ایک چھوٹا سا مگر مکمل آدمی اسی کے اندر سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔"

بعد میں" پی یر روسو" اپنی باتوں کو اس طرح سے جاری رکھتا ہے:

"آیا ان باتوں پر یقین کر لیا گیا؟ جی ہاں، ماہرین حیاتیات نے اس دلیرانہ اور بیہودہ مزاح پر یقین کر لیا، نتیجتاً ایک تند و تیز بحث شروع ہوئی کہ آیا بشریت کی بنیاد حوّا کے تخم میں ہوتی ہے یا آدم کے نطفے میں؟"

اس کے بعد" پی یر روسو" دو سائنسدانوں کی طرف سے نظریہ "تشکیل قبلی" کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"نظریۂ" تشکیل قبلی" اگرچہ" ہالر" اور" شارل بو" جیسے عظیم و بلند پایہ دانشوروں کے ذریعے مستحکم نہ ہوا، لیکن اس کے باوجود اس نے بڑے بڑے سائنسدانوں اور دانشوروں کو اپنا حامی بنا لیا، یہاں تک کہ "کودیہ" جو اٹھارویں صدی کے نصف اول اور انیسویں صدی کے نصف دوّم کا مشہور عالمِ حیاتیات تھا وہ بھی کچھ عرصے بعد خود اسی نظریہ کا پیرو بن گیا۔"

پی یر روسو اس بے سود نظریہ کی جانب اکثر دانشوروں کے میلان کا سبب بیان نہیں کرتا صرف اتنا ہی کہتا ہے۔" ماہرین حیاتیات نے اس گھٹیا مذاق پر یقین کر لیا۔" لیکن وہ یہ نہیں کہتا کہ کیوں اور کس لیے؟ خاص طور پر یہ بات غور طلب ہے کہ اس نظریہ میں خیال پردازی کا دخل اس حد تک رہا ہے کہ ایک نے یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ مرغی کے انڈے سینے سے پہلے میں نے مرغی کے بچے کو اس میں دیکھا ہے! دوسرے نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے نطفے (SPERMATOZON) کو جب خوردبین کے ذریعہ نظرِ تحقیق سے دیکھا تو اس میں مجھے چھوٹے سائز کا مکمل آدمی نظر آیا!! ہمارا خیال ہے کہ یہ مفروضہ محض امرِ خلقت کی توجیہ کے لیے بنایا گیا۔ اس طرح سے انہوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ہر ذی حیات پروردگار کی مخلوق ہے۔ اچھا یہ دیکھا جائے کہ انہوں نے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے یہ مفروضہ (کہ جب سے ہر انسان کیا بلکہ ہر ذی حیات کے جدِ اعلیٰ کی پیدائش ہوئی ہے، اسی روز سے ہر انسان کا وجود بھی

چھوٹے سائز میں مکمل طور پر موجود چلا آرہا ہے) کیوں قائم کیا ہے! دراصل یہ اسی یہودی فکر کا پرتو ہے جو ان کے دل و دماغ پر مسلط تھی اور ان کے جانے بغیر اس طرز فکر نے ان کی قوت متخیلہ میں اپنی جگہ بنالی۔

یہ دیکھئے کہ اس طرز فکر اور اس طرز فکر میں کتنا فرق ہے جو خداوند کریم کے خالق مطلق ہونے کی نشاندہی کرنا چاہے تو کہتا ہے: خدا وہی ہے، جو بے شکل، بے رنگ، سادہ اور متجانس مادے کو رحم میں مختلف مراحل کے دوران مختلف شکلیں اور صورتیں عطا کرتا ہے۔

"ھو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء"

وہی ہے جو جس طرح چاہے رحم میں تم کو شکل و صورت بخشتا ہے۔"

پہلا نمونہ: عام طور پر حیاتیات و فلسفہ کی کتابوں، یہاں تک کہ کلاسیکی کتابوں میں بھی جب کبھی ابتدائے آفرینش کی بحث ہوتی ہے اور یہ سوال آتا ہے کہ زندگی زمین پر کس طرح ظاہر ہوئی، تو سب ان مفروضوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے ایک بھی سائنسی نقطہء نظر سے قابل قبول نہیں ہے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان مفروضوں میں سے ایک کا نام "مفروضۂ تخلیق" رکھتے ہیں جو یہ ہے کہ موجودات کی تمام انواع شروع سے کسی سابقے اور مقدمے کے بغیر مکمل صورت میں پیدا کی گئی ہیں۔ ظہری طور پر اس تعبیر کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تمام مفروضے صحیح ہوں تو پھر کسی طرح کی تخلیق کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کون سی چیز تھی جس نے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اگر موجودات کی خلقت اتفاقی طور پر، بغیر کسی مقدمے کے ہوئی ہے، تو خلقت نے عملی جامہ پہنا ہے ورنہ خلقت نے عملی شکل اختیار نہیں کی اور وہ کونسی چیز ہے جس نے مفہوم خلقت کو ان محدود کتابوں کو لکھنے والے مفکرین کے ذہن میں خاص شکل بخشی؟ آیا اس کا سبب اس غلط یہودی فکر کے تسلط کے سوا اور کوئی دوسری چیز ہے؟

"فرضیہ ہای تکامل" (ارتقا کے مفروضے) نام کی کتاب میں مؤلف صفحہ نمبر ۹ پر "ابتدائے حیات" عنوان سے ایک نئے باب کا آغاز کرکے ایک مقدمہ کے بعد کہتا ہے:

"فی الحال ہم ان اہم مفروضوں کا ذکر کریں گے جو ایک زمانے سے رائج اور لوگوں کی نظر میں مقبول رہے ہیں"

اس کے بعد چند مفروضوں کا ذکر کرتا ہے ۔ بعنوان مثال : " پہلا ذی روح موجود (جرثومہ) کسی ایک سیارے سے جدا ہو کر اتفاقاً زمین پر آن پڑا اور تمام موجودات خود بخود پیدا ہوگئے یا یہ کہ تمام موجودات ناری ہیں وغیرہ ۔ لیکن پہلے مفروضے کے بارے میں جب بیان کرتا ہے تو اس کا نام " مفروضۂ خلقت " رکھتا ہے اور ضمناً یہ کہنا چاہتا ہے : اگر ذی حیات موجودات بے جان مادّے سے خود بخود پیدا ہوئے ہیں ، تو پھر خلقت کا دخل کیا ، اور اگر ذی حیات موجودات کا سرچشمہ کسی ایک سیارے سے زمین تک پہنچا ہے ، تو پھر تمام ذی حیات موجودات کا شمار زمینی مخلوقات میں نہیں کیا جا سکتا اور خدا کے مخلوقات کا اطلاق صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب تمام ذی حیات موجودات کی خلقت میں مذکورہ دو باتیں اثرانداز نہ رہی ہوں اور وہ بغیر کسی مقدمہ کے پیدا ہوئے ہوں !! حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر اس کتاب کی تألیف کرنیوالے کے ذہن میں تخلیق سے متعلق ان معنوں کے علاوہ دوسرے معنی آئے ہی نہیں تھے ۔

دوسرا نمونہ : تاریخ علم حیاتیات نشاندہی کرتی ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کا مشہور و معروف ماہر حیاتیات " کوویہ " جو اپنے معاصرین کے درمیان بہت زیادہ علمی اثر و رسوخ رکھتا تھا ، وہ ذی حیات موجودات کے سلسلے میں تدریجی ارتقا کا منکر تھا ، اور کیوں کہ متحجرات ، فسیل (FOSSILES) کے بارے میں علما کی تحقیق اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ مختلف ادوار میں جانوروں کی شکل و ہیئت یکساں نہیں رہی ہے ، لہٰذا کوویہ نے اسی کے پیش نظر ایک مفروضہ قائم کر کے اس کی حمایت کی اور وہ مفروضہ یہ تھا کہ اس نے کچھ زمینی حوادث و انقلابات پر یقین کرتے ہوئے کہا :

وہ تمام انواع جو علمِ طبقات الارض (جیالوجی) کے مختلف ادوار میں رہے ہیں ، عام مصائب و حوادث کے نتیجہ میں ہمیشہ فنا ہوتے رہے اور سلسلہ جاری رکھنے کی غرض سے خدا دنیا میں نئی اور پہلے سے کامل تر مخلوق پیدا کرتا رہا ہے ۔

مجلۂ سخن ، تہران (شمارہ ، آذر ماہ ۱۳۳۸ ش) میں ایک تہرانی دانشور اپنے مقالے (یہ مقالہ ان تقریروں پر مشتمل ہے جو موصوف نے انجمن نشر کتاب " سرچشمہ انواع " (ORIGIN OF SPECIES) کی گولڈن جوبلی میں کی تھیں) میں یوں تحریر فرماتے ہیں ۔

" کوویہ نے علم طبقات الارض (جیالوجی) کے مختلف مرحلوں کو مدنظر رکھتے ہوئے گذشتہ ذی حیات موجودات کے متحجرات (فسیلوں "FOSSILES") پر تحقیق کر کے

ان کے تدریجی ارتقا کے بارے میں معلومات فراہم کیے ہیں۔ اس کی بنا پر وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچا ہے کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے ہر دور کے جاندار گذشتہ دور کے مماثل رہے ہیں۔ لیکن چونکہ انواع کے اثبات اور ان کے مکررات کے فنا ہونے کا قائل رہا ہے۔ لہٰذا۔ اپنی بات منوانے کے لئے "مفروضہ قانون خلقت" کو بیچ میں لے آیا ہے۔

کوویہ خلقت کے بارے میں اپنے دعوی کا اظہار یوں کرتا ہے:

ذی حیات موجودات کی خلقت کے سلسلے میں ایک کلی قانون کارفرما ہے۔ اسی کی بنا پر ہر بار نئی خلقت ہوتی ہے اور مختلف ادوار میں ذی حیات کی ایک دوسرے سے بنیادی مماثلت کا ظہور اسی قانون کا نتیجہ ہے۔

لوگوں نے اس مقالے کے علاوہ دوسرے مقامات پر جب کبھی "کوویہ" کے نظریہ کو ایک دور سے دوسرے دور کے موجودات کی علیحدگی اور فرق پر منطبق کرنا چاہا ہے تو سلسلۂ تخلیق کا نام "خلقت متوالی" (تہہ در تہہ تخلیق) رکھا ہے۔ یہ وہی نام ہے جسے کوویہ نے بذات خود اپنے نظریہ کے لیے وضع کیا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں کوویہ یا کم سے کم اس کے ماننے والوں سے یہ سوال کرنا چاہیے: ایسی کونسی وجہ تھی جس کی بنا پر تم لوگ اس طرح سوچتے تھے کہ صرف ذی روح موجودات کے نسلی عدم ارتباط اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کی صورت میں ہی مفہوم و معنائے خلقت کا دم بھرا جا سکتا ہے۔ کیا اس صورت کے بغیر خلقت کسی معنی و مفہوم کی حامل نہیں؟

تیسرا نمونہ: تاریخ علوم صفحہ ۷۰۱ میں ہے:

"ڈاروِن کے ماننے والوں نے جس وقت اپنے تئیں انسان اور حیوانات کے مبدأ پیدائش کو جان لیا، تو اپنے علمی دائرے کو غیر محدود سمجھنے کے نتیجہ میں فوراً دوسرے مسئلہ "آغاز حیات" کو موضوع بحث قرار دیا، جس کو "ژان مولر" کے جانشین اور جرمنی کے مشہور ماہر طبیعیات "ایمل دوبوا ریمون" (۱۸۱۸ء — ۱۸۹۶) نے برلن سائنس اکاڈمی (۱۸۸۰ء) میں اپنی مشہور تقریر کے دوران دنیا کے سات بنیادی مسائل میں سے ایک جانا تھا۔ درحقیقت اس مسئلہ میں بڑی خامیاں تھیں، اس لیے

کتاب مقدس (توراۃ و انجیل) اور کوویہ کے افکار و خیالات کی رو سے تو خداوندی طاقت ہے جس نے جاندار مادّے کو عدم سے نکال کر شرفِ وجود بخشا، لہذا اگر ہم اس خیال سے منحرف ہوتے ہیں تو ہمیں یہ قبول کرنا ہوگا کہ یہ جاندار مادّہ خود بخود وجود میں آیا ہے، یا دوسرے الفاظ میں ہمیں ذی حیات موجودات کی خودزائی کے نظریہ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ یعنی ہمیں وہی مفروضہ اپنانا پڑے گا جسے "پاسچر" نے تجربی علم کے لحاظ سے فنا پذیر جانا تھا۔

اس کے بعد مصنف پیدائش حیات کے بارے میں مادّیون کی پیش کردہ منسوخ تجویز کا ذکر کرتے ہوئے اپنی بات کو یوں آگے بڑھاتا ہے:

"ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس زمانے کے بعد اس مسئلہ نے کوئی خاص ترقی نہیں کی، ہمیشہ سے یہ بات قابلِ غور و فکر رہی ہے کہ کس طرح سے، کاربن، اوزون، آکسیجن اور ہائیڈروجن کے سینکڑوں جواہر (ATOMS) نے ایک دوسرے سے مل کر جاندارہ مادہ کے ایک سالمہ (MOLECULE) کو بنایا ہے ...... ہر حال میں ایک خلیہ (CELL) کی پیدائش کا تعلق اتفاق محض سے ہوتا ہے اور یہ اتفاق اس قدر عمدہ ہے کہ معجزہ کے سوا اسے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا لہذا کیا ہمیں زبردستی "خلقت خداوندی" پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟ کیونکہ علم مثبت یا تجربی نہ تو خلقت اور نہ ہی خودزا پیدائش کو قبول کرتا ہے اور یہ بات اثباتی نظر سے درست ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے ہم صرف یہی تصور کر سکتے ہیں کہ زمین نے بھی سڑے آب گوشت کی طرح کیڑے پیدا کرنے کا کھیت تیار کیا ہے۔ لیکن پھر بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کھیت میں حیات کا بیج کہاں سے آیا؟"

پلی یرروسو جیسا بڑا دانشور، جس کا دعویٰ ہے کہ قدیم اور جدید دونوں علوم پر عبور رکھتا ہے، اس بات کا مستحق ہے کہ ہم اس کے اقوال کا ایک بار پھر سے جائزہ لیں اور اس کی باتوں کے لب لباب سے خداوند اور خلقت کے بارے میں اس کے طرزِ تصور کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے اعتقاد کے مطابق، علم مثبت خلقت اور خودزا پیدائش دونوں تصورات کو قبول

نہیں کرتا۔ ایل کہنے میں وہ حق بجانب ہے، اس لیے کہ خلقت کے بارے میں وہ جس تصور کا حامل ہے، علم کے ذریعے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اس پر اضافہ کرکے کہتا ہوں: "خلقت کے بارے میں جو تصور پی یر روسو یا اس کے ہم مشرب دانشور کہتے ہیں وہ فلسفے کے مضبوط اور غیر قابلِ تردید دلائل کی رو سے نہ صرف محال و ممتنع ہے بلکہ ازل سے اس کا وقوع ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ خلقت کا وہ تصور محض اتفاق اور خرافات پر مبنی ہے، جبکہ خلقت الٰہی مخصوص و قطعی احکام و قوانین کے بغیر عملی جامہ اختیار نہیں کرتی، خواہ اس کے آثار ہمارے لیے واضح و معلوم ہوں یا نہ ہوں۔

یہاں پر دو سوال ابھر کر سامنے آتے ہیں، ایک یہ کہ، ممکن ہے محترم قارئین یہ تصور کریں کہ پی یر روسو اور دوسرے دانشور سائنس کے ترجمان ہیں اور سائنس نے جہاں تک ترقی کی ہے اس کی وضاحت انہوں نے کردی ہے، لہٰذا یہ اعتراضات ان کی شخصیت و قابلیت پر نہیں بلکہ سائینس کی ترقی کے حدود پر عاید ہوتے ہیں۔ اس بات پر اصرار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اب تک جو کچھ مثالوں کے طور پر ہم ذکر کرتے چلے آئے ہیں وہ محض اس بات کو ثابت کرنے کیلئے تھا کہ جس چیز نے ان مفروضوں کو یہ شکل و صورت عطا کی، مثبت یا تجربی مشاہدے اور عینی تجربے نہیں ہیں۔ سائینسی تجربوں کو دوسری طرح اور دوسری تعبیر کے ساتھ بھی بیان کیا جاسکتا ہے، مفہوم و معنائے خلقت میں دانشوروں کا مخصوص تصور اور وہ خاص فلسفیانہ طرزِ فکر جو ان کے ذہنوں پر حکم فرما تھا، اس بات کا باعث بنا ہے کہ مذکورہ بالا مسائل نے سائینس کی تاریخ میں مذکورہ بالا شکل اختیار کی، دوسرے الفاظ میں مثال کے طور پر پی یر روسو نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس دعاوی اور عنوان کتاب سے قطع نظر، وہ محض تاریخ سائنس اور عینی مشاہدے پر مبنی نہیں، بلکہ دراصل سائنسی نظریات میں یورپی تاریخ فلسفی کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ اس کے مضحک و قابلِ افسوس پہلوؤں کا تعلق جدید سائینسوں کی تاریخ سے نہیں بلکہ یورپ کی تاریخ فلسفہ سے ہے، مختصر یہ کہ خلقت اور خدا کے بارے میں یورپی دانشوروں کا تصور اور طرزِ فکر بیہودی ہے جو منفی طرزِ فکر ہے۔ اس کی تفصیل "قرآن و حیات" کے تحت میں اپنے مقالے میں دے چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ یہ لوگ خدا کو اپنے مجہولات میں تلاش کیا کرتے تھے۔

قارئین محترم کو یہیں سے سمجھ لینا چاہیے کہ یورپ میں مادی مکتب فکر کیوں اس قدر

رواج پذیر ہوا۔ وہ غلط منطق شروع سے تردید و فنا کے لائق تھی جو الٰہی مسائل کے سلسلے میں دانشوروں کے افکار و خیالات پر اکثر حکم فرما رہی ہے۔

درحقیقت راقم الحروف جس وقت جدید صدیوں میں تاریخ علم کی روداد کا جائزہ لیکر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ صرف دانشوروں کے خاص فلسفیانہ طرز فکر نے علم کے پاک و پاکیزہ دامن کو داغدار کیا ہے، تو اسے شدید تأسف کا احساس ہوتا ہے اور اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ کاش تمام دانشور اس عظیم فلسفیانہ طرز فکر سے آشنا ہوتے، جس نے چودہ سو سال تک قرآن کریم کی آغوش میں رشد و نمو کے مراحل طے کیے ہیں۔ کاش مغربی دانشور اور سائنس دان علم کے صاف و شفاف پانی کو یہودی طرز فکر کے رنگ سے آلودہ نہ کرتے۔ خاص طور میرے رنج و الم میں اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب میں جدید علوم سے نئے آشنا ہونے والے ان نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو تجزیہ و تحلیل کی صلاحیت نہیں رکھتے اور سائنس کو آلودہ کرنے والے طرز فکر کی آمیزش جدید فلسفیانہ کتابوں یا سائینس کی تاریخوں حتیٰ کہ کلاسیکی کتابوں میں دیکھ کر اس بات کے معتقد ہوجاتے ہیں کہ خلقت اور وجود باری کا مفروضہ، ان مفروضوں میں سے ایک ہے جو برسوں پہلے سائنسی تجربات اور تجربوں کے ذریعہ باطل قرار پاچکے ہیں۔ وہ اپنے تئیں اس طرح سوچتے ہیں کہ خلقت و خالق کے مفروضات کا مصدر آباء و اجداد کے تاریک رسم و رواج ہیں جو علم کی روشنی میں باقی نہیں رہ سکتے۔

ممکن ہے ایک دوسرا سوال قارئین محترم کریں وہ یہ کہ جس چیز نے دانشوروں کو خاص طرز فکر اپنانے پر راغب کیا وہ مدارج سفر تکوین کی پابندی ہے یا وہ خاص فلسفیانہ طرز فکر جسے ہم یہودی طرز فکر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں؟

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ سفر تکوین کے مدارج کا اثر فکر پر ضرور رہا ہے، لیکن زیادہ سے زیادہ یہی ہوا ہے کہ خلقت کے مسئلے کو خاص انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سفر تکوین میں یہ بات تو کہیں پر نہیں کہی گئی ہے کہ اگر اس صورت سے ہٹ کر موجودات پیدا ہوئے ہوں تو خلقت و پیدائش کے کوئی معنی ہی نہیں، بنیادی طور پر کوئی ایسا مخصوص طرز فکر موجود نہیں جو سفر تکوین کو خلقت کے معنی و مفہوم سے آشنا کر سکے، اس بارے میں دانشوروں کا طرز فکر

نشاندہی کرتا ہے کہ تمام دانشور خواہ الٰہی ہوں یا مادّی ایک خاص نقطہ نظر کے علاوہ اور کسی طرح سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سفرِ تکوین کی رو سے خلقت و پیدائش کو قبول نہ کرنے کے باوجود مفہوم خلقت کے بارے میں دانشوروں کا طرزِ تصور ایک ہی رہا ہے۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کج فکری میں کسی دوسری وجہ کا بھی دخل رہا ہے۔ ہمارے خیال میں وہ وجہ ایک ایسے طرزِ فکر کا رواج ہے جو یہودی مزاج کا خاصہ ہے اور جس کا سرچشمہ یہودی علم کلام ہے نہ کہ سفرِ تکوین، اس پر مستزاد یہ کہ وہ صحیح اور منطقی طرزِ فکر رواج نہ پاسکی جو قرآن کریم کی تعلیمات سے آگاہ افراد کا خاصہ ہے۔

مجلّہ سخن میں (شمارہ آذر ماہ سنہ ۱۳۳۸ھ ش، جس کا حوالہ پہلے بھی دیا جاچکا ہے)، آفاتِ ناگہانی ارضی وسمادی کے بارے میں کوویہ کے نظریۂ کو نقل کرنے کے بعد تہرانی محقق کہتا ہے۔

"اس بات کی یاددہانی بے جا اور لطف سے خالی نہ ہوگی، کہ لوئی اگاسیس نے جو کوویہ کے شاگردوں میں سے ہے اور نظریۂ ارتقا کے مخالفین میں شمار ہوتا ہے۔ ذی حیات موجودات کی ارتقا اور تغیر و تبدیلی (جو اُن کے فسیلوں "FOSSILES" کے ذریعے قابل مشاہدہ ہے) کو نظریۂ "ثباتِ انواع" کا نام دینے کی غرض سے ایک ایسا عجیب نظریہ قائم کیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کفرِ محض ہے۔ اگاسیس، ادوارِ گذشتہ کے مقابلے میں بعد کے ادوار کے جانوروں میں رونما ہونے والے کمال یا ان کے تدریجی ارتقا کو اس ارتقا کا نتیجہ مانتا ہے جو شروع سے لیکر اب تک خالق متعال کے ذہن میں رونما ہوا ہے۔"

اس طرح معلوم ہوسکتا ہے کہ مخصوص یہودی فکر کا اثر و رسوخ ذہنوں پر دینی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ فلسفیانہ افکار کی شکل میں اس حد تک عام رہا ہے کہ تدریجی خلقت کے تصور کے مقابلے میں خدا کے ذہن میں ارتقا رونما ہونے کا تصور ایک دانشور کے لیے زیادہ آسان اور قابل قبول ہے۔ آیا سفرِ تکوین میں ارضی وسمادی حوادث کا مسئلہ بھی واقعی شامل رہا ہے؟ آیا سفرِ تکوین میں یہ بات کہی گئی ہے کہ خداوند کے علم میں رفتہ رفتہ ارتقا ہوتا ہے؟

(ان سوالات پر اس بحث کو ختم کیا جاسکتا ہے)

شناخت

• نفسِ امّارہ • نفسِ مطمئنّہ

جناب سید کلب صادق
(ھندوستان)

کونسی وہ شے ہے جو آج کے انسان کے قابو میں نہیں آگئی۔ امراض پر اس نے قابو پالیا۔ بہت سے وہ امراض جو پہلے ناقابل علاج اور موت کی تمہید سمجھے جاتے تھے، وہ اب قابل علاج ہو چکے ہیں۔

زمین پر اس نے قابو پالیا۔ انسان نہ صرف یہ کہ زمین کے اوپر دندناتا پھر رہا ہے بلکہ زمین کے سینہ کو چیر کر اس کے خزانوں پر قبضہ کرتا چلا جاتا ہے۔

دریاؤں پر اس نے قابو پالیا۔ بند باندھ کر جدھر چاہتا ہے ان کا رخ موڑ دیتا ہے اور کبھی اس پانی کے زور سے ٹربائینیں چلا کر بجلی پیدا کرتا ہے۔ بجلی بنتی ہے تو گھر روشن ہوتے ہیں، ریڈیو بولنے لگتے ہیں، ٹی وی جگمگانے لگتے ہیں، کارخانے چلنے لگتے ہیں، مشینوں میں جان پڑ جاتی ہے، گاڑیاں دوڑنے لگتی ہیں۔

سمندروں پر اس نے قابو پالیا۔ اس کے بنائے ہوئے دیوپیکر جہاز موجوں کو روندتے پانی کا سینہ چیرتے ہوئے جدھر چاہتے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ غوطہ خور کشتیاں سمندر کی تہوں میں ڈوبی ہوئی قعرِ سمندر میں چھپے ہوئے سربستہ رازوں کو آشکار بناتی چلی جاتی ہیں۔

ہوا پر انسان نے قابو پالیا۔ اس کے بنائے ہوائی جہاز اسے لیے ہوئے شہروں شہروں ملکوں ملکوں اڑتے پھرتے ہیں۔

حد یہ ہے کہ خلائیں بھی انسان کے قابو میں آتی چلی جاتی ہیں۔ انسان کے قدم چاند کی زمین کو روند چکے، اب اس کی نظر سیاروں اور کہکشانوں پر ہے۔

اس ذرہ خاکی نے سائینس کے ذریعہ کس شے پر قابو پا نہیں لیا؟ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے

تک جس سے، جب چاہتا ہے بات کرتا ہے، موسم کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ ایرکنڈیشنڈ گھروں میں رہتا ہے اور ایرکنڈیشنڈ سواریوں میں سفر کرتا ہے۔ "کولڈ اسٹوریج" کی بدولت ہر زمانہ ہر جگہ کے پھل کھاتا ہے۔

مختصر یہ کہ "جسم اصغر" دھیرے دھیرے "عالم اکبر" پر قابو پاتا چلا جاتا ہے مگر حیرت ہے کہ "عالم اکبر" کو دھیرے دھیرے اپنے قابو میں لانے والا انسان اگر نہیں قابو حاصل کر پاتا ہے تو اپنے اس ننھے دل پر جو خود اس کے سینہ میں دھک دھک کر رہا ہے۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ دنیا جس قدر اس کے پنجہ اقتدار میں آتی چلی جاتی ہے دل اسی تناسب سے ہاتھوں سے نکلا چلا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دل ہی قابو میں نہ ہو تو انسان کیا قابو میں رہے گا! اور انسان قابو میں نہ ہو تو اس کی صلاحیتیں کب قابو میں رہیں گی؟ نتیجہ یہ ہے کہ جس قدر انسان کا اقتدار بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ہلاکت خیزیاں بڑھتی جاتی ہیں، اور نوبت یہ آگئی ہے کہ پوری نوع انسان کا وجود ہی خود انسان ہی کے ہاتھوں خطرہ میں پڑ گیا ہے۔

ہر شئی کا علاج انسان نے ڈھونڈ لیا مگر قلب پریشان اور "نفس مضطرب" کا علاج انسان کے بس کے باہر دکھائی دے رہا ہے۔ سکون قلب اور طمانینت روح کے لیے انسان گھبرا کر شراب کا سہارا لیتا ہے اور ایک منزل وہ آتی ہے کہ گویا غرق مئے ناب ہو جاتا ہے۔

کبھی جنس پرستی (SEX) کی طرف چل پڑتا ہے تو اس راہ میں ہر فطری حد کو توڑ دیتا ہے، نہ جنس کی قید رہتی ہے، نہ صنف کی، نہ رشتہ کی نہ سن و سال کی، نہ اپنے کی اور نہ پرائے کی۔

کبھی دولت کی طرف جھپٹتا ہے تو حرام و حلال کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ جعل، فریب، رشوت، ظلم، ستم، قتل اور غارت جس راہ سے بھی دولت مل سکے یہ سمیٹتا چلا جاتا ہے۔

مگر ساری خواہشیں پوری ہو جانے کے باوجود، دل کی یہ حسرت نکل جانے کے بعد بھی اسے سکون نہیں ملتا تو یہ مسکن دواؤں کا استعمال شروع کر دیتا ہے، خواب آور گولیاں کھانا شروع کر دیتا ہے اور اس کے بعد بھی ذہنی کرب اور اندرونی گھٹن (FRUSTATION) کم نہیں ہوتی تو ذرا ذرا سی بات پر یا دوسروں کو قتل کر کے ان کی زندگی ختم کر دیتا ہے یا خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

حیرت ہے کہ بار بار کے تجربہ کے باوجود انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھ پا رہا ہے کہ عیاشیاں

دولت، سائنس کی نت نئی ایجادیں مادی ہیں، یہ صرف اس کے جسم کو سکون دے سکتی ہیں، روح کو نہیں، قلب کو نہیں، نفس کو نہیں۔ قلب کو روح کو نفس کو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے "ایمان سے "وقلبه مطمئن بالایمان" سورہ النحل آیت: ۱۰۶) مالک حقیقی کی یاد سے الابذکر اللہ تطمئن القلوب (سورہ الرعد آیت: ۲۸)

تجربہ شاہد ہے کہ مادہ پرست فرد ہو یا قوم، آسائش اور اقتدار کو حاصل کرتی ہے تو نعمتوں اور آسائشوں کے نشے میں قابو کیا، انسانیت کے جامے سے باہر ہو جاتی ہے اور حیوانیت کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے کہ جانور بھی شرمندہ ہو جائیں (کلا ان الانسان لیطغیٰ ان رآہ استغنی سورہ علق آیت ۶) اور نعمتیں جانے لگتی ہیں، اقتدار خطرہ میں پڑتا ہے، مصیبتیں سامنے آجاتی ہیں تب بھی انسان ان نعمتوں اور اقتدار کو بچانے کے لئے شرافت اور انسانیت کے سارے حدود پھلانگ جاتا ہے وَ اِنْ اصابته فتنة انقلب علیٰ وجهه سورہ الحج آیت: ۱۱)

اس کے برخلاف خدا پرست انسان نہ نعمتوں کے وفور میں حد سے گزرتا ہے نہ مصیبتوں کے ہجوم میں مضطرب و پریشان ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں نعمتیں اور مصیبتیں امتحان کے دو پرچے ہوتے ہیں خالق کائنات جن کے ذریعہ انسان کا امتحان لیا کرتا ہے۔ اسے نعمتیں ملتی ہیں تو ان کو امتحان سمجھتا ہے۔ اس لیے ان نعمتوں کو اللہ کے بندوں کی راہ میں صرف کر کے اجر آخرت کا طلب گار ہوتا ہے اور اگر مصیبتوں میں گھرتا ہے تو اسے بھی اپنے لیے ایک امتحان تصور کر کے صبر و استقامت اور عزم و استقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ کر کے رضاء پروردگار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے ان دونوں ہی موقعوں پر اس کا نفس مطمئن اور قلب پر سکون رہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ نفس دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو نعمتوں کے وفور یا مصیبتوں کے ہجوم میں مضطرب و پریشان ہو کر انسان کو صراط مستقیم سے ڈگمگا دیں دوسرے وہ جو ان دونوں حالتوں میں پر سکون رہ کر انسان کو صراط مستقیم پر جمائے رکھیں۔ پہلے قسم کے نفس کو مذہبی اصطلاح میں "نفس امّارہ" اور دوسرے قسم کے نفس کو مذہبی اصطلاح میں "نفس مطمئنہ" کہا جاتا ہے۔

نعمتیں اور اقتدار ملنے پر نفس امّارہ رکھنے والا انسان کیا ہو جاتا ہے اگر یہ دیکھنا ہو تو نمرود، فرعون، یزید اور ہٹلر کے اپنے اپنے وقت میں دور اقتدار کو دیکھ لیں اور اقتدار خطرہ

میں پڑے مشکلیں اور مصیبتیں سامنے آجائیں تو نفس امّارہ رکھنے والا انسان کیا ہوجاتا ہے ، اس کے لیے بھی آپ انھی نمرود ، فرعون ، یزید اور ہٹلر کے اس دور کو دیکھ لیں جب ان کا اقتدار خطرہ میں آگیا تھا ۔ آپ دیکھیں گے کہ کبھی ایک انسان کو جلانے کے لیے لاکھوں من لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں ، کبھی ہزاروں معصوم بچوں کو انکی ماؤں کی گودیوں سے چھین چھین کر ذبح کردیا جاتا ہے ۔ کبھی کبھی آل رسولؐ پر ایسا ظلم کیا جاتا ہے کہ لفظ یزید ظلم کا ہم معنی بن جاتا ہے اور کبھی ہزاروں کو زندہ جلاکر خود اپنی زندگی کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کرلیا جاتا ہے ۔

اس کے برخلاف نفس مطمئنہ رکھنے والے افراد کا کردار ان دونوں موقعوں پر کیا ہوتا ہے اس کے شواہد بھی تاریخ میں موجود ہیں ۔

حضرت سلیمانؑ کو حکومت ملی اور ایسی کہ نہ اس سے قبل کسی کو ایسی حکومت ملی نہ اس کے بعد کسی کو ملیگی ۔ مگر یہ حکومت ملی تو زبان سلیمان پر دل سے نکلی ہوئی یہ دعا تھی رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ ..... الصالحین (سورہ النمل آیت ۱۹) "پروردگارا مجھے توفیق دے کہ میں ہمیشہ شکر گزار رہوں ان نعمتوں کے لیے جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر نازل فرمائیں" اور اس حکومت کے بعد میرا طرز عمل میرا طریقہ کار ایسا رہے کہ تو خوش ہوجائے اور تو اپنے رحم و کرم کے صدقہ میں میرا شمار اپنے نیک بندوں میں کرلے " خدا کے نیک بندوں کی دعائیں ان کے دلی جذبات اور طرز فکر کی آئینہ دار ہوتی ہیں ۔ وہ جس مقصد کے لیے دعا کرتے اس کی راہ میں تن من دھن سے لگ بھی جاتے ہیں ۔ خدا کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اسے خدا کے بندوں کی راہ میں صرف کیا جائے ۔ حکومت ملنے کے بعد جناب سلیمانؑ کا یہ عزم اس بات کی دلیل تھا کہ ان کے سینہ میں نفس مطمئنہ ہے نفس امارہ نہیں ۔

حضرت یوسفؑ کو مصر پر حکومت ملی تو ظلم و عدوان تمرد و سرکشی کی نمونہ نہ ہوئی جو نفس امّارہ کی علامت ہوتی ۔ بلکہ آپ عفو و کرم کا نمونہ بن گئے ۔ حکومت ملی تو جان کے دشمنوں کی بھی غذا کی ناکہ بندی نہ کی بلکہ قحط پڑا تو کبھی باقیمت اور کبھی بے قیمت سامان غذا فراہم کیا گیا ۔ جن لوگوں نے یوسف کے قتل کی سازش کی تھی ان کو معافی ہی نہیں دیدی گئی ، اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلایا گیا ۔ یہ کردار نفس مطمئنہ رکھنے والوں کا ہوتا ہے نفس امّارہ رکھنے والوں کا نہیں ۔

صاحبان نفس مطمئنہ کے با اقتدار ہونے کی حالت کے کچھ اور مثالی نمونہ دیکھنا چاہیں تو تاریخ کے

ان مقامات کی ورق گردانی کریں جب رسول خاتم تہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے تھے یا امیر المومنین
کو دنیاوی اقتدار ملا تھا۔

خطرات کے موقع پر اور مصیبتوں کے ہنگام میں اطمینان نفس، سکون قلب اور عظمت کردار کے
نمونہ بھی صاحبان نفس مطمئنہ کی سیرت میں نمایاں ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے جلانے کے لیے آگ روشن کی گئی اور ایسی کہ تاریخ بشر میں نہ اس سے قبل
نی آگ فراہم کی گئی تھی نہ اس کے بعد کبھی فراہم کی گئی۔ ایک انسان کے لیے اس قدر آگ کا فراہم کرنا اضطراب
قلب نمرود کا پتہ دے رہا تھا۔ مگر دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق میں رکھ کر تیزی سے گھمایا جاتا
ہے اور متعدد چکر دیکر آگ کے سمندر کی طرف اچھال دیا جاتا ہے، ظاہری حالت میں موت و زندگی میں چند
ثانیوں کا فاصلہ رہ گیا ہے، بھڑکتے شعلے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ ہوا میں قلابازیاں کھاتے
جا رہے ہیں، نہ ہاتھ قابو میں نہ پیر نہ سر قابو میں نہ دھڑ۔ مگر اس عالم میں بھی جب جبرئیل آکر سوال کرتے ہیں
هل لك حاجة ؟ خلیل خدا کیا کوئی تمنا ہے؟ کوئی آرزو ہے؟ تو جواب وہ دیتے ہیں جو اس بات کا
شاہد ہے کہ جسم چاہے قابو میں نہ ہو مگر صاحب نفس مطمئنہ کا دل و دماغ، نفس سب بالکل اطمینان و سکون
کی حالت میں ہے۔ فرماتے ہیں اما الیك فلا - ہے تو تمنا ضرور مگر تم سے نہیں کہوں گا، جبرئیل نے کہا
پھر جس سے کہنا ہے اس سے کیوں نہیں کہتے، جواب دیا کہ وہ دل کی تحریر خود ہی پڑھ رہا ہے، کہنے کی
ضرورت نہیں۔

حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے بچانے کے لئے راتوں رات بنی اسرائیل سمیت
مصر سے روانہ ہو گئے۔ فرعون کو خبر ہوئی تو زبردست لشکر لیکر تعاقب میں روانہ ہوا ابھی بنی اسرائیل
بحر احمر کے قریب ہی پہنچے تھے اور سوچ ہی رہے تھے کہ اس سمندری پٹی کو کیونکر عبور کیا جائے کہ
فرعون اپنے لشکر کو لیے ہوئے موجیں مارتا ان کے سر پر پہنچ گیا۔ سامنے بھی موت، پیچھے بھی موت
بنی اسرائیل لاکھوں تھے مگر گھبرا گئے، ٹھنڈے پسینے آگئے، بےچین ہو کر کہا انا لمدركون
(سورہ الشعراء آیت: ۶۱) لو ہم تو دھر لیے گئے۔ مگر جناب موسیٰ تنہا تھے مگر صاحب نفس مطمئنہ تھے
اس لئے کمال اطمینان کے ساتھ جواب دیا کہ: كلا إن معي ربي سيهدين (سورہ: الشعراء آیت ۶۲)
ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا پروردگار ہے وہ ضرور نجات کی کوئی راہ پیدا کرے گا۔

حضورکریمؐ خطرات کے موقع پر کیسا مطمئن رہتے تھے۔ اس کے لیے امیرالمومنینؑ کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں: "جب جنگ کا تنور بھرپور بھڑکنے لگتا تھا اور پرجگر افراد تک کو میدان میں ٹکنا دشوار محسوس ہونے لگتا تھا تو ہم کو رسولؐ کے مطمئن چہرہ کو دیکھ کر صبر و سکون کا درس ملتا تھا۔"
شب ہجرت بستر رسولؐ کا کھنچی ہوئی تلواروں کے سایہ میں آرام کرتے رہنا صاحب نفس مطمئنہ ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

سیرت معصومین کے یہ سارے ہی نمونہ خطرات، شدائد اور مصائب کے مقابلے میں صاحبان نفوس مطمئنہ کے سکون قلب اور طمانینت روح کے بہترین نمونہ تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سکون قلب طمانینت روح اور اطمینان نفس کا جو مظاہرہ حسین بن علیؑ نے کربلا کے میدان میں کیا وہ بالکل بے مثال تھا۔

کربلا کے قبل و بعد اللہ کے مقرب بندوں نے مصائب و خطرات میں سکون قلب کا ثبوت بیشک پیش کیا، مگر وہاں امتحان صرف ایک یا چند ایک رخوں سے تھا، خطرات تھے، مصائب تھے، مگر قابل شمار، یعنی وہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا کیا مصیبتیں پڑیں اور یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کونسی مصیبت نہیں پڑی۔

عظیم رہنما وہی ہوتا ہے جو حالات کا صحیح تجزیہ کرے، صحیح علاج تجویز کرے اور پھر علاج کو صحیح طریقہ سے انجام تک پہنچائے۔ مگر تجزیہ، فکر اور عمل کی منازل انسان صحیح طریقہ اسی وقت اختیار کر سکتا ہے جب ان تینوں منزلوں میں حالات کے زبردست دباؤ کے باوجود اس کا دل و دماغ پرسکون اور اطمینان کی حالت میں ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ نے حالات کا بالکل صحیح تجزیہ کیا، بالکل صحیح علاج تجویز کیا اور اس علاج کو صد در صد صحیح طریقہ سے شدید ترین ناگوار حالات میں روبہ کار کیا۔

حسینؑ نے مدینہ میں آنے والے حالات کے متعلق جو پیش بینی کی تھی وہ ادنیٰ جزئیات کی حد تک بالکل صحیح نکلی، جس موقع کے جس طریقۂ کار کا انتخاب کیا وہ بھی صد در صد درست تھا اور اس عمل کے مختلف مراحل کے لیے جن افراد کا انتخاب کیا یہ انتخاب بھی محیر العقول حد تک درست نکلا۔ مدینہ میں کیا ہوگا، مکہ میں کیا ہوگا، کربلا میں کیا ہوگا، بعد شہادت کوفہ اور دمشق میں

کیا ہوگا یہ سب گویا حسینؑ اپنی دوررس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر ہر عمل کے لیے حسینؑ نے جس طریقۂ کار کا انتخاب کیا اس سے بہتر طریقۂ کار ممکن نہ تھا اور ہر طریقۂ کار کے لیے جن افراد کو منتخب کیا ان سے بہتر افراد ممکن نہ تھے۔ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے مضمون کافی نہیں کتاب کی ضرورت ہے۔

حسینؑ کا کمال یہ نہ تھا کہ ہجوم بلا و مصیبت میں خود پرسکون رہے بلکہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جن کو حسینؑ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، بوڑھے ہوں یا بچے، آزاد ہوں یا غلام و کنیز، عرب ہوں یا عجم، ان سب کے عزم میں، ارادہ میں، صبر و ثبات میں جذبہ سرفروشی میں حسینی عزم، حسینی ارادہ، حسینی صبر و ثبات اور حسینی جذبۂ سرفروشی یوں جھلک رہا تھا کہ کربلا میں، کوفہ میں، شام میں لشکر حسینی کا ہر سپاہی مرد ہو یا عورت بوڑھا ہو یا بچہ اپنی جگہ پر حسینؑ بنا ہوا تھا۔ کربلا میں زیادہ تر مردوں کو صبر و استقامت کے جوہر دکھانے کا موقع ملا مگر کوفہ و شام میں عورتوں نے صبر و استقامت، عزم و استقلال کے محیر العقول کارنامہ پیش کیے اور غیروں تک سے کلمہ پڑھوالیا کہ "تمہارے مرد بہترین مرد اور تمہاری عورتیں بہترین عورتیں ہیں"

ظاہر ہے جس کے ساتھی محیر العقول صبر و ثبات کے نمونہ پیش کریں خود اس کا سکون و اطمینان کس شان پر ہوگا، اس کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے۔

میرے خیال میں کربلا کی سب سے سنگین قربانی وہ تھی جو بظاہر سب سے زیادہ سبک تھی، جب ایک چھ ماہ کا بچہ حسینؑ کی گود میں خون میں نہا گیا تھا۔ مگر اس منزل پر بھی حسینؑ کے سکون و اطمینان میں فرق نہ تھا، فرما رہے تھے   پروردگارا یہ منزل بھی آسان ہے اس لیے کہ تو نظروں کے سامنے ہے۔

کربلا کے میدان میں دوستوں، عزیزوں، جگر کے ٹکڑوں کے لاشے اٹھانے کے بعد بھی بیکس سیدانیوں اور سہمے ہوئے بچوں کے پرہول مستقبل کو نظروں میں رکھنے کے باوجود بھی، سیکڑوں زخموں کے ہوتے ہوئے بھی جہاد آخری میں حسینؑ کتنا مطمئن تھے اس کے لیے خود حسینؑ کے ایک دشمن کا بیان ہے:

"خدا کی قسم میں نے کربلا سے پہلے اور کربلا کے بعد کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا

جو اتنا مصیبت زدہ ہو، اتنا زخمی ہو، اتنا پیاسا ہو جتنا حسینؑ تھے اور پھر اتنا مطمئن ہو، اتنا پرسکون ہو جتنا مطمئن اور پرسکون حسینؑ جہاد آخر کے وقت دکھائی دے رہے تھے۔"

جہاد آخر ختم ہوا، شہادت کی منزل سامنے آئی، شمر خنجر بکف دکھائی دیا تو حسینؑ نے فرمائش کی نہ صرف یہ کہ مجھے اس معبود کی بارگاہ میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کر لینے دے جسکی یاد دل میں بسائی تو وہ قوت ملی، وہ طاقت برداشت ملی کہ پہاڑوں کو پگھلا دینے والے مصائب کے ہجوم میں نہ گھبرایا نہ تڑپا نہ مضطرب ہوا نہ دماغ معطل ہوا نہ فکر نے ساتھ چھوڑا۔ حسینؑ نے نماز شروع کی، سر سجدہ میں رکھا، قاتل پشت پر آیا، گردن پر خنجر رواں ہوا اور حسینؑ کے کانوں میں مشیت کا نغمہ گونج رہا تھا۔ یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔ اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف کامیابیوں دکامرانیوں کے ساتھ پلٹ آ۔ تو مجھ سے خوش میں تجھ سے راضی۔

علامہ اقبال

لا اِلٰہ اِلّا اللہ

نکتہ‌ئی می گویم از مردانِ حال:
امّتاں را لا جلال الّا جمال

لا و الّا احتسابِ کائنات — لا و الّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید و از الّا سکون
تا نہ رمزِ لا اِلٰہ آید بدست — بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست — ایں نخستین منزلِ مردِ خداست
ملّتے کز سوزِ او یک دم تپید — از گلِ خود خویش را باز آفرید
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات
از جنونش ہر گریباں چاک نیست — در خورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست
جذبۂ او در دلِ یک زندہ مرد — می کند صد رہ‌نشیں را رہ نورد

بنده را با خواجه خواهی در ستیز؟ تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز
هر کرا این سوز باشد در جگر هولش از هولِ قیامت بیشتر
لا مقامِ ضربهائے پے بہ پے این غوِ رعد[1] است نے آوازِ نے

ضربِ او هر بود را سازد نبود
تا برون آئی ز گردابِ وجود

با تو میگویم ز ایامِ عرب تا بدانی پخته و خامِ عرب
ریز ریز از ضربِ او لات و منات در جهات آزاد از بندِ جهات
هر قبائے کہنه چاک از دستِ او قیصر و کسریٰ هلاک از دستِ او
گاه دشت از برق و بارانش بدرد گاه بحر از زورِ طوفانش بدرد
عالم در آتشِ او مثلِ خس این همه هنگامهٔ لا بود و بس
اندرین دیرِ کہن پیہم تپید تا جہانِ تازهٔ آمد پدید
بانگِ حق از صبح خیزیهائے اوست هر چه هست از تخم ریزیهائے اوست
اینکه شمعِ لاله روشن کرده اند از کنارِ جوئے او آورده اند

لوحِ دل از نقشِ غیر الله شست
از کفِ خاکش دو صد هنگامه رست

---

[1] غوِ رعد : بجلی کی کڑک

هم چنان بینی که در دورِ فرنگ　　بندگی با خواجگی آمد بجنگ

روس را قلب و جگر گردیده خون　　از ضمیرش حرفِ لا آمد برون

آن نظامِ کهنه را برهم زد است　　تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

کرده ام اندر مقاماتش نگه　　لا سلاطین لا کلیسا لا اِلٰه

فکرِ او در تند بادِ لا بماند　　مرکبِ خود را سوئے الّا نراند

آیدش روزے که از زورِ جنون　　خویش را زین تند باد آرد برون

در مقامِ لا نیاساید حیات　　سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لا و الّا سازو برگِ امتاں　　نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں

در محبّت پختہ کے گردد خلیلؑ　　تا نگردد لا سوئے الّا دلیل

اے که اندر حجره ها سازی سخن　　نعرهٔ لا پیشِ نمرودے بزن

ایں که می بینی نیرزد با دو جو　　از جلالِ لا اِلٰہ آگاه شو

هر که اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جمله موجودات را فرمانرواست

دلیل : راه نما

توجّہ طلب

ہمارا پوسٹ بکس بدل گیا ہے نوٹ فرمائیں :

۱۵۸۱۵/۳۱۹۵

تہران ـــ ایران

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۲۱۹۵ / ۱۵۸۱۵
جمہوری اسلامی ایران ۔ تہران

فارم ممبری

براہ مہربانی درج ذیل پتے پر مجلۂ توحید اردو ارسال فرمادیا کریں۔

نام .... کوچہ .... روڈ ------------

شہر .... صوبہ .... ملک ....

تاریخ ------------------------ دستخط

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ	سالانہ
اسلامی جمہوریہ ایران	۱۵۰ ریال	۵۰۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے	۵۰ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم	۳۲ درہم
سعودی عرب	۸ ریال	۳۲ ریال
قطر	۸ ریال	۳۲ ریال
کویت	۶۵۰ فلس	۲½ دینار
افریقہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ	۸ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
کینیڈا	۴½	۱۸ ڈالر

اسلامی، علمی، فکری [illegible] رسالہ

توحید

جلد ۱، شمارہ ۳، صفر ـ ربیع الاول ـ ربیع الثانی [illegible]

مقاصد

كلمة التوحيد
و
توحید الکلمہ

قرآن وسنت وسیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔

علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔

اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔

فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔

عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی تحریکی [illegible] انقلاب [illegible]

[illegible]

بدل اشتراک

ملک	فی عدد
ایران	۲۰۰ ریال
پاکستان	۱۵ [illegible]
ہندوستان	۱۵ [illegible]
بنگلہ دیش	۱۵ [illegible]
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	[illegible]
افریقہ	[illegible]
برطانیہ	[illegible]
امریکہ	[illegible]
کینیڈا	[illegible]

ترسیل زر کا پتہ

[illegible]

توحید

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد (۱) شمارہ (۴)

ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۳۱۹۵
تہران۔ جمہوری اسلامی ایران
فون ۲۵ - ۸۲۵۰۲۲

صفر ۔ ربیع الاول ۔ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ / نومبر ۔ دسمبر ۱۹۸۴ء ۔ جنوری ۱۹۸۵ء

فکر و فلسفہ

شعر

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نوٹ : ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ۔

شذرہ

(۱)

نبیِ خاتم رسول اعظم ـــ
قرآن جس کی جان، زندگی جس کی قرآن ـــ
وہ نبی مکرمؐ جس کا شہرِ ولادت، خدائے وحدہ لاشریک کی قسم ـــ لا اقسم بھذا البلد وانت حلٌ بھذا البلد ـــ اور ـــ ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ ـــ اور جس کا گھر ووالدٍ وما ولد ـــ جس کا مربّی ـــ الم یجدک یتیماً فآوی ـــ جس کی زندگی کا آغاز ـــ وانک لعلیٰ خلقٍ عظیم ـــ اور ـــ علّمک مالم تکن تعلم ـــ جس کی تخلیق و وجود ـــ ما ارسلناک الا کافۃً للناس بشیراً ونذیرا ـــ جس کا اعلان رسالت سے پہلے یہ عالم کہ وہ کون سا لمحہ ہوگا جب کارِ تبلیغ شروع کروں گا ـــ ووجدک ضالاً فھدیٰ ـــ وہ مبارک لمحہ آیا جب انتظار کا کرب اور فکر و تردد کا خاتمہ ہوا ـــ فاصدع بما تؤمر واعرض عن الجاھلین ـــ وحی آئی تو بشارت علم لائی ـــ اقرا باسم ربک الذی خلق ـــ اعلان رسالت کیا تو نویدِ انعام آئی ـــ لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ـــ جس نبیِ اکرمؐ کو ایک نجی جلسے کا حکم دیا ـــ وانذر عشیرتک الاقربین ـــ جس نے نبوت کے فرائض ادا کرنا شروع کیے تو خوشی سے دل باغ باغ ہونے لگا ـــ الم نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظھرک ـــ مشکلات تبلیغ اور دشمنوں کے سخت ترین حملوں کے بارے میں ہمت بڑھائی ـــ ان مع العسر یسرا ـــ پورے پورے دن دکھ جھیلنے اور پیغام حق پہنچانے کو دیکھا تو کہا ـــ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ ـــ راتوں کو عبادت میں دن کر دیا تو ندا آئی ـــ یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا ـــ بندگی کے نقطۂ کمال دیکھنے میں اپنے محبوب کا جذبہ دیکھا تو ـــ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا ـــ لنریہ من آیاتنا ـــ کا اعلان کیا ـــ گود کے خالی ہونے پر دشمن نے طعنہ دیا تو یقین دلایا ـــ انا اعطیناک الکوثر

فصل لربک وانحر ان شانئک ہو الأبتر ۔

مکہ والوں کو سزا دینے اور مدینے کو نیا مرکز بنانے کا وقت آیا تو ارشاد ہوا ۔ واصبر علیٰ مایقولون واہجرہم ہجرا جمیلا ۔ ہجرت کے وقت کافروں کی رکاوٹ غیر مؤثر قرار دی تو قرآن میں آیا ۔ وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینا ہم فہم لایبصرون ۔ قافلۂ مہاجرین قبا میں اترا ، حضورؐ نے مسجد بنائی تو اللہ نے تعریف کی ۔ لمسجد اسس علی التقویٰ من اول یوم احق ان تقوم فیہ ۔ مدینہ میں احکام کا سلسلہ جاری ہوا تو اس نوید کے ساتھ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا ۔ رسول اللہؐ نے کمال اطاعت کا ثبوت دیا تو سند ملی ۔ ولقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ ۔ قبلہ کی سمت بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف ہوئی تو دل کو ہی کے انداز میں فرمایا ۔ فلنولینک قبلۃ ترضاہا ۔ دشمن کے ظلم اور حضورؐ کے صبر کی حد نہ رہی تو اجازت ملی ۔ یا ایہا النبی جاہد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم ۔ جہاد شروع ہوئے تو پیش قدمیاں بڑھیں تو بشارت ہوئی ۔ اذا جاء نصر اللہ والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا ۔ بدر واحد ، خیبر و خندق کے معرکے سر ہوئے اور مکہ میں جانے کا شوق فراواں آخری حد میں داخل ہوا تو وحی نے پیشگی مطلع کیا ۔ لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین ۔ حج سے مشرف ہوئے اور لاکھ سے زیادہ حاجیوں کے قائد کی حیثیت سے پلٹے تو حکم آیا ۔ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک ۔ آنحضرتؐ نے غدیر خم میں تعمیل حکم میں اعلان وصی کیا تو کمال دین و تمام نعمت پر آیت اتری ۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ۔

(۲)

مسلمانان عالم کے لیے ماہ ربیع الاول ، عید کا مہینہ ہے ۔ معانقہ و پیام تہنیت کا زمانہ ، اسلام و رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تجدید عہد کے دن ، اتحاد و اتفاق و یگانگت بڑھانے کے لمحات ہیں ، سب جشن مناتے ہیں ، گھر گھر خوشیاں اور روشنیاں ہوتی ہیں میلاد کے جلسے اور سیرت کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں ، مگر مقامی اور علاقائی طور پر ۔ انقلاب اسلامی کے قائد حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ العالی نے جس طرح حج کو عالم اسلام کے مسائل سمجھنے

اور حل کرنے کا مبارک موقع قرار دیا ہے۔ توحید کی تبلیغ اور نفی ماسوی اللہ، عبادت و ریاضت کا درس حاصل کرنے، اسلام اور اسلامیانِ عالم کو پرچم لا الہ الا اللہ تلے یکجا ہونے کی دعوت دی اور اس سلسلے میں عملی اقدامات کرکے دنیا بھر کے مسلمانوں کو بیدار کیا اور حجاج کرام گواہ ہیں کہ رہبر اعظم کے اس پیام نے انھیں مشرق و مغرب کی بڑی طاقتوں کی تحقیر اور عقیدۂ توحید کی قوت سمجھنے میں مدد بھی دی اور استعماری قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی جرأت بھی بخشی ہے۔ یہ بات اور یہ عمل اسلامی عقائد کو عملی طور پر ثابت کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر اور یہ اقدامات اسلام کے زندہ و پائندہ ہونے کے ثبوت ہیں۔

امامِ اُمت نے اسلام کی عظیم عبادت حج ادا کرنے والوں کو جس قدر توجہ سے درس و پیام دیے اور تعلیم قرآن و سنت سے باخبر کیا اسی قوت اور توجہ سے ماہ ربیع الاوّل کی اہمیت اور عید میلاد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت پر زور دیا، پوری دنیا میں "ہفتۂ وحدت" کا پروگرام وحدت ملت کا تعلیمی پروگرام بھی ہے اور تربیتی نصاب بھی۔ ہر جگہ علماء اسلام بلا تمیز رنگ و نسل، بلا امتیاز فرقہ و گروہ جمع ہوں، تعلیم اسلام پر غور کریں، سنت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ کریں، اور تمام دنیا پر ثابت کریں کہ جس طرح حج میں مسلمان عقیدۂ توحید پر ایک ہوتے ہیں، عقیدۂ رسالت میں بھی ایک ہیں اور دشمنان اسلام کو بتا دیں کہ وہ ایک ہیں، پھر اس عہدِ مبارک سے فائدہ اٹھائیں۔ مسلمانانِ عالم کو دشمنوں کے چنگل سے آزاد کرائیں۔ تہذیب و ثقافت، تعلیم و احکام اسلام کو اسلامی ملکوں میں نافذ کریں، رحمۃ للعالمین روحی و ارواح العالمین لہ الفدا کی پاک سیرت کے مطابق دنیا کے ستم رسیدہ انسانوں، اور عرب و عجم، سیاہ و سفید، مشرقی و مغربی زنجیروں میں جکڑے ہوئے مستضعفین کو امن و آزادی کی نعمت سے فیض یاب ہونے کی بشارت دیں

(۳)

حسن اتفاق و سعادت کی بہترین مثال یہ ہے کہ تعلیمات رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شارح اور شریعت اسلامیہ کے محافظ امام ششم کی ولادت بھی ربیع الاوّل میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۷ ربیع الاوّل سنہ عام الفیل میں اور امام جعفر صادق علیہ السلام اسی تاریخ

۸۳ھ میں جلوہ آرائے عالم امکان ہوئے ۔ علوم، وثقافت و تاریخ اسلام میں حضرت کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا ہے ۔ جابر بن حیان، ہشام بن حکم، حمران بن اعین، و زرارہ بن اعین، ابان بن تغلب، مفضل بن عمر اور ہشام بن محمد بن سائب اور ابوحنیفہ جیسے مشاہیر کے نام آپ کے شاگردوں میں ہیں ۔ کیمیا، حیوان شناسی، انسان شناسی، علم الانساب، علم جدل، فلسفہ و فقہ و عقائد و تفسیر و حدیث ... ان حضرات کے تاسیسی کارناموں سے تاریخ کے صفحات چمک رہے ہیں ۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد طاغوت عہد مطمئن ہوگیا تھا کہ اس نے خاندان نبوت و دبستان رسالت کا خاتمہ کردیا، مگر امام زین العابدین ؑ کی سعی مسلسل اور امام محمد باقر علیہ السلام کے درس مؤثر کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کی شخصیت اتنی ابھری کہ اس گھرانے کے علاوہ تمام شخصیتیں چھوٹی ہوگئیں ۔ بہت سے نام تو ایسے آئے کہ ارباب نظر ان کا تذکرہ بھی امام کے ساتھ خلاف ادب سمجھتے ہیں ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام، عقل و علم کے سب سے بڑے حامی اور رواج فلسفہ و کلام و فقہ و حدیث کے نقیب تھے انھوں نے متنوع علوم و فنون پر لکچروں کا نیا نظام قائم کیا ۔ ان کا درس خارج مستقبل کی تاریخ کا حرف اول قرار پایا ۔ ان کی مجلس تصنیف و تالیف کی تحریک اور ان کا پیام کتاب و سنت کی ترویج ہے ۔ ہم اس مرحلے پر دو ہری مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔

(۴)

توحید کا یہ آخری شمارہ اس مجلہ کی زندگی کا پہلا سال مکمل کر رہا ہے ۔ ہم نے چاروں شماروں میں چھپے ہوئے مقالات کی مکمل فہرست بھی اس شمارے میں حاضر کی ہے ۔ اس سے احباب کو حوالے اور عام مطالعے میں آسانی ہوگی ۔ الحمد للہ، احباب نے پورے سال جس ذوق و شوق سے اسے پڑھا اس کا ثبوت وہ خطوط اور محبت نامے ہیں جو ہماری ہمت افزائی کا سبب ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں ارباب قلم اور صاحبان فکر کچھ اور زیادہ تعاون کریں کہ ہم اس سال اپنے محور سے نکل کر ذرا اور بڑے دائرے میں قدم رکھیں، زینہ بزینہ بڑھنے کا حوصلہ اور اللہ پر توکل کا عقیدہ ہمارے ساتھ ہے ۔ اچھے ساتھیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھیں گے تو مشرق و مغرب کے فکری تسلط سے آزاد ہو کر اسلامی فکر کے افق روشن کر سکیں گے ۔

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔ ۸ ۔ الصف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیامِ زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا
مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ
وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ
بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ
مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ
فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ فَجَعَلْنَاهَا
نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ۝

ترجمہ :

یقیناً مسلمان و یہودی اور نصرانی و صابی لوگوں میں جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کو ان کے رب کی بارگاہ سے اجر ملے گا، اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے (۶۲)

اور جب ہم نے تم سے میثاق (عہد) لیا اور ہم نے طور کو تمہارے سروں کے اوپر معلق کیا۔ جو ہم نے تمہیں (پیام) دیا اسے مضبوطی سے سنبھالو، اور جو کچھ اس میں ہے اس کا دھیان رکھو! تاکہ تم متقی بن سکو (۶۳)

اس کے بعد تم نے روگردانی کی، پھر اگر اللہ کا فضل و رحم تم پر نہ ہوتا تو تم سب گھاٹا اٹھانے والے ہوتے (۶۴)

اور یقیناً تم اپنے ان آدمیوں کو تو جانتے ہو جنھوں نے "سبت" کے بارے میں زیادتی کی، تو ہم نے ان سے کہا: تم (مسخ ہوکر) ذلیل بندر ہوجاؤ (۶۵)

ہم نے اس واقعہ کو، جن کے سامنے ہوا تھا اور ان کے بعد والوں کے لیے، عذاب (وعبرت) اور متقیوں کے لئے نصیحت قرار دیا (۶۶)

تفسیر:

۶۲۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا ....

آیت میں یہودیوں کی قومیت کو رد کیا گیا ہے، وہ خدا کے قبیلے، بخشے ہوئے خاندان اور تنہا خدا پرستی کے ٹھیکیدار ہونے کے مدعی تھے، اللہ نے گذشتہ زمانے کی نعمت شماری و استحقاق عذاب کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمان، یہود، نصاریٰ اور صابی چار گروہ ایک ہی زمرے میں شامل ہیں، ان میں سے کوئی بھی صرف گروہی بنیاد پر عفو و اجر کا مستحق نہیں، بلکہ خود مسلمان بھی جب تک توحید و قیامت پر مضبوط عقیدہ اور حسب فرمانِ الٰہی اعمال بجا نہیں لاتے انعام و جزا نہیں پائیں گے۔ ہاں، عقیدۂ توحید و اطاعتِ رسولؐ کے بعد دنیا و آخرت میں عذاب سے بے خوف رہنا چاہیے۔

۶۳۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ ....

۶۴۔ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ ....

ایک بات ہو تو کہی جائے یہ بنی اسرائیل عجیب ہیں اللہ نے انہیں اپنے عظیم دین کا ذمہ دار بنایا ان سے کہا کہ موسیٰ پر عقیدہ رکھو، تورات کا احترام کرو۔ قانون کے پابند رہو۔ اس بات کو دل نشیں کرانے کے لیے کوہ طور کا ایک حصہ اتنا بلند کیا کہ سروں پر آگیا۔ اس معجزے کو دیکھ کر انہیں عقیدہ و عمل میں استواری اور راہ تقویٰ میں پائیداری حاصل کرنا چاہیے تھی۔

لیکن انہوں نے عہد شکنی کی۔ اس کے باوجود اللہ کی رحیمیت و رحمانیت آگے بڑھی ورنہ یہ لوگ بڑے عذاب سے دوچار ہوتے۔

---

۱ صابی: ایک قدیم گروہ جو اصولاً بعض انبیاء ماسلف کو مانتا ہے، مگر اس کی کتاب رکتا ہیں الگ دستور الگ اور تاریخ الگ ہے۔ ان کے چند فرقے ہیں۔ کچھ موحد ہیں۔ کچھ مشرک۔ کچھ ستارہ پرست، کچھ بتوں کو بھی مانتے ہیں۔ آج کل یہ لوگ، حران و آہواز و عراق میں پائے جاتے ہیں۔

۶۵۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ . . . .

۶۶۔ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا . . . . . .

بنی اسرائیل کے لیے ہفتہ کا دن محترم تھا اس دن شکار کھیلنا منع تھا۔ مگر شر پسند لوگ حسبِ دستور مخالفت پر اتر آئے اور مچھلیاں پکڑنے لگے۔ جب جرم کا احساس ختم ہو جائے اور آدمی سمجھانے بجھانے سے باز نہ آئے تو سزا میں سختی حکمت کے مطابق ہے اور اس حالت میں سزا نہ دینا بسا اوقات قانون کی اہمیت کھو دیتا ہے۔ چنانچہ ان بدکاروں کے لیے اللہ نے فضا میں کوئی ایسی تبدیلی کی جس کے اثر سے یا پھر ایسا عذاب بھیجا کہ آناً فاناً سب بندر بن گئے اور تین دن میں سب تمام ہو گئے (خاسئین کے معنی ہیں، ہر خیر سے دور، ہر بھلائی سے بے نصیب)

یہ سزا، اللہ نے معاصر قوموں کے لیے عبرت اور مستقبل میں آنے والوں کے لیے نصیحت قرار دی۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے "وما خلفها" سے مسلمان مراد لیے ہیں اور اسی قوم کے متقین کو واقعاً ان تذکروں سے تقوے کا درس زیادہ ملتا ہے۔

نیز ملاحظہ ہو سورۃ الاعراف ۱۶۳ ــ ۱۶۶ - سورۃ المائدہ آیت نمبر ۶۰۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ
قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا
مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ
قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا

وَإِنَّآ إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۝ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ ٱلْأَرْضَ وَلَا تَسْقِى ٱلْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ
فِيهَا قَالُوا۟ ٱلْـَٰٔنَ جِئْتَ بِٱلْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا۟ يَفْعَلُونَ ۝

ترجمہ:

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تم کو بتاکید حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ ان لوگوں نے کہا: کیا تم ہم سے دل لگی کرتے ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہل بنوں (۶۷) ان لوگوں نے کہا: اپنے رب سے ہماری خاطر درخواست کرو کہ وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: وہ بتاکید فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بہت بوڑھی ہو نہ بچھیا، ان دونوں میں اوسط درجے کی ہو۔ جو حکم تم کو دیا گیا ہے اسے فوراً بجالاؤ (۶۸) انھوں نے کہا: اپنے رب سے ہماری خاطر یہ درخواست کرو کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس گائے کا رنگ کیا ہو؟ موسیٰؑ نے کہا: وہ بتاکید فرماتا ہے کہ وہ گائے حتمی طور پر خوب گہرے زرد رنگ کی ہو، دیکھنے والوں کو خوش کر دے (۶۹) ان لوگوں نے کہا، اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں واضح کرے کہ وہ گائے ہو کیسی؟ بلاشبہ گائے تو ہمارے لیے مبہم بن گئی ہے۔ اور اگر خدا نے چاہا تو ہم پتہ لگالیں گے (۷۰) موسیٰؑ نے کہا: وہ بتاکید فرماتا ہے کہ وہ گائے حتمی طور پر نہ اتنی سدھی ہوئی ہو کہ زمین جوتے نہ کھیتی سینچنے والی ہو۔ اچھی خاصی، یک رنگ، بے داغ ہو۔ ان لوگوں نے کہا: اب مطلب کا حق تم لوگوں نے ادا کیا۔ پھر انھوں نے ایسی گائے ذبح (تو) کی لیکن وہ یہ کرنے پر مائل نہ تھے (۷۱)

تفسیر:

۶۷۔ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦٓ . . . . . .

گائے کا قضیہ ـــ اسی تذکرے کی بنا پر اس سورت کا نام "البقرہ" مشہور ہے۔ یہ عجیب وغریب

قوم جسے حضرت موسیٰؑ جیسے عظیم نبی نے مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی، جو فرعون کو شکست دے کر ان سب کو ارضِ مقدس کی طرف لائے۔ حق تو یہ تھا کہ سب ان کے شکر گذار و اطاعت شعار ہوتے مگر اس قوم نے ایک بات بھی خوشی سے نہ سنی اور ایک کام بھی اطاعت گذاری کے طور پر انجام نہ دیا۔ نتیجہ میں قیامت تک کے لیے ملعون ٹھہری۔ قرآن مجید تمام انسانوں کو ان کی تاریخ و کردار سے مطلع کر کے ہدایت کی راہیں روشن کرتا ہے۔

گائے مصریوں کے یہاں مقدس تھی، بنی اسرائیل نے مصر میں رہ کر اس جانور سے محبت سیکھی آقاؤں کو مدتوں پوجا کرتے دیکھا تو خود بھی پوجا کرنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہر قسم کے بتوں کو توڑا حتی کہ فرعون کو (جو انسان نما بت تھا) سرنگوں کیا۔ ان کی اس توحید خالص کے نظام میں جانور پرستی کیسے روا ہوسکتی تھی؟ اللہ نے حکم دیا، موسیٰؑ! انھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دو۔ سادہ سی بات تھی، گائے ذبح کر دیتے، فرمانبرداری کی سند ملتی اور نبی کا مدعا بھی پورا ہوجاتا، مگر انھوں نے تابڑ توڑ سوال پر سوال کیے اور آخر میں چھوٹا منہ بڑی بات کہہ ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیا کرایا اکارت گیا۔ اور نفرین کا قلادہ گردن میں پڑا۔

موسیٰؑ نے کہا: گائے ذبح کرو۔ انھوں نے اسے مذاق کہا۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں مذاق نہیں کرتا۔ یہ فرمایا۔ کہ خدا کی پناہ میں اور نادانوں کی بات کروں۔ یعنی دین و احکام کے معاملے میں مذاق کرنا، بے وقوفوں، بے علم اور ناسمجھ لوگوں کا شیوہ ہے۔ مومن و عالم ایسے مقامات پر سرِ تسلیم جھکاتے ہیں چہ جائے کہ ایک اولوا العزم نبی۔ مگر یہ جواب سننے کے بعد بھی وہ لوگ چپ نہ رہے۔

۶۸۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا ....

پہلا سوال یہ کیا، موسیٰؑ! وہ ہو کیسی؟ لیکن اس بات کے لیے دو گستاخانہ باتیں کیں ۱۔ آپ خود جواب نہ دیں، خدا سے پوچھ کے بتائیں ۲۔ خدا ہی سے نہیں۔ اپنے خدا سے۔ ہمارے لیے پوچھیں۔
پھر سوال بھی یہ کہ "ماھیَ" وہ ہے کیا؟ وہ ہو کیسی؟ گائے، لیعنی چہ!
جناب موسیٰؑ نے نہایت نرمی سے فرمایا، خدا کی رضا ہے کہ گائے اوسط عمر، اوسط درجے کی ہو۔

فافعلوا ما تؤمرون ۔ جس کا حکم دیا گیا اس کی تعمیل جلدی سے کر ڈالو۔ اسی میں بندگی کا اظہار ہے یہی طریقۂ مومن ہے ۔ حضرت موسیٰؑ، تربیت و اصلاح کردار چاہ رہے ہیں ۔

۶۹ ۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا . . . . .

قوم نے دوبارہ اسی بگڑے ہوئے لہجے میں سوال کیا ۔ اپنے رب سے پوچھ کر ہمیں اس کا رنگ بتائیے ؟ حضرت نے فرمایا : اللہ کا حکم ہے ، گائے زرد اور جاذبِ نظر رنگ کی ہو ۔
عمر معلوم کر کے چپ نہ ہوئے ، رنگ پوچھا ، تسلّی نہ ہوئی ۔

۷۰ ۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ . . . ۷۱ ۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ . . . .

کہنے لگے ، اپنے رب سے یہ بھی پوچھیے ۔ وہ ہو کیسی ؟ یعنی وہی پہلا سوال ، وہی الفاظ ، وہی سرکشی ۔ اضافہ یہ کہ ، گائے کی دو صفتیں اور مطلوبہ عمر و رنگ سمجھنے کے بعد بھی ۔ حکم مشتبہ ہے ، مسئلہ صاف نہیں ہوا جواب ملا ۔ ہل چلانے اور کنویں سے پانی کھینچنے والی نہ ہو ۔ وہ پھر بھی کم قیمت مل جاتی ۔ یک رنگ خوشنما زرد ہو اور ایسی کہ دوسرے رنگ کا ذرا سا بھی نشان نہ ہو ۔ تاکہ ایسی گائے تلاش کرنے میں زحمت اور قیمت میں زیادتی برداشت کرنا پڑے ۔

قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ . . . .

پانچویں مرتبہ پھر بولے ۔ اب آپ حق لائے ۔ گویا ، اب تک جو ہوا وہ کچھ اور تھا ۔ نعوذ باللہ ۔ یہ ہے سرکش انسان کے ضمیر کی پستی ۔
بہر حال ، با دل ناخواستہ ، گائے ذبح کی ۔ اور اگر اللہ ، اس قدر اصرار نہ کرواتا اور موسیٰ ذرا بھی چپ ہو جاتے تو گائے کی محبت میں وہ یہ عمل انجام نہ دیتے ۔
آج بھی کبھی کبھی منیٰ میں جانوروں کی قربانیوں پر کچھ اسی قسم کے خیالات سننے میں آتے ہیں ۔ قرآن مجید نے اپنے معجزہ آفرین انداز میں ان کو بہت پہلے سمجھا دیا کہ جب ایک کام کرنا ہے تو اپنی پسند کے لیے نہیں اپنے خدا کی رضا کی خاطر اور حق بندگی ادا کرنے کے لیے ہنسی خوشی انجام دو کہ انعام پاؤ اور متقی کہلاؤ ۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَأْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ :

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا، پھر تمہارے اندر اس بارے میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اللہ، وہ بات ظاہر کرنا چاہتا تھا جسے تم چھپانا چاہتے تھے (۷۲) لہٰذا ہم نے کہا، اس گائے کا کوئی ٹکڑا لے کر اس (مردہ) کے جسم پر مارو۔ یوں اللہ مردے کو زندہ کرتا ہے اور تم کو اپنی آیتیں دکھاتا ہے تاکہ عقل کو استعمال کرو (بات سمجھو) (۷۳) اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ وہ دل پتھر جیسے یا اس سے بھی زیادہ سخت (و بے درد) حالانکہ پتھروں میں ایسے پتھر بھی ہیں جن سے پانی نکلتا ہے، ان میں ایسے بھی ہیں جو خوفِ خدا سے گرتے ہیں۔ اور اللہ، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے غافل نہیں ہے (۷۴)

تفسیر :

۷۲۔ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَأْتُمْ فِيهَا ....

فادّارأتم : دَرَءَ ۔ دفع کیا۔ ادّرء (اختلف) ادّرأتم فیھا۔ تم نے اس معاملے میں جھگڑا کیا۔ ایک دوسرے کو قاتل ٹھہرایا (قاتل کا پتہ نہ بتایا)

۷۳۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ....

گائے ذبح کرنے میں ان کی بحث گائے سے محبت کے علاوہ ان کی ایک کمزوری کا نتیجہ تھی کسی اپنے قریبی رشتہ کے بھائی کو قتل کر دیا تھا، اور قاتل خود یا اس کا خاندان دوسرے شخص کو قاتل کہتا تھا جھگڑا تھا کہ قاتل کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام کے لیے دو صورتیں تھیں یا قتل کا فیصلہ نہ کریں یا خدا سے مدد لیں خدا کی طرف سے کہتے ہیں کہ فلاں قاتل ہے تو قوم جھٹلائے گی۔ اللہ نے ان لوگوں کی رسوائی و بدفطرتی خود ان کے ہاتھوں ظاہر کرنے کے لیے حکم دیا، گائے ذبح کریں، اس ذبیحہ کا ایک ٹکڑا مقتول کے بدن سے مس کریں، مقتول زندہ ہو کر خود بتائے گا، قاتل کون ہے۔ گائے کے معاملے میں وہ لوگ جھگڑے تو ایک جوان مومن کو اس کی گائے کے بدلے بڑی قیمت ملی (گائے کا مالک ایک بوڑھا تھا جس نے اپنے جواں بیٹے کے حسن کردار سے خوش ہو کر وہ رقم اسے دیدی) ذبیحہ کا ایک ٹکڑا چھوایا گیا۔ مقتول نے زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دیا۔ واقعہ کی یہ ترتیب کردار نمایاں کرنے اور متعدد فوائد کے نقطۂ نظر سے معجزہ ہے۔

كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

اس معجز نمائی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے اور خدا کے قادر مطلق محی و ممیت ہونے کا عقیدہ مستحکم ہو جائے۔ جیسے یہ مردہ زندہ ہوا ہے اسی طرح خدا مردوں کو جس طرح چاہے زندہ کر سکتا ہے۔ اسی قسم کے دو واقعے اسی سورے کی آیت ۲۵۹ ـــ ۲۶۰ میں بیان ہوئے ہیں

۷۴۔ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ ....

معجزہ دیکھنے، اور ایک نبی سے بحث کرنے اور وحی کے بعد وحی سننے کے بعد عقل روشن ہونا چاہیے تھی مگر ان کے اور تم یہودیوں کے احساسات مردہ اور دل پتھر بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ قرآن (مشبہ بہ) پتھر اور پہاڑ کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔

(الف) پتھروں سے چشمے پھوٹتے ہیں۔ خود عصائے موسیٰؑ سے پتھروں نے پانی دیدیا تھا

(ب) پتھر خوف خدا سے ریزہ ریزہ ہوتے ہیں۔ طور کا عالم دیکھا جا چکا ہے۔ مگر بنی اسرائیل

وہی پتھر بلکہ اس سے بدتر ثابت ہوئے (یعنی مشبہ وجہ شبہ میں ادنیٰ ہے) اس تشبیہ سے مذمت میں تاکید کا فائدہ ہوا جو اعجازِ کلام کی ایک جہت ہے۔

آخر میں تنبیہ ہے۔ کہ اللہ ہر ایک کے عمل سے باخبر ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ نیتوں کے بھید اور خفیہ کام اس پر عیاں نہیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ
مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ
وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا
وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ
عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ أَوَلَا
يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ وَمِنْهُمْ
أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا
يَظُنُّونَ ۝ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ
ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ
فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ۝

ترجمہ:

کیا تم لوگ آرزو رکھتے ہو کہ یہ (تمہارے قانون و نظام پر) تمہارا جیسا ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ وہ تھا جو، کلام اللہ کو سنتا اور سمجھنے کے بعد اسے الٹ پلٹ کر دیتا تھا، اور وہ سب جانتے بوجھتے تھے (۷۵) اور جب ایمان لانے والوں سے ملتے تو کہتے ہم ایمان لا چکے، اور جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے تو کہتے کیا (مسلمانوں کو) تم وہ بتا دو گے جو اللہ نے تم پر عیاں کیا ہے؟ اس طرح وہ تمہارے

رب کے حضور تم پر حجت تمام کریں گے، کیا تم عقل کھو بیٹھے ہو؟ (۷۶) لیکن کیا وہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ بلاشبہ اللہ، جو (باتیں وہ) چھپاتے ہیں اور جو علانیہ کرتے ہیں انھیں خوب جانتا ہے (۷۷) اور ان میں سے کچھ ان پڑھ (عوام) ہیں جو کتاب خدا کو چند خیالات و مجموعۂ تمنا کے سوا کچھ نہیں جانتے وہ لوگ پندار میں مبتلا ہیں (۷۸) ان لوگوں پر عذاب! جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ کر (اپنی اپچ سے تفسیر کرکے) کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، مقصد یہ ہے کہ تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالیں، مگر وائے اس پر کہ جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور وائے ان پر کہ جو (اور جس طرح کہ وہ) کماتے ہیں (۷۹)

تفسیر

۷۵۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ . . . .

بنی اسرائیل کے یہ کردار اس تفصیل سے یوں بیان کیے گئے کہ مسلمان سوچتے تھے کہ یہودی جلد ہی ایمان لے آئیں گے، ان کے پاس توریت اور اس کا علم ہے، ہمارے نبیؐ کے اوصاف سے باخبر ہیں۔ مخلص مسلمانوں اور سادہ لوح عوام کی یہ خواہش کہ یہودی جلدی اسلام قبول کرلیں، ان کے لیے نفسیاتی پریشانی بنی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کو وحی کے ذریعے حوصلہ دیا گیا اور قرآن نے سمجھایا کہ یہ لوگ اور دعوت حق قبول کریں؟ ان کے باپ دادا جو حضرت موسیٰؑ سے براہ راست کلام خدا سن کر تحریف کیا کرتے تھے، بات سمجھتے تھے مگر الٹ دیتے تھے، جانتے تھے۔ مگر جھوٹ سے باز نہ آتے تھے۔ پھر یہ کیا ماننے والے بن سکیں گے۔

۷۶۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا . . . .

آج ان کا حال تمھارے سامنے ہے، مومنوں سے ملتے ہیں تو مدعی ایمان اور اپنوں میں بیٹھتے ہیں تو جواب طلبیاں کرتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کے پاس کیوں گئے تھے؟
امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا، کچھ یہودی بہت زیادہ دشمنی کا اظہار نہ کرتے تھے بلکہ

مسلمانوں کو تورات میں لکھی باتوں کا حوالہ بھی دے دیتے تھے۔ یہ خبر سربراہوں نے سنی تو انہوں نے ڈانٹا کہ محمدؐ کے اوصاف تورات کے حوالے سے کیوں بتاتے ہو۔ تمھاری اس بات سے تمھارے خدا کے حضور مسلمانوں کی حجت تمام ہو جائے گی اور تم رسوا ہو گے تم عقل کھو بیٹھے ہو، پاگل ہو گئے ہو۔

بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ـــ جو راز، جو معانی اللہ نے تمھیں بتائے ہیں۔ اس مقام پر ہمارے لیے یہ درس ہے کہ تعلیمات الٰہی کے بیان کرنے میں ملامت کرنے والوں کی پرواہ نہ کرنا چاہیے۔

۷۷۔ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ . . . .

کیا ان یہودیوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے تعلیماتِ تورات چھپانے اور نبی آخر الزمانؐ کی دشمنی دل میں رکھنے، اور زبانی اظہار ایمان یا انجان بننے کی حقیقت کو اللہ جانتا ہے؟ نہیں یہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ، عالم ظاہر و باطن ہے۔ دراصل حق جاننے کے بعد چھپانا بدترین بات ہے۔

۷۸۔ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ . . . .

امانی : جمع اُمنیہ : جھوٹ۔ خود ساختہ تمنّائیں۔ پندار۔ تلاوت۔

صورتِ حال یہ ہے کہ ان میں کچھ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، تورات کے تعلیمات سے بے خبر ہیں، تحریف پسند ربّیوں سے جو سنا، اسی کے مطابق اعتقاد بنالیا، وہ اپنے پندار و گمان میں مگن ہیں، کبھی آباؤ اجداد کی بڑائیوں کا خیال کرتے ہیں کہ "نحن ابناء اللّٰہ" مائدہ ۱۸ کبھی کہتے ہیں "لن تمسّنا النار الّا ایّامًا معدودۃ۔" ہمیں تو کچھ ہی دن دوزخ جلاسکے گا۔ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ بھلا ایسوں سے عقل و خرد کی بات ماننے کی توقع ہی کیا۔ یہ فقط کل کی بات نہیں، آج بھی علم و خرد سے ہاتھ دھونے والوں اور سنی سنائی باتوں کو گرہ میں باندھ کر بر خود غلط اندیش آدمیوں کا یہی حشر ہے۔

۷۹۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ . . . .

ویل : ہلاکت۔ تباہی۔ تباہی و بربادی کے وقت کہتے "ویل"

عذاب و تباہی ان لوگوں کے لیے جو اپنی لکھی ہوئی باتوں کو خدا کا پیام و کلام بتاتے ہیں، ان تحریروں اور دعووں کا مقصد ان کی تھوڑی سی قیمت اور چند ٹکے ہیں، بربادی ہے، جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ہلاکت ہے، جو انھوں نے کمایا۔ اللہ کی کتاب میں من مانی تاویلیں اور کلام اللہ میں ردوبدل، چند پیسوں کی خاطر نبی کریمؐ کے صفات جو تورات میں لکھے ہیں انھیں بدلنا۔ صرف دوکانداری کے لیے منشاء باری کو بدلنا سخت نفرین کا سبب ہے، اس لیے ایک آیت میں تین مرتبہ "ویل" کہا گیا ہے۔ نعوذ باللہ۔ کل کے یہودی آج کے وہ لوگ ہیں جو بقول اقبال ؎

آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ
عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى
اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ
خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

ترجمہ:

اور وہ لوگ کہتے ہیں ہمیں گنتی کے چند دنوں کے سوا آگ چھوئے ہی گی نہیں۔ آپ (جواب میں) کہیے کیا تم لوگوں نے اللہ سے عہد لے رکھا ہے کہ اللہ (تمہارا پابند ہوگیا)۔ اپنے قول و قرار کے خلاف ہرگز نہ کرے گا۔ یا اللہ پر بے سمجھے بوجھے طوفان باندھتے ہو۔ (۸۰) ہاں! جو برے کرتوت کرے گا اور اس کی خطائیں اسے گھیر لیں گی۔ وہی جہنمی ہیں۔ وہ سب اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں (۸۱) اور جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے اچھے کام کیے وہ جنتی لوگ ہیں وہ اس بہشت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں (۸۲)

تفسیر

۸۰۔ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا ....

یہودی اپنے تئیں اونچی ذات، خدا کا فرزند (نعوذ باللہ) جانتے اور لوگوں میں پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ، ہمارا کیا، جہنم میں گئے بھی تو صرف اتنے دن جن میں گوسالہ پرستی کی تھی یا سات دن مدتِ تخلیق آسمان آگ ہماری اوپری جلد کو مس کرے گی اور بس، غرور و خود فریبی۔ لن تمسنا النار۔ کا زور ہرگز ہرگز آگ چھوئے گی نہیں مگر چند روز۔ جواب کا تیور و جلال دیکھیے۔ "ہرگز" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا سے دستاویز لکھوالی ہے؟ ذرا ان سے پوچھیے۔ اگر ایسا نہیں۔ یعنی ہرگز ایسا نہیں اللہ عادل ہے، وہاں رحم کی درخواست تو ہوسکتی ہے مگر قانونِ انصاف کے خلاف فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اس کے خلاف کہتا ہے تو خدا پر بہتان باندھتا ہے۔ اس کا قانون دیکھنے کے لیے نہیں عمل کے لیے بنا ہے۔ عمل کے بعد جزا و سزا نہ ہو تو فائدہ ہی کیا؟ (دیکھیے آیت ۱۱۱)

آیت نمبر ۹۴ میں یہی خیال اور اس کا جواب آرہا ہے۔

۸۱۔ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً ....

امامؑ نے فرمایا ہے "سیئہ محیط" یہ ہے کہ آدمی گناہ پیشہ بن کر حدود آئین خدا سے یکسر نکل جائے ولایت خدا و رسولؐ و ائمہ کا عملاً منکر بن جائے، یہی شرک بخدا اور یہی کفر بہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و دشمنی ائمہ علیہم السلام ہے۔ اس کے بعد آدمی نہ مستحق رحم ہے، نہ حقدار شفاعت۔

۸۲۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ....

جو لوگ ایمانِ تابدار اور عمل صالح کے مالک ہیں، راہ رضا پر چلتے رہے۔ ایسے مومن عقیدۂ توحید و اتباع سنت و پیروی اہل بیتؑ کو نصب العین بنائے رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ
لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِى ٱلْقُرْبَىٰ
وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُوا۟ لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا۟
ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم
مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ
وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ
تَشْهَدُونَ ۝ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ
فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَٰرِهِمْ تَظَٰهَرُونَ عَلَيْهِم بِٱلْإِثْمِ
وَٱلْعُدْوَٰنِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَٰرَىٰ تُفَٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ
عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ ٱلْكِتَٰبِ وَتَكْفُرُونَ
بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْىٌ
فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَيَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰٓ أَشَدِّ ٱلْعَذَابِ
وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشْتَرَوُا۟
ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا بِٱلْءَاخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ ٱلْعَذَابُ وَلَا هُمْ
يُنصَرُونَ ۝

ترجمہ :

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے "میثاق" لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین، یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک کرنا اور لوگوں سے بات اچھی کرنا، اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا۔ اس کے بعد تم میں سے کچھ افراد

کے علاوہ تم سب منحرف ہو گئے، اور تم ہی لوگ منہ پھیرنے والے ہو (۸۳)
اور جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم آپس میں خونریزیاں نہ کرنا اور اپنے لوگوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا، پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کے گواہ بھی ہو (۸۴)
پھر وہی تم ہو کہ خود اپنوں کو قتل کرتے ہو اور ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کرنے میں ایک دوسرے کی پشت مضبوط کرتے ہو اور اگر تمہارے پاس قید کر کے لائے جاتے ہیں تو تم خود ان کا فدیہ لیتے ہو۔ حالانکہ تم پر ان کا نکالنا ہی حرام کر دیا گیا تھا۔ کیا تم لوگ "کتاب" (تورات) کے بعض حصے کو مانتے ہو اور کچھ حصے کے منکر ہو؟ اب تمہاری سزا تو یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں ناکام و رسوا رہو اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں دھکیل دیے جاؤ۔ اور اللہ، جو کچھ تم کرتے ہو (اس سے) غافل نہیں ہے (۸۵)
یہی لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلے زندگانی دنیا خریدلی، اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ وہ لوگ مدد سے نوازے جائیں گے (۸۶)

تفسیر:

۸۳۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ . . . .

۸۴۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ . . . .

یہود مدینہ کو تنبیہ کی جا رہی ہے اور تمام مسلمانوں کو عہد قدیم یاد دلایا جا رہا ہے۔ وہ میثاق جو آج بھی تعمیر ذات و معاشرہ کے لیے بلکہ نظم و نسق ملک و ملت کے لیے ہدایت آفرین ہے۔
یاد کرو! ہم نے تمہارے بزرگوں سے عہد لیا تھا:
۱۔ صرف اللہ کی عبادت کرنا اور کسی کو معبود نہ سمجھنا۔
۲۔ ماں باپ پر احسان اور حسن سلوک کرنا۔ اللہ کے بعد یہ دونوں تربیت آدم زاد

کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا احترام خدا کے بعد، ان پر احسان دوسروں سے پہلے اس لیے کہ آداب بندگی وسلیقہ اطاعت وسرداری آجائے۔

۳۔ رشتے داروں، یتیموں اور نادار لوگوں کو نوازتے رہنا کہ سرمایہ داری کی خو اور عوام کو ادنیٰ درجے کا سمجھنے کی حس پیدا نہ ہونے پائے۔ غرور نہ آجائے۔ الگ الگ رہنے کی عادت سے معاشرے میں ہم آہنگی نہیں رہتی۔

۴۔ ہر انسان سے شیریں زبانی اور نرم گفتاری برتنا۔

۵۔ نماز پڑھتے رہنا۔ کہ حضور خدا میں حاضری سے احساسات متاثر ولطیف ہوتے ہیں۔ انسان پر یہ سب سے پہلا حق ہے۔ یہ حق اللہ کی طرف سے ہے۔

۶۔ زکوٰۃ ادا کرنا۔ اس میں غریبوں کا حق ہے۔ حق الناس ہے۔

۷۔ باہم خوں ریزی نہ کرنا۔ امن انسانی اقدار کے فروغ کا باعث ہے، جنگ درندگی اور بد اخلاقی کو جنم دیتی ہے۔

۸۔ کسی کو اس کے گھر یا وطن سے نہ نکالنا۔ اس سے زندگی بے لطف اور معاشرتی مشکلات پیدا ہوتے ہیں۔

۹۔ جب کوئی بنی اسرائیلی قید ہو، تو سب اس کی رہائی کی قانونی سعی کرنا، فدیہ دینا یا ضمانت ادا کرنا۔

تورات یہ عہد نامہ تھا، اسلام نے بھی اس کے بارے میں تاکید فرمائی۔ یہ اللہ کا نظام ہے اسرائیلی، نظام خداوندی سے منحرف ہو کر ذلیل اور قانونی مراعات سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے نہ اللہ کے حق ادا کیے نہ بندوں کے۔ معدودے چند افراد پابند اصول البتہ رہے۔

۸۵۔ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ . . . .

ان سب باتوں کو جاننے اور میثاق خدا کے بعد تم اے اہل یثرب! آپس میں جنگ وقتل وجلا وطنی وقید وبند کے عمل کر رہے ہو، پھر مزہ یہ ہے قیدیوں کو چھڑاتے ہوتے شرارت کرتے ہو۔ خود قید کرتے اور خود جرمانہ وصول کرتے ہو پھر تورات کا حوالہ دیتے ہو؟ شرم کرو! اپنا محاسبہ

کرو۔ اس عمل کی سزا دنیا و آخرت میں بہت سخت ہے۔ اور یہ بنی اسرائیل ہی کے ساتھ نہیں، خدا کا عام دستور یہی ہے کہ پیامِ خدا کو مانو تو سب کچھ مانو، ورنہ سزا سے بچ نہیں سکتے۔

بنی قریظہ اور قبیلہ اوس یہودی تھے، دونوں میں باہمی فوجی معاہدہ تھا، ان کے حریف خزرج بت پرست تھے، ان کا معاہدہ بنو نضیر کے ساتھ تھا۔ جنگ کے موقع پر خوب لڑتے تھے۔ جنگ کے بعد قیدیوں کی رہائی میں توراۃ کے حوالے دیکر کام نکالتے تھے۔ قرآن میں ان لوگوں کی سرزنش کی گئی ہے۔

بعض روایات کے مطابق "ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ" کے مخاطب اس وقت کے مسلمان ہیں، کہ تم خاندان رسالتؐ، سید الشہداؑ اور اصحابِ پیغمبرؐ ابوذرؓ جیسوں کے ساتھ یہ سلوک نہ کرنا ورنہ رسوائی بھی ہوگی اور عذاب کے مستحق بھی ہوگے۔ اور آج بھی یہ تنبیہ برقرار ہے۔

۸۶۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا . . . .

فسادی لوگ، قانون الٰہی کے ایک حصے کو ماننے کا دعویٰ کرنے والے دنیا کے بندے ہیں انھوں نے دین کا دنیا سے سودا کر لیا ہے۔ اس لیے وہ شفاعت سے محروم اور پوری سزا کے مستحق ہوں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا
مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ
بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ
اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (توراۃ) دی اور ان کے بعد بہت سے پیغمبروں کو ان کے قدم بہ قدم لے چلے اور عیسیٰؑ بن مریمؑ کو واضح و روشن معجزے دیے اور

ان کی روح القدس (جبرئیل) کے ذریعے مدد کی۔ کیا تم (اس قدر بد دماغ ہو گئے ہو کہ) جب کوئی پیغمبر تمھارے پاس تمھاری خواہش نفسانی کے خلاف کوئی حکم لے کر آیا اور تم اکڑ گئے اس کے بعد کچھ لوگوں نے ان (پیغمبروں) کو جھٹلایا اور کچھ لوگوں نے ان کو قتل کر دیا (۸۷) اور انھوں نے کہا "ہمارے دل غلافوں میں ہیں" (یہ بات نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے۔ تو (ان میں سے) کچھ لوگ ہی ایمان لاتے ہیں (۸۸)

تفسیر:

۸۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ . . . .

مذکورہ بالا میثاق اور اس کی تفصیل کتاب کی صورت میں وحی کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی۔ یہ کتاب اتنی جامع تھی کہ اس کے انبیاء اور صاحبان صحف کے لیے عرصے تک بطور دستور باقی رہی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو اللہ نے ان کو مزید معجزات دیے۔ روح القدس یعنی جبرئیل کے ذریعے ان کی امداد کی اور انھیں انجیل دی۔

مگر تمھارا دستور یہی رہا کہ پیغمبر اگر تمھاری خواہش کے مطابق حکم دیتے تو قبول کرتے اور خلاف پسند بات کہتے تو اپنی بڑائی اور عقلمندی جتاتے۔ کچھ پیغمبروں کو ماننے سے انکار کیا، کچھ پیغمبروں کو تم نے قتل کیا۔ کسی بھی قوم کی بات ہو اصول یہ ہے کہ رسول خدا کو مانو تو اس کے ہر حکم کو برحق جانو تب جا کر بندگی کامل ہوتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

فبعث فيهم رسله وواتر اليهم انبياءه . . . .

پھر اللہ نے ان انسانوں میں اپنے رسول بھیجے اور لگاتار پیغمبروں کا سلسلہ جاری فرمایا تاکہ وہ اس آدم زاد سے اس کی فطرت کے تقاضوں کو پورا کرائیں اور فراموش شدہ نعمتوں کو یاد دلائیں، پیغام خدا پہنچا کر حجت تمام کریں اور چھپی ہوئی عقل کی قوتوں کو بیداری بخشیں۔

۸۸۔ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ . . . .

سرکشی جب بڑھ جائے تو آدمی کہتا ہے، ہم سنتے ہی نہیں۔ ہماری عقل پر تو پتھر پڑ چکے ہیں یہودی کہتے تھے " دل غلافوں میں بند ہو گئے "۔ احساسات مر چکے ہیں اثر کیسے ہو؟ آپ بیکار یہ باتیں کرتے ہیں۔ جواب ملا ۔ اس انکار شدید کی بنا پر ان لوگوں پر اللہ لعنت کرتا ہے۔ ان سے بات ہی نہ کرو یہ ایمان لانے والے نہیں ۔ ان میں بہت کم افراد ایمان قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ
وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ
مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ بِئْسَمَا
اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا
أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا
بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝

ترجمہ :

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے (قرآن جیسی) کتاب آگئی، وہ اس کی تصدیق بھی کرتی ہے جو (تورات) ان کے پاس ہے ۔ اور وہ لوگ اس سے پہلے (کہ قرآن و نبی آخر الزمان آئے) کافروں پر فتح یاب ہونے کی دعائیں کیا کرتے تھے ۔ جب ان کی جانی بوجھی چیز (شخصیت یا کتاب) آگئی تو انکار کر بیٹھے ۔ اس کے بعد ان کافروں پر اللہ کی لعنت ہے (۸۹) انھوں نے جس چیز کے بدلے اپنی ضمیریں بیچی ہیں وہ کس قدر قابل نفرت ہے ۔ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس بندے پر چاہا اپنے فضل (وکرم) سے جو چاہا نازل کیا (کتاب ہو یا منصب) اب اس حسد کی بنا پر اللہ نے جو کچھ نازل کیا اس سے انکار کر بیٹھے ۔ اس کے بعد وہ (منکر) اللہ کے

غضب در غضب کا نشانہ بن گئے۔ (وہ قہر الٰہی میں گھر گئے) اور کافروں کے واسطے
رسوا کن عذاب ہے ﴿۹۰﴾

تفسیر:

۸۹۔ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ . . . .

یہودیوں کو آنحضرتؐ کے ظہور کی خبر تھی، ان کے دانشور آپ کی آمد و بعثت کے منتظر بھی تھے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یہودیوں کو مقام ہجرت بھی معلوم تھا اسی لیے ان کا ایک گروہ تیما، فدک اور خیبر تک پہنچا جہاں کوہ عیر و احد تلاش کر کے انھیں یقین ہو گیا کہ توراۃ کے تمام علامات اسی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے واقفان حال کو خط بھی لکھے کہ ہم نے وہ جگہ پالی جہاں نبیِ موعود آئے گا (صافی) اور ہم اس کا ساتھ دے کر دشمنوں پر فتح پائیں گے۔

جب نبی اکرم، رسول خاتم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ پہنچے اور یہودیوں کے ربی ملے تو انھوں نے سب کچھ سوچا سمجھا، جیسا پڑھا تھا ویسا پایا تو ان کی قومی خصلتیں پلٹ آئیں آج بھی بات اور شخصیت، انا اور ذات کی خاطر حق کو رد کیا جاتا ہے۔ کل بھی یہی ہوا تھا۔ کج روی کا مزاج یہی ہے کہ بحث کے بعد بات مانی جائے پھر اس کا تدریجی یا مجموعی انکار کر دیا جائے۔ قرآنی فلسفۂ تعلیم یہ ہے۔ اصول خداوندی مان لو۔ پھر جو حکم دیا جائے اس پر عمل کرو۔ اگر اقرار کر کے مکرو گے تو خدا کی لعنت کے مستحق ہو گے۔

۹۰۔ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ . . . .

اللہ نے ان لوگوں کی سرزنش فرمائی ہے جو اللہ سے اپنی خواہش کے مطابق احکام سننا چاہتے ہیں۔ اور جب اللہ ان کے پسند کے مطابق ان کے ہادی نہیں بھیجتا تو یہ لوگ انکار کر بیٹھتے اور مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ حالانکہ اللہ مختار مطلق ہے کسی کو اس کے بھیجے ہوئے پیشوا

پر حق اعتراض کیسے ہو سکتا ہے۔

وَإِذَا
قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا
وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝
وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ
وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ
الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا
وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَ
مَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝

ترجمہ :

اور جب ان سے کہا گیا کہ جو (قرآن) اللہ نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔ انھوں نے (جواب میں) کہا ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم (بنی اسرائیل) پر نازل کیا گیا ہے اور اس کے بعد جو (قرآن و اسلام) آیا اس کو نہیں مانتے۔ حالانکہ وہ (کتابِ محکم) حق ہے اور جو ان کے پاس (تورات) ہے اس کی تائید بھی کرتی ہے۔ (اچھا خیر) ان سے کہیے کہ پھر تم ماضی میں انبیاء اللہ کو قتل کیوں کرتے رہے، اگر (ان پر) ایمان رکھتے تھے؟ (۹۱) اور موسیٰؑ تمہارے سامنے صاف دلیلیں (کھلے معجزے) لائے اس کے باوجود ان کی عدم موجودگی میں تم لوگوں نے گاؤ سالہ (بچھڑے) کو (معبود) بنالیا، اس حالت میں تم ہی ظالم تھے (اور تم ہی کفر ڈھا رہے تھے) (۹۲) اور جب ہم نے تمہارا قول و قرار لیا تھا اور طور کو تمہارے

اوپر لٹکایا تھا، جو احکام ہم تم کو دیتے ہیں، عزیمت (دپختگی) سے لو اور سنو (بات پر دھیان دو)۔ (جن کو تم مومن کہتے ہو) انھوں نے کہا: ہم نے سن لیا مگر عمل نہ کیا۔ اور انکے دلوں میں ان کی بے ایمانی کی وجہ سے گوسالہ سما گیا تھا۔ آپ فرمادیں کہ جن کاموں کا حکم تمہارا (مفروضہ) ایمان تمھیں دیتا رہا وہ بہت ہی برے ہیں۔ اگر تم (بقول خود) اہل ایمان ہو (۹۳)

تفسیر:

۹۱۔ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا ....

مدینہ کے یہودی پیام اسلام کے جواب میں کہتے تھے ہم تو اس کتاب و شریعت پر ایمان لاچکے جو ہم پر۔ ہمارے خاندان، ہمارے انبیا پر ــــ نازل ہوئی تھی کسی غیر پر نازل ہونے والی شریعت ہم نہیں مانتے۔ ان یہودیوں سے کوئی پوچھے کہ عقل دشمنی کی کوئی حد بھی ہے۔ قرآن تو خود گذشتہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن گذشتہ پیغمبروں کی دعوت کو آگے بڑھانے والا پیام ہے۔ دراصل ان لوگوں کا جواب جس تاریخی اور خود ان کے روایتی پس منظر پر مبنی ہے وہ ہے ان کی ہٹ دھرمی۔

۹۲۔ وَلَقَدۡ جَآءَكُمۡ مُّوۡسٰى بِالۡبَيِّنٰتِ ....

موسیٰؑ، کیا کیا دلیلیں نہ لائے، کیا کیا معجزے تھے جو بنی اسرائیل نے نہ دیکھے، مگر اطاعت حکم رسول تو کجا تم نے تو خدا کے مقابلے میں گائے کا بچہ پوجنا شروع کر دیا موسیٰؑ تورات و احکام لے کر طور سے پلٹے تو تم گائے کی محبت میں دیوانے ہو رہے تھے۔ اور دین خدا پر بلکہ خود اپنی عقل پر اور انسانیت پر ظلم ڈھا رہے تھے۔

۹۳۔ وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِيۡثَاقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا ....

اللہ نے میثاق لیا (جس کا تذکرہ آیت ۸۳ میں گذرا) مگر عہد کرنے کے بعد دلوں میں کھٹکا تھا، اللہ نے طور کی پہاڑی ان کے سروں پر لٹکادی، جس سے وہ ڈرے تو (آیت ۶۳) لیکن بات سن کر ٹال دی، نافرمانیاں کرتے رہے۔

گائے کی محبت نے دلوں کو سیراب کیا ـ یہ ایمان ہے؟ تو تمھارے ایمان نے کتنے برے کام تم سے کروا لئے۔ شرم کرو۔

اسلام کا دعوی اور اسلام دشمن عمل، معقول آدمی کی شان کے خلاف ہے۔ آدمی کو اللہ کا پیام سننے کے بعد سراپا تسلیم ہونا چاہیئے کج بحثی تعمیر ذات میں رکاوٹ بنتی ہے۔

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

جناب شیخ محمد قانصوہ

عذرِ بارش

روایاتِ اہل بیتؑ:

١ــ روى عبدالرحمٰن بن ابي عبدالله، عن ابي عبدالله عليه السلام أنه قال: «لا بأس أن تدع الجمعة في المطر»[١].

١. عبدالرحمٰن بن ابی عبداللہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی، حضرت نے فرمایا: بارش میں جمعہ چھوڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

٢ــ محمد بن علي بن الحسين قال: قال النبي (ص): «اذا ابتلت النعال فالصلاة في الرحال»[٢].

والرواية غير مخصوصة بالجمعة بل عامة ثم هي قريبة من رواية أهل السنة.

٢. محمد بن علی بن حسین نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب نعلین پانی میں بھیگنے لگیں تو نماز پالان پر ہوسکتی ہے۔

یہ روایت جمعہ سے مخصوص تو نہیں مگر حضرات اہل سنت کی روایات کے مطابق ہے۔

روایاتِ اہل سنّت :

۱ـ اخبرنا ابوالحسن علي بن محمد المقري، انبأنا حسن بن محمد بن اسحاق، حدثنا يوسف بن يعقوب القاضي، حدثنا نصر بن علي، انبأ سفيان بن حبيب، عن خالد الحذاء، عن أبي تلابة، عن أبي المليح، عن أبيه، أنه شهد رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم جمعة واصابهم مطر زمن الحديبية لم يبتل اسفل نعالهم فأمرهم النبي صلى الله عليه وسلم أن يصلوا في رحالهم [۳].

وروى احمد باسناده الى ابي المليح بن اسامة عن ابيه نحوه [۴].

وروى الهيثمي عن عبدالرحمٰن بن سمرة أن رسول الله (ص) كان يقول؛ اذا كان مطر وابل فليصل أحدكم في رحله، رواه عبدالله، عن ابيه، وجادة [۵]. ورواه المستدرك للحاكم باسناده [٦].

۱۔ ..... ابی الملیح نے اپنے والد سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمعہ کے دن بارش میں حکم دیا کہ لوگ نماز ڈیرے میں پڑھیں۔ حدیبیہ کے دن تھے اور بارش سے لوگوں کی نعلین بھی نہ بھیگی تھیں

احمد نے یہی حدیث اپنی سند سے ابی الملیح بن اسامہ، اپنے والد سے نقل کی ہے۔

ہیثمی نے عبد الرحمٰن بن سمرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے: جب تیز بارش ہو تو ہر شخص تم میں سے اپنے ڈیرہ میں نماز پڑھے۔ اسی روایت کو عبد اللہ نے اپنے والد سے وجادةً نقل کیا ہے۔ اور حاکم نے مستدرک میں اپنی سند سے لکھا ہے۔

۲ـ حدثنا مسدد قال حدثنا اسماعيل قال أخبرني عبدالحميد صاحب الزيادي قال حدثنا عبدالله بن الحرث بن عم محمد بن سيرين، قال ابن عباس لمؤذنه في يوم مطير: اذا قلت أشهد أن محمداً رسول الله فلا تقل حيّ على الصلاة قل صلوافي بيوتكم فكأن الناس استنكروا، قال فعله من هوخير مني ان الجمعة عزمة واني كرهت أن اخرجكم فتمشون في الطين والدحض [۷].

وبهذه الاحاديث اسانيد متعددة ذكزها البيهقي والبخاري فراجع.

۲۔ .... ابن عباس نے بارش کے دن اپنے مؤذن سے کہا "اشھد ان محمداً رسول اللہ" کہنے کے بعد ۔ حی علی الصلاۃ ۔ کے بدلے کہنا ۔ صلوا فی بیوتکم ۔
لوگوں نے یہ بات بہت ناپسند کی، ابن عباس نے کہا ۔ یہ اس کا عمل ہے جو مجھ سے بہتر تھا۔ جمعہ عزیمت ہے، مجھے اچھا نہ معلوم ہوا کہ میں تمہیں کیچڑ اور دلدل میں گھر سے باہر بلاؤں ۔
بیہقی و بخاری نے یہ حدیث متعدد سندوں سے نقل کی ہے۔

پانچ افراد کی شرط

روایاتِ اہل بیتؑ :

۱ــ عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن ابي عمير، عن أبن أذينه، عن زرارة قال: كان[8] ابوجعفر(ع) يقول؛ لاتكون الخطبة والجمعة وصلاة ركعتين على اقل من خمسة رهط الامام واربعة. ورواه الشيخ باسناده عن علي بن ابراهيم مثله [9].

۱۔ .... زرارہ کے بقول ابوجعفر علیہ السلام فرماتے تھے: خطبہ اور جمعہ اور دو رکعتیں پانچ افراد سے کم میں نہیں ہوتیں، امام اور چار دوسرے افراد ۔
شیخ نے اپنی سند سے علی بن ابراہیم کے ذریعے اسی جیسی روایت کی ہے ۔

۲ــ الصدوق، عن أبيه، عن سعد، عن أحمد بن محمد؛ عن البزنطي، عن عاصم بن عبدالحميد، عن ابي بصير، عن ابي جعفر(ع): قال: لا تكون جماعة بأقل من خمسة [10].

۲۔ صدوق .... ابو بصیر امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، حضرتؑ نے فرمایا: جماعت پانچ سے کم میں نہیں ہوتی ۔

۳ـ محمد بن الحسن باسناده، عن الحسين بن سعيد بن عثمان بن عيسى، عن ابن مسكان عن ابن ابي يعقوب، عن أبي عبدالله (ع) قال: لا تكون جمعة ما لم يكن القوم خمسة [۱۱].

۳۔ .... ابن ابی یعقوب، ابوعبداللہ علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں، حضرت نے فرمایا: جب تک پانچ کی جمعیت نہ ہو جمعہ نہیں ہو سکتا۔

روایاتِ اہل سنت:

۱ـ اخبرنا ابوالحارث الفقيه، انبأنا علي بن عمر الحافظ حدثنا ابوبكر النيسابوري، حدثنا محمد بن يحيى، حدثنا محمد بن وهب بن عطية حدثنا بقيه بن الوليد، حدثنا معاوية بن يحيى حدثنا معاوية بن سعيد النجيبي حدثنا الزهري عن ام عبدالله الدوسية، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «الجمعة واجبة على كل قرية وان لم يكن فيها الا أربعة» [۱۲].

۱۔ .... ام عبداللہ الدوسیہ کہتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ ہر بستی پر واجب ہے خواہ اس میں چار آدمی ہی رہتے ہوں۔

شرطِ مسافت

روایاتِ اہل بیتؑ:

۱ـ محمد بن الحسن، عن محمد بن أحمد بن يحيى، عن يعقوب بن يزيد، عن ابراهيم بن عبدالحميد، عن جميل، عن محمد بن مسلم، عن أبي جعفر (ع) قال: «تجب الجمعة على من كان منها على فرسخين» [۱۳].

۱۔ ...... محمد بن مسلم نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے، حضرت نے فرمایا: جمعہ اس شخص پر واجب ہے جو جمعہ (کی ایک نماز) سے دو فرسخ پر (رہتا) ہو۔

۲ــ محمد بن يعقوب عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن جميل بن دراج، عن محمد بن مسلم وزرارة، عن أبي جعفر(ع)، قال: «تجب الجمعة على كل من كان منها على فرسخين [۱۴].

ورواه الشيخ باسناده، عن محمد بن علي بن محبوب، عن علي بن السندي، عن محمد بن ابي عمير مثله [۱۵].

۲۔ ...... محمد بن مسلم اور زرارہ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے حضرت نے فرمایا: جمعہ ہر اس شخص پر واجب ہے جو جمعہ (کی نماز) سے دو فرسخ کے اندر ہو۔

• شیخ نے اپنی سند سے محمد بن علی بن محبوب، ..... محمد بن ابی عمیر کے ذریعے اسی جیسی روایت کی ہے۔

۳ــ محمد بن يعقوب، عن أبيه، عن حماد، عن حريز، عن محمد بن مسلم، قال: سألت ابا عبدالله(ع) عن الجمعة فقال: «تجب على كل من كان منها على رأس فرسخين فان زاد على ذلك فليس عليه شيء»[۱۶] ورواه الشيخ باسناده عن علي بن ابراهيم، عن ابيه [۱۷].

۳۔ ..... محمد بن مسلم نے حضرت ابو عبد اللہ علیہ السلام سے جمعہ کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت نے فرمایا: نماز جمعہ اس شخص پر واجب ہے جو ایک نماز سے پورے دو فرسخ کی مسافت پر ہو۔ اگر اس مسافت سے زیادہ پر ہو تو اس پر واجب نہیں ہے۔

روایات اہل سنت:

۱ــ احمد، قال: حدثنا عبدالله بن وهب، قال، أخبرني عمرو بن الحرث عن عبيدالله ابن أبي جعفر أن محمد بن جعفر بن الزبير،

حدثه: عن عروة بن الزبير، عن عائشة زوج النبي (ص)، قالت: « كان الناس ينتابون يوم الجمعة من منازلهم والعوالي فيأتون في الغبار يصيبهم الغبار.... الخ الحديث » [18].

والعوالي: القرى المجتمعة حول المدينة من جهة نجدها، وبعد بعض العوالي من المدينة اربعة اميال، وابعدها ثمانية أميال، كما في شرح صحيح مسلم [19].

۱۔ ..... حضرت عائشہ فرماتی ہیں: جمعہ کے دن لوگ اپنے گھروں اور العوالی سے غبار میں آتے تھے، ان پر غبار پڑا ہوتا تھا۔

عوالی: مدینہ میں نجد کی سمت چند ملی جلی بستیوں کا نام ہے۔ عوالی کا کچھ حصہ مدینہ سے چار میل ہے۔ طویل ترین عوالی کی مسافت آٹھ میل ہے۔ جیسا کہ شرح مسلم میں درج ہے۔

۲۔ أخبرنا ابوبكر بن الحارث الفقيه، انبأنا ابومحمد بن حيان، حدثنا ابواسحاق ابراهيم بن محمد بن الحسن حدثنا ابوعامر حدثنا الوليد هو ابن مسلم، اخبرني سبرة بن العلاء عن الزهري: أن اهل ذي الحليفة كانوا يجتمعون مع النبي صلى الله عليه وآله وسلم وذلك على مسيرة ستة أميال من المدينة. قال: وحدثنا الوليد، اخبرنا الاوزاعي، عن عطاء بن ابي رباح، قال: « كان أهل منى يحضرون الجمعة بمكة » [20].

وذكره عبدالرزاق، عن معمر، عن الزهري، وفيه بزيادة قال الزهري: وذلك ـ بعد ذي الحليفة ـ ستة اميال، قال معمر وقتادة: فرسخين [21].

وذكر نهي رسول الله (ص) عن عدم حضور الجمعة لمن كان على رأس الميلين من المدينة أو الثلاثة [22].

۲۔ .... زہری کے بقول، ذوالحلیفہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ ذوالحلیفہ مدینہ سے چھ میل ہے ۔ اور ۔ عطا بن رباح کے بقول ساکنین منی کے ہر جمعہ پڑھنے آتے تھے۔

• عبد الرزاق نے معمر سے انہوں نے زہری سے جو روایت کی ہے اس میں بعد ذی الحلیفہ ...... ستة امیال ۔ کے بعد ہے۔ معمر اور قتادہ کہتے ہیں۔ فرسخین، دو فرسخ ۔
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ممانعت کا ذکر کیا ہے کہ جو شخص مدینے سے دو یا تین میل اوپر ہو ۔

آیت "انفضوا"

روایات اہل بیتؑ :

١ــ تفسير علي بن ابراهيم: قال: كان رسول الله صلى الله عليه وآله يصلي بالناس يوم الجمعة ودخلت ميرة وبين يديها قوم يضربون بالدفوف والملاهي فترك الناس الصلاة ومرّوا ينظرون اليهم فأنزل الله؛ «واذا رأوا تجارة أولهواً انفضوا اليها وتركوك قائماً» [٢٣] .

۱۔ تفسیر علی بن ابراہیم۔ راوی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے ساتھ نماز میں مصروف تھے کہ ایک قافلہ آیا جس کے آگے ایک گروہ دف اور ڈھول وغیرہ بجا رہا تھا، لوگ نماز چھوڑ کر اسے دیکھنے چلے گئے تو اللہ نے آیت نازل فرمائی " اذا رأوا تجارة او لهواً انفضوا اليها وتركوك قائما" جب تجارت کا کھیل تماشہ دیکھتے ہیں تو ادھر بھاگتے اور آپ کو اکیلا (نماز کی حالت میں) کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

٢ــ الجعفريات اخبرنا محمد، حدثني موسى، حدثنا أبي، عن أبيه، عن جده جعفر بن محمد(ع) عن ابيه(ع)، قال: بينما رسول الله(ص) قائماً يخطب يوم الجمعة وكان سوق يقال لها البطحا وكانت بنوسليم تجلب اليها السبي والخيل والغنم وكانت الانصار اذا تزوجوا ضربوا بالكبر والمزمار واذا سمعوا ذلك خرج الناس اليهم وتركوا رسول الله صلى الله عليه وآله قائماً فعيّرهم الله بذلك فانزل الله؛ «واذا رأوا تجارة أولهواً انفضوا اليها... الآية» [٢٤].

۲۔ ..... امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے اور دیلی کا بازار لگا تھا۔ بنو سلیم اس بازار میں لونڈی، غلام، گھوڑے، بھیڑ بکری بیچنے لاتے تھے۔ انصار کا دستور تھا کہ خوشی کے موقع پر طبل اور بانسری بجاتے چلتے تھے۔ یہ آوازیں جو سنیں تو سب ادھر دوڑے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالت قیام میں چھوڑ گئے۔ اللہ عزوجل نے اس کردار پران کی مذمت کی۔ واذا رأوا تجارۃ او لھوا انفضوا الیھا۔

روایات اہل سنّت:

١ــ اخبرنا ابوعبدالله الحافظ، انبأ ابوالفضل بن ابراهيم، حدثنا احمد بن سلمة حدثنا اسحاق بن ابراهيم، حدثنا جرير، عن حصين، عن سالم بن أبى الجعد، عن جابر بن عبدالله، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يخطب يوم الجمعة قائماً فجاءت عِيَرٌ من الشام فانفتل الناس اليها حتى لم يبق معه الا اثني عشر رجلاً فانزلت هذه الآية التي في الجمعة: «واذا رأوا تجارة أو لهواً انفضوا اليها و تركوك قائماً» [٢٥]

١۔ جابر بن عبداللہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کا خطبہ کھڑے ہوئے دے رہے تھے اتنے میں شام سے ایک قافلہ آگیا، لوگ ادھر بھاگے۔ آنحضرتؐ کے حضور میں بارہ آدمی رہ گئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ۔ "واذا رأوا تجارۃ او لھواً ....."

٢ــ اخبرنا ابوبكر احمد بن محمد بن الحارث الفقيه، أنبأنا علي بن عمر الحافظ، حدثنا احمد بن محمد بن اسماعيل الآدمي، حدثنا محمد بن اسماعيل الحساني، حدثنا علي بن عاصم، عن حصين بن عبدالرحمن، عن سالم بن ابي الجعد، عن جابر بن

عبدالله، قال: بينما رسول الله صلى الله عليه وسلم يخطبنا يوم الجمعة اذ أقبلت عِيَرٌ تحمل الطعام حتى نزلوا بالبقيع، فالتفتوا اليها وانفضوا اليها وتركوا رسول الله صلى الله عليه وسلم ليس معه إلاّ اربعون رجلاً أنا فيهم قال فأنزل الله على النبى صلى الله عليه وآله؛ «واذا رأوا تجارة أو لهواً انفضوا اليها وتركوك قائماً» ۲۶.

۲۔ . . . . جابر بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن ہمارے سامنے خطبہ دے رہے تھے، اتنے میں ایک قافلہ، غلّہ لیے بقیع میں پہنچا، سب لوگ ان کی طرف مڑے اور آنحضرت کو چھوڑ کر ادھر دوڑے۔ حضرت کے پاس صرف چالیس آدمی رہ گئے جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ اس وقت اللہ عزّ اسمہ نے آنحضرت پر آیت نازل کی "وإذا رأوا تجارة ...."

دو رکعتوں کے بجائے دو خطبے

روایاتِ اہل بیت :

۱ــ محمد بن الحسن باسناده عن الحسين بن سعيد، عن صفوان، عن العلاء، عن محمد بن مسلم، عن احدهما (ع) قال: سألته عن أناس في قرية، هل يصلون الجمعة جماعة؟ قال (ع): نعم ويصلون أربعاً اذا لم يكن من يخطب ۲۷.

۱۔ . . . . . . محمد بن مسلم نے معصوم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جو قریے میں رہتے تھے، کیا وہ لوگ نماز جمعہ جماعت سے پڑھیں؟ امام نے فرمایا: ہاں۔ اگر کوئی خطبہ دینے والا نہ ہو تو چار رکعت (ظہر) پڑھیں گے۔

۲ــ محمد بن الحسن، عن الحسين بن سعيد، عن فضالة، عن أبان بن عثمان، عن الفضل بن عبدالملك قال: سمعت أبا عبدالله (ع)، يقول: اذا كان قوم في قرية صلوا الجمعة أربع ركعات فان كان لهم من يخطب لهم جمعوا اذا كانوا خمس نفر وانما جعلت ركعتين لمكان الخطبتين ۲۸.

۲۔ . . . . فضل بن عبدالملک کہتے ہیں میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام کو فرماتے سنا، اگر کوئی جمعیت دیہات میں رہتی ہو تو جمعہ کے دن چار رکعت پڑھے۔ لیکن اگر خطبہ دینے والا کوئی شخص ہو تو سب جمع ہوں اگر جمعیت پانچ افراد پر مشتمل ہو تو دو خطبوں کے بعد دو رکعتیں پڑھیں (دو خطبے دو رکعتوں کا بدل ہیں)۔

۳ـ محمد بن الحسن باسناده، عن الحسين بن سعيد، عن النظر، عن عبدالله بن سنان، عن أبي عبدالله (ع) في حديث قال: «انما جعلت الجمعة ركعتين من أجل الخطبتين فهي صلاة حتى ينزل الامام»[٢٩].

۳۔ . . . . . . عبداللہ بن سنان حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں حضرت نے فرمایا جمعہ کی دو رکعتیں اس لیے قرار دی گئی ہیں کہ دو خطبے دو رکعتوں کا بدل ہیں وہ نماز ہے تا ایں کہ امام منبر سے اترے۔

روایاتِ اہل سنّت :

۱ـ اخبرنا أبوحازم الحافظ، أنبأنا ابواحمد محمد بن محمد الحافظ، أنبأنا ابوجعفر محمد بن عبدالرحمن الضبي، حدثنا القاسم وهو ابن عبدالله بن مهدي ابوالطاهر بمصر، حدثنا عمي يعني محمد بن مهدي، حدثنا يزيد، يعني ابن يونس بن يزيد الايلي، عن ابيه يونس، عن الزهري، قال: بلغنا أن اول ما جمعت الجمعة بالمدينة قبل أن يقدمها رسول الله صلى الله عليه وسلم فجمع المسلمين مصعب بن عمير، قال: وبلغنا أنه لاجمعة الا بخطبة فمن لم يخطب صلى أربعا[٣٠].

۱۔ . . . . . . زہری کہتے ہیں، ہمیں اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینے میں آنے سے پہلے جو نماز جمعہ پڑھی گئی، اس کی امامت مصعب بن عمیر نے کی اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ خطبے کے بغیر جمعہ نہیں اور جب خطبہ نہ ہو سکے تو چار رکعت ادا کی جائے۔

جس پر جمعہ واجب نہ ہو اور وہ پڑھ لے تو نماز ظہر کے لیے کافی ہے

روایاتِ اہل بیتؑ :

۱ــ محمد بن الحسن، باسناده عن سعد بن عبدالله، عن محمد بن الحسين عن عباد ابن سليمان، عن القاسم بن محمد، عن سليمان، عن حفص بن غياث، قال: [سمعت بعض ٠ إليهم سأل ابن أبي ليلى عن الجمعة، هل تجب على العبد والمرأة والمسافر؟ قال: لا، قال: فإنْ حضر واحد منهم الجمعة مع الإمام فصلاّها هل تجزيه تلك الصلاة عن ظهر يومه؟ قال: نعم، قال: و كيف يجزى مالم يفرضه الله عليه عمّا فرض الله عليه... الى ان قال: فما كان عند ابن أبي ليلى فيها جواب، وطلب اليه أن يفسّرها له، فأبى. ثم سألته أنا ففسّرها لي، فقال: الجواب عن ذلك؛ ان الله عزّوجلّ فرض على جميع المؤمنين والمؤمنات ورخص للمرأة والعبد والمسافر أنْ لايأتوها، فلما حضروا سقطت الرخصة، ولزمهم الفرض الأول، فمن أجل ذلك أجزأ عنهم. فقلت: عمّن هذا؟ قال: عن مولانا أبي عبدالله (ع)] [۳۱]

۱۔ . . . . . حفص بن غیاث کہتے ہیں ایک شیعہ نے ابن ابی لیلے سے جمعہ کے بارے میں پوچھا کہ : غلام، ورت اور مسافر پر نماز جمعہ واجب ہے ؟ جواب ملا ، نہیں ۔ سائل نے پوچھا : اگر ان میں کوئی جمعہ میں امام کے پیچھے کھڑا ہو جائے اور نماز جمعہ پڑھ لے تو کیا ظہر کے لیے کافی ہے ؟ جواب ملا "ہاں" ۔ اس نے پوچھا ، جو فریضہ ندا نے عائد ہی نہیں کیا اس کی ادائگی فریضہ کے بجائے کیسے کافی ہو سکتی ہے ؟ . . . . . یہاں تک کہ راوی نے پوچھا ن لیلی نے کیا جواب دیا ؟ ذرا اس کی تفصیل بتاؤ ! اس نے معذرت کی (تفصیل بیان نہ کی) انھوں نے کہا : ماز جمعہ اللہ نے ہر مومن مرد و عورت پر فرض کی ہے اور عورت و غلام و مسافر کو جمعہ کی حاضری سے معاف کر دیا ہے ۔ لیکن اگر وہ حاضر ہو جائیں تو ان پر سابقہ فرض ہی عائد ہو جاتا ہے اسی وجہ سے ان کی نماز جمعہ ظہر کے بجائے افی ہے ۔ راوی نے پوچھا ، یہ آپ نے کیسے کہا ؟ انھوں نے حضرت ابو عبداللہ علیہ السلام کا حوالہ دیا ۔

۲ــ دعائم الاسلام، عن علي (ع) أنه قال: «إذا شهدت المرأة والعبد الجمعة، أجزأت عنها من صلاة الظهر». ۳۲

ماورد من طريق أهل السنة:

۲۔ دعائم الاسلام ـ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے حضرتؑ نے فرمایا: اگر عورت اور غلام جمعہ کے وقت آجائیں تو ان کی نماز جمعہ ظہر کے بدلے کافی ہوگی۔

روایات اہل سنّت:

۱ــ روينا عن الحسن البصري، أنه قال: [قد كنّ النساء يجمعن مع النبي (ص)]. ۳۳

۱۔ ہم نے حسن بصری سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا: کبھی خواتین بھی آنحضرتؐ کے پیچھے نماز میں شریک ہو جاتی تھیں۔

۲ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أنبأنا أبوبكر أحمدبن اسحاق الفقيه، أنبأنا اسماعيل بن اسحاق، حدثنا سليمان بن حرب، حدثنا شعبة عن عمروبن مرة، قال: [سمعت حميد الفزاري يحدث عن إمرأة منهم، قالت: جاءنا ابن مسعود يوم الجمعة، فقال: كيف تصلين؟ ثم قال: إذا صليتنّ مع الإمام فبصلاته، وإذا صليتنّ وحدكنّ فتصلين أربعاً]. وأخرج نحوه بزيادة عن جعفربن سليمان عن شعبة بقية السند، وأخرج نحوه بإسناد آخر.۳۴

ماورد من طريق أهل البيت (ع):

۲۔ ...... عمرو بن مرہ نے حمید فزاری سے سنا، کسی عورت نے کہا، کہ اس کے یہاں جمعہ کے دن ابن مسعود آئے اور پوچھنے لگے تم نماز کیسے پڑھتی ہو (امام کے پیچھے جمعہ یا گھر میں ظہر) .... اس کے بعد ابن مسعود نے کہا: جب امام کے ساتھ پڑھا کرو تو اس کی نماز (جمعہ) اور جب اکیلی (فرادیٰ) پڑھو تو چار رکعت (ظہر کی) ـــ بقیہ سند شعبہ کی ہے اور دوسرے طریقے سے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

۳ــ عبد الرزاق عن معمر عن قتادة قال: [إذا شهدن النساء الجمعة فانهن تصلين اربعاً]

۳۔ قتادہ نے کہا: جب خواتین جمعہ کے دن حاضر ہوں تو چار رکعت پڑھیں۔

توحید ۴۴

نماز جمعہ کی دو رکعتیں ہیں

روایاتِ اہل بیتؑ :

۱ـ محمد بن الحسن، عن الحسن عن زرعة عن سماعة، قال: سألته عن قنوت الجمعة... الى ان قال؛. قال: [إنما صلاة الجمعة مع الإمام ركعتان، فمن صلّى مع غير إمام وحده، فهي أربع ركعات بمنزلة الظهر...] إلخ الحديث[۳۶]

۱ـ ...... سماعہ نے امامؑ سے قنوت نماز جمعہ کے بارے میں سوال کیا ..... فرمایا: امام کے ساتھ نماز جمعہ دو رکعت ہے، اگر کوئی شخص فرادیٰ نماز پڑھے تو چار رکعتیں ظہر کی ...... الی آخر الحدیث۔

۲ـ محمد بن علي بن الحسين بإسناده عن سماعة، عن أبي عبدالله (ع) قال: [صلاة الجمعة مع الإمام ركعتان، فمن صلّى وحده فهي أربع ركعات][۳۷]

۲ـ ..... سماعہ نے حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ امام نے فرمایا۔ نماز جمعہ امام کے ساتھ دو رکعت ہے اور جمعہ کے دن نماز فرادیٰ پڑھے تو چار رکعتیں (ظہر کی پڑھے)

روایاتِ اہل سنّت :

۱ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أنبأنا أبوبكر بن اسحاق الفقيه، أنبأنا عبدالله بن محمد بن رافع، حدثنا محمد بن بشر، حدثنا يزيد بن زياد بن أبي الجعد، عن زبير الأيامي، عن عبدالرحمن بن أبي ليلى، عن كعب بن عجرة، قال: قال عمر رضي الله عنه: [صلاة الأضحى ركعتان، وصلاة الفطر ركعتان، وصلاة الجمعة ركعتان، وصلاة المسافر ركعتان، تمام غير قصر][۳۸] ونقله البيهقي عن الثوري بأسانيد. وفي، متن آخر بزيادة في آخره (على

لسان نبيكم صلى الله عليه وآله وسلم[3]). ونقله البيهقي عن يحيى القطان. وكذا رواه النسائي بإسناده، أهل البيت (ع):

۱۔ ...... کعب بن عجرہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے کہا: نماز عید قربان دو رکعت۔ نماز عید الفطر دو رکعت اور نماز جمعہ دو رکعت اور نماز مسافر دو رکعت اور قصر کے بغیر کامل۔
اور بیہقی نے ثوری سے ۔ اور متن میں آخر کی یہ عبارت زائد ہے ۔ "تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی" ....

امام کا لباس

روایات اہل بیت[ع]:

۱ــ محمدبن الحسن، باسناده عن محمدبن علي بن محبوب، عن العباس، عن حمادبن عيسى، عن ربعي، عن عمربن يزيد، عن أبي عبدالله (ع) قال: [إذا كانوا سبعة يوم الجمعة، فليصلوا في جماعة، وليلبس البُرد والعمامة، ويتوكأ على قوس أو عصى] قلت: ويظهر أن الضمير راجع الى إمام الجمعة كما هو واضح[4].

۱۔ ...... عمر بن یزید نے حضرت ابو عبد اللہ علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرت نے فرمایا اگر جمعہ کے دن سات آدمی موجود ہوں تو نماز جماعت سے پڑھو۔ امام کو عبا (برد، یعنی ردا) اور عمامہ پہننا چاہیے اور کمان یا عصا پر ٹیک دے (کر خطبہ دینا چاہیے)

۲ــ محمدبن الحسن، بإسناده عن الحسين بن سعيد، عن الحسن، عن زرعة، عن سماعة، قال: قال أبوعبدالله (ع): [ينبغي للإمام الذي يخطب بالناس يوم الجمعة أن يلبس عمامة في الشتاء والصيف، ويتردى ببرد يمنية أوعدنى]... إلخ الحديث[41].

۲۔ ...... سماعہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی روایت کی ہے کہ حضرت نے فرمایا جو امام جمعہ کے دن خطبہ دے اسے گرمی جاڑے میں عمامہ اور یمنی یا عدنی عبا پہننا چاہیے۔

۳ــ وفي البحار عن جعفر بن محمد، أنه قال: [وينبغي للإمام يوم الجمعة أن يتطيب، ويلبس أحسن ثيابه، ويتعمم][۴۲].
ماورد من طريق أهل السنة:

۳ ـ بحار میں .... حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کے دن پیش نماز کو خوشبو لگانا اور اچھے کپڑے اور عمامہ پہننا چاہیے ۔

روایاتِ اہلِ سنّت :

۱ــ أخبرنا أبوزكريا بن أبي اسحاق المزكي، أنبأنا أبوعبدالله محمد بن يعقوب، حدثنا جعفر بن محمد، حدثنا بن يحيى، أنبأنا وكيع، عن المساور الوراق، عن جعفر بن عمرو بن حريث، عن أبيه؛ [أن النبي (ص) خطب الناس وعليه عمامة سوداء][۴۳]. ونقله البيهقي عن مسلم في الصحيح عن يحيى بن يحيى.

۱۔ ..... عمرو بن حریث کے والد نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور آپ کالا عمامہ پہنے ہوئے تھے ۔ بیہقی نے مسلم کی الصحیح سے بروایت یحیی بن یحیی، یہ روایت نقل کی ہے ۔

۲ــ وأخبرنا أبوعلي الروذباري، أنبأنا محمد بن بكر، حدثنا أبو داوود، حدثنا الحسن بن علي، أنبأنا أبو أسامة، عن مساور الوراق، عن جعفر بن عمرو بن حريث، عن أبيه، قال: [رأيت النبي (ص) على المنبر وعليه عمامة سوداء قد أرخى طرفها بين كتفيه][۴۴].
ونقله البيهقي عن مسلم في الصحيح عن الحسن بن علي، وأبي بكر بن أبي شيبة عن أبي أسامة[۴۵].

۲ ... جعفر بن عمرو بن حریث سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منبر پر دیکھا، کالا عمامہ سرِ مبارک پر جس کے دونوں کنارے دونوں کاندھوں پر تھے ۔
بیہقی نے صحیح مسلم سے بروایت حسنؑ بن علیؑ اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے اسامہ سے یہی حدیث نقل کی ہے ۔

۳ـ أخبرنا أبوالحسن علي بن أحمد بن عبدان، أنبأنا أحمد بن عبيد الصفار، حدثنا اسماعيل القاضي، حدثنا مسدد، حدثنا حفص بن غياث، عن حجاج بن أرطأة، عن أبي جعفر، عن جابر بن عبدالله: [أنّ رسول الله (ص) كان يلبس بُرده الأحمر في العيد والجمعة][۴۶].

۳۔ ...... ابو جعفرؑ نے جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید اور جمعہ میں اپنی سرخ عبا زیب دوش فرماتے تھے ۔

روایات اہل بیتؑ : رخ امام کی طرف

۱ـ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن النوفلي، عن السكوني، عن أبي عبدالله (ع)، قال: قال رسول الله (ص): [كل واعظ قبلة ـ يعني إذا خطب الإمام الناس يوم الجمعة ـ ينبغي للناس أنْ يستقبلوه][۴۷].

۱۔ ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : ہر خطبہ خوان قبلہ ہے ۔یعنی جب جمعہ کا پیش نماز خطبہ دے رہا ہو تو لوگوں کا رخ اسی کی طرف ہونا چاہیے ۔

۲ـ وفي البحار، عن نوادر الراوندي . بإسناده عن موسى بن جعفر، عن آبائه مثله، ولكن دون التفسير ـ أي فقط (كل واعظ قبلة)[۴۸] و كذا في المستدرك عن الجعفريات، قال: أخبرنا محمد، حدثني موسى، حدثنا أبي، عن أبيه، عن جده جعفر بن محمد (ع) عن أبيه (ع)... إلخ مثله. ونقله عن الراوندي كما في البحار بإسناده الى موسى بن جعفر (ع) ولعلّ الفرق إسقاط[۴۹].

۲۔ بحار ..... امام موسی کاظم علیہ السلام نے اپنے آبا و کرام سے ایسی ہی حدیث نقل فرمائی ہے لیکن تشریحی فقرے کے بغیر صرف "کل واعظ قبلۃ" ہی ہے۔ ....

مستدرک میں جعفریات سے اور بحار میں راوندی سے .... یہی روایت ہے ۔فرق حذف کا ہے۔

۳ــ عبدالله بن جعفر في قرب الإسناد، عن عبدالله بن الحسن، عن جده علي بن جعفر، عن اخيه، قال: [سألته عن القعود في العيدين والجمعة والإمام يخطب، كيف يصنع؟ يستقبل الإمام؟ أويستقبل القبلة؟ قال: يستقبل الإمام][۵۰].

ورواه في البحار عن قرب الإسناد، بإسناده الى علي بن جعفر، ضمن حديث طويل.

۳۔ .... عبداللہ بن حسن نے اپنے جد بزرگوار علی بن جعفر سے انھوں نے اپنے بھائی (موسیٰ کاظمؑ) سے روایت کی کسی نے حضرت سے پوچھا کہ عیدین اور جمعہ میں جب پیش نماز خطبہ دے رہا ہو تو کیسے بیٹھیں؟ امام کی طرف رخ کریں یا قبلہ کی طرف رخ کریں؟ فرمایا: امام کی طرف رخ کیا کریں۔

۴ــ محمد بن علي بن الحسين، قال: قال النبي (ص): [كل واعظ قبلة، وكل موعوظ قبلة للواعظ، يعني في الجمعة والعيدين وصلاة الإستسقاء في الخطبة يستقبلهم الإمام و يستقبلونه حتى يفرغ من خطبته][۵۱].

۴۔ ...... امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، خطیب سننے والوں اور سننے والے خطیب کے لیے قبلہ ہیں، یعنی جمعہ، عیدین اور نماز استسقا کے خطبے میں خطیب حاضرین کے سامنے اور سامعین خطیب کی طرف رخ کرکے بیٹھیں، تاایں کہ وہ خطبہ تمام کرے۔

۵ــ وعن علي (ع) انه قال: [يستقبل الناس الإمام عند الخطبة بوجوههم، و يصغون اليه][۵۲].

ماورد من طريق أهل السنة:

۵۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: خطبے کے وقت لوگ اپنا رخ امام کی طرف رکھیں اور خطبے کو توجہ سے سنیں۔

روایاتِ اہل سنت:

۱ــ أخبرنا ابوالحسن بن أبي المعروف الفقيه المهرجاني بها، حدثنا أبوسهل بشر بن احمد الإسفرائيني، حدثنا حمزة بن محمد الكاتب، حدثنا نعيم بن حماد حدثنا ابن المبارک عن معمر عن الزهري، قال: [كان رسول الله (ص) إذا أخذ في خطبته، استقبلوه بوجوههم حتى يفرغ منها][۵۳].

۱۔ ...... معمر نے زہری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب خطبہ کا آغاز فرماتے تھے تو لوگ حضرتؐ کے اتمام خطبہ تک آپ کی طرف متوجہ رہتے تھے۔

٢ــ أخبرنا أبوحازم الحافظ، أنبأنا أبو أحمد محمد بن الحافظ، أنبأنا أبوبكر محمدبن اسحاق بن خزيمة، حدثنا اسماعيل بن اسحاق ــ أصله كوفي ــ بالفسطاط، حدثنا محمدبن علي بن عراب، حدثنا أبي، عن ابان بن عبدالله البجلي، عن عدي بن ثابت، عن البراء بن عازب، قال: [كان النبي (ص) إذا صعد المنبر أوقال قعد على المنبر، استقبلناه بوجوهنا][٥٤].

٢۔ .... براء بن عازب کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب منبر پر قدم رکھتے ــ یا کہا۔ منبر پر بیٹھتے تو ہم سب حضور کی طرف منہ کر لیتے تھے۔

٣ــ قال لعله أبو أحمد محمدبن الحافظ ــ وأخبرنا أبوبكر بن خزيمة قال: [هذا الخبر عندي معلول] ــ حدثنا عبدالله بن سعيد الاشج، حدثنا النضربن اسماعيل عن ابان بن عبدالله البجلي، قال: [رأيت عدي بن ثابت يستقبل الإمام بوجهه، إذا قام يخطب، فقال له: رأيتك تستقبل الإمام بوجهك، قال: رأيت أصحاب رسول الله صلى الله عليه و سلم يفعلونه][٥٥]. و نقله عن ابي داوود في المراسيل، عن أبي توبة، عن ابن المبارك [٥٦].

٣۔ .... ابان ابن عبید اللہ بجلی کہتے ہیں، میں نے عدی بن ثابت کو امام کی طرف رخ کرتے ہوئے دیکھا، جب وہ خطبہ دینے کھڑا ہوتا۔ کسی نے ان سے پوچھا آپ امام کی طرف رخ کرتے دکھائی دیتے ہیں؟ انھوں نے جواب میں کہا: میں نے اصحاب رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہی کرتے دیکھا ہے ٢٦

امام سلام کرے

روایاتِ اہل بیتؑ:

١ــ محمدبن الحسن، بإسناده عن محمد بن علي بن محبوب، عن محمد بن الحسين، عن الحسن بن علي بن يوسف، عن معاذ بن ثابت، عن عمروبن

جميع رفعه، عن علي (ع) قال: [من السنّة إذا صعد الإمام المنبر أن يسلم إذا استقبل الناس][۵۷].

۱۔ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے: سنّت یہ ہے کہ امام جب منبر پر جائے اور لوگ متوجہ ہوں تو سلام کرے۔

۲ــ وفي البحار عن علي (ع): [انه كان إذا صعد المنبر سلّم على الناس][۵۸].

۲۔ ..... امیر المومنین علیہ السلام جب منبر پر بلند ہوتے تو لوگوں کو سلام کرتے تھے۔

روایاتِ اہل سنّت:

۱ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أنبأنا أبوبكر بن اسحاق، أنبأنا أحمد بن ابراهيم، حدثنا عمرو بن خالد، حدثنا ابن لهيعة، عن محمد بن زيد ابن المهاجر يعني ابن قنفذ التيمي، عن محمد بن المنكدر، عن جابر قال: [كان رسول الله (ص) إذا صعد المنبر سلّم][۵۹].

۱۔ ..... جابر کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب منبر پر تشریف لاتے تو سلام فرماتے تھے۔

۲ــ أخبرنا أبوسعد الماليني، أنبأنا أبوأحمد بن عدي الحافظ، حدثنا أبو عروبة، حدثنا عبدالوهاب بن الضحاك (ح قال وأنبأنا) أبو أحمد، وحدثنا الفضل بن عبدالله بن سليمان، حدثنا الوليد بن عتبة، قال الوليد بن مسلم عن عيسى بن عبدالله الأنصاري، وقال الوليد: حدثني عيسى بن ابي عون القرشي عن نافع عن ابن عمر، قال: [كان رسول الله (ص) إذا دنا من منبره يوم الجمعة سلّم على من عنده من الجلوس، فإذا صعد المنبر استقبل الناس بوجهه ثم سلّم][۶۰]. واخرج عبد الرزاق، عن ابن جريج، عن عطاء، نحو آخره. وكذا عن الشعبي بزيادة؛ ان ابوبكر و عمر كانا يفعلان ذلك بعد النبي (ص)[۶۱].

۲۔ ..... ابن عمر کہتے ہیں: جمعہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب منبر کے قریب

تشریف لاتے تو اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرتے اس کے بعد جب منبر پر بلند ہوتے اور لوگ آپ کی طرف رخ کرتے تو پھر سلام کرتے۔

.... شعبی نے ایک اضافہ بھی کیا ہے " ابوبکرؓ و عمرؓ بھی آنحضرتؐ کے بعد یہی عمل انجام دیتے تھے۔

مؤذن کی اذان ختم ہونے تک امام بیٹھا رہے

روایاتِ اہل بیتؑ:

۱ـ محمدبن الحسن، عن الحسن بن علي، عن جعفر بن محمد، عن عبدالله بن ميمون، عن جعفر، عن ابيه، قال: [كان رسول الله (ص) إذا خرج الى الجمعة، قعد على المنبر حتى يفرغ المؤذنون][٦٢].

۱۔ ...... جعفرؑ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جمعہ کے لیے تشریف لے جاتے تو منبر پر مؤذن کی اذان ختم ہونے تک انتظار میں بیٹھے رہتے۔

۲ـ دعائم الإسلام عن جعفر بن محمد (ع) انه قال: [يبدأ بالخطبة يوم الجمعة قبل الصلاة، واذا صعد الإمام، جلس وأذن المؤذنون بين يديه، فإذا فرغوا من الآذان، قام فخطب، ووعظ، ثم جلس جلسة خفيفة، ثم قام فخطب خطبة أخرى يدعو فيها، ونزل، فصلى الجمعة ركعتين، يجهر فيها بالقراءة][٦٣].

قلت: هذا الحديث يستفاد منه في أبواب الخطبة.

۲۔ ...... امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کے دن نماز سے پہلے خطبہ سے ابتدا کریں اور جب امام منبر پر جا کر بیٹھے اور اذان دینے والے اس کے سامنے اذان شروع کریں، پھر جب وہ اذان ختم کریں، تو خطیب کھڑے ہو کر خطبہ دے اور وعظ کہے، اس کے بعد مختصر وقفہ کے لیے بیٹھے، پھر کھڑے ہو کر دوسرا خطبہ دے جس میں دعا ہو۔ اس کے بعد منبر سے اترے، تو جمعہ کی دو رکعتیں پڑھے۔ نماز میں قرأت بلند آواز سے کرے۔

نوٹ: مباحثِ خطبہ میں بھی اس حدیث سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

روایاتِ اہل سنّت :

۱ــ وأخبرنا ابوعلي الروذباري، أنبأنا محمد بن بكر، حدثنا أبو داوود، حدثنا محمد بن سليمان الأنباري، حدثنا عبدالوهاب يعني ابن عطاء عن العمري، عن نافع، عن ابن عمر، قال: [كان النبي (ص) يخطب خطبتين، كان يجلس إذا صعد المنبر حتى يفرغ اراه المؤذن، ثم يقوم فيخطب، ثم يجلس فلا يتكلم، ثم يقوم فيخطب].

قلت في قوله اراه المؤذن اضطراب، والأصح ان يكون (اراد المؤذن) أو (أراه اراد المؤذن) أو ماشابه. ثم هذا الحديث يفيد في باب الخطبتين والجلسة[۶۴]. ولعله صحيح لان الضمير يعود الى المؤذن المستند.

۱۔ ...... ابن عمر کہتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دو خطبے دیتے تھے۔ منبر پر جا کر کسی دیر تک بیٹھے رہتے تھے جتنی دیر تک مؤذن اذان دیتا تھا، پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے، پھر بیٹھتے تھے پر گفتگو نہ فرماتے تھے، اس کے بعد پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ دیتے تھے۔

نوٹ: حدیث کا فقرہ " اراہ المؤذن " نقل میں خلل پر مبنی ہے شاید زیادہ صحیح " اراد المؤذن " یا " اراہ اراد المؤذن " جیسا کوئی فقرہ ہو ۔ (مترجم)

یہ حدیث اس مسئلہ میں بھی کام آسکتی ہے جہاں خطبتین اور دو وقفہ نشست پر گفتگو ہو ۔

۲ــ أخبرنا محمد بن عبدالله الحافظ، أنبأنا عبدالله بن الحسين القاضي، حدثنا الحارث بن أبي أسامة، حدثنا محمد بن عيسى بن الطباع، حدثنا مصعب بن سلام، عن هشام بن الغاز، عن نافع، عن ابن عمر، قال: [كان النبي (ص) إذا خرج يوم الجمعة فقعد على المنبر، اذن بلال][۶۵] وذكره الحاكم في المستدرك بهذا الإسناد: [قال هذا حديث صحيح الاسناد][۶۶].

۲۔ .... ابن عمر کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ جمعہ کے لیے جب گھر سے چلتے اور منبر پر جلوہ فرما ہوتے تو بلال اذان شروع کرتے تھے۔ حاکم نے مستدرک میں انہی اسناد سے یہ حدیث نقل کی اور لکھا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔

۳ــ عبد الرزاق لعله عن ابن جريج ــ ابن الإعرابي شك ــ قال: أخبرنا عطاء، قال: [إنّما كان الآذان يوم الجمعة فيما مضى واحداً قط، ثم الإقامة، فكان ذلك الآذان يؤذن به حين يطلع الإمام، فلا يستوي الإمام قائماً، حيث يخطب حتى يفرغ المؤذن][۶۷].

۳۔ ...... عطا کی خبر ہے کہ گذشتہ زمانے میں فقط ایک ہی اذان ہوتی تھی، پھر اقامت۔ اذان اس وقت شروع ہوتی تھی جب امام گھر سے باہر آتے تھے، پھر وہ منبر پر ٹھیک طرح سے اس وقت تک کھڑے نہ ہوتے تھے جب تک مؤذن اذان ختم نہ کردے۔

خطیب کا کھڑا ہونا واجب ہے

روایات اہل بیتؑ:

۱ــ علي بن ابراهيم ــ في تفسيره ــ عن احمد بن ادريس (محمد بن احمد) عن احمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن صفوان، عن ابن مسكان، عن ابي بصير، انه سأل عن الجمعة كيف يخطب الإمام، قال: [يخطب قائماً، انَّ الله يقول: «و تركوك قائماً»][۶۸].

۱۔ ...... ابو بصیر نے پوچھا۔ امام کیسے خطبہ دے گا؟ کہا: امام کھڑے ہو کر خطبہ دے گا اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے: "وترکوک قائما" اور وہ لوگ آپؐ کو قیام کی حالت میں چھوڑ جاتے۔

۲ــ تفسير القمي، عن احمد بن ادريس، عن محمد بن احمد، عن الحسين بن سعيد، عن صفوان، عن ابن مسكان، عن ابي بصير انه (ع) سُئِلَ عن الجمعة كيف يخطب الإمام، قال: [يخطب قائماً، فإنَّ الله يقول: و «تركوك قائماً»][۶۹].

۲۔ تفسیر قمی ...... ابو بصیر کہتے ہیں کہ امام علیہ السلام سے جمعہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ امام خطبہ کیسے پڑھے؟ فرمایا: کھڑے ہو کر، قرآن مجید میں ہے "وترکوک قائماً"

روایاتِ اہل سنّت:

۱ــ حدثنا عبيدالله بن عمر القواريري، قال: حدثنا خالد بن الحرث، قال: حدثنا عبيدالله بن عمر، عن نافع، عن ابن عمر رضي الله عنها، قال: [كان النبي (ص) يخطب قائماً، ثم يقعد، ثم يقوم كما تفعلون الآن][۷۰].

ورواه مسلم عن القواريري وابو كامل الجحدري، عن خالدبن الحارث مثله، بتغيير «يجلس» بدل «يقعد»[٧١].

وأرسل البخارى حديثاً عن أنس في قيام النبي (ص) بالخطبة[٧٢].

۱۔ . . . . . ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کھڑے ہوکر خطبہ دیتے تھے، پھر بیٹھتے تھے جیسے آج کل ہوتا ہے۔ مسلم نے، قواریری اور ابو کامل جحدری نے خالد بن حارث سے یہی روایت یجلس کے بجائے یقعد کے اختلاف سے نقل کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت قیام میں خطبہ دیتے تھے۔ بخاری نے ایک اور مرسل حدیث نقل کی ہے۔

٢ــ حدثنا يحيى بن يحيى، أخبرنا أبو خيثمة، عن سماك ، قال: أنبأني جابر بن سمرة: ان رسول الله (ص) كان يخطب قائماً، ثم يجلس، ثم يقوم فيخطب قائماً، فمن أنبأك انه كان يخطب جالساً فقد كذب. والله صليت معه أكثر من ألفي صلاة[٧٣].

قلت؛ ويظهر ان المراد من الألفي صلاة، الأعم من الجمعة وغيرها. ثم هذا الحديث، وكذا الحديث السابق في باب الخطبتين والقعدة بينهما، و مثل هذا الحديث رواه في البحارج ٨٩ ص ١٣١ وفي المستدرك عن غوالي اللئالي ج ١ ص ٤١٠ كلاهما عن جابر بن سمرة. وهذا الحديث أخرجه عبدالرزاق، عن اسرائيل بن يونس، عن سماك ، عن جابر نحوه[٧٤].

۲۔ . . . . . جابر بن سمرہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوکر خطبہ دیتے تھے، پھر بیٹھتے پھر کھڑے ہوتے اور دوسرا خطبہ دیتے تھے۔ اب جو کہے کہ حضرتؐ بیٹھ کر خطبہ دیتے تھے وہ جھوٹ بولتا ہے، خدا کی قسم میں نے حضرتؐ کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ نمازیں پڑھی ہیں۔

نوٹ: بظاہر "دو ہزار نمازوں" سے مراد، جمعہ و غیر جمعہ کی نمازیں ہیں۔ نیز یہ حدیث اور حدیث سابق "دو خطبے اور درمیان میں نشست" کے ذیل میں بحار، ج ۸۹ ص ۱۲۱، اور مستدرک میں غوالی اللئالی ج ۱ ص ۴۱۰، دونوں حدیثیں جابر بن سمرہ سے نقل ہیں۔ یہ حدیث عبدالرزاق نے، اسرائیل بن یونس نے سماک اور انہوں نے جابر سے . . . . نقل کی ہے۔

بیٹھ کر خطبہ دینے کی پہل

روایاتِ اہل بیتؑ :

١ــ محمد بن الحسن، بإسناده عن الحسين بن سعيد، عن فضالة، عن معاوية بن وهب، قال. ابو عبدالله (ع): ان أول من خطب وهو جالس معاوية، وآستأذن في ذلك من وجع كان بركبتيه، و كان يخطب خطبة وهو جالس، وخطبة وهو قائم، يجلس بينهما... ثم قال: الخطبة وهو قائم خطبتان يجلس بينهما جلسة لايتكلم فيها بقدر ما يكون فصل بين الخطبتين[75].

وهذا الحديث، يفيد في أبواب الخطبة المتقدمة.

١۔ . . . . . معاویہ بن وہب کہتے ہیں، حضرت ابوعبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا: بیٹھ کر جس نے سب سے پہلے خطبہ دیا وہ معاویہ ہے۔ اس نے گھٹنے میں درد کی بنا پر اجازت مانگی تھی۔ وہ ایک خطبہ بیٹھ کر اور ایک خطبہ کھڑے ہو کر دیتا اور دونوں کے درمیان بیٹھتا تھا . . . . . پھر فرمایا: خطبہ کھڑے ہو کر ہی دیا جائے۔ دو خطبے جن کے درمیان ایک نشست جس میں دونوں کا فاصلہ واضح ہو، اس وقت بات نہ کرے

روایاتِ اہل سنّت :

١ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أنبأنا ابوالعباس المحبوبي، حدثنا سعيد بن مسعود، حدثنا النظر بن شميل، أنبأنا شعبة عن حصين، قال: سمعت الشعبي، قال: [أول من أحدث القعود على المنبر معاوية][76].

وقال البيهقي: قال الشيخ احمد: يحتمل انه انما كان قعد لضعف أو لكبر أو مرض والله أعلم.

١۔ . . . . . . حصین کہتے ہیں میں نے شعبی سے سنا انھوں نے کہا منبر پر بیٹھنے کی نئی بات سب سے پہلے معاویہ نے کی۔

ـــ اور بیہقی نے کہا کہ شیخ احمد نے کہا: ممکن ہے کہ وہ کمزوری یا بڑھاپے یا مرض کی حالت میں ہوں

ـــ واللہ اعلم

توحید ۵۶

۲ـ عبدالرزاق، عن معمر عن قتادة [ان رسول الله (ص) وأبابكر و عمر وعثمان كانوا يخطبون يوم الجمعة قياماً، ثم فعل ذلك عثمان، حتى شق عليه القيام، فكان يخطب قائماً، ثم يجلس، ثم يقوم أيضاً، فيخطب: فلما كان معاوية خطب الأولى جالساً، ثم يقوم فيخطب الآخرة قائماً][۷۷]. وأخرج عن محمد بن راشد، عن سليمان بن موسى، نحوه ولم يذكر فعل عثمان، بل قال: أول من جلس، معاوية، وزاد فعل عبدالملك[۷۸].

۲۔ ...... معمر نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ اور ابوبکر و عمر و عثمان جمعہ کا خطبہ کھڑے ہو کر دیتے تھے۔ عثمان یہی کرتے رہے یہاں تک کہ ان پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا، پھر بھی خطبہ کھڑے ہو کر دیتے پھر بیٹھتے پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ دیتے۔ جب معاویہ کا عہد آیا تو وہ پہلا خطبہ بیٹھ کر دیتے پھر کھڑے ہوتے اور آخری خطبہ کھڑے کھڑے دیتے۔ .... محمد بن راشد کی سلیمان بن موسی سے ایک روایت ہے جس میں عثمان کے عمل کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ہے۔ سب سے پہلے جو بیٹھا وہ معاویہ ہے۔ اور عبدالملک کے عمل کا اضافہ کیا۔

۳ـ عبدالرزاق، عن ابن جريج، قال: أخبرني جعفر بن محمد (ع) عن أبيه (ع)، قال: [فلما كان معاوية استأذن الناس في الجلوس في إحدى الخطبتين، وقال: إني قد كبرت، وقد أردت أجلس إحدى الخطبتين، فجلس في الخطبة الأولى][۷۹].

۳۔ ..... ابن جریج نے حضرت جعفر بن محمد، انھوں نے اپنے والد سے روایت کی، جب معاویہ کا دور آیا تو اس نے لوگوں سے ایک خطبہ بیٹھ کر دینے کی اجازت لی۔ اور کہا میں بوڑھا ہو گیا ہوں میری نیت ہے کہ ایک خطبے میں بیٹھا رہوں۔ پھر وہ پہلے خطبے میں بیٹھا رہتا۔

دو خطبوں کے درمیان نشست

روایاتِ اہل بیتؑ:

۱ــ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن حماد، عن حريز، عن محمد بن مسلم، قال؛ سألته عن الجمعة، فقال: الحديث... الى ان قال: فيصعد المنبر، فيخطب ولا يصلي الناس مادام الإمام على المنبر، ثم يقعد الإمام على المنبر قدر مايقرأ «قل هو الله أحد» ثم يقوم، فيفتتح خطبة، ثم ينزل... الحديث[۸۰].

۱۔ . . . . وہ منبر پر جاتے اور خطبہ دیتے تھے۔ جب تک امام منبر پر رہتا لوگ نماز نہ پڑھتے تھے، امام خطبہ دے کر اتنی دیر نشست کرتا جتنی دیر میں سورۂ قل ھو اللہ پڑھا جا سکے۔ پھر امام کھڑے ہو کر خطبہ دیتا، خطبہ دے کر منبر سے نیچے آتا . . . طویل حدیث۔

۲ــ محمد بن الحسن، عن العباس، عن حماد بن عيسى، عن ربعي، عن عمر بن يزيد، عن أبي عبدالله (ع) قال: اذا كانوا سبعة يوم الجمعة، فليصلوا في جماعة، وليلبس البرد والعمامة، و يتوكأ على قوس أوعصا، وليقعد قعدة بين الخطبتين... الخ الحديث[۸۱].

قلت: قد ذكرنا هذا الحديث في باب «الإمام يتوكأ على قوس أوعصا»، عن محمد بن علي بن محبوب عن العباس.

۲۔ . . . . . امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب سات آدمی جمعہ کے دن موجود ہوں تو جماعت سے نماز پڑھیں، امام بردِ (یمن کی عبا) اور عمامہ پہنے، کمان یا عصا پر ٹیک دے اور اسے دو خطبوں کے درمیان بیٹھنا چاہیے . . . .

ـــ یہ حدیث "امام کمان یا عصا پر ٹیک دے" کے عنوان سے محمد بن علی بن محبوب و عباس سے نقل کر چکے ہیں۔

۳ــ محمد بن يعقوب، عن محمد بن الحسين و أحمد بن محمد، جميعاً عن عثمان بن عيسى، عن سماعة (في حديث) قال: قال ابوعبدالله (ع):

يخطب ــ يعني إمام الجمعة ــ وهو قائم يحمد الله ويثني عليه، ثم يوصي بتقوى الله، ثم يقرأ سورة من القرآن صغيرة (قصيرة) ثم يجلس، ثم يقوم فيحمد الله ويثني عليه ويصلي على محمد (ص) وعلى أئمة المسلمين... الخ الحديث[۸۲].

۳۔ . . . . ابو عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا :

ــ امام جمعہ ــ خطبہ دے ۔ کھڑے ہو کر حمد و ثنا کے بعد تقویٰ کی نصیحت کرے پھر قرآن مجید کی چھوٹی سی سورت پڑھے ۔ بیٹھے ۔ دوبارہ کھڑے ہو کر حمد و ثنا بجالائے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ و ائمۂ اہل اسلام پر درود بھیجے . . . . . .

روایاتِ اہل سنّت :

ماورد من طريق أهل السنة:

۱ــ حدثنا مسدد، قال: حدثنا بشر بن المفضل، قال: حدثنا عبيدالله بن عمر، عن نافع، عن عبدالله بن عمر، قال: [كان النبي (ص) يخطب خطبتين يقعد بينهما][۸۳] ورواه النسائي عن اسماعيل بن مسعود، عن بشر نحوه، وبزيادة (وهو قائم)[۸۴] ورواه عبدالرزاق، عن معمر، عن عبيد الله بن عمر بن نافع بقية الإسناد نحوه[۸۵].

۱۔ . . . . رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم دو خطبے دیتے دونوں کے درمیان بیٹھا کرتے تھے۔ اور نسائی نے اسماعیل بن مسعود سے بشر کی ایسی ہی روایت نقل کی ہے ــ اور ــ اس میں "وھو قائم" کا اضافہ ہے ۔ عبد الرزاق نے معمر انھوں نے عبید اللہ بن عمر بن نافع و بقیہ اسناد کے ساتھ اسے وارد کیا ہے ۔

۲ــ حدثنا يحيى بن يحيى وحسن بن الربيع وابوبكر بن ابي شيبة، قال: يحيى أخبرنا، وقال: الاخران؛ حدثنا أبو الأحوص، عن سماك، عن جابر بن سمرة، قال: [كانت للنبي (ص) خطبتان، يجلس بينهما، يقرأ القرآن، ويذكر الناس][۸۶].

وروى النسائي نحو هذا الحديث بتغيير مفيد[۸۷] ورواه الحاكم في المستدرك بتغيير[۸۸].

قلت: يستفاد من نص الحاكم، ان هذه الرواية المتقدمة في باب القيام عن جابر بن سمرة، رواية واحدة، فقسمها الرواة.

في باب القيام عن جابر بن سمرة، رواية واحدة، فقسمها الرواة.

۳۔ ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو خطبے ہوتے جن کے درمیان نشست فرماتے تھے، قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے۔

نسائی نے یہی روایت ایک مفید تبدیلی کے ساتھ اور حاکم نے مستدرک میں ایک تبدیلی کے ساتھ نقل کی ہے۔

۔۔ حاکم کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ باب قیام کی روایت اور یہ روایت جابر بن سمرہ نے نقل کی ہے روایت ایک تھی راویوں نے اسے دو کر دیا۔

۳ــ حدثنا محمد بن سليمان الأنباري، حدثنا عبدالوهاب ــ يعني ابن عطاء ــ عن العمري، عن نافع، عن ابن عمر، قال: [كان النبي صلى الله عليه و سلم يخطب خطبتين. كان يجلس إذا صعد المنبر حتى يفرغ ــ أراه قال المؤذن ــ ثم يقوم فيخطب، ثم يجلس، فلا يتكلم، ثم يقوم، فيخطب][89].

ونحوه روى الترمذي بإسناده عن نافع، عن ابن عمر[90]. وروى نحوه مجمع الزوائد بإسناده عن السائب بن يزيد[91].

وفي الباب روايات عديدة، فراجع[92].

۳۔ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو خطبے دیتے اور آنحضرتؐ منبر پر اس وقت تک تشریف فرما رہتے جب تک وہ تمام کرتا ۔ میرے خیال میں مؤذن مراد ہے ۔ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے پھر بیٹھتے ۔ اور کلام نہ فرماتے، پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ دیتے۔

اسی جیسی روایتیں ترمذی نے اپنے اسناد ... سے اور ایسی ہی روایت مجمع الزوائد میں اپنے اسناد سے موجود ہے۔

اس عنوان سے بہت سی روایتیں اور بھی ہیں، دیکھئے مصادر۔

حاشیے:

(۱) من لا يحضره الفقيه ج ۱ ص

۲۹۷ الوسائل ج ۳ ص ۳۷ وفي هامشه عن التهذيب ج ۱ ص ۳۲۲.

(۲) الوسائل ج ۲ ص ۴۷۸.

(٣) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٨٦ ورواه باسنادين عن ابي المليح عن ابيه ونقله عن مسلم وعن معمر وروى نحوه ثلاث روايات وابي داوود ج ١ ص ٢٧٨ والمستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٩٣ وتلخيص الذهبي في نفس المصدر.

(٤) احمد ج ٥ ص ٢٤.

(٥و٦) مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٩٤ والمستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٩٢ وتلخيص الذهبي في نفس المصدر السابق.

(٧) البخاري ج ٢ ص ٧ والبيهقي باسنادين عن مسدد مثله جـ٣ ص ١٨٥ ونقله عن مسلم ايضا وابوداوود ج ١ ص ٢٨٠ والمستدرك للحاكم ج ١ ص ٢٨٤ وتلخيص الذهبي في المصدر السابق.

(٨ و ٩) الوسائل ج ٥ ص ٧ وفي هامشه عن الكافي ج ١ ص ١١٦ والتهذيب ج ١ ص ٢٥١ وعن الاستبصار ج ١ ص ٢١٠ ووجدته في الكافي ج ٣ ص ٤١٩ والاستبصار ج ١ ص ٤١٩.

(١٠) الوسائل ج ٥ ص ٨ وفي هامشه عن الخصال ج ١ ص ١٣٩ والبحار ج ٨٩ ص ١٦٩ نقله عن الخصال وفي الهامش عن نفس الصفحة ومع ذلك فلفظ (الجماعة) معرفة (بأل) في البحار.

(١١) الوسائل ج ٥ ص ٩ والاستبصار ج ١ ص ٤١٩.

(١٢) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٧٩. وقد تقدم ذكره وذكر أن البيهقي رواه باسانيد متعددة فراجع باب وجوبها على القرى.

(١٣) الوسائل ج ٦ ص ١١ ونحوه في التهذيب ج ٣ ص ٢٣ ونحوه في البحار ج ٨٩ ص ٢٥٥ عن دعائم الاسلام.

(١٤) الوسائل ج ٥ ص ١٢.

(١٥) الوسائل ج ٦ ص ١٢ والاستبصار ج ١ ص ٤٢١ ولكن بنقصان كلمة (كل).

(١٦) الوسائل ج ٥ ص ١٢.

(١٧) الاستبصار ج ١ ص ٤٢١.

(١٨) البخاري ج ٢ ص ٧ ومسلم ج ٣ ص ٣ وابوداوود بنقصان عجزه ج ١ ص ٢٧٨ ورواه البيهقي ج ٣ ص ١٨٩ و ١٧٣.

(١٩) صحيح مسلم ص ١٠٩ نقله عن فتح الباري.

(٢٠) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٧٥.

(٢١) مصنف عبد الرزاق ج ٣ ص ١٦١ الحديث ٥١٥١.

(٢٢) مصنف عبد الرزاق ج ٣ ص ١٦٥ الحديث ٥١٦٦ ورواه كنز العمال ج ٧ ص ٥١٩ الحديث ٣٤٦٨ وص ٥١٨ الحديث ٤٣٦٦ و٣٤٦٧ ونقله عن متعددين. فراجع.

(٢٣) البحار ج ٨٩ ص ٢٠٠ عن التفسير المذكور ص ٦٧٩.

(٢٤) مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٠ باب ١٤ الحديث ٣.

(٢٥) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٨١ و ١٩٧ ومسلم ج ٢ ص ٩ و ١٠ رواه عن عثمان بن ابي شيبة عن اسحاق بن ابراهيم،

كلاهما عن جرير مثله بل وبأسانيد أربعة وروى البخاري مثله باختلاف يسير وباسناد آخرج ٢ ص ١٥ وج ٣ ص ٣٩ باسناد آخر.

(٢٦) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٨٢ ونحوه سنن الدار قطني ج ٢ ص ٤ ذكره باسنادين ونحوه المنتقي ج ٢ ص ٣٣ رقم ١٦٣٧ و١٦٣٨ نقل الاول عن احمد ومسلم والترمذي والثاني عن احمد والبخاري.

(٢٧) الوسائل ج ٥ ص ١٠ ونقله عن التهذيب ج ١ ص ٣٢١ وفي الاستبصار ج ١ ص ٤١٩ الا انها بنقصان (نعم).

(٢٨) الوسائل ج ٥ ص ١٠ ونقله في هامشه عن التهذيب ج ١ ص ٣٢١ وفي الاستبصار ج ١ ص ٤٢٠ ونحوه عن الرضا(ع) في مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤٠٨.

(٢٩) الوسائل ج ٥ ص ١٠ وفي هامشه عن التهذيب ج ١ ص ٢٤٨.

(٣٠) سنن البيهقي ج ٣ ص ١٩٦.

٣١ ــ الوسائل ج ٥ ص ٣٤، والتهذيب ذكر الحديث في ضمن حديث طويل بتغيير في أوله وبزيادة قوله: (لا تجب على واحد منهم ولا الخائف). ج ٣ ص ٢٢ ح ٧٦.

٣٢ ــ المستدرك ج ١ ص ٤١٠

٣٣ ــ سنن البيهقي ج ٣ ص ١٨٦.

٣٤ ــ سنن البيهقي ج ٣ ص ١٨٦، وعبد الرزاق ج ٣ ص ١٩١ ح ٥٢٧٤ و ٥٢٧٣.

٣٥ ــ مصنف عبد الرزاق ج ٣ ص ١٩١ ح ٥٢٧٥.

٣٦ ــ الوسائل ج ٥ ص ١٥، والكافي بتغيير بسيط ج ٣ ص ٤٢١.

٣٧ ــ الوسائل ج ٥ ص ١٤، والفقيه ج ١ ص ٢٦٩ ح ١٢٣٠ بتغيير بسيط.

٣٨ و٣٩ ــ البيهقي ج ٣ ص ١٩٩، و ٢٠٠ وج ٣ ص ١١١.

٤٠ ــ الوسائل ج ٥ ص ٣٨.

٤١ ــ الوسائل ج ٥ ص ٣٧، والبحار ج ٨٩ ص ٢١٠ نقلاً عن كتاب (العروس) بالتغيير الآتي ونحوه بتغيير بدل قوله: عدنية كلمة عبري في كتاب مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٠ عن كتاب العروس والكافي ج ٣ ص ٢٤٦.

٤٢ ــ البحار نقلاً عن دعائم الإسلام ج ٨٩ ص ٢٥٧ وفي هامشه دعائم الإسلام ج ١ ص ١٨٣.

٤٣ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٤٦.

٤٤ و ٤٥ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٤٦ وفي (المشكاة) ص ١٢٣ نقله عن مسلم.

٤٦ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٤٧. وروي بإسناد آخر نحوه بتغيير بسيط في نفس الصفحة.

٤٧ و٤٨، ٤٩ ــ الوسائل ج ٥ ص ٣٩، والكافي ج ٣ ص ٤٢٤، والبحار ج ٨٩ ص ١٩٧ عن النوادر. وفي الهامش عن ص ٢٤ و٤٦ و٥٠ و٥١: والمستدرك ج ١ ص ٤٢٥ الحديث ١ و٢ باب ٤٥.

٥٠ ــ الوسائل ج ٥ ص ٨٦.

٥١ ــ الوسائل ج ٥ ص ٨٦.

٥٢ ــ مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤٠٩، ويظهر انه نقلاً عن دعائم الإسلام، وكذا عن دعائم الإسلام ج ١ ص ٤٢٥.

٥٣ ــ البيهقي ج ٣ ص ١٩٩، ونحوه في المنتقى ج ١ ص ٢٥ ح ١٦٠٦.

٥٤ ــ البيهقي ج ٣ ص ١٩٩، وروى الترمذي نحوه عن عبدالله بن مسعود ج ٢ ص ٣٨٣، وروى نحوه ابن ماجة ج ١ ص ٣٦٠، ونحوه في المشكاة ص ١٢٤.

٥٥و٥٦ ــ البيهقي ج ٣ ص ١٩٨ و ١٩٩.

٥٧ ــ الوسائل ج ٥ ص ٤٣.

٥٨ ــ البحار نقلاً عن دعائم الإسلام ج ٨٩ ص ٢٥٧، وفي هامشه دعائم الإسلام ج ١ ص ١٨٣، وفي مستدرك الوسائل ج ٤ ص ٤١٣ الحديث ١ باب ٢٢ عن دعائم الإسلام.

٥٩ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٠٤ والمنتقى ج ٢ ص ٢٣ ج ١٦٠١ نقله عن ابن ماجة. وابن ماجة ج ١ ص ٣٥٢.

٦٠و٦١ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٠٥ وأسنده بإسناد آخر مع تغيير في نفس الصفحة. وعبد الرزاق ج ٣ ص ١٩٢ ح ٥٢٨١ و ٥٢٨٢، ومجمع الزوائد في لفظ البيهقي ج ٢ ص ١٨٤.

٦٢ ــ الوسائل ج ٥ ص ٤٣.

٦٣ ــ مستدرك الوسائل عن دعائم الإسلام ج ١ ص ٤٠٨ الحديث الثالث باب ٦.

٦٤ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٠٥، وفي المشكاة ص ١٢٤. ونصب الراية ج ٢ ص ١٩٦.

٦٥و٦٦ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٠٥ والحاكم في المستدرك ج ١ ص ٢٨٣ و روى المنتقى نحوه بتغيير ج ١ ص ٢٤ ح ١٦٠٥.

٦٧ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٣ ص ٢٠٥ ح ٥٣٣٩.

٦٨ ــ الوسائل ج ٥ ص ٣٢.

٦٩ ــ البحار ج ٨٩ ص ١٨٥.

٧٠ و ٧١ ــ البخاري ج ١ ص ١٠٨، ومسلم ج ٣ ص٩،والبيهقي ج٣ ص ١٩٧، والمنتقى ج ٢ ص ٢٧ ح ١٦١٤.

٧٢ ــ البخاري ج ١ ص ١٠٨.

٧٣و٧٤ ــ مسلم ج ٣ ص ٩، وابو داوود بإسناده عن سماك مثله ج ١ ص ٢٨٦، والبيهقي بإسناده عن جابر بن سمرة مثله ج ٣ ص ١٩٧، ونقله عن مسلم، وقد قدّ مناه، والنسائي ج ٣ ص ١٠٩ بتغيير ونقصان آخره، ورواه بإسناد آخر نحوه ص ١١٠، والحاكم في المستدرك بتغيير وزيادة سؤال عن الخطبة في آخره ج ١ ص ٢٨٦، والمنتقى ج ٢ ص ٢٧، ونقله عن أحمد وعبد الرزاق ج ٣ ص ١٨٧ ح ٥٢٥٧، وذكر أحاديث كثيرة حول القيام في الخطبة. وأخرجه أبو داوود بإسناده ج ١ ص ٢٨٦ ح ١٠٩٣ وذكر نحوه بتغيير الحاكم في المستدرك ج ١ ص ٢٨٦ وفي المشكاة ص ١٢٤ ونصب الراية ج ٢ ص ١٩٦.

٧٥ ـ الوسائل ج ٥ ص ٣١ والتهذيب ج ٣ ص ٢٠ ح ٧٤.
٧٦ ـ البيهقي ج ٣ ص ١٩٧.
٧٧و٧٨ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٣ ص ١٨٧ ح ٥٢٥٨ و ٥٢٥٩.
٧٩ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٣ ص ١٨٨ ح ٥٢٦٤ وفي قعود معاوية في مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٨٧.
٨٠ ـ الوسائل ج ٥ ص ١٦ والكافي ج ٣ ص ٤٢٤.
٨١ ـ الوسائل ج ٥ ص ١٥ و ٣٨ و ٩.
٨٢ ـ الوسائل ج ٥ ص ٣٨ والكافي ج ٣ ص ٤٢١ وفي الباب أحاديث كثيرة. البحارج ٨٩ ص ٢٥٦.
٨٣ و٨٤ و٨٥ ـ البخاري ج ١ ص ١٠٩، والبيهقي ج ٣ ص ١٩٦ بإسناده عن نافع، عن ابن عمر بتغيير آخر. النسائي ج ٣ ص ١٠٩، وعبدالرزاق ج ٣ ص ١٨٨ ح ٥٢٦١، وراجع مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٨٧ عن البزار وقال في الحديث رجال الطبراني رجال الصحيح ، وأخرج نحوه عن السائب بن يزيد، ونحوه روى ابن ماجة في سننه ج ١ ص ٣٥١، ونصب الراية ج ٢ ص ١٩٦.
٨٦و٨٧ و ٨٨ ـ مسلم ج ٣ ص ٩ وأبو داوود ج ١ ص ٢٨٦، والنسائي ج ٣ ص ١١٠، والحاكم في المستدرك ج ١ ص ٢٨٦، وروى نحوه المنتقى ج ٢ ص ٢٦ ح ١٦١١، وروى عبدالرزاق الثوري عن سماك عن جابر نحوه ج ٣ ص ١٨٧ ح ٥٢٥، وأخرجه بإسناده أبو داوود ج ١ ص ٢٨٦، ونحوه في المشكاة ص ١٢٣، والدار قطني ج ١ ص ٣٦٦.
٨٩ و ٩٠ و ٩١ ـ أبو داوود ج ١ ص ٢٨٦، ونحوه بتغيير في نفس الصفحة عن جابر بن سمرة والترمذي ج ٢ ص ٣٨٠ ومجمع الزوائد ج ٢ ص ١٨٧.
٩٢ ـ عبدالرزاق ج ٣ ص ١٨٨ والطبراني ج ٢ ص ١٨٧ وأبو داوود ج ١ ص ٢٨٧ ومايأتي.

آخری قسط

شہید ڈاکٹر بہشتی

مالکیت ــ اسلامی نقطۂ نظر سے

منافع ــ سرمایہ کی تینوں قسموں میں

۱۔ پہلی قسم یعنی پیداواری آلات کی صورت میں سرمایہ ، جب سرمایہ محنت کے ساتھ ہو تو ایک نئی مصرفی قدر پیدا ہوتی ہے ، مثلاً ،

۱۰۰ کلو دھاگہ ← چرخہ + ۱۰۰ گھنٹے محنت

ایک کلو دھاگہ ← چرخہ ۔ ۱۰ گھنٹے محنت

اب اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ چرخہ پیداوار میں اضافے کا باعث ہوا ہے ۔ اس لئے اس نئی قدر مصرف کا ایک حصہ سرمایہ (چرخہ) کو بھی ملنا چاہیئے تو یہ اس کلیہ کی رو سے قابل قبول ہوگا جسے ہم نے فطری تقاضوں کے مطابق سبب مالکیت کے عنوان سے تسلیم کیا ہے ، ایسی صورت میں سرمایہ کا منافع (بشرطیکہ معقول ہو) نہ صرف یہ کہ باعث استحصال نہ ہوگا اور قدر زائد کا مسئلہ پیدا نہ ہوگا بلکہ یہ مزدوروں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی مدد کا سبب بھی ہوگا ۔

۲۔ دوسری صورت ، یعنی جب کہ سرمایہ جائیداد و املاک کی شکل میں ہو ، مردہ کام ایک جگہ پر اکٹھا ہوگیا ہے ، اسے فقط استعمال ہی کیا جاسکتا ہے وہ کسی نئی مصرفی قدر کی ایجاد کا باعث نہیں ہے لیکن خود اسے مصرفی قدر کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے ۔

ایک شخص اپنے لیے گھر بناتے وقت مسافروں کے قیام کی غرض سے ایک زائد کمرہ تعمیر کرتا ہے اور مسافروں سے اس کے بدلے کرایہ وصول کرتا ہے، یہ مکان اس کا جائیدادی سرمایہ ہے۔
دوسری مثال: زید آمدورفت میں سہولت کی خاطر اپنے لیے سائیکل بناتا ہے، ایک دن وہ خود استعمال کرنے کے بجائے عمرو کو کرایہ پر دیتا ہے، عمرو پیدل چل کر جتنا راستہ دو دن میں طے کرتا سائیکل کے ذریعہ چند گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے۔

۳۔ تیسری حالت، تجارتی سرمایہ سے منافع حاصل کرنا ہے۔ بتایا جا چکا ہے کہ اس صورت میں سرمایہ بانجھ ہے، خود اسے صرف کیا جا سکتا ہے وہ خود کوئی نئی قدر مصرف ایجاد نہیں کر سکتا اسی لیے ممکن ہے کہ یہ سرمایہ نامرئی وبہم استحصال کا باعث بن جائے جس کے نتیجے میں طبقاتی فاصلے پیدا ہوں۔ اور اسباب مالکیت کے سلسلے میں جن چیزوں کو بنیاد بنایا گیا ہے ان کے پیش نظر اس قسم کے منافع کی کوئی معقول بنیاد نہیں ہے، مذکورہ مثال میں ایک انسان دس لاکھ روپے میں ایک سوٹن چاول خرید کر اسے دس لاکھ بیس ہزار روپے میں فروخت کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مذکورہ اسباب مالکیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا بیس ہزار روپیہ زائد وصول کرنا جائز ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس نے یہ بیس ہزار روپیہ اس محنت (خدمات) کے بدلے میں لیا ہے جو اس نے خرید و فروخت کے سلسلے میں کی ہے تو پھر یہ سرمایہ کا منافع نہ ہوگا بلکہ محنتانہ ہے لیکن اس وقت سوال یہ پیدا ہوگا کہ ایک سوٹن چاول کی خرید و فروخت میں اس نے کس قدر محنت کی ہے جو اس رقم کا حقدار قرار پایا ہے؟

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ جس طرح ایک چھوٹا دوکاندار محنت کرتا ہے اسی طرح بڑا تاجر بھی محنت کرتا ہے، جو چیز قابل قبول ہے وہ اس کی محنت ہے اور اسی محنت کی مناسبت سے اسے معاوضہ دیا جانا چاہیئے، لیکن اگر یہی تاجر ایک سال کی تجارت میں ایک کروڑ روپیہ منافع کما لے تو اس رقم کو کس مد میں سمجھا جائے گا؟ اس تاجر اور اس چھوٹے دوکاندار میں کیا فرق ہے؟ تاجر یہ رقم معاشرے سے اپنے سرمایہ کے بدلے میں مانگتا ہے، وہ اپنے سرمایہ کا منافع چاہتا ہے لیکن انسانی فطرت اس کی مانگ تسلیم نہیں کرتی۔ اس مثال میں موجودہ زمانے میں زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ روپئے منافع دیا

جا سکتا ہے، پھر یہ بیس ہزار روپیہ کہاں سے آیا؟ اگر اس رقم کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اس میں سے دو سو روپیہ اس کی تجارتی محنت کی اجرت ہے اور بقیہ ۱۹ ہزار ۸ سو روپیہ وہی قدر زائد ہے، جو معاشیات میں موضوع بحث و گفتگو بنا ہوا ہے اور حتیٰ مارکس سے بھی پہلے "تجزیاتی معاشیات" میں اسے نامنظور کیا جا چکا ہے۔

تجارتی سرمایہ کے منافع کے سہارے کچھ لوگ دوسروں کی ذہنی و جسمانی محنت سے حاصل ہونے والی پیداواری اقدار کو ہضم کرنے کے لیے غیر مرئی راستے ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور یہ چوری اور سینہ زوری ہے، اس خرید و فروخت سے حاصل ہونے والے منافع میں جتنا حصہ، تاجر، منشی، منیم، مزدور وغیرہ کی محنت کے معاوضہ اور ٹیلیفون نیز ٹرانسپورٹ وغیرہ کے اخراجات سے متعلق ہے وہ جائز اور معقول ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ چونکہ میں نے ایک ہزار ٹن چاول کی خرید و فروخت کی ہے لہذا ہمارا منافع اس قدر ہوگا اور اگر اتنی ہی محنت سے سو ٹن کی خرید و فروخت کی ہوتی تو اس کا منافع اس منافع کا دسواں حصہ ہوتا۔ یہ غلط ہے اور وہی سرمایہ کا ظالمانہ منافع ہے جسے مسترد کیا جا چکا ہے۔ یہ شخص نقد ہو یا ادھار ہر حال میں سرمایہ کا نفع لینا چاہتا ہے۔ اس کا نقد، ادھار وقت سے فائدہ اٹھانا ہے وہ سرمایے کا نفع وقت کے حساب سے لیتا ہے:

نفع	یومیہ
۱۰ روپے کا نفع	۱ روپیہ
۳۰ روپے کا نفع	۲۰ روپیہ

اب صورت حال یہ ہے کہ اس کے وقت (TIME) کو عامل تو بنایا ہے لیکن سرمایہ اب بھی منجمد رہا اور یہ آدمی اسی منجمد سرمایے سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے (۱)۔ اس صورت میں تجارتی سرمایہ محنت طلب کام کے لیے شرط ہے سبب نہیں ہے، جبکہ پیداواری آلات سبب ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا نظام قائم ہو جائے کہ اشیاء صرف کا پیدا کرنے والا خود براہ راست اپنا مال دوکانداروں تک پہنچا دے اور اس سے یہ طے کر لے کہ اسے فروخت کر کے اپنا محنتانہ نکال کر بقیہ رقم اسے واپس کر دے تو

خرید فروخت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اس صورت میں تاجر کا تجارتی سرمایہ بیچ میں نہ رہے گا اور اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا یعنی اس کا وجود و عدم بے اثر ہے۔ حالانکہ پہلی صورت میں اگر پیداواری آلات کو نکال دیا جائے تو اس سے پیداوار پر اثر پڑے گا۔

معاشیات میں جسے قدر زائد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ دوسروں کی محنت کے نتائج کو چوری کرنے کا باعث ہوتی ہے، اور تجزیاتی معاشیات کے نقطۂ نظر سے یہ اسی سرمایہ سے متعلق ہے جو پیداواری آلات کی صورت میں ظاہر نہ ہو، بلکہ پیداواری و خدماتی نوٹوں جیسے بازار وغیرہ میں گردش کرنے والے سرمایہ کی صورت میں ہو۔

تجارتی سرمایہ اور منافع کے بارے میں اسلامی نظریہ

ابھی تک ہماری گفتگو صرف معاشیاتی نقطۂ نظر سے تھی، اسلامی نظریہ کے مطابق اس مسئلہ کو دو عنوانوں سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ کہا جائے کہ تاجر اپنی اجناس کا مالک ہے؟ اور چونکہ مالک ہے لہذا مشہور و معروف فقہی قاعدے "لا یحل مال امرء مسلم الا عن طیب نفسہ" (۲) یا آیۂ ..... لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض ....." کے مطابق وہ جتنا چاہے منافع حاصل کر سکتا ہے مثلاً اگر تین روپے کلو شکر خرید کر پانچ روپئے کے بجائے ۳۰ روپئے کلو فروخت کرے تو یہ جائز ہے اور کوئی حرج نہیں۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ان دلائل کے مقابلے میں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اجحاف ظلم و محروم کرنا حرام اور انصاف واجب ہے، آداب تجارت سے متعلق ائمہ اطہارؑ اور پیغمبر اکرمؐ کی احادیث کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اسلامی اخلاق سے متصف اور اسلامی اصول کا پابند تاجر صرف اتنا ہی منافع لیتا ہے جتنا اس کے منصفانہ محنتانہ کے مطابق ہو اور ظالم و بے ایمان ہے وہ تاجر جو اقتصادی نقطۂ نظر سے بانجھ سرمایے سے معجز نمائی کی امید رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں اسلامی معیار

اتنے واضح و روشن ہیں کہ اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

بیع اور ربا

جب اسلامی معاشرے میں سود کی حرمت کے سلسلے میں قرآنی آیات نازل ہوئے تو سود خواروں نے یہ سوال اٹھایا کہ سود سے ہاتھ آنے والے منافع اور خرید و فروخت سے حاصل ہونے والے منافع میں کیا فرق ہے؟

ذٰلک بانھم قالوا انما البیع مثل الربا

مثال: خرید و فروخت میں انسان دس ٹن چاول دے کر منافع کماتا ہے، اب اگر کوئی اسی دس ٹن چاول کی قیمت مثلاً دس ہزار یا ایک لاکھ روپیہ کسی کو دے کر یہ کہے کہ دو ماہ بعد یہ رقم کچھ اضافے کے ساتھ ہمیں واپس کر دینا، اس صورت میں بھی وہ اپنی رقم دے کر منافع حاصل کرتا ہے، لہٰذا ان دونوں منفعتوں میں کیا فرق ہے؟ قرآن کا جواب یہ ہے:

احل اللہ البیع وحرم الربا ....

ربا (سود) اور بیع (خرید و فروخت) میں فرق ہے، بیع میں درحقیقت آپ ایسی خدمت انجام دیتے ہیں جس کی ضرورت ہے، کیوں کہ بیع سے مراد اشیاء کی تقسیم اور سپلائی ہے یعنی پیداوار کے بعد صارفین کے ہاتھوں تک پہنچانا اور یہ انسانی معاشرے میں نہایت ضروری کام ہے، لیکن ربا میں یہ بات نہیں ہے، ربا میں آپ کوئی مفید کام انجام نہیں دیتے، بلکہ مفید کام وہ شخص انجام دیتا ہے جس نے پیسہ آپ سے لیا ہے، وہ آپ کے دیئے ہوئے "پیسے" سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا، لہٰذا صرف اسے پیسہ دے دینا بے سود ہے، پیسہ ایک وسیلہ ہے جسے لوگوں تک پہنچا دینا ہی کافی ہے نہ کوئی خدمت ہے (جب تک کہ وہ شخص کوئی کام نہ کرے) اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کس منافع کو جائز قرار دیتا ہے؟ ہم آیت "احل اللہ البیع وحرم الربا" سے صرف معقول محنتانہ کی حد تک منافع سمجھتے ہیں، اس سے زیادہ منافع اقتصادی ماہیت کے لحاظ سے ایک

قسم کا ظلم اور سو فیصد ربا ہے۔

افراط زر کی شرح اور منافع

اس سلسلے میں ایک دوسرا مسئلہ جو پیش آتا ہے وہ افراط زر یعنی پیسے کی قوت خرید میں کمی کا جبران و ازالہ ہے، اسی مثال میں ایک شخص سو ٹن چاول دس لاکھ روپئے کا خرید کر دس لاکھ دو سو روپئے میں فروخت کرتا ہے تاکہ دو سو روپئے اس کا محنتانہ حلال ہو اور " الکاسب حبیب اللہ " ہو، کا مصداق بن سکے، جب یہ تاجر سو ٹن چاول دس لاکھ دو سو روپئے میں بیچ کر دوبارہ سو ٹن چاول دس لاکھ روپئے میں حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس وقت تک چاول کی قیمت بڑھ چکی ہوتی ہے، اب دس لاکھ روپئے میں صرف ۹۹ ٹن چاول مل سکتا ہے، یہ ایک ٹن چاول جو تاجر کے ہاتھ سے نکل گیا اس کا علاج کس طرح ہوگا؟ بعینہ یہی مشکل پیسے کے معاملے میں بھی ہے، مثلاً آج آپ اپنے چچا زاد بھائی سے ایک لاکھ روپیہ قرض لیتے ہیں، آپ کا بھائی اس ایک لاکھ روپیہ سے گھر خریدنا چاہتا تھا لیکن آپ نے اپنی فوری ضرورت کے پیش نظر اس سے کہا کہ مکان کچھ دنوں بعد خریدے اور مطلوبہ رقم آپ کو قرض دیدے۔ کچھ دنوں بعد جب آپ نے قرض واپس کیا اور اس نے مکان خریدنا چاہا تو معلوم ہوا کہ مکان کی قیمت بڑھ چکی ہے، اس نقصان کا کیا ہوگا؟ یہاں بھی بیع و ربا میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر افراط زر کی بات ہے تو قرض اور خرید و فروخت دونوں ہی کے لیے چارہ جوئی ہونی چاہیئے۔"

اگر افراط زر معاشرے میں تکاثر کا سبب ہے تو اس کی بیخ کنی بھی ضروری ہے۔ افراط زر کے بہت سے اسباب ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا سبب یہی گردش میں رہنے والے سرمایے کا منافع ہے، اگر ہم کسی اقتصادی نظام میں اس سرمایہ کے منافع کو ختم کردیں تو ممکن ہے کہ افراط زر کی شرح میں کافی حد تک کمی آجائے، اگر ہم افراط زر کا مکمل وہمہ جہات جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ افراط زر کے دیگر اسباب وعلل کا سرچشمہ یہی ایک سبب (تجارتی سرمایہ کا منافع) ہے، افراط زر کے جملہ اسباب وعلل کی جڑ یہی گردش

میں رہنے والے سرمایے کا منافع ہے جو نہ پیداواری آلات کی صورت میں ہوتا ہے اور نہ جائیداد ہے جس سے استفادہ کیا جا سکے، صرف گردش میں رہنے والا سرمایہ ہے جس کے منافع کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرمایے کا منافع، افراط زر کے متعدد اسباب میں سے صرف ایک سبب ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب ہیں جن سے مفر نہیں ایسی صورت میں اس منافع کو "ازالۂ افراط زر" کہا جانا چاہئے، جیسے دیوالہ سے پیدا ہونے والے نقصانات کی تلافی جہاں تاجر کی مالی امداد غلط نہیں ہوتی۔

ان تمام مسائل کا سرچشمہ "قیمت" ہے، افراط زر کا ایک مؤثر عامل "قیمت" ہے، قیمت معین کرنے میں غلطی اور قیمت معین کرنے والے یونٹ کی غلطی افراط زر ایجاد کرتی ہے قیمت ادا کرنے والا یونٹ معاشی مسائل کا پیچیدہ ترین مسئلہ ہے، افراط زر کا سبب یہ ہے کہ قابل استفادہ امکانات کی پیداوار عوام کو دی جانے والی قوت خرید سے کم ہے، مثلاً سرمایہ دار کو تجارتی سرمایہ سے حاصل ہونے والا منافع اسے قوت خرید دیتا ہے حالانکہ ایک روپے کے برابر بھی معاشرے میں قابل استفادہ وسائل (یا اشیاء صرف) میں اضافہ نہیں ہوا ہے، یہی افراط زر کا باعث ہے۔ ایسی صورت میں مزدور سمجھتا ہے کہ اسے اپنا پورا حق مل گیا ہے حالانکہ اس کی قوت خرید اس مقدار سے کم ہے جو اسے ملا ہے یہ وہی استحصال اور مزدوروں کی جیب کاٹنا ہے۔ (۴)

سرمایہ داری نظام معیشت میں جو چیز قدر زائد کے مسئلہ کو جنم دیتی ہے اور اس کے تخریبی کردار کو واضح کرتی ہے اس کا سرچشمہ یہی تجارتی سرمایہ کا منافع ہے ورنہ پیداواری آلات یا جائیداد کی شکل میں سرمایہ تباہ کن قدر زائد کا سبب ہرگز نہیں ہوتا۔ (۵)

اس گفتگو کے بعد، اسلامی معاشیات میں سرمایے کی مذکورہ تینوں قسموں کے بارے میں جو بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ لکھنا ضروری ہے۔

۱۔ اجارہ

ہماری فقہ میں اشیا کا اجارہ (جیسے گھر، دکان، گاڑی، سائیکل وغیرہ کا کرایہ)

دوسری حالت (یعنی املاک و جائیداد کی شکل میں سرمایہ کے منافع) سے تعلق رکھتا ہے اور گذشتہ گفتگو کے مطابق اس کی صحیح اور قابل قبول اقتصادی توجیہ بھی ہوسکتی ہے اور یہ بذاتہ ظلم نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگر اجارہ کو تسلیم کرلیا جائے تو مالک و کرایہ دار کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا، مالک کرایہ دار کو تنگ کرے گا نادار افراد پریشانیوں میں مبتلا ہوجائیں گے۔ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ معاشرے کے اقتصادی نظام میں ان مشکلات کو دور کیا جائے، اتنی زیادہ تعداد میں مکان بنائے جائیں کہ کم تر افراد کرائے کے مکان لینے پر مجبور ہوں، ہر شخص کے پاس اپنا مکان ہو۔ ایسی صورت میں عام طور سے لوگوں کے پاس اپنا گھر ہوتا ہے اور اگر کسی وقت کسی سبب سے (جیسے تحصیل علم یا علاج وغیرہ) کسی جگہ وقتی طور پر قیام کرنا چاہتے ہیں تو پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، اور آسانی سے کرایہ کا مکان دستیاب ہوجاتا ہے، مثلاً مجھے پورے سال میں گاڑی کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن کبھی کبھی سال میں چند دنوں کے لیے سفر پیش آجاتا ہے، اگر کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے چند دنوں کے لیے گاڑی کرایہ پر حاصل کرکے اس سفر کو انجام دے سکوں تو یہ میرے لئے بلکہ پورے معاشرے کے لیے اس سے کہیں زیادہ بہتر اور منصفانہ تر ہے کہ میں چند دنوں کے لیے گاڑی خرید کر گھر میں رکھے رہوں۔ البتہ اس کا کرایہ معقول اور کم ہونا چاہیے، اس کے لئے ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو قیمتوں کو بڑھنے نہ دے، حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ منصفانہ قیمت پر نظر رکھے، ہر جگہ دیکھ بھال کرے، ایک ایسا نظام وضع کرے جو قیمتوں کو بڑھنے سے روکے اور ایک معاشی و دبستانی حکومت کے جواز سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کی مشکیں کسنے اور کرایہ سے ہونے والی آمدنی کے سبب معاشرے میں بڑھنے والے فاصلوں کی روک تھام کے لیے دو چیزیں نہایت ضروری ہیں۔

۱۔ ضرورت مندوں کے لیے اشیاء کی فراوانی میں تعاون۔

۲۔ قیمتوں کو کم رکھنے کے لیے منصوبہ سازی۔

اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ کسی معاشیاتی دبستان میں اجارہ و کرایہ کے جائز ہونے کا لازمہ اقتصادی عدل و انصاف پر مبنی اصولوں کی پامالی نہیں ہے اور

نہ ہی قدر زائد کا باعث جس کی گفتگو مارکس اور اس سے پہلے کے اقتصادی دبستانوں میں پائی جاتی ہے۔

۲۔ مزارعہ

مزارعہ سے مراد یہ ہے کہ زید محنت و مشقت سے کسی زمین کو زرخیز و کارآمد بناتا ہے نہر کھود کر پانی کھیت تک پہنچاتا ہے، زمین کو ہر اعتبار سے کھیتی کے لئے تیار کرتا ہے لیکن خود کسی وجہ سے (مثلاً بیماری یا سفر) کھیتی نہیں کر سکتا، ایسی صورت میں زید دو کام کر سکتا ہے

۱۔ تیار کردہ زمین اور پانی، خالد کو کرایہ پر دے دے یہ وہی پہلی حالت (اجارہ) ہے جس کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔

۲۔ زید، خالد سے معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس زمین پر کام کرے جب فصل تیار ہو جائے تو مفید اور مناسب مقدار کے مطابق دونوں آپس میں بانٹ لیں۔ معاشی نقطۂ نظر سے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اب رہی یہ بات کہ زید کا حصہ بہت زیادہ اور ظالمانہ نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ لیکن اصل مسئلہ معقول اقتصادی دلیل سے رد نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر خالد سال بھر کسی ایسی زمین پر محنت کرتا جو پہلے سے تیار نہ ہوتی اور پانی بھی وہاں تک نہ پہنچتا تو ممکن تھا اس کی محنت کا پھل تیار شدہ زمین کا ۱/۳ ہوتا۔ اگر خالد زید کی تیار کردہ زمین پر ۳۰۰۰ گھنٹے کام کرے جہاں پانی بھی موجود ہے تو مثلاً ۳۰ ٹن گیہوں پیدا ہوگا۔ لیکن اگر اتنی ہی محنت افتادہ زمین پر کرے تو شاید دس ٹن گیہوں بھی دستیاب نہ ہو۔

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس تیس ٹن میں سے خالد کا حصہ صرف دس ٹن ہے اور بقیہ بیس ٹن زید کی ملکیت ہے، یہ تقسیم لالچی سرمایہ داروں کی تقسیم ہے، ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اس پیداوار میں زید بھی حصہ دار ہے۔ ممکن ہے مزارعہ اس سے بھی بڑھ کر ہو، یعنی زید نے محنت و مشقت سے زمین تیار کی یا کھیت تک پانی پہنچانے کا انتظام کیا، کھیت جوت کر بوائی کی، پودے بھی نکل آئے، اس کے بعد زید مریض ہو گیا، اس وقت سے کٹائی تک کا ذمہ دار خالد کو بنا دیا کہ فصل کٹنے کے بعد پیداوار کو منصفانہ طریقے

آپس میں بانٹ لیں اس میں کیا حرج ہے ؟ مذکورہ گفتگو کی روشنی میں مزارعہ عقل پسند بنیادوں پر استوار ہے ۔

ممکن ہے یہ سوال بھی اٹھے کہ مزارعہ مال دار اور غریب طبقے کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے ۔ اس مشکل کا علاج بھی آسان ہے ۔ راہ حل یہ ہے کہ کوئی کسان کھیت، پانی اور مشینی آلات نہ ہونے کی بنا پر اپنی محنت کو، کھیت، پانی اور مشینی آلات کے مالکوں کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنے پر مجبور نہ ہو یہ وہی چیز ہے جو اساسی دستور کی دفعہ ۴۳ شق ۲ میں بیان ہوئی ہے ۔

یہ اسلامی اصولوں کے مطابق ایک نئی معاشیاتی تھیوری ہے جسے میں "پیداواری آلات و امکانات کی فراوانی" کہتا ہوں، اسی دفعہ کی ایک دوسری شق فلاح و بہبود کے وسائل کی فراوانی کی تھیوری سے تعلق رکھتی ہے ۔ اس تھیوری کے مطابق معاشرے میں اس آزادی کے باوجود کہ ایک شخص زمین کو قابل کاشت بنا کر، تخم پاشی کرکے، انکھوا نکلنے کے بعد دوسرے کے سپرد کر دے ۔ دوسرے شخص کو بھی یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ حساب لگائے آیا اس زمین پر کام کرنا اس کے حق میں مفید ہے یا نہیں، وہ تھوڑی سی اجرت کے عوض میں اپنی محنت کو فروخت کرنے پر مجبور نہ ہو ۔ اس طرح مزدور کی محنت کو اجباری طور پر سستے داموں فروخت کرنے کا امکان ختم ہو جاتا ہے ۔ اس قسم کا اقتصادی تفاوت دونوں کو آزادی حیات دیتا ہے ۔ چنانچہ اس تفاوت کو ہم باقی رکھیں گے ۔ ہماری اسلامی معیشت آزادی اور نفیِ استحصال دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتی ہے ۔

۳۔ مساقات

مساقات صرف آب یاری اور وہ بھی زیادہ تر درخت وغیرہ کی آب یاری میں ہے، مثلاً زید نے باغ لگایا، لیکن چونکہ وہ سفر کرنا چاہتا ہے لہٰذا خالد سے معاہدہ کرتا ہے کہ اس کے جانے کے بعد باغ میں سنچائی اور درختوں کی حفاظت کرے (یہاں زراعت میں خالد کا کوئی دخل نہیں) اور اس کے عوض میں باغ کے پھلوں کو منصفانہ اور معقول طور پر تقسیم کرے ۔ یہ عمل، مزارعہ کے مانند ہے ۔

توحید ۴۷

۴۔ مضاربہ

مضاربہ پیداواری عمل اور تبادلہ کی شکل میں خدماتی کام (سروس) کے ملاپ سے عبارت ہے مضاربہ کا مصداق اور اس کا نمونہ "پھیری والا" بنجارہ، بیلہ ور ہے اب جیسے ایک دیہاتی پھل، اناج، مویشی، مرغی، انڈا مہیا کرتا ہے۔ لیکن اس کے پاس پارچہ بافی اور برتن سازی کی فرصت نہیں، یا اسے برتنوں کی ضرورت تو ہے لیکن برتن سازی کے فن سے ناآشنا ہے، برتن ساز قصبہ یا شہر میں رہتا ہے۔ برتن ساز صبح سے شام تک برتن بناتا ہے، لیکن اس کے تمام خریدار صرف شہر ہی میں نہیں رہتے، بہت سے خریدار دیہاتوں میں رہتے ہیں، لیکن برتن ساز کے لئے نفع بخش نہیں ہے کہ وہ برتنوں کو خود دیہات لے جاکر فروخت کرے، اور دیہاتیوں کے لئے بھی فائدہ نہیں ہے کہ ہر روز اپنے کام کاج چھوڑ کر دس عدد انڈے شہر میں لاکر فروخت کریں۔ پھیری والے کا کام یہ ہے کہ شہر سے برتن، موزے، جوتے وغیرہ لاکر دیہات میں فروخت کرے اور مرغ، انڈا پنیر، دودھ، دہی، گیہوں وغیرہ دیہات سے شہر پہنچائے، خواہ وہ جنس کے بدلے میں جنس کو فروخت کرے یا عمل تبادلہ کو آسان بنانے کے لئے پیسہ استعمال کرے۔

جیسا کہ کہا جا چکا مضاربہ کا مصداق پھیری والے کا عمل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بیلہ ور برتن ساز کے برتنوں کے بدلے میں پیسہ نہیں دیتا کیونکہ اس کے پاس ہے ہی نہیں، بلکہ برتن ساز سے معاہدہ کرتا ہے کہ برتنوں کو دیہات لے جاکر فروخت کرے گا۔ منافع کا کچھ حصہ برتن ساز کو دے گا بقیہ خود اس کا اپنا ہوگا۔ دوسری طرف سے دیہاتیوں سے بھی معاہدہ کرتا ہے کہ ان کے مرغ اور انڈے وغیرہ شہر میں فروخت کرے گا، منافع کا ایک حصہ اس کا ہوگا اور بقیہ دیہاتیوں کا، یہی مضاربہ ہے۔ سرمایہ (جو برتن یا مرغ اور انڈے سے عبارت ہے) برتن ساز اور دیہاتی کا ہے اور خدماتی کام (سروس) پھیری والے کا اور یہ عمل پیداواری و خدماتی کام کی ترکیب ہے۔ چنانچہ منافع بھی پیداواری و خدماتی کاموں کے درمیان منصفانہ طریقے سے تقسیم ہوگا۔ اس مثال میں صحت مند مضاربہ میں بانجھ سرمایہ کو نفع حاصل نہیں ہوا۔ جو کچھ بھی نفع حاصل ہوگا وہ پیداواری کام کی مظہر اجناس اور پھیری والے کی محنت سے کے

…طابق تقسیم کیا جائے گا۔ ..،،

مضاربہ تجارتی سرمایہ کا نفع دینا نہیں ہے۔ سرمایہ کے نفع دینے کا مطلب (ہماری اس مثال میں) یہ ہے کہ برتن ساز پھیری والے کو دس پلیٹیں دیتا ہے اور واپس آنے کے بعد گیارہ پلیٹوں کا پیسہ وصول کرتا ہے۔ حالانکہ ہماری اس مثال میں ایسا نہیں ہے بلکہ پھیری والا برتن ساز سے دس پلیٹیں لیتا ہے اور اسے دیہات میں فروخت کرکے گیارہ پلیٹوں کی قیمت وصول کرتا ہے۔ ایک پلیٹ کی قیمت اپنی محنت و خدمت کے بدلے میں رکھ لیتا ہے اور دس پلیٹوں کی قیمت برتن ساز کو لوٹا دیتا ہے۔ لہٰذا برتن ساز کو صرف دس پلیٹوں کی قیمت ملی گیارہ کی نہیں۔ یہ ہے حقیقی مضاربہ۔

معاشیات میں جو بحث ہے وہ یہ کہ مضاربہ کو منصفانہ میکنزم پر استوار ہونا چاہیے، بات بھی صحیح ہے، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خود مضاربہ مشکل رہا ہے۔ دونوں میں فرق ہے، پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مضاربہ، مشکل رہا نہیں ہے۔ بلکہ پیداواری عمل اور اجناس کی تقسیم کے سلسلے میں خدماتی کام کی ترکیب ہے۔ اور فطری بات ہے کہ منافع صرف پیداواری کام کے بقدر نہیں ہوگا بلکہ پیداواری اور تقسیمی دونوں کاموں کے مطابق ہوگا، پیداواری عمل اور خدماتی کام کے ملنے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، وہ درحقیقت نفع نہیں ہے بلکہ ایک چیز ہے جو خدمت کے بدلے میں ملنی چاہیئے۔ پھیری والا، تھال، سیلز پھیری لگانے والوں، نانبائی اور اخبار فروش کا کام ایسا ہی ہے، اور ان میں سے کوئی بھی غیر پیداواری و غیر جائیدادی سرمایے کو نفع دینا نہیں ہے۔

مزارعہ و مساقات ایک قسم کی پیداواری سرمایہ کاری ہے، اجارہ، کبھی پیداواری سرمایہ کاری ہوتا ہے اور کبھی جائیدادی سرمایہ کی شکل میں۔ لیکن مضاربہ نہ یہ ہے نہ وہ، بلکہ پیداواری و خدماتی کاموں کا ملاپ اور ترکیب ہے، اقتصادی نقطۂ نظر سے مزارعہ، مساقات، اجارہ اور مضاربہ میں کوئی حرج نہیں۔

اس کے علاوہ جس نظام میں بیمہ، ریٹائرمنٹ اور بے کاری کے ایام کا کوئی انتظام نہ ہو، کیا اس قسم کے بیموں کے لیے یہ (مزارعہ، مساقات، اجارہ، مضاربہ) صحیح

خار موسے نہیں ہو سکتے؟ ہم بنیادی اصول یہی سمجھتے ہیں کہ معاشرے میں کوئی مفت خور نہ ہو، جو محنت کرے گا وہی کھائے گا، مریض و لاچار افراد مستثنیٰ ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ محنت و مشقت کرنے والا ہر انسان کیا آخر عمر تک کام کر سکتا ہے، یا کوئی ایسا وقت بھی آئے گا جب اس میں محنت و مشقت کی سکت باقی نہ رہ جائے گی؟ سرمایہ داری نظام ہو یا موجودہ سوشلزم یا آئیڈیل اشتراکی نظام (جس میں حکومت کا وجود نہ ہوگا ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرے گا اور حسب خواہش استفادہ کرے گا) ہر جگہ کچھ ایسے افتادہ انسان ملیں گے جو کسی کام کے لائق نہیں ہوتے، لیکن ان لوگوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والی اقدار استعمال کرتے ہیں جو آج پیدا کر رہے ہیں، خواہ بچپنے کا دور ہو یا بڑھاپے کا زمانہ، انسان کی زندگی کے یہ دو سرے ایسے ہیں جب وہ کچھ پیدا کئے بغیر استعمال کرتا ہے اور یہ قدرتی امر ہے۔ کبھی اور کسی معاشرے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر انسان صرف اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں سے استفادہ کرے، کیونکہ زندگی کے بعض حصوں میں پیدا کر کے کھا سکتا ہے لیکن زندگی کی کچھ گھڑیاں ایسی بھی ہیں جب وہ کسی کام کا نہیں رہ جاتا۔ لیکن اشیاء صرف سے استفادہ کرتا ہے، یہ استفادہ کیوں کر ہو؟ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایام جوانی میں محنت و مشقت کر کے مصرفی اقدار پیدا کرتا ہے اس وقت اسے چاہیے کہ اپنی ضرورت سے کچھ زائد پیدا کر کے ایام بے کاری کے لئے ذخیرہ کر لے، یہ ذخیرہ و پس انداز دو طرح سے ہو سکتی ہے، یا حکومت پس انداز کرتی ہے یا خود انسان پس انداز کرتا ہے۔ وہ بوڑھا کسان جس نے جوانی میں اپنی تمام طاقتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دس یا بیس ایکڑ زمین کو قابل زراعت بنایا ہے، ایک ٹریکٹر اور کچھ بیج فراہم کیا۔ سینچائی کے لئے نہریں بنائی ہیں، لیکن اب ساٹھ سال کی عمر میں کھیتی باڑی کا کام انجام نہیں دے سکتا، اگر یہ بوڑھا کسان ان تمام امکانات و وسائل کو کسی جوان کسان کے سپرد کر دے اور اس سے کہے کہ پیداوار کا ایک حصہ اس کا ہو اور ایک حصہ جوان کسان کا، اس میں کیا حرج ہے؟ کیا فرق ہو گا اگر حکومت اس بوڑھے کسان سے چھین کر دوسرے کسان کے سپرد کر دے؟ حکومت اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے؟ یہی نہ کہ حکومت اس دوسرے کسان کی پیدا کردہ اقدار کا

ایک حصہ لے کر پہلے کسان کے حوالے کردے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس صورت میں دفتری کاموں اور فائل بازی کا اضافہ ہو جائے گا تاکہ حساب وکتاب درست رکھے اور اس کسان سے لے کر اس کسان کے حوالے کرے، معلوم نہیں ہے کہ یہ حکومت سالاری اور بیوروکریسی یہ حکومتی سرمایہ داری پیداشدہ مصرفی اقدار کو تمام عوام کے درمیان بہتر طریقے سے تقسیم کرسکے گی یعنی کمتر خدماتی کام کے ذریعہ اس تقسیم کو انجام دے سکے؟ یہ محتاج تجربہ ہے اور میرے خیال میں ایران میں ان ہی معیاروں کے مطابق ایک نیا اقتصادی تجربہ ضروری ہے۔

حاشیے :

۱۔ یاد رہے کہ گذشتہ مثال میں ۵۰۰ کیلو کپاس کے لئے منافع کے قائل نہیں ہوئے ہیں، حالانکہ چرخے اور مزدور کی محنت کے منافع کو تسلیم کیا ہے۔ (۲) مال مسلم میں تصرف، اس کی مرضی کے بغیر ناجائز ہے۔ (۳) کاسب (تاجر) حبیب خدا ہے۔ (۴) کارخانہ کا مالک بھی جب کارخانہ کی کارکردگی میں اپنا نفع معین کرنا چاہتا ہے تو اس طرح حساب کرتا ہے: اس نے کارخانہ میں دس کروڑ روپیہ سرمایہ لگایا ہے، عمارت (۲۰ لاکھ روپیہ) مشین (۸۰ لاکھ روپیہ) خام مال اور مہینہ میں کارکنوں کو دی جانے والی اجرت (۹ کروڑ روپیہ) وہ کہتا ہے اس سرمایہ کا ایک کروڑ روپیہ عمارت اور مشینوں سے تعلق رکھتا ہے، اور ۹ کروڑ روپیہ خام مال اور کارکنوں کو دی جانے والی اجرت سے متعلق ہے تاکہ اجناس کی گردش ہوسکے، کیونکہ خام مال خرید کر فلاں شی کے بنانے اور اسے سیل تک پہنچا کر اس کی قیمت وصول کرنے تک چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوتا ہے، لہٰذا وہ صرف ایک کروڑ کا منافع نہیں مانگتا بلکہ دس کروڑ کا نفع چاہتا ہے۔ یہاں پر بھی اس ۹ کروڑ روپے کا منافع تجارتی سرمایہ کے منافع کے مانند ہے، معقول اور جائز منافع صرف اتنا ہی ہے جتنا پیداشدہ مصرفی اقدار کی افزائش میں مؤثر پیداواری آلات اور عمارت وغیرہ سے تعلق رکھتا ہو، اس کے علاوہ جتنا منافع اس کے خدماتی کام اور ناقابل اجتناب افراط زر کی شرح سے متعلق ہے جیسے استھلاک ڈیپریسیو کا جبران (بشرطیکہ افراط زر کو تسلیم کرلیا جائے) وہ بھی معقول ہے، لیکن اس سے زائد منافع اقتصادی نقطہ نظر سے ربا اور ناقابل قبول ہے یہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو اس سرمایہ کو اہمیت دیتا ہے۔ (۵) یہاں پر چند مسئلے سامنے آتے ہیں، سوشلسٹ معاشروں میں افراط زر کی کیا وجہ ہے؟ کیا اس کا سبب سرمایہ دارانہ معاشروں کے تجارتی تعلقات ہیں، یا اس کی وجہ محنت کو صحیح مقام نہ دینا ہے؟ کیا سوشلسٹ معاشروں میں افراط زر کا سبب یہ نہیں ہے کہ مثلاً روس اپنے مصنوعی سیاروں کے اخراجات زراعتی اور استعمالی اشیاء کی پیداوار سے پورا کرنا چاہتا ہے، جس کی وجہ سے افراط زر وجود میں آتا ہے؟ یعنی درحقیقت وہی منافع جو امریکہ میں "سرمایہ دار" سرمایہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے، روس میں "حکومت" سرمایہ سے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو افراط زر ہو ہی نہیں سکتا، افراط زر میں، گردش میں رہنے والے سرمایہ کے منافع کے نشان قدم نامناسب ٹیکسوں کے ہمراہ نظر آتے ہیں، حکومت ممکن ہے دو قسم کے ٹیکس لگادے۔ ایک ٹیکس وہ جس کے بدلے حکومت مزدور کو سہولت پہنچاتی ہے اور دوسرا وہ ٹیکس جس کے بدلے کوئی سہولت نہیں دیتی، اضافہ اسلحہ بھی اسی میں شامل ہے، مگر یہ کہ وہاں جو اطمینان مزدور کو دلایا جاتا ہے واقعاً منصفانہ ہو کیونکہ اطمینان کے لئے بھی اخراجات ہوتے ہیں، یہ بہت لمبی اور دقیق بحثیں ہیں۔ شرعی نقطہ نظر سے کوئی شخص زیادہ منافع لینے کا حقدار نہیں ہے۔ ہماری قطعی ویقینی اسلامی نصوص کے مطابق کم از کم اتنا تو ثابت ہی ہے کہ زیادہ منافع خلاف انصاف ہے۔ بہرحال یہ نظام قیمت ہے جو بہت ہی پیچیدہ ہے۔ میرے خیال میں اقتصادی نظاموں کی تمام اچھائیوں اور برائیوں کا سرچشمہ منصفانہ ترین قیمت کا نظام ہے، انسانی سماج میں آج تک انصاف مطلق قیمت موجود نہیں ہوئی ہے خواہ وہ اسلامی نظام ہو یا مارکسی یا سرمایہ دارانہ نظام، منصفانہ قیمت کے لیے میکنزم کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ "علم اقتصاد" کا کام ہے، گو اخلاق بھی ایک اہم عامل ہے لیکن علمی عامل سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ (۶) مزید اطلاع کے لیے ابعاد اساسی در بخش اقتصاد قانون اساسی" کا مطالعہ کیجئے۔ (۷) ہماری فقہ میں مضاربہ کے کیا شرائط ہیں؟ بعض فقہا کا کہنا ہے کہ مضاربہ صرف اس سرمایہ میں محقق ہوتا ہے جو سونے چاندی کی شکل میں ہو یہ بہت ہی نازک فقہی بحث ہے۔

جناب مفتی سید طیب جزائری

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوب قیصر روم کے نام

کسی انسان کے "خط و خال" صورت و زیبائی کو دیکھنا ہو تو اس کی تصویر دیکھیے اور اگر "خط و حال" سیرت و شخصیت پر نظر کرنا ہو تو اس کی تحریر کا مطالعہ کیجیے۔ اہل نظر کے لیے تصویر بولتی ہے اور اہل دانش کے لیے تقریر ہے۔ خاص کر خط و مکتوب تاریخ و تنقید میں بڑی معنی خیز دستاویز ہے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامہ ہائے مبارک اہل علم کے لیے خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔ یہ مکتوبات سیاست، ریاست، حکومت، انسان شناسی، دعوت و تبلیغ اور اسلامی روابط بین المللی کے مطالعہ میں سنگ میل ہیں۔ مکتوبات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے کہ نہیں؟ اگر جانتے تھے تو ایک "حیرت" ــــ اور اگر نہیں جانتے تو ــــ "صد حیرت"۔ جاننے پر حیرت اس لیے کہ اپنے قلم مبارک سے لکھا کیوں نہیں؟ ہمیشہ املا کروایا۔ اور اگر نہیں جانتے تھے تو ایسے نبی کو نہ ماننے کے بارے میں لوگوں نے جاہل ہونے کو دلیل کیوں نہ بنایا؟ تعجب ہے کہ کلمہ گو اس صفت کے منکر ہیں۔

منکرین کتابت کا استدلال اور اس کا جواب

ان لوگوں نے تین باتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ آپ کا مشہور لقب "امیّ" تھا، اور امی اس کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔

۲۔ آپ نے کبھی کچھ نہ لکھا، اگر جانتے ہوتے تو کبھی نہ کبھی تو لکھتے؛

۳۔ سورۂ عنکبوت کی اڑتالیسویں آیت: وما کنت تتلو من قبلہ من کتاب ولا تخطہ الخ

۱۔ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ "امی" "ام القریٰ" سے ہے جو مکہ کا دوسرا نام ہے جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے: ھوالذی بعث فی الامیین رسولا منھم (جمعہ: ۲) "وہ خدا وہ ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا"۔ اگر "امی" کے معنی ان پڑھ (جاہل) کے مراد لیے جائیں تو اس آیت کا کیا مطلب ہوگا؟ یعنی جاہلوں میں رسول بھیجا؟ حالانکہ مکہ میں پڑھے لکھے لوگ بھی تھے۔

اس کی مؤید امام محمد تقی علیہ السلام سے ایک روایت علل الشرایع وغیرہ میں منقول ہے جو ہمارے مدعیٰ پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی جعفر الجواد علیہ السلام قال: (الراوی جعفر بن محمد الصوفی) فقلت یابن رسول اللہ لم سمی النبی بالامی؟ فقال مایقول الناس؟ قلت: یزعمون انہ انما سمی الامی لانہ لایحسن ان یکتب. فقال: کذبوا علیھم لعنۃ اللہ انّی ذلک؟! واللہ یقول فی محکم کتابہ: ھوالذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ. فکیف کان یعلم مالایحسن، واللہ لقد کان رسول اللہ (ص) یقرء ویکتب باثنین وسبعین لسانا، وانما سمی الامی لانہ کان من اھل مکۃ، ومکۃ من امہات القری وذالک قول اللہ عزوجل: لتنذر ام القری ومن حولھا (۱)

امام ابوجعفر جوادؑ سے روایت ہے (راوی جعفر بن محمد صوفی کہتا ہے) میں نے حضرت سے پوچھا کہ (ہمارے) نبیؐ کو امی کے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟ فرمایا: لوگ کیا کہتے ہیں؟ میں نے عرض کی: وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ آپؐ چونکہ لکھنا نہیں جانتے تھے، اس لیے آپ کا نام امی پڑگیا، حضرت نے فرمایا: وہ جھوٹ بولتے ہیں، ان پر اللہ کی لعنت ہو! بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟! درآنحالیکہ اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: وہ اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس (اللہ) کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کے باطن کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت پڑھاتا ہے، (اس کے بعد امامؑ

(۱) علل الشرایع ۱/۱۲۵ط تہران، اس کے علاوہ یہ حدیث معانی الاخبار، اختصاص، بصائر الدرجات میں بھی ہے۔

فرمایا) اگر نبی ان پڑھ (جاہل) تھے تو ان کو پڑھاتے کس طرح تھے؟ (پھر آپ نے فرمایا) خدا کی قسم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر زبانوں میں پڑھ اور لکھ سکتے تھے (یا بہتر زبانوں میں پڑھتے اور لکھتے تھے) آپ کو امی اس لیے کہا جاتا تھا کہ آپ اہل مکہ سے تھے اور مکہ ام القریٰ ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:
تاکہ تم (اے رسول) ڈراؤ ام القریٰ اور اس کے اطراف کی آبادیوں کو

(دوسری بات) کا جواب یہ ہے کہ آپ نے بر مصلحت نہیں لکھا اور نہ لوگوں کو شک پڑ جاتا کہ آپ نے کہیں سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے جیسا کہ مذکورہ آیت میں ہے "اذاً لارتاب المبطلون" اصل بات یہ ہے کہ نہ تو آپ نے کسی مدرسے میں پڑھا نہ کسی انسان سے تعلیم پائی کیونکہ آپ سے بہتر کوئی تھا ہی نہیں، پڑھتے کس سے؟ اس کے بعد اتنا بڑا معجزہ "قرآن" پیش کر دیا۔ یہ فی الحقیقت "معجزہ در معجزہ" ہے کیونکہ قرآن بذات خود ایک معجزہ ہے، پھر اس معجزہ کو ایک ایسا شخص پیش کرتا ہے جس نے ایک حرف نہیں پڑھا، نہ کسی کے آگے زانوئے ادب تہ کیا نہ تمام عمر اپنے قلم سے کوئی لفظ لکھا۔ اگر آپ عام لوگوں کی طرح سے لکھنا پڑھنا شروع کر دیتے تو شبہ ہوتا کہ آپ نے شاید پوشیدہ طور سے اس کو سیکھا ہے، اس لیے آپ نے بحکم الٰہی اپنے ہاتھ میں قلم نہیں لیا دوسروں سے لکھوایا تاکہ آپ کی ذات اور قلم میں ایک طرح کی مغایرت تامہ ہو جائے اور اس سے حقانیت قرآن و اسلام کی تقویت ہو، اور ذہن انسانی یہ ماننے پر مجبور ہو جائے کہ جس شخص نے نہ لکھنا سیکھا اور نہ اپنی زندگی میں کبھی کچھ لکھا اس نے اتنی بڑی کتاب اور اتنی جامع شریعت کیسے پیش کر دی؟ چونکہ ایسا نہیں ہو سکتا اس کے باوجود ہوا۔ لہٰذا یہ ایک معجزہ برحق ہے!

(تیسری بات) "آیت مذکورہ" سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت (تم اس سے قبل نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے اگر ایسا ہوتا تو باطل والے شک میں پڑ جاتے) میں کہاں کہا گیا ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اس میں تو یہ کہا گیا ہے کہ لکھتے پڑھتے نہیں تھے:" اور یہ واقعہ ہے کہ آپ نے اپنی عمر میں لکھا پڑھا نہیں پھر وجہ یہ بیان کی گئی کہ اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل شک و شبہ کر سکتے تھے، اس طرح یہ آیت برعکس ہمارے دعوے کو ثابت کرتی

ہے کہ دعوائے مخالف کو!

آنحضرتؐ کے کاتب:

سطور بالا سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ بہ مصلحت الٰہی خود نہیں لکھتے تھے لہٰذا طبعی امر تھا کہ دوسرے لوگوں سے لکھوائیں، ان لوگوں کو رسول اللہؐ کا کاتب کہا جاتا ہے جن کی تعداد بیالیس تک بتلائی جاتی ہے، لیکن ان سب میں نمایاں حضرت علی علیہ السلام کی ذات ہے۔ کیونکہ آپؑ میں تین امتیاز پائے جاتے تھے:

۱۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے قدیمی کاتب تھے۔

۲۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے کاتب تھے جس نے وحی، عہود، خطوط وغیرہ تمام چیزوں کی کتابت کی جبکہ دوسرے لوگوں نے الگ الگ مطالب کی کتابت کی۔

۳۔ آپ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا [1]

شاہان وقت اور زعمائے عصر کے نام آپؐ کے مکتوبات:

سنہ ۶ ہجری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو صلح "حدیبیہ" کے موقع پر ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو کسی جنگ میں حاصل نہیں ہوئی۔ دین حق کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا، چونکہ آنحضرتؐ کو بھی اب سکون میسر آگیا تھا لہٰذا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے عرب و عجم کے بادشاہوں، رؤسائے قبائل، بڑے بڑے راہبوں کو (جن کا مقام بادشاہوں سے بھی اونچا تھا) خطوط لکھوائے اور ان کو اللہ اور اس کے برحق دین کی طرف دعوت دی یہاں تک کہ ایک روز میں آپ نے چھ مکتوب لکھوائے اور انکو چھ سفیروں کے ذریعہ اطراف و اکناف میں روانہ کیا، اس کے عظیم نتائج برآمد ہوئے۔ سب سے پہلے آپ نے شہنشاہ روم (قیصر)، شہنشاہ ایران (کسریٰ)، شاہ حبش (نجاشی) اور شاہ مصر قبط کو خط لکھوائے۔

---

[1] اسد الغابۃ، الاستیعاب

شہنشاہ روم قیصر کے نام آپؐ کا مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ من محمد بن عبد اللہ، الیٰ ھرقل عظیم الروم ،
سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ، اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام ، اسلم تسلم
یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فانما علیک اثم الاریسین [ویا اھل
الکتاب] تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ، ولا نشرک
بہ شیئاً ، ولایتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا
اشھدوا بانا مسلمون ۔" [سیرت حلبیہ ۲/۲۷۵ ۔ مسند احمد ۱/۲۶۳ ۔ تاریخ ابن عساکر ۱/۱۴۰
کنز العمال ۲/۲۷۵ ۔ صحیح بخاری کتاب الجہاد باب ۱۰۲ ۔ صحیح مسلم ۵/۱۶۵ ۔ در منثور ۲/۴۰ اعیان الشیعہ ج ۲]

ترجمہ :

اس اللہ کے نام سے جو مہربان اور رحم کرنے والا ہے ، یہ خط محمد بن عبد اللہ کی طرف سے ہے ہرقل زعیم روم کی طرف ، سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے اس کے بعد یہ کہ میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں ، اسلام لے آو (ہمیشہ کے لئے) سالم ہو جاؤ (سلامتی پا جاؤ) تم کو اللہ اس کا دہرا اجر دے گا (ایک اجر تمہارے ایمان لانے کا دوسرا اجران لوگوں کے ایمان لانے کا جو تمہاری وجہ سے ایمان لائیں گے) اور اگر تم نے روگردانی کی تو تمہاری گردن پر تمہارے نوکروں چاکروں اور تمہاری رعایا کے گناہ کا بار بھی رہے گا ، (اس کے بعد آپ نے اس آیت کا اضافہ کیا) اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر ہم سے مل جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے ، وہ بات یہ ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں ، اس کا شریک کسی کو نہ بنائیں اور اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہ کہنے لگیں ، پھر بھی اگر یہ منہ پھیریں تو ان سے کہدو کہ تم گواہ رہنا ہم مسلمان ہیں ۔

یہ خط آپ نے "دحیہ کلبی" کے ہاتھ "قیصر" کے پاس روانہ کیا جو اس وقت شام میں مقیم تھا ، کیونکہ اس نے نذر کی تھی کہ اگر ایران پر اس کو فتح حاصل ہوئی تو وہ پا پیادہ بیت المقدس

کی زیارت کرے گا، جو اس وقت اس کی قلمرو میں داخل تھا۔ دحیہ کلبی کا پیشہ تجارت تھا، شا
اور حجاز کے درمیان تجارت کرتے تھے، اتنے خوبصورت و وجیہ تھے کہ جبرئیل امین کبھی کبھی ان کی
شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا کرتے تھے۔[1]

"دحیہ" آنحضرت کا خط لے کر "عدی بن حاتم طائی" کے ہمراہ بادشاہ کے دربار کی طرف روانہ ہوئے۔ جب قیصر روم کے عالیشان دربار میں پہنچے تو اس کا شاہی دبدبہ، بلند و بالا ایوانوں میں لاتعداد خوبصورت ستون، ستونوں میں جگمگاتے ہوئے پتھر، دروازوں میں حریر و دیبا کے پردے، سیڑھیوں پر مخملی فرش، ہر طرف دوڑتے ہوئے سینکڑوں زرین کمر غلام و کنیز، سب سے بڑے ایوان میں شہ نشین پر ایک زرنگار تخت رکھا ہوا تھا جس پر "قیصر" بڑے رعب اور دبدبہ کے ساتھ جلوہ افروز تھا، اور کوئی ہوتا تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔ مگر جس کی آنکھوں میں جمال محمدی سمایا ہوا ہو، دماغ میں زلف رسول کی خوشبو بسی ہو، دل میں عشق "حبیب" کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو، جس پر دبدبہ ہو تو "اللہ" کا رعب ہو تو "رسول اللہ" کا، اس پر "ماسوی اللہ" کا کیا اثر ہو سکتا ہے! کچھ لوگوں نے کہا اے کلبی! رکوع میں جھک جا! کچھ نے کہا کلبی! جلدی سے سجدہ میں گر جا، جب تک اعلیٰ ملوکانہ اٹھنے کی اجازت نہ دے اپنا سر نہ اٹھا، دحیہ نے بڑی نخوت سے کہا: لا افعل ھذا ابدا ولا اسجد لغیر اللہ ایسا ہرگز نہ کروں گا، میں غیر خدا کا سجدہ نہیں کروں گا۔
جواب ملا: پھر بادشاہ ہرگز تم سے خط نہ لے گا۔ یہ سنکر دحیہ نے وہ خط آگے بڑھ کر بغیر جھجکے شہ نشین کی سیڑھی پر رکھدیا، شاید "قیصر" کی عمر میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ "دحیہ" کی اس جرأت نے قیصر کو مجبور کیا کہ جھک کر خط اٹھائے اور اس کو کھول کر پڑھے۔

خط کھولتے ہی "قیصر" کے دماغ کی کھڑکیاں کھل گئیں، اس نے کہا "ہائیں! یہ تو ایک انوکھا خط ہے جیسا سلیمان کا خط بلقیس کے نام تھا، کیونکہ اس کی نگاہ سب سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پر پڑی، اس نے کہا: ان ہذا کتاب لم ارہ بعد سلیمان۔ "یہ ایک ایسا

---

[1] سیرت بن ہشام ۳/ ۲۵۳ ، بحار الانوار ۶/ ۶۹ے ط قدیم
توحید ۸۴

خط ہے جو میں نے سلیمانؑ کے خط کے بعد کبھی نہیں دیکھا تھا پھر اس نے ترجمان کو بلوا کر پورا خط بغور سنا، اس کے بعد کہا اگر کوئی یثرب سے آیا ہوا ہو تو اس کو میرے پاس جلد حاضر کرو۔

شاہ روم کے دربار میں ابوسفیان کی پیشی:

وقت کی بات کہ اس وقت ابوسفیان لوگوں کے ہاتھ آ گئے جو کسی تجارتی مقصد سے شام گئے ہوئے تھے۔ قیصر کے حکم سے ان کو دربار میں بلوایا گیا تاکہ ان سے رسول اللہؐ کا حال پوچھے، ان کو رسول اللہؐ سے جو لگاؤ ہے اور جو کچھ انہوں نے اور ان کی اولاد بلکہ زوجہ محترمہ نے رسول اللہؐ اور ان کے خاندان کے ساتھ کیا ہے وہ سب پر روشن ہے، رسول اللہؐ کے خلاف قریش کی جتنی جنگیں ہوئیں، ان سب میں پیش پیش تھے۔ قیصر نے ان حضرت سے وہ سب کچھ اگلوایا جس طرح کسی تنگ منہ کی بوتل سے تھپک تھپک کر گھی یا شہد نکال لیا جاتا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ابوسفیان بیان کرتے ہیں کہ جب میرے اور رسول اللہؐ کے درمیان صلح ہو گئی (یعنی صلح حدیبیہ کا زمانہ) تو میں نے شام کا سفر کیا اتفاق سے اسی زمانہ میں رسول اللہ کا خط ہرقل کے نام پہنچا، خط پڑھ کر ہرقل نے کہا: کیا یہاں کوئی ایسا شخص ہے جو اس مرد کی قوم سے ہو جو اپنے کو نبی خیال کرتا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں، اس پر مجھ کو کچھ قریشیوں کے ہمراہ دعوت دی گئی چنانچہ ہم سب ہرقل کے دربار میں داخل ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ قیصر بیٹھا ہوا ہے، اس کے سر پر تاج ہے، روم کے دوسرے حکمراں اس کے چاروں طرف ہیں، ہم اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ ہرقل نے پوچھا تم سب میں اس مدعی نبوت سے کون زیادہ نزدیک ہے؟ میں نے کہا "میں"۔ اس نے حکم دیا کہ میں آگے بیٹھوں، میرے باقی ساتھی میرے پیچھے بیٹھیں، پھر اس نے ترجمان کے ذریعہ ان قریشی لوگوں سے کہا جو میرے پیچھے بیٹھے تھے، کہ میں اس آدمی (ابوسفیان) سے کچھ سوالات کرتا ہوں اگر اس نے جھوٹ بولا تو تم اس کو ٹوک دینا، ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم اگر اس وقت مجھ کو جھوٹ کے کھلنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں صحیح بات کبھی نہ بتلاتا۔ اس کے بعد شاہ روم اور ابوسفیان میں یہ سوال جواب ہوئے:

ہرقل نے سب سے پہلے یہ سوال کیا :
"تمہارے درمیان اس شخص کا حسب نسب کیسا ہے ؟"
"وہ ہمارے درمیان بڑے حسب و نسب والے ہیں" میں نے جواب دیا
"کیا اس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی بادشاہ گذرا ہے ؟" ہرقل نے پوچھا
"نہیں۔"
"اس کے ادعائے نبوت سے پہلے کبھی وہ جھوٹ بولا ہے ؟"
"نہیں" پھر ہرقل نے پوچھا :
"اس کا اتباع کرنے والے کون لوگ ہیں ، اونچا طبقہ یا نیچا طبقہ ؟"
"نیچا طبقہ"
"ان کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے ؟"
"ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۔" میں نے جواب دیا ۔
"کیا ان میں سے کوئی شخص اس نبی سے روٹھ کر دوبارہ اپنے پہلے دین پر پلٹ گیا ہے؟"
میں نے کہا : "نہیں"
"کیا تم نے اس سے کوئی جنگ کی ہے ؟" اس نے پھر سوال کیا ، میں نے کہا :
"ہاں"
"تمہاری جنگ اس کے ساتھ کیسی تھی ؟"
"ہمارے اور اس کے درمیان بڑی گھمسان کی جنگیں ہوئیں کبھی اس نے ہم کو نقصان پہنچایا اور کبھی ہم نے اس کو نقصان پہنچایا۔" پھر اس نے پوچھا :
"اچھا کبھی اس نے تمہارے ساتھ دھوکے سے بھی کام لیا ہے ؟"
"نہیں تو ... لیکن ایک مدت سے ہم اس سے الگ ہیں لہذا معلوم نہیں اس نے اس مدت میں کیا کیا ؟"
ابوسفیان کہتا ہے : خدا کی قسم ! ہرقل نے مجھکو کہیں اس بات کا موقع نہیں دیا کہ میں اپنی مرضی کی بات کہہ سکوں ، سوائے اس جگہ کے ، ہرقل نے پھر سوال کیا :

"جو دعویٰ اس نے کیا ہے، اس سے پہلے تمہارے وطن میں کسی اور نے بھی ایسا دعویٰ کیا تھا؟"

"نہیں"

"اچھا یہ بتلاؤ اس کی عقل اور رائے کیسی ہے؟"

"ہم نے اس کی عقل و رائے کی کبھی مذمت نہیں کی" پھر اس نے پوچھا:

"وہ تم کو کس بات کا حکم دیتا ہے؟" میں نے کہا:

"وہ ہم کو نماز، زکوٰۃ، پاکدامنی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کرو اور وہ ہم کو وعدہ کی پابندی اور امانت داری کی تاکید کرتا ہے۔"

یہ سن کر ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا اس شخص سے کہدو کہ:

میں نے تم سے اس نبی کے حسب و نسب کے متعلق سوال کیا، تو تو نے جواب دیا کہ اس کا حسب و نسب اچھا ہے، وہ ہمارے خاندان کا آدمی ہے، انبیاء کی یہی شان ہے کہ وہ خاندانی ہوتے ہیں اور سب سے پہلے اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں۔

پھر میں نے تم سے پوچھا کہ اس کے اجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ تم نے جواب دیا "نہیں" اگر اس کے آبا و اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہوتا تو میں یہ خیال کرتا کہ یہ شخص نبوت کے بہانہ اپنا آبائی تخت و تاج حاصل کرنا چاہتا ہے۔

پھر میں نے اس کے ماننے والوں کے متعلق سوال کیا تو تم نے کہا کہ نچلا طبقہ (غریب عوام) اس کا اتباع کرتے ہیں، بات بھی یہی ہے کہ رسولوں کا اتباع زیادہ تر غریب لوگ کرتے ہیں پیسہ والے کترا جاتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ کیا تم نے اس سے کبھی کوئی جھوٹ دیکھا ہے؟ تم نے کہا "نہیں" اس سے میں یہ سمجھا کہ جو شخص لوگوں کے معاملہ میں جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا کے معاملہ میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہے!

پھر میں نے سوال کیا کہ کیا کوئی انسان اس سے ناراض ہو کر مرتد ہوا ہے؟ تم نے کہا: نہیں، تو ایمان کا یہی حال ہے کہ جب وہ کسی کے دل کی گہرائیوں میں داخل ہو جاتا ہے تو

پھر نہیں نکلتا۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ : اس کے پیروکار گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟ تم نے کہا: وہ بڑھ رہے ہیں، تو ایمان کا یہی حال ہے کہ وہ روز بروز بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اپنے کمال کو پہنچ جائے۔

میں نے یہ بھی تم سے دریافت کیا کہ، کیا تم نے اس سے جنگ کی ہے؟ تم نے کہا: کی ہے، اور بہت سخت جنگ کی ہے، تو رسولان برحق کا یہی حال رہا ہے کہ وہ اپنی امت کے ساتھ سختیوں میں مبتلا رہے اور آخر میں ان کو فتح ہوتی ہے۔

میں نے تم سے پوچھا کہ: اس نے کبھی دھوکہ دیا ہے؟ تم نے کہا: نہیں، تو رسول ایسے ہی ہوتے ہیں وہ کسی کو کبھی دھوکہ نہیں دیتے۔

پھر میں نے پوچھا: جو باتیں وہ کہتا ہے اس سے پہلے بھی کسی نے کہی ہیں؟ تم نے کہا: نہیں! میں نے سوچا کہ اگر اس سے قبل کسی نے یہ باتیں کہی ہوتیں تو ہو سکتا ہے اس کے دل میں بھی اس کی پیروی کا خیال آگیا ہو۔

آخر میں "قیصر" نے کہا: اے بھائی! جو جوابات تم نے دیئے ہیں وہ اگر صحیح ہیں تو یہ شخص نبی برحق ہے، اگر میں اس کے پاس ہوتا تو میں اس کا پیرو ہوتا۔

اس کے بعد "قیصر" نے دوبارہ آنحضرت کا خط پڑھوایا اور اس سے محظوظ ہونے لگا پاس ہی اس کا بھتیجا بیٹھا ہوا یہ منظر دیکھ کر ڈر رہا تھا کہ یہ کیا ہونے والا ہے؟ میرے چچا تو ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں، ایک بدو عرب کے لائے ہوئے خط پر ایمان لا کر اپنے تخت و تاج سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، اس نے بڑے غصے کے ساتھ چچا سے کہا کہ: "ذرا آپ اس کی جسارت تو دیکھئے کہ اس نے اپنے خط میں پہلے اپنا نام (من محمد بن عبداللہ) لکھا ہے، حالانکہ پہلے آپ کا نام لکھنا چاہیئے تھا، پھر اسی توہین پر اکتفا نہیں کی، نہ تو ملک لکھا نہ قیصر لکھا، "عظیم الروم" کے کلمہ سے خطاب کیا ہے"؟ قیصر نے جواب دیا: "میرے بیٹے! خدا کی قسم تیری رائے بہت کمزور ہے، کیا تو چاہتا ہے کہ میں اس شخص کے خط کو پھینک دوں، جبکہ پاس "ناموس اکبر" (جبریل) آتا ہے، یقیناً یہ شخص اسی کا سزاوار ہے کہ اس کا نام پہلے ہو، اور یہ

جو اس نے مجھکو لکھا "عظیم الروم" یہ بھی صحیح ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ابو سفیان اور اس کے ساتھیوں کو شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرائیں، ابو سفیان جب مہمان خانہ میں آیا تو اس نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مار کے کہا: "ابو کبشہؓ کے فرزند کا دین زور پکڑ گیا، شاہ روم بھی اس سے ڈرنے لگا۔" ابو سفیان ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سڑک پر ایک منادی کی یہ آواز آئی: "لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ ہرقل نے دین نصرانیت کو چھوڑ دیا ہے اور دین محمدیؐ کو اختیار کر لیا۔"

یہ خبر سنکر لوگوں میں انتشار پیدا ہو گیا، اس کا لشکر بگڑ گیا اور اس نے مسلح ہو کر قیصر کے قصر کو گھیر لیا، قیصر نے لوگوں کا یہ رنگ دیکھا تو اپنی استادانہ سیاست سے کام لے کر منادی سے کہا کہ اب یہ اعلان کر دے کہ: "قیصر کا مقصد اس اعلان سے صرف تمہارا یہ امتحان کرنا تھا کہ تم اپنے دین پر کس حد تک قائم ہو؟ تو یہ معلوم ہو گیا اچھا تم پلٹ جاؤ بادشاہ تم سے راضی ہے۔

پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد (دحیہ کلبی) کو بلا کر کہا کہ: مجھ کو یقین ہے کہ یہ شخص نبی مرسل ہے، اسی کا ہم انتظار کر رہے تھے، ہماری کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے، لیکن مجھ کو اہل روم کی شورش کا ڈر ہے کہ مجھ کو قتل نہ کر دیں، لہذا تم بڑے پادری "ضغاطر" کے پاس جاؤ اور اس سے اپنے اس نبی کی خبر بیان کرو، اس کی حیثیت روم میں مجھ سے بھی زیادہ اہم ہے، اس کی بات کو لوگ زیادہ مانتے ہیں، دیکھو وہ کیا کہتا ہے؟

قیصر نے "دحیہ" کو بڑے احترام کے ساتھ رخصت کیا، ان کو کچھ مال اور قیمتی چادر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کچھ تحفوں کے ساتھ حسب ذیل خط ان کو دیا کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیں:

"یہ خط ہے احمد رسول اللہ کی طرف، جن کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰؑ

۱۔ آپؐ کی مرضعہ کے شوہر کا نام ابو کبشہ تھا، آپ کے دشمن جب آپ کی تحقیر کرنا چاہتے تھے تو "ابن ابو کبشہ" کے نام سے پکارتے تھے۔

نے دی تھی، قیصر شاہ روم کی جانب سے، میرے پاس آپ کے قاصد کے ذریعہ آپ کا خط آیا، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں انجیل مقدس میں آپ کا ذکر ہے، عیسیٰ بن مریم نے آپ کی بشارت دی ہے، میں نے اہل روم کو آپ کی طرف دعوت دی کہ وہ آپ پر ایمان لائیں، مگر انھوں نے انکار کیا، اگر وہ اس معاملہ میں میری اطاعت کرتے تو ان کے لیے اچھا تھا، میری حالت تو یہ ہے کہ دل چاہتا ہے کہ آپ کی خدمت میں ہوتا اور آپ کے قدم مبارک دھونے کی سعادت حاصل کرتا۔"

یہ خط جب رسول اللہ ؐ کو ملا تو آپ نے ارشاد فرمایا: اس کا ملک اس وقت تک باقی رہے گا جب تک میرا خط اس کے خزانے میں باقی رہے گا۔

ادھر دحیہ" قیصر" کا خط لے کر روانہ ہوئے ان کے پیچھے اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو مدینہ بھیجا، جس کا تعلق قبیلۂ غسّان سے تھا اور اس کو یہ تاکید کی کہ مدینہ جا اور محمد ؐ کی خبر لا خصوصاً تین چیزوں کو بغور دیکھنا:

۱۔ دیکھنا کہ وہ کس چیز پر بیٹھے ہیں؟ ۲۔ ان کے داہنی طرف کون شخص ہے؟ ۳۔ اگر ممکن ہو تو ان کی انگوٹھی پر نظر کرنا کہ اس پر کیا لکھا ہے۔؟

غسّانی، قیصر کی حسب ہدایت مدینہ آیا، چونکہ خود عرب تھا اس لئے کسی نے اس پر شک بھی نہیں کیا کہ یہ "قیصر" کا فرستادہ ہے، مسجد میں پہنچا، حضرت کے دربار کی سادگی دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا، نہ تزک و احتشام، نہ حشم و خدم، نہ اونچی دیواریں، نہ بلند دروازہ، نہ حریر و دیبا کے پردے، نہ مخمل و کمخواب کے فرش، مسجد کی کچی دیوار، خاک کا قدرتی فرش جس پر خیر البشر، سید المرسلین، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے، پیشانی کے نور سے چاند ماند پڑ جائے، چہرہ کے جمال سے حوروں کو شرم آجائے، ہیبت و جلال سے دم سینوں میں رک جائے۔

غسانی آہستہ آہستہ آگے بڑھا، دل میں کہا: ایک بات تو معلوم ہوئی جو بالکل خلاف امید نکلی کہ آپ زمین کے خاکی فرش پر بیٹھتے ہیں، دوسری خصوصیت تو دیکھوں کہ

داہنی طرف کون ہے؟ اب جو نگاہ ڈالی تو دیکھا ایک نوجوان جس کی آنکھوں سے جلال آشکار ہاتھوں میں دو دھاری تلوار، بھلا کس کو جرٔت کہ نظریں ملائے، ساتھ کے ایک آدمی سے اس کا نام پوچھا، جواب ملا" ارے ان کو نہیں جانتے؟ یہی تو غالب کل غالب اسد اللہ علی بن ابی طالبؑ ہیں، رسولؐ کے ابن عم بھی ہیں، آپ کے امیر لشکر بھی ہیں، اس کے علاوہ داماد پیغمبر بھی ہیں، دل میں کہا دو باتیں تو معلوم ہوئیں دونوں علامتوں کو چپکے سے لکھ لیا، گھبراہٹ کا یہ عالم کہ تیسری بات بھول گیا، چاہا کہ مسجد سے باہر نکل جائے کہ ایک آواز کان میں آئی ایسی دلربا آواز جو دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی: اے غسانی! ادھر دیکھ! تیسری چیز جس کا تیرے ساتھی نے حکم دیا تھا وہ تو تو نے دیکھی ہی نہیں، یہ کہکر آپ نے اپنا ہاتھ اونچا کر دیا، انگشت مبارک میں "خاتم نبوت" صاف نظر آرہی تھی جس میں لکھا تھا "محمد رسول اللہ" محمد نیچے رسول بیچ میں اوپر اور اللہ سب کے اوپر۔

غسانی نے جب "قیصر" سے یہ واقعہ جاکر بیان کیا تو اس نے کہا: ھذا الذی بشر بہ عیسی بن مریمؑ انہ یرکب البعیر فاتبعوہ وصدقوہ "شتر سوار" کے نام سے مسیح نے جس کی بشارت دی تھی وہ یہی ہے اس کی اطاعت کرنا ہے۔ [1]

اس مکتوب گرامی کے عظیم اثرات

جس قدر کوئی شے عظیم ہوگی اسی قدر اس کے اثرات بھی عظیم ہوں گے، اس خط کا بھیجنے والا چونکہ عظیم تھا لہٰذا اس کے اثرات بھی بہت عظیم تھے جن میں سے بعض یہ ہیں،

۱۔ ہرقل چونکہ اس وقت نصرانیوں کا سب سے بڑا حکمران تھا، جس کی سلطنت کے حدود روم سے لیکر شام و اردن تک پھیلے ہوئے تھے، بڑے بڑے بادشاہ اس کے باج گزار تھے بلکہ ایران سے لڑائی میں بھی اس کو غلبہ حاصل ہوا تھا اس لئے بلاد عجم بھی اس سے مرعوب تھے جب اتنا بڑا شہنشاہ اس خط سے مرعوب و متأثر ہوا تو سارا عالم نصرانیت کا متأثر ہونا ایک لازمی امر تھا۔

۲۔ ہرقل چونکہ اس وقت شام آیا ہوا تھا لہٰذا اس خط کا واقعہ ان اطراف میں مشہور ہوا اور وہاں کے رہنے والے اس سے متأثر ہوئے، اس طرح اہل شام (یعنی سوریہ

---

[1] کافی کتاب الزی والتجمل ص ۲۱۰ طبع حجری، سنن بیہقی ۱۰/۱۲۸

وار دن ولبنان وفلسطین سب کے دلوں میں اسلام کی داغ بیل پڑی، کم از کم سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ جس نبی کی پیشین گوئی انبیائے ماسبق کیا کرتے تھے اس کا ظہور ہو چکا ہے۔

۳۔ قیصر نے اپنا جو ایلچی معلومات حاصل کرنے کے لیے مدینہ بھیجا تھا، اس کا تعلق قبیلۂ غسان سے تھا جو اصل میں یمنی قبیلہ تھا لیکن سیلاب عرم کے بعد شام آ کے آباد ہوا تھا۔ ان میں بہت سے بادشاہ ہوئے جن کی حکومت تین سو سال تک رہی تھی۔ لہٰذا اس خط اور معجزہ کا ذکر شام سے لیکر یمن تک پھیلا جس کی بنا پر غسانیوں میں اسلام کا چرچا عام ہوا۔ اور آگے بڑھ کر ان میں مشہور علماء پیدا ہوئے جیسے ابو علی حسین بن محمد غسانی اندلسی ۴۲۷ھ/۵۱۸ھ جن کو علم حدیث کا امام مانا گیا ہے، اور قاضی رشید ابو الحسین احمد ۵۶۳ھ جو اپنے عصر میں علم ہندسہ وادب و شرعیات میں اوحد الناس مانے جاتے تھے۔[1]

۴۔ دحیہ کلبی جس شخص کے ہمراہ دربار قیصر میں پہنچے تھے اس کا نام "عدی بن حاتم" تھا یہ مشہور زمانہ سخی حاتم طائی کا بیٹا تھا، اپنے قبیلہ کا سردار، اپنے باپ کی سخاوت کی وجہ سے زمانہ میں مشہور و مقبول تھا، اس خط سے اس پر بڑا اثر پڑا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کے اسلام لانے سے اسلام کو بہت تقویت پہنچی، اسلام بھی وہ جس میں ولاء کی روح بھی پڑی ہوئی تھی، کیونکہ اس شخص نے آخر تک اہلبیتؑ طاہرین کا ساتھ دیا، اپنی ایک آنکھ جنگ جمل میں حضرت علی علیہ السلام پر قربان کی، پھر تین جوان بیٹے طرفہ وطریف وطراف جنگ صفین میں قربان کیے۔

۵۔ اس خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کو پیش کیا: یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الخ یعنی اے اہل کتاب آؤ ہم اور تم دونوں ایک مشترکہ نقطہ پر مل جائیں اور وہ نقطہ یہ کہ غیر خدا کی پرستش نہ کریں، شرک نہ کریں، کسی بندے کو خدا نہ کہیں، یہ توحید کی طرف ایک ایسے انداز میں دعوت تھی کہ نصاریٰ کو بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ شرک ایک نامعقول عقیدہ ہے۔ انہوں نے اس سے بچنے کے لیے شرک سے

---

[1] معجم البلدان ومنتہی الارب۔ [2] دائرۃ المعارف فرید وجدی۔

فرار کرنا شروع کیا اور کہنے لگے کہ ہم جس توحید کو مانتے ہیں وہ " التوحید فی التثلیث والتثلیث فی التوحید ہے "۔ یہ مقولہ اگرچہ ایک نامعقول مقولہ تھا، لیکن اگر تامل کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ بھی توحید حقیقی کی طرف ایک قدم تھا۔

۶۔ اس خط کے لے جانے والے صاحب کردار قاصد، یعنی جناب دحیہؓ کلبی کے کردار نے بھی لوگوں پر بہت گہرا اثر چھوڑا کیونکہ قاصد فی الحقیقت صاحب خط کا ترجمان اور اس کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے، دحیہ کی شان سے شان نبی دوبالا ہوگئی، کیونکہ انہوں نے قیصر کی ملوکیت و جبروتیت کے سامنے اپنا سر جھکانے سے صاف انکار کردیا، اس طرح انکا سر بھی قلم کیا جاسکتا تھا، دحیہ کلبی کا یہ انکار مادہ پرستی کے منہ پر ایک طمانچہ تھا، جس نے دبدبہ شاہی، کبکبۂ طاغوتیت اور طنطنۂ انانیت کے بہتے ہوئے دریا کا منہ موڑ دیا اور دیکھنے اور سننے والے یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ جب " نائب " ایسا ہے تو " منوب عنہ " کیسا ہوگا۔

۷۔ قیصر نے ابوسفیان سے رسول اللہؐ کے جو صفات کرید کرید کر پوچھے اور اس کو یہ بتانا پڑا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے، کبھی کسی سے غداری نہیں کی، کبھی خیانت نہیں کی، اس سے بھی لوگوں کے دل پر کافی اثر پڑا، جو لوگ مسلمان نہ بھی ہوسکے وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد اگر نبوت کی احتیاج ہے تو اس شخص کے سوا کوئی دوسرا نبی نہیں ہوسکتا۔

یہ تھا، حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خط کا مختصر حال اور اس کے اثرات کا ذکر جو آپؐ نے قیصر روم کو روانہ کیا تھا۔

مصادر

اس مقالہ کو لکھنے کے لیے حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:

بحار الانوار ۲۰/۳۸۶ ط جدید تہران۔

صحیح بخاری کتاب جہاد باب ۱۰۲ ،
صحیح مسلم ۵/۱۶۳ ،
مسند احمد بن حنبل ۱/۲۶۲ ،
تاریخ کامل ۲/۸۰ ،
تاریخ طبری ۲/۲۹۰
تاریخ ابن عساکر ۱/۱۳۹ ،
سیرت حلبیہ ۳/۲۷۳ ،
طبقات کبریٰ ۱/۲۹۵ ،
سیرت زینی دحلان ، برحاشیہ حلبیہ ۱/۱۵۸ ،
تاریخ ابو الفداء ۱/۱۴۸

خمس

تلخیص مقالہ

جناب علی احمدی، میانجی

مکاتیب مبارک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کا مطالعہ

جناب علی احمد میانجی نے رسالہ "نور" قم میں مسئلہ خمس پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے. اس مقالے کی پہلی قسط کتاب و سنّت کے جن دلائل پر مشتمل ہے ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے خطوط مبارک کا مطالعہ خاصہ کی چیز ہے. جس میں تحصیل زکات و خمس کے بارے میں سیرت کے بعض پہلو سامنے آئے ہیں۔ ادارہ اس کی تلخیص پیش کر رہا ہے۔

اسلام میں جن مالی واجبات کی ادائیگی واجب ہے۔ ان میں سے ایک "خمس" ہے۔ وجوب خمس پر کتاب و سنّت میں جو کچھ ہے اس کے مطالعے سے پہلے تاریخ تشریع خمس ۔ پر گفتگو مناسب و مفید ہے۔

حکم خمس کب آیا ؟

علامہ فخر الدین رازی کا بیان ہے :

صاحبِ کشاف، جار اللہ زمخشری نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ آیۂ خمس :

۔ (واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ) ۔ سنہ ۲ھ یا سنہ ۳ھ، جنگ بدر میں نازل ہوئی ۔ واقدی کے بقول غزوۂ بنی قینقاع میں خمس نکالی گئی۔ غزوۂ بنی قینقاع، بدر کے ایک ماہ تین دن بعد ہوا ۔ ۱۵، شوال ہجرت کے بیس ماہ بعد۔ تفسیر فخر الدین ۱۵/۱۶۶

رشید رضا نے تفسیر المنار میں لکھا ہے :

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیت بدر میں نازل ہوئی اور تقسیم غنائم کی ابتدا بھی بدر میں

ہوئی۔ لیکن سیرت نگاروں میں کچھ لوگ کہتے ہیں غزوۂ بنی قریظہ میں تقسیم غنائم کی تشریع ہوئی۔ بعض لوگوں کے نزدیک غزوۂ حنین میں آیت پر عمل ہوا۔ اور ابن اسحاق اس تشریع کی تاریخ بدر سے دو ماہ پہلے رجب کا سریۂ عبداللہ بن جحش بتائے ہیں جس میں غنائم حاصل ہوئے تھے۔ سبکی کہتے ہیں۔ سورۂ انفال جنگ بدر میں اتری اور میرے خیال میں آیۂ خمس کا نزول تقسیم غنائم کے بعد ہوا۔ کیونکہ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ بدر میں آنحضرتؐ نے غنیمت کا مال سب میں برابر سے تقسیم فرمایا اور خمس نہیں نکالی۔ اسی کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام سے یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خمس مال غنیمت بدر میں سے ایک اونٹ مجھے دیا تھا[1]۔۔۔ (المنار، الانفال، ضمن آیت ۴۱)

حافظ ابن حجر اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

اکثر علماء کا خیال ہے کہ وجوب خمس کا وقت نزول آیۂ مبارکہ "واعلموا انما غنمتم ..... ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وقت وجوب خمس میں سیرت نگاروں کے اقوال مختلف ہیں بعض محققین تو قبل از ہجرت تشریع خمس کے قائل ہیں[2]۔

آیۂ خمس:

واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل ان کنتم آمنتم باللہ وما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان واللہ علی کل شیٔ قدیر (انفال/۴۱)

ترجمہ: اور یہ جان لو کہ جب کسی طرح کی غنیمت تمہارے ہاتھ آئے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ

---

① ۔ بخاری نے کتاب فرض الخمس میں حدیث یوں لکھی ہے: زہری سے روایت ہے انھوں نے کہا مجھے خبر دی علیؑ ابن الحسینؑ نے انھوں نے حسینؑ ابن علیؑ سے (نقل کیا)۔ انھیں خبر دی کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: میرے پاس مال غنیمت بدر میں سے ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خمس میں مجھے دیا تھا۔ دیکھئے ج ۴/ ۹۵ ۔ حاشیہ فتح ج ۶/ ۱۲۵ تفسیر قرطبی ج ۸/ ۱ صحیح مسلم ج ۲/ ۵۶۸ کتاب الاشربہ حدیث ۲ ۔ ② الصحیح من سیرۃ النبیؐ ج ۳/ ۲۲۸ بحوالہ ابن عساکر تحقیق محمودی ج ۲/ ۴۰ و رجوع کنید بہ مناقب خوارزمی/ ۲۲۵ و فرائد السمطین ج ۱/ ۳۲۲ نیز حاشیہ ابن عساکر

کا اور رسولؐ کا اور رسولؐ کے قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے بشرطیکہ تم اللہ پر ایمان لا چکے ہو اور اس (مدد) پر جو ہم نے اپنے بندے پر یوم فرقان جس دن دو گروہوں کی مڈبھیڑ ہوئی تھی نازل کی اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔"

لغوی معنی:

غنیمت پر تفسیر و فقہ میں معنوی گفتگو دو نکتوں پر مبنی ہے:

۱۔ "غنیمت" و "فئے" کا فرق — یہ دونوں کلمے، کفار سے حاصل شدہ دو قسم کے اموال کے لیے مستعمل ہیں — اگر جنگ و قہر و غلبہ سے حاصل کریں تو — غنیمت — کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اگر جنگ و قہر و غلبہ کی صورت پیش نہ آئے تو — فئے — ہے۔

غنیمت کا پانچواں حصہ مذکورۂ بالا آیت کے حکم کے مطابق صرف ہوگا۔ اور چار حصے میدان جنگ کے حاضر سپاہیوں میں تقسیم ہوں گے۔

فئے: کفار سے بے جنگ و قتال حاصل ہونے والے مال سے پانچواں حصہ نکالنے کے بعد چار حصے صوابدید سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق تقسیم ہوں گے۔

۲۔ "غنیمت" سے مراد موالی/غلام و کنیز ہے، جو میدان جنگ میں کفار سے ملیں یا "غنیمت" سے مراد ہر قسم کا فائدہ ہے۔ جنگ اور غیر جنگ کی بحث نہیں۔

پہلے معنی کے نقطۂ نظر سے بحث معنی میں نہیں بلکہ حاصل شدہ مال اور اس کے بارے میں احکام سے مربوط ہے۔

دوسرے معنی میں بات یہ ہے کہ غنیمت فقط مال جنگ ہے یا مطلق فائدہ لغوی معنی ہیں اور کفار سے بہ جنگ و غلبہ حاصل ہونے والے مال کو شریعت میں مخصوص کر دیا گیا ہے اور ان معنوں میں "غنیمت" حقیقت شرعیہ ہے۔

مجمع البیان:

الغنیمۃ، ما اخذ من اموال اهل الحرب من الکفار بقتال . . . . .

غنیمت: جنگ میں لڑنے والے کافروں کا جو مال حاصل کیا جائے۔

تفسیر کبیر فخر الدین رازی:

الغنم: الفوز بالشئ والغنیمة فی الشریعة مادخلت فی ایدی المسلمین من اموال المشرکین علی سبیل القھر بالخیل والرکاب۔

غنم، کوئی چیز پاجانا۔ شرع میں اس کے معنی ہیں۔ وہ چیزیں جو پیدل و سوار فوج کشی میں غالب آنے پر مشرکوں سے حاصل ہوں۔

تفسیر قرطبی:

الغنیمة فی اللغة ماینالہ الرجل او الجماعة بسعی۔ والاتفاق حاصل علی ان المراد بقولہ "غنمتم من شئ" مال الکفار اذ اظفر بہ المسلمون علی وجہ الغلبة والقھر ولا تقتضی اللغة ھذا التخصیص ولکن عرف الشرع قید اللفظ بھذا النوع ....."

لغت میں "غنیمت" وہ مال جسے کوئی شخص یا جماعت محنت کے بعد حاصل کرے غنمتم من شئ کے معنوں میں اس پر سب متفق ہیں کہ یہاں فتح و غلبہ کے ذریعے مسلمانوں کے ہاتھ آنے والا مال ہے لیکن لغت میں اس قسم کی تخصیص موجود نہیں یہ قید "علی وجہ الغلبة" عرف شرع / فقہی محاورہ ہے۔

اس تشریح سے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے "غنیمت" ثانوی حقیقت پیدا کر چکا ہے۔ اس کے ساتھ متعدد عبارتوں سے ۔ نفے ۔ اور ۔ غنیمت ۔ میں فرق بھی نظر آتا ہے۔ جیسے مجمع البیان یا پھر "غنمتم" کے ارد گرد ایسے قرینے ہیں جو جنگ سے غنیمت کا استعمال خاص اور مجاز ثابت کرتے ہیں۔

آیۂ مبارکہ میں "غنیمت" کی بحث کا نتیجہ ابھی تک واضح نہیں ہوا۔ لہذا اس بحث کو آگے بڑھانا ہوگا۔

الف ۔ لغت و تفسیر

ثعالبی نے التفسیر میں لکھا ہے ۔" انسان کوشش سے جو مال حاصل کرے، لغت میں اسے غنیمت کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی حدیث ہے۔ الصیام فی الشتاء ھی الغنیمة الباردة " سردی کا روزہ بے مشقت ملنے والا مال ہے۔

قاموس۔ اقرب الموارد اور لسان العرب میں ہے:

الغنم: الفوز بالشیٔ من غیر مشقۃ ۔ زحمت کے بغیر ہاتھ آنے والا مال۔ "بے مشقت و بلازحمت" کی قید صحیح نہیں ہے۔ ورنہ اس تعریف میں غنیمت جنگ شامل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ وہ مال زحمت سے ہاتھ آتا ہے اور زیادہ تر استعمال "بلازحمت" کی قید کے بغیر ہے مگر ابن اثیر نے نہایہ اور راغب نے مفردات میں "مطلق فائدہ" کو غنیمت کہا ہے۔

ب: کتاب و سنت میں
کلمۂ غنیمت کا استعمال

۔ وَاغتنم مَن استقرضك (نہج البلاغہ، خط ۳۱)

جب تم سے کوئی قرض مانگے تو اسے غنیمت سمجھو (اور فائدہ اٹھاؤ)

۔ الطاعۃ غنیمۃ الاکیاس ۔ (نہج البلاغہ، کلمات قصار ۳۳۱۔ فرماں برداری خدا دانا لوگوں کے لیے نفع کی چیز ہے۔

۔ کالفالج الیاسر الذی ینتظر اول فوزۃ من قداحہ توجب لہ المغنم و یرفع بھا عنہ المغرم (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۳)

اس جواری کی طرح جو بازی جیتنے کا منتظر ہو، جو اس کے لیے غنیمت (مفت کا مال) لائے اور قرض کا بوجھ اٹھائے۔

۔ الرھن لمن رھنہ لہ غنمہ و علیہ غرمہ

رھن اس کا ہے جس کے پاس ہو، فائدہ بھی اسی کا اور نقصان بھی اسی کا۔

۔ الصوم فی الشتاء الغنیمۃ الباردۃ ۔ (ابن اثیر، نہایہ)

جاڑے کا روزہ بلازحمت ہاتھ آیا ہوا مال ہے۔

۔ فعند اللہ مغانم کثیرۃ ۔ (النساء ۹۴)

تو خدا کے پاس بہت غنیمتیں ہیں۔

۔ اللھم اجعلہ مغنما ولا تجعلہ مغرما (دعاء زکات، مقدمہ مرآۃ العقول ج ۱۶/ص ۸۴)

خدایا اسے نفع قرار دے، نقصان قرار نہ دے۔

ـــ غنیمۃ مجالس الذکر الجنۃ (مقدمہ مرآۃ العقول ج ۱/ ۸۴)
مجالسِ یادِ خدا کا نفع جنت ہے۔
ـــ ہو غنم للمومن ـــ بیان اوصاف روزہ (مقدمہ مرآۃ العقول ج ۱/ ۸۴)
روزہ مومن کا (مال) غنیمت ہے۔

استعمالات مذکورۂ بالا میں "غنیمت" کے معنی نفع اور فائدے کے ہیں۔ انہی معنی میں کثیر الاستعمال ہے۔ دوسرے معنی میں اس کا استعمال اتنا عام نہیں ہوا کہ حقیقت ثانیہ پیدا کرتا۔ نیز غنم و غنیمت سے تبادر ہوتا ہے ایسی چیز کا ہاتھ آنا جس کے عوض میں کچھ نہ دینا پڑے اور غرم (ضد غنم) ہاتھ سے ایسی چیز کا جاتے رہنا جس کے عوض کچھ نہ ملے۔

ج۔ مطلق فائدہ کے معنی میں اس کا استعمال حدیث میں بہ کثرت ہے:

ـــ کلما افادہ الناس فھو غنیمۃ لا فرق بین الکنوز والمعادن" (جامع الاحادیث ج ۸/ ۵۳۹)
جو تمہے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے وہ غنیمت ہے خزانے اور کانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ـــ ...... ان عبد المطلب سن فی الجاہلیۃ خمس سنن ...... وجد کنزا فاخرج منہ الخمس وتصدق فانزل اللہ عز وجل: واعلموا انما غنمتم .... (جامع الاحادیث ج ۸/ ۵۳۸)
عبد المطلب نے قبل از اسلام پانچ دستور جاری کیے .... دفینہ ملا تو اس سے خمس نکال کر صدقہ دیتے تھے۔ آیت نازل ہوئی" واعلموا انما غنمتم ...."

"فاما وجہ الامارۃ فقولہ تعالی: واعلموا انما غنمتم ... فجعل للہ خمس الغنائم یخرج من اربعۃ وجوہ (جامع الاحادیث ج ۸/ ۵۲۹)
...... حکومت کے طور پر ارشاد باری ہے۔ جان لو، جو غنیمت حاصل کرو .... غنائم کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے چار مقاصد میں صرف ہوگا۔

پہلی حدیث میں غنیمت کے معنی بیان ہوئے اور آمدنی کے حصول میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ دوسری حدیث میں حضرت عبد المطلب کے عمل کو آیۂ خمس کا مصداق ظاہر کیا گیا ہے۔

د۔ صحابہ و تابعین کے استعمالات میں بھی مغنم و غنیمت اعم ہے اور جس معنی میں استدلال کیا ہے اس کلمہ کا مفہومِ خاص میں منتقل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً۔

کتاب المصنف عبدالرزاق میں۔ جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے: " ما وجد من غنیمۃ ففیہا الخمس "۔ جو بھی غنیمت میں ملے اس میں خمس ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر غنیمت سے مال جنگ مراد ہوتا تو یہ جملہ توضیح واضح سے زیادہ کچھ نہ ہوتا۔

ابن جریح کہتے ہیں: کوئی شخص مکان یا زمین خریدے اس میں "عادی"[1] پرانا دفینہ ملے وہ مال اس شخص کے لیے غنیمت ہے۔ (مصنف، ج ۴/۱۱۶)

محمد بن حسن شیبانی کہتے ہیں: اگر کسی کو صحرا میں " رکاز "۔ دفینہ ملے یا معدن میں کام کرتے ہوئے کوئی چیز پا جائے؟ خود ہی جواب دیا: اسے خمس دینا چاہیے۔ لوگوں نے کہا: خمس دینے کے بعد بھی زکات واجب ہوگی؟ کہا: ہاں، رکاز و معدن، مغنم[2] ہے۔

ابو عبید نے کتاب الاموال (ص ۴۸۰ — ۴۸۵) میں جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ "عنبر میں خمس نہیں کیونکہ غنیمت نہیں، جسے ملے وہ مالک ہے۔

عمر بن عبدالعزیز نے عروہ بن زبیر کو لکھا تھا: زمانہ سابق میں عنبر کے بارے میں مسلمان کیا کہتے تھے؟ عروہ نے لکھا: میرے نزدیک عنبر کا غنیمت جیسا ہونا ثابت ہے، اس سے خمس لی جائے گی۔ دوسری روایت: عروہ نے جواب لکھا: مجھے ثابت ہو چکا ہے کہ ماضی کے لوگ عنبر کو غنیمت کی طرح جانتے تھے اور خمس لیتے تھے۔ (المصنف، عبدالرزاق ج ۴/۶۴ و ۶۵)

کتاب الاموال (ص ۴۸۲ — ۴۸۴) میں ابو عبید لکھتے ہیں — دوسرے افراد — مالک و اہل مدینہ — معدن (کان) کو رکاز کے ضمن میں شمار کرتے اور اس میں خمس واجب سمجھتے تھے۔ معدن، میری نظر میں غنیمت سے زیادہ ملتی جلتی چیز ہے۔

زیدی عالم نے "البحر الزخار" میں غنائم دریا، موتی و شکار بحر و خشکی کو خمس کا مال قرار دیتے ہوئے آیہ " واعلموا اما غنمتم "، سے استدلال کیا اور مخالفین کے دلائل کی رد کی ہے (البحر الزخار ج ۳/۲۱۲)

---

[1] عادی - عاد کے زمانے کی چیز - بہت پرانا دفینہ

[2] اصل شیبانی ج ۲/۱۱۶

خمس

اس تمہید کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکاتیبِ مبارک کا مطالعہ بھی اسلامی نظام مال کے زکات اور خمس کے فریضہ پر روشنی مہیا کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب قبیلوں یا اپنی طرف سے فرستادہ صاحبان منصب کو جو خط ارسال فرمائے تھے۔ ان میں سے:

۱۔ قبیلۂ بنی البکا[1] کے نام مکتوب میں ہے:

"..... من اسلم واقام الصلوٰۃ وآتی الزکاۃ واطاع اللہ ورسولہ واعطی من المغنم الخمس ....." (الوثائق السیاسیۃ ص ۲۶۴)

جو شخص مسلمان ہو جائے اور نماز پڑھے، زکات دے، اللہ، رسول کی اطاعت کرے اور مغنم میں خمس دے۔

۲۔ بنی زہیر کے نام مکتوب میں ہے:

"... ان شہدوا ان لا الٰہ الا اللہ ... واقروا بالخمس فی غنائمہم وسہم النبیؐ وصفیہ .... (الوثائق .../۲۶۳)

.... اگر یہ لوگ توحید کے قائل ہو جائیں .... مال غنیمت میں خمس اور حصہ رسولؐ وصفی خدا ادا کر دیں .... "

۳۔ خاندان مدس[2] کے نام مکتوب میں ہے:

"... واقام الصلوٰۃ وآتی الزکاۃ واعطی حظ اللہ ورسولہ ...."

.... اور وہ نماز پڑھیں زکات دیں اور اللہ و رسول کا حصہ ادا کریں ....

۴۔ بنی جوین کے نام مکتوب میں ہے۔

"..... اقام الصلوٰۃ وآتی الزکاۃ وفارق المشرکین واطاع اللہ ورسولہ واعطی من المغانم خمس اللہ وسہم النبیؐ ....." (الوثائق .../۲۳۱)

"... نماز پڑھیں، زکات دیں اور مشرکوں سے قطع تعلق کر لیں، اللہ، رسولؐ کی فرمانبرداری کریں مغانم سے اللہ اور رسولؐ کا حصہ ادا کریں۔"

[1] مکہ و بصرہ کی درمیانی راہوں میں رہنے والا قبیلہ۔ [2] لخم کی ایک شاخ جو شام کے مدس نامی شہر میں آباد تھی (الوثائق ۱۵/۔
[2] لخم کی ایک شاخ جو تیما میں آباد تھی۔

۵۔ قبیلہ بنی معاویہ[1] کے نام مکتوب میں ہے:

"..... اقام الصلوٰۃ وآتی الزکاۃ واطاع اللہ ورسولہ واعطی من المغانم خمس اللہ وسھم النبی ..." (الوثائق السیاسیہ / ۲۵۰)

"..... نماز پڑھیں، زکات دیں، اللہ و رسول کی پیروی کریں اور مغانم میں اللہ کا خمس اور حصہ نبیؐ ادا کریں ....."

۶۔ بنی قرقہ کے ایک گروہ اور بنی جرمز[2] کے مکتوب میں ہے:

"..... اقام الصلوٰۃ وآتی الزکات واطاع اللہ ورسولہ واعطی من المغانم خمس اللہ وسھم النبی .... (الوثائق السیاسیہ / ۱۸۱) دیکھیے ترجمہ ۶

۷۔ جنادہ[3] و قبیلۂ جنادہ کے نام مکتوب میں ہے:

"..... باقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ ومن اطاع اللہ ورسولہ واعطی الخمس من المغانم خمس اللہ ...." (الوثائق / ۱۹۶)

"..... وہ پابند ہے کہ نماز قائم کرے، زکات دے اور جو شخص خدا و رسول کے احکام کی اطاعت کرے اور مغانم میں خمس دے۔ اللہ اور رسول کا خمس ....

۸۔ مالک بن احمر[4] کے نام خط میں ہے:

"..... امانا لھم ما اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ ... وجانبوا المشرکین وادوا الخمس من المغنم وسھم الغارمین ... (الوثائق / ۲۰۲ واسد الغابہ ۴ / ۲۷ ورسالات النبویہ / ۲۵۳)

"..... ان لوگوں کو امان ہے جب تک نماز پڑھتے، زکات ادا کرتے رہیں اور مشرکین سے قطع تعلق کریں اور مغنم سے خمس دیں اور نقصان اٹھانے والوں کو ان کا حصہ دیں۔

---

[1] اجاء کی پہاڑی میں طی کی آبادی کے پاس بنی معاویہ رہتے تھے۔ [2] بنی جھینہ کے دو گروہ جس کا مسکن مدینہ و وادی القریٰ کے درمیان تھا۔ [3] الوثائق السیاسیہ ص ۱۹۶ — اسد الغابہ ج ۱ / ۳۰۰ و ۱۹۹

[4] مجموعۃ الوثائق السیاسیہ میں اشتباہاً مبارک بن احمر کا نام لکھا ہے۔ مالک بن احمر سنہ ۹ ہجری میں مسلمان ہوئے یہ خط ان کے اور قبیلے کی دعوت کے طور پر بھیجا گیا۔ یہ قبیلہ مدین و تبوک کے مابین رہتا اور مشتری ستارے کو پوجتا ہے۔

۹۔ بنی قیش بن اقیش کے نام مکتوب میں ہے[1]:

"فانتم ان اقمتم الصلوٰۃ واتیتم الزکوٰۃ واعطیتم سہم اللہ والصفی فانتم آمنون. . . ." (اسد الغابہ ۱/۳۲۸ ۔ رسالات نبویہ/۱۳۸)

اگر تم لوگوں نے نمازیں پڑھیں، زکات دی، خدا و صفی کا حصہ خمس ادا کیا تو سب لوگ امان میں رہوگے۔

سہم اللہ ادا کرنا خمس ادا کرنے ہی کے معنی میں ہے ۔ کیونکہ اس کا بیان زکات کے بعد ہے اسی طرح صفیہ کا استعمال بھی قرینہ ہے۔

۱۰۔ بنی ثعلبہ کے سردار صیفی[2] کے نام بھیجے گئے خط میں ہے:

". . . . وآتی الزکوٰۃ واعطی خمس المغنم وسہم النبی والصفی . . ." (الوثائق/۶۴)

"زکواۃ دے اور مغنم کا خمس اور حصۂ نبی و صفی ادا کرے . . .

۱۱۔ جنادہ[3] کے خط میں ہے:

". . . . ما اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ . . . . . واعطوا من المغانم خمس اللہ وسہم النبی . . . ." (الوثائق/۱۹۶)

. . . جب تک وہ لوگ نماز پڑھتے اور زکات دیتے رہیں . . . اور مغانم میں اللہ کی خمس اور رسول اللہ کا حصہ دیتے رہیں۔

۱۲۔ نہشل[4] بن مالک کے نام مکتوب میں ہے:

". . . . واقام الصلوٰۃ وآتی الزکاۃ واطاع اللہ ورسولہ واعطی من المغنم خمس اللہ وسہم النبی . . . ." (طبقات ۱/۲۸۴ رسالات نبویہ ۲۹۴)

---

[1] خیال ہے کہ یہ خط اور بنی زہیر بن اقیش کے نام خط ایک ہی ہے راویوں نے الفاظ میں اختلاف کی بنا پر دو خط مان لیا۔ مگر ایک خط پر نمر بن تولب اور دوسرے پر حارث ابن زہیر کا نام ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے دونوں سردار الگ الگ گئے ہوں اور دونوں کو ملتے جلتے فرمان بارگاہ رسالت سے مرحمت ہوئے ہوں۔

[2] بنی ثعلبہ کی بہت سی شاخوں میں یہ شاخ مدینہ سے عراق کی سمت چھتیس میل کے فاصلے پر رہتی تھی اور اسلام قبول کرتے وقت اس کا سردار صیفی بن عامر تھا۔

[3] یہ خط طبقات ۱/۲۷۰ اور کنز العمال ۵/۳۲۰ میں ہے۔ ایک احتمال ہوتا ہے یہ خط ۸ ہی ہے مگر قطعی طور پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

[4] باہلہ کا ایک قبیلہ سنہ ۹ھ میں مسلمان ہوا تو ان کے سردار نہشل کو آنحضرتؐ نے یہ خط دیا۔

"... نماز پڑھے زکات دے، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرے مغانم سے خدا اور رسولؐ کا حصہ ادا کرے۔

۱۳۔ اہلِ یمن کے نام حضورؐ کا مکتوب بہت سے احکام پر مشتمل ہے۔ ایک جگہ یہودیوں کے ضمن میں جزیہ کا تذکرہ۔ اور زکات و نصابِ زکات اور نماز کے بعد خمس کے بارے میں یہ جملے ہیں:

"... وآتیتم الزکاۃ واعطیتم من المغانم خمس اللہ وسھم النبی والصفی..."

تم لوگ زکات دو، مغانم سے خمسِ خدا اور حصہ نبی وصفی ادا کرو۔

۱۴۔ سردارانِ قبائل حمیر شرحبیل ونعیم وحارث پسران عبد کلال اور قبائل ہمدان کے نام ایک عام خط عمرو بن حزم انصاری کے ہاتھ بھیجا گیا جس میں یہ فقرے بھی تھے:

"..... فقد رجع رسولکم واعطیتم من الغنائم خمس اللہ عز وجل وما کتب علی المؤمنین ....." (الوثائق السیاسیہ/۱۸۵)

تمہارا قاصد واپس آیا اور تم نے اپنے غنائم سے خمس خدا اور مومنین کے حقوق و واجبات (جو تم پر تھے) ادا کردیے۔

اسی مکتوب کی دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔

"... وان اللہ قد ھداکم بھدایتہ ان اصلحتم ... وآتیتم الزکاۃ واعطیتم من المغانم خمس اللہ وسھم نبیہ وصفیتہ ...."

اور اللہ نے تمہیں اپنی خاص ہدایت سے نوازا ہے بشرطیکہ تم ٹھیک ہوجاؤ اور زکات دو، مغانم سے اللہ کی خمس اور رسولؐ وصفی کا حصہ ادا کرو۔

۱۵۔ عمرو بن حزم انصاری کے نام ایک تفصیلی خط ہے، جس میں بہت سے احکام حرام و حلال کے ذیل میں ہے:

"وامرہ ان یاخذ من الغنائم خمس اللہ وما کتب علی المؤمنین فی الصدقۃ ...."

۱۔ یعقوبی ۶۴/۲، طبقات ۲۶۴/۱ و ۱۲۱/۳۔ فتوح البلدان/۸۲۔ کنز العال ۳۱۸/۵۔ احکام القرآن جصاص ۱۲۰/۳ ترتیب المسند الشافعی میں اشارہ نامہ دیکھیے۔

۲۔ طبری ۳۸۱/۲۔ فتوح البلدان/۸۲، سیرۃ ابن ہشام ۲۵۸/۴۔۲۶۰۔ و و و۔

۳۔ طبری ۳۸۸/۲۔ فتوح البلدان/۸۰۔ تنویر الحوالک ۱۵۶/۱۔ الوثائق السیاسیہ.....

اور عمرو کو پابند کیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے خمس اور مومنوں پر صدقے کے جو واجبات ہیں، انہیں وصول کیا کریں . . . . .

۱۶۔ عمان کے فرمانروا کے نام مکتوب میں ہے :

" . . . . انھم آمنوا باللہ واقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکاۃ . . . . واعطوا حق النبیؐ . . . . "

یہ خط بندگانِ خدا کے لیے امان نامہ ہے . . . . اگر اللہ پر ایمان لے آئیں نماز پڑھیں، زکات دیں . . . اور حقِ نبیؐ ادا کریں . . . . "

زکات کے بعد حق النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی خمس ہے۔

۱۷۔ سعدِ ھذیم کے دو قبیلوں، قضاعہ اور جذام کے نام مکتوب میں ہے :

" وامرھم ان یدفعوا الصدقۃ والخمس الی رسولیہ اُبیّ وعنبسۃ او من ارسلاہ "

اور انہیں حکم دیا گیا ہے کہ صدقہ اور خمس اُبیّ اور عنبسہ یا ان کے فرستادے کو دیا کریں۔

حاصلِ نظر

غنائم، مغنم اور غنم . . . . سے مالِ حاصل شدہ از جنگ مراد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان مکاتیب میں ان کلمات کا استعمال، نفع اور بچت۔ فائدہ کے لائق چیز کے معنوں میں ہوا ہے، اس پر کچھ دلائل یہ ہیں :

۱۔ اصولی طور پر اسلام میں۔ دنیا بھر کی حکومتوں میں بھی۔ خصوصاً عہدِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دستور یہ تھا کہ جنگ کا فیصلہ مرکز کرتا تھا۔ یعنی ولیِ امر اہلِ اسلام حضرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود یا آپ کی طرف سے معین شدہ شخص فرمان دیتا اور جنگ اسی فرمان کے مطابق شروع اور ختم ہوتی تھی۔ تاریخِ اسلام میں کوئی مقام ایسا نہیں

---

۵ ابی عبید، کتاب الاموال / ۲۰۔ رسالات النبویہ / ۱۳۴، الوثائق . . . .

۶ الوثائق السیاسیہ / ۲۲۴۔ مقدمہ مرآۃ العقول ۱ / ۱۰۲

مثلاً کہ مسلمان قبائل نے بطور خود جنگ شروع کر دی ہو۔ جنگ تو جنگ کوئی چھوٹی سی سماجی اور انتظامی بات ایسی نہیں جو اجازت و تعیین حاکم شرعی کے بغیر ہوئی ہو۔ جمعہ و جماعت کے پیش نماز، زکات کی تحصیل وصول کرنے والا (عامل)۔۔۔۔ اسلام کے علاوہ دوسری حکومتوں اور نظاموں میں بھی حکومت کی صوابدید کے بغیر معین نہیں ہوا کرتے۔

جنگ کے بعد اموال غنیمت ایک جگہ جمع ہوتے، خمس (مجموع کا پانچواں حصہ) نکالنے کے بعد قانون اسلام کے مطابق خود آنحضرتؐ یا آپ کے نامزد کردہ شخص کی نگرانی میں وہ مال تقسیم ہوتا تھا۔ اس بنا پر قبائل عرب یا سرداران قبائل کے امان ناموں یا ان کے نام عمومی پیغاموں یا معاہدوں میں غنائم سے خمس نکالنے کا حکم مفروضہ معنوں میں مراد لینا درست نہیں۔ پھر خطاب بھی عوام سے ہے، کسی امیر فوج یا کمشنر اور گورنر سے نہیں ہے۔

امیر لشکر، حاکم یا والی کو خمس وصول کرنے کا حکم دینا تو ایک بات بھی ہوئی وہ خمس میں اپنا حصہ لے کر باقی مال صحرا نشین، دیہاتی اور غربا میں تقسیم کر دیتے۔ امان نامہ یا معاہدہ حاصل کرنے والے افراد و قبائل ان کے فرائض و شرائط بتلانا چاہتے تھے۔ ان فرائض کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک مالی فریضہ خمس بھی یاد دلایا گیا، جو ان کے ملی منافع و آمدنی سے متعلق تھا۔

۲۔ جن قبیلوں کے لیے یہ خط لکھے گئے ہیں وہ جزیرۃ العرب، عمان و بحرین و یمن و شام میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی پراگندگی، کمزوری اور افرادی قوت کی بنا پر کیسے ممکن تھا کہ کفار سے جنگ کرتے اور انھیں حکم دیا جاتا کہ حاصل شدہ مالِ غنیمت سے خمس ادا کرو۔

اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ "غنائم سے خمس ادا کرنے کا" مطلب نہیں بلکہ اس سے مراد شخصی آمدنی سے پانچویں حصہ کا نکالنا اور باقی حصہ بیت المال کو ادا کرنا مسلمان کا ذاتی فریضہ ہے۔

۳۔ ان خطوط مبارک میں اگر غنائم سے مراد جنگی مال غنیمت ہے، تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت عام دے رکھی ہے کہ جس کا جب اور جہاں دل چاہے جنگ کرے۔ عقلاً ایسا حکم یا اجازت افراتفری و بدنظمی پھیلانے کے برابر ہے۔ اور یہ بات قطعی طور پر اسلام کے قانون و دستور کے خلاف ہے۔ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا نہ تاریخ اسلام میں اس قسم کی بے نظمی کا وجود ہے۔ اس کے برعکس اسلام نظم و انتظام باقاعدگی کو ہر مرحلے میں پیش نظر رکھتا ہے۔

۴۔ ان خطوں میں احکام اسلامی کا ایک بیان ہے، مثلاً: توحید ۔ نبوت ۔ قیامت ۔ نماز ۔ روزہ ۔ زکات، یہ سب انفرادی فرائض (واجب عینی احکام) ہیں، ہر مسلمان سے ان کی ادائگی کا مطالبہ ہے۔ چونکہ خمس بھی اسی ضمن و فہرست میں درج ہے اس لیے اس کا مطالبہ بھی ہر شخص سے ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب غنیمت کے معنی غنائم جنگ نہ ہوں، یعنی جس طرح ہر شخص کی تکلیف ہے کہ وہ اپنے مال سے زکات دے اسی طرح اس کا شرعی فریضہ ہے کہ اپنے مال سے خمس ادا کرے

۵۔ عمرو بن حزام کے ہاتھ جو خط حمیر و ہمدان کے رؤسا کو بھیجا گیا ہے اس میں ایک رقم کی رسید با ین الفاظ ہے ۔ تمھارا قاصد واپس آیا اور غنائم سے خمس خدا ادا کر دی ۔ یہ عبارت صاف صاف بتا رہی ہے کہ لوگوں نے اپنے اوپر واجب خمس کی رقم بھیجی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کی وصول یابی سے ان لوگوں کو مطلع کیا۔

۶۔ عمرو بن حزام کے نام فرمان میں ضروری ہدایات میں اموال خمس وصول کرنے کا حکم اسی انداز سے دیا، جس طرح زکات وصول کرنے کا فرمان دیا ہے۔

۷۔ سعد و جزلم کے نام فرمان میں ارشاد ہے، انھیں حکم دیتا ہوں کہ زکات و خمس دیں یہ رقم اُبی یا عنبسیں یا ان کے فرستادہ ۔ یہ قبیلے نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے اسلامی جنگ میں شرکت بھی نہیں کی ۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان سے خمس لینے کی ذمہ داری اس شخص پر ڈال رہے ہیں جو ان سے زکات وصول کرنے پر مامور ہے ۔ جیسے عمرو بن حزم۔

۸۔ غنائم سے خزانہ، دفینہ یا رکاز مراد لینا بھی وہم ہے یعنی جیسے حضرت علی علیہ السلام نے یمن میں رکاز (دفینہ) سے خمس وصول کی تھی ۔ ذرا سا غور کرنے سے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ بھلا، جن علاقوں اور قبیلوں کو یہ حکم دیا گیا ہے وہاں کتنے دفینے تھے جو اس اہتمام سے بات کی گئی؟ چھوٹے چھوٹے علاقوں اور قبیلوں تک فریضۂ خمس کے بارے میں یہ اہتمام اور تاکید فقط دفینے کی بنیاد پر سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے، دراصل حکم عام اور فریضۂ شرعی سب سے متعلق تھا۔ اور وہ شخصی آمدنی اور بچت اور نفع کی بات ہے۔

اعتراض: ان خطوط میں "صفی و سہم نبی" خمس غنائم کے ساتھ ساتھ درج ہے۔ چونکہ صفی (خالصہ)، غنائم، جنگ میں مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے اس لئے

قرائن کی بنا پر "مغانم" "وغنائم" سے اموال جنگ ہی مراد ہیں کوئی اور معنی درست نہیں۔
جواب: یہ کلمہ (صفی وسہم النبیؐ) خمس کے ساتھ، عمرو بن حزم۔ قضاعہ۔ جذلم اور مالک ابن احمر وفجیع وملوک عمان وجھنیہ کے مندرجات میں ہے۔ لہٰذا جہاں ابہام موجود ہو، وہاں ہوگا ان خطوں میں تو بات صاف ہے اور آپ معنی مراد لینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔
دوسری بات: "صفی وسہم النبیؐ" چونکہ اقسام غنیمت میں ایک قسم سے تلازمہ رکھتے ہیں اس لیے اس کے بیان میں صفی کا استعمال مناسبت وقرینۂ مانعہ کا فائدہ دیتا ہے۔
تیسری بات: امکان ہے کہ جن مکاتیب میں "صفی وسہم النبی" ہے وہاں عطف تفسیری وبیانی ہے کہ خمس بہ انتخاب پیغمبرؐ خدا کی طرف سے ہے۔

خمس کی تحصیل وصول کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معین کردہ افراد

درج ذیل حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عمومی مالی واجبات وصول کرنے کے واسطے دو گروہ معین تھے اور یہ لوگ خصوصی فرمان کے ذریعہ بھیجے جاتے تھے۔ یعنی،

۱۔ زکات وصول کرنے والے افراد۔
۲۔ خمس وصول کرنے والے افراد۔

عمرو ابن حزم جن کو فرمانِ منصب ملا تو ان کے فرمان میں احکام وضوابط اسلامی کا تذکرہ تھا اسی بنا پر انہیں شہرت حاصل ہوئی۔ اس فرمان میں عمرو کو حکم وصولیابی خمس بھی موجود ہے یعنی مغانم سے پانچواں حصہ لے لیا کریں۔
"جب اہل یمن کو رسول اللہؐ کی بعثت کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے نمائندے بھیجے، نمائندوں نے رسول اللہؐ کے حضور حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ایک خط دیا جس میں ان کے اسلام لانے پر مالی تحفظات کا تعین دلایا گیا تھا اور کچھ افراد کو ذمہ داریاں سونپی گئیں کہ وہ جائیں اور اہل یمن کو آداب واحکام اسلام سے باخبر کریں یہود ونصاریٰ سے جزیہ اور باقی افراد سے صدقات بھی وصول کریں (دیکھیے مکاتیب الرسول)
عبد کلال کے بیٹوں حارث شرجیل ونعیم۔ حارث وہمدان کو بھیجا اور خط لکھا کہ "تمہارے

یندے واپس جا رہے ہیں ان لوگوں نے تمہارے اموال (خمس غنائم) پہنچائے اور تم نے
بات ادا کر دیے "

بنی سعد و جذام کے نام خط میں حکم دیا کہ ابی و عنبسہ کو خمس و زکات ادا کر دیہ دونوں
رے فرستادہ ہیں ۔

ابن قیم (زاد المعاد - ۱/۲۲) کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی
یہ السلام کو یمن میں قاضی اور محصل خمس بنا کر بھیجا تھا۔[۲]

البدایہ والنہایہ (۵/۱۰۴) میں بریدہ سے منقول ہے، آنحضرت نے حضرت علیؑ کو خالد
ن ولید سے خمس اپنی تحویل میں لینے کو بھیجا ۔

زید بن ارقم کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو
ن بھیجا، اہل یمن حضرت کے پاس "رکاز" لائے حضرت علیؑ نے اس میں سے خمس لے لیا باقی
ں مالک کو واپس کر دیا[۳] ۔

اعلام الوریٰ : رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو دعوت اسلام کے لیے
ن بھیجا، نیز کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ کو خمس رکاز وصول کرنے اور تعلیم احکام حلال و حرام
ے لیے نامزد فرمایا ۔

نجران بھی حضرت علیؑ کو بھیجا تھا کہ وہاں سے صدقات اور جزیہ وصول کریں (بحار
نوار ۲۱/۳۶۰)

ابن جریح نے حضرت جعفرؑ ابن محمدؑ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ نے
ضرت علیؑ کو یمن بھیجا اور وہاں سے خمس رکاز وصول کرنے کی ذمہ داری سونپی ۔[۴]

بنی زبید کے محمیہ بن جزء نامی آدمی کو رسول اللہؐ نے خمس رکاز وصول کرنے یمن بھیجا۔[۵]

مجلہ الہادی سال ۶ شمارہ ۲ ص ۵۲ مقالہ سید جعفر مرتضی ۔ ۲ مصنف، عبد الرزاق ۴/۱۶ ا مجمع الزوائد ۳/۸۰،
صب الرایہ، زیلعی ۲/۳۸۲ بحار الانوار ۲۱/۳۶۰
مصنف، عبد الرزاق ۴/۱۱۶
الصحیح من السیرۃ ۳/۳۱۲ از اموال ابی عبید ۴۱۶

بید ۱۱۰

مؤلف الصحیح من السیرۃ (۳/۳۱۲ - ۳۱۳) نے لکھا ہے:

"یہ خیال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو صدقات کی تحصیل وصول کے لیے بھیجا غلط ہے (جبکہ لوگوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے انھیں جمع اخماس کے لیے بھیجا) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی ہاشم کو صدقات جمع کرنے نہیں بھیجتے تھے۔ اس سلسلے میں عبدالمطلب ابن ربیعہ اور فضل بن عباس کا واقعہ مشہور ہے۔ بلکہ آنحضرتؐ اپنے موالی (آزاد کردہ غلاموں) کو بھی اس کام سے روکتے تھے۔ مثلاً ابو رافع سے فرمایا:

مولی القوم من انفسہم وانا لاتحل لنا الصدقہ "کسی خاندان کا آزاد کردہ غلام اس خاندان کی فرد شمار ہوتا ہے۔ اور ہم لوگوں پر صدقہ حرام ہے۔

ز - آیۂ کریمہ واعلموا انما غنمتم میں "غنمتم" کے معانئے لغوی مراد ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ایک حدیث دلیل ہے:

تہامہ میں عبدالقیس کا ایک گروہ رہتا تھا یہ لوگ وہاں سے بحرین کوچ کر گئے۔ ۹ھ یا ۱۰ھ ہجری میں ان کے چند سردار آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر توجہات کریمانہ پیغمبرؐ سے سرفراز ہوئے۔ حضرتؐ نے ان کو ایک خط مرحمت فرمایا۔

وفد عبدالقیس نے عرض کیا: ہم ماہ ہائے حرام کے علاوہ حاضری سے معذور ہیں، مضر کا کافر قبیلہ رکاوٹ بنتا ہے۔ سرکار کچھ واضح احکام مرحمت فرمادیں، ہم وہ احکام اپنے قبیلے کو بتا کر جنت کے مستحق ہوں .... آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چار اوامر اور چار نواہی کی تعلیم توحید پر ایمان کا حکم دیتے ہوئے پوچھا، اللہ کی یکتائی پر ایمان کا مطلب جانتے ہو کیا؟

انہوں نے عرض کیا: خدا اور رسولؐ بہتر جانتے ہیں! فرمایا: توحید کا مطلب ہے:

شہادۃ ان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ نماز قائم کرنا۔ زکات دینا۔ رمضان کے روزے رکھنا۔ اور مغنم سے خمس دینا۔ متن حدیث کے الفاظ ہیں:

"تعطوا الخمس من المغنم"

حدیث میں گزشتہ قرائن کے علاوہ ایک تصریح یہ ہے کہ گروہ (وفد) عبدالقیس کا بیان ہے۔ بنی مضر کا ایک گروپ ہمیں باہر نکلنے نہیں دیتا، ہم سفر نہیں کر سکتے، صرف

ماہ‌ہائے حرام میں جب جنگ بند ہوتی ہے تو ہم باہر نکلتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ جنگ کی قوت نہیں رکھتے تھے اور لڑنے کی قوت نہ تھی تو مالِ غنیمت جنگ کا سوال کہاں سے پیدا ہوگا۔

حدیث کا ظاہر و عیاں مطلب، لوگوں کے شخصی واجبات و فرائض کی تعلیم ہے، جن میں کلمۂ توحید و نماز و روزہ و زکات و خمس، فوری واجبات ہیں (ہر لمحہ کلمہ۔ ہر روز نماز اور ہر سال زکات و خمس) ظاہر ہے کہ مال غنیمت جنگ، جہاد پر موقوف اور اسلام بآسانی اجازت جہاد نہیں دیتا۔

رسولِ اسلامؐ کا فلسفۂ علم و تعلیم

جناب ڈاکٹر وحید اختر
پروفیسر فلسفہ
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ہمارے عہد میں دانشوروں اور مفکرین کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ انسانی علوم اس تیزی سے ترقی کر رہے ہیں کہ ان کا احاطہ و انضباط ہماری قدرت سے باہر ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ "آج ہم اپنی ترقی علم کے گزیدہ ہیں۔" کسی نے کہا "علم ہماری نجات نہیں، ابتلا ہے۔" کسی اور نے محسوس کیا کہ "سائنسی علوم میں اختصاصی مہارت کا تقاضا ہمہ گیر جہل کا سبب بن رہا ہے۔" کچھ کو احساس ہے کہ "تمام مختص علوم ایک دوسرے سے اس قدر غیر مربوط ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے درمیان پل باندھنا ممکن نہیں۔" بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ "مخصوص سائنسوں کی زبان آتنی زیادہ اصطلاحی ہو گئی ہے کہ بڑے سے بڑا عالم بھی اپنے دائرۂ اختصاص سے باہر علوم کی زبان سمجھنے سے یکسر قاصر ہے۔" جن لوگوں نے علم کو انسانی وجود کے مسئلے سے غیر منفک سمجھا، ان کا کہنا ہے کہ "علم کی بہتات میں انسان نے خود اپنے آپ کو گم کر دیا ہے۔" فلسفۂ تعلیم کے ماہرین اور نظامِ تعلیمات پر کام کرنے والوں کو اس خطرے کا احساس ہے کہ موجودہ طرزِ تعلیم انسان کی ہمہ جہت ترقی و تشکیل میں ناکام رہا ہے" نظریات کے تنوع کی یلغار میں حیرتِ مستقل کو ابتدا و انتہا کا پتہ نہیں ملتا۔ یہ اور اس طرح کے یا اس سے مختلف خیالات آتنی کثرت سے سامنے آ رہے ہیں کہ ہمیں ایک بار رک کر سوچنا پڑتا ہے

کہ آخر علم کا مقصد کیا ہے؟ علم کا انسانی شخصیت کی تکمیل سے کیا تعلق ہے؟ علم افراد اور معاشرے کی ہم آہنگی میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟ علم ناقابلِ تقسیم وحدت ہے یا پارہ پارہ حقائق کی محض ریزہ چینی؟ ان سوالات کے کئی رخ ہیں، اور ہر رخ سے علم اور ترسیلِ علم (تعلیم و تدریس) کے مسائل پر غور کیا جائے تو کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے مسائل کے بحرِ زخار سے گذرنا پڑے گا۔ تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں، اجمالی طور پر چند بنیادی مسائل کی نشاندہی پر اکتفا کرنا ہوگا۔

علم انسانی تجربۂ وجود کی کسی سطح سے متعلق ہو، انسان کی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔ علم کی خود کئی سطحیں ہیں: وجدانی یا حضوری علم جو استدلالی طرزِ فکر اور تجربۂ حواس سے مستغنی ہے، اسی کا نام اعلیٰ سطح پر عرفان ہے، اکتسابی یا تجربی علم، اس کی اساس تجربۂ حواس پر ہے۔ اس بنیاد پر فہم معطیاتِ حواس (SENSEDATA) کو چند قوانینِ ربطِ تصورات کے تحت ترتیب دے کر ان میں ربط پیدا کرتی ہے تب تعقلات (CONCEPTS) تشکیل پاتے ہیں۔ ان تعقلات کا معروضی اشیا سے کیا ربط ہے؟ اور خود حقیقت سے ان کا کیا رشتہ ہے؟ یہ علیحدہ مسائل ہیں۔ ان سے قطع نظر، تجربی علم منطقی بھی ہے اور سائنسی بھی۔ ایک منطق استخراجی یا استنباطی ہے (DEDUCTIVE) دوسری استقرائی ہے۔ استخراجی منطق کلیات سے چل کر افراد و اشیا کے متعلق نتائج اخذ کرتی ہے جبکہ استقرائی منطق جزئیات یا افراد سے چل کر کلیات یا قوانینِ عامّہ تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ استقرا ہی سائنسی منہاج کی اساس ہے۔ لیکن ہمیں اصطلاحی معانی کے لحاظ سے عقلی اور تجربی میں بھی سطحوں کا ہی نہیں، طریقہ ہائے کار کا بھی فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ عقلیت (RATIONALISM) تصورات کو وہبی اور فطری مان کر انھیں سارے علم کی بنیاد مانتی ہے۔ حواس و ادراک کا کام ضمنی و ثانوی ہے۔ اس کے برخلاف تجربی نظریہ وہبی تصورات کا منکر ہے، اور حواس و ادراک ہی کو ذریعۂ علم مانتا ہے۔ عقل کا کام تجزیۂ تصورات اور ترکیب تعقلات ہے۔ یعنی اکتسابی علم کا ایک نظریہ عقل کے وہبی تصورات کے وسیلے سے علم حضوری کا معترف ہے، دوسرا نظریہ اس کا منکر۔

ذرائع علم و منابعِ علم کے لحاظ سے علم کو اور بھی کئی ذیلی سطحوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس تقسیم سے ہٹ کر اگر ہم مختلف بنیادی علوم کو لیں تو موٹی سی تقسیم یہ ہوگی: مذہب، ادب بشمولِ فنونِ لطیفہ، فلسفہ اور سائنس۔ مذہب کی اصل نقل (سند) ہے یعنی وحی و الہام یا صحف و رسالت پر ایمان

جو استدلالِ عقلی و منطقی کا محتاج نہیں۔ مذہب علم کے معنی میں کُل انسانی شخصیت کا خالقِ حیات و کائنات سے مخصوص ربط اور اس ربط کی آگہی ہے۔ خالق و مخلوق کے ربط کی بحث میں انسانوں کا باہمی رشتہ خود بخود دائرۂ بحث میں آجاتا ہے۔ ادب و فنونِ لطیفہ کا تخلیقی تجربہ اس روحانی تجربے سے مماثل ہے جسے مذہبی اصطلاح میں عرفان، الہام یا قلبی واردات کا نام دیا جاتا ہے، یا جدید فلسفے کی اصطلاح میں وجودی تجربہ (EXISTENTIAL EXPERIENCE) کہا جاتا ہے۔ ادب اور آرٹ فلسفہ و سائنس کی طرح استدلالی عقل کے پابند نہیں۔ ماورائے سخن تک رسائی کا طریقہ بھی ماورائے منطق ہے۔ ادب کی زبان بھی مذہبی تجربے کی زبان کی طرح استعاراتی (METAPHORICAL) اور علامتی (SYMBOLIC) ہوتی ہے۔ فلسفہ اذعان و ایمان کی جگہ عقل کو دیتا ہے۔ اب یہ عقلی استدلال پر ہے کہ کوئی فلسفی حقایقِ مذہبی و روحانی کی تصدیق کرتا ہے یا نفی۔ ازمنۂ قدیم و وسطیٰ میں فلسفے کو حقیقتِ مجموعی کا کلی احاطہ کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ افلاطون کا قول ہے "فلسفی زمان و مکان کا من حیث الکل ناظر ہوتا ہے۔" اسی بنا پر فلسفہ ایک جامع و مبسوط تصورِ حیات و کائنات سمجھا جاتا تھا دورِ جدید میں علوم کی تقسیم در تقسیم اور کسی ایک مسئلہ میں اختصاصی مہارت کے رجحان نے فلسفے پر بھی اثر ڈالا اور آج فلسفہ کی منہاجیات (METHODOLOGY) کا اصرار اس پر ہے کہ فلسفہ کا کام جامع نظامِ تصورات کی تشکیل نہیں، بلکہ تصورات کا تجزیہ و تحلیل ہے۔ یعنی فلسفہ جو آج سے پہلے مذہب کی طرح مکمل نظامِ تصورات کی تشکیل کا مدعی تھا، خود اپنے ہاتھوں اس منصب سے دست بردار ہو رہا ہے۔ سائنس کا طریقۂ کار خالصتاً تجزیاتی (ANALYTIC) ہے۔ ہر سائنس حقیقت کے کسی ایک پہلو سے بحث کرتی ہے۔ مثلاً طبیعیات مادے اور طبیعی قوتوں سے۔ کیمیا عناصر و مرکبات کے خواص وغیرہ سے، نباتیات پودوں سے، حیوانیات جانداروں سے، علمِ طبقات الارض زمین کی پرتوں اور ان میں مخفی وسائل و خزائن سے۔ آگے چل کر ان میں سے ہر سائنس کئی خانوں میں بٹ گئی۔ اب ان میں سے ہر ایک کی کئی شاخیں ہیں۔ پھر اطلاقی سائنسیں ہیں جیسے انجینئرنگ، طب، علمِ زراعت وغیرہ جو خود اختصاص کے لحاظ سے بہت سی ذیلی شاخوں میں منقسم ہیں۔ سائنس کا طریقۂ تجزیہ یہیں رک نہیں جاتا۔ سائنس ایک طرف موضوعِ زیرِ نظر کو اجزا میں اور اجزا کو مزید چھوٹے اجزا میں تحلیل کر کے انتہائی (یا ابتدائی؟) جز کے متعلق

مشاہدہ و اختبار (EXPERIMENT) کی مدد سے معلومات اخذ کرتی اور پھر انہیں عمومیت دے کر ان کے متعلق سائنٹفک عام قوانین دریافت کرتی ہے۔ سائنسی طریقہ استقرائی ہے جس کے وسائل مشاہدہ و اختبار ہیں۔ یہ عقل کے تحلیلی ملکے پر مکمل تکیہ کرتی ہے۔ اور مذہب کے برخلاف صداقت کے معاملے میں قطعیت اور حتمیت کی قائل نہیں۔ سائنس میں ہر صداقت مزید علم و انکشافات کی روشنی میں تغیر و اصلاح پذیر رہتی ہے۔ ان سب علوم کا بنیادی مقصد منہاج کے اختلاف کے باوجود ایک ہی ہے، صداقت کی تلاش۔ مذہب صداقت کو روحانی تجربے اور الہامی ہدایت کے ذریعہ معلوم کرتا ہے۔ ادب اور آرٹ فرد کے داخلی تجربے اور واردات قلبی کے وسیلے سے اس کا انکشاف کرتے ہیں۔ فلسفہ عقل کے ذریعے اور سائنس مشاہدہ و اختبارات کے تجزیاتی مطالعے کے ذریعے صداقت تک پہنچنے کے راستے دکھاتے ہیں۔

اگر صداقت ہر طرز علم و دائرۂ علم کا مقصود و منتہا ہے تو پھر اتنی تقسیم در تقسیم کیوں؟ ایک علم اور دوسرے علم کی زبان و طریقہ میں اتنا فرق کیوں؟ سائنسوں کے درمیان ناقابل عبور خلیجیں کس لیے؟ ان سب سوالات کا جواب یہی ہے کہ علم بذات خود وحدت ہے، نہ تو اسے حضوری وحصولی، عرفانی و تجربی کے خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور نہ مذہب، ادب، فلسفے اور سائنس کے آخری نتائج کو لکیریں کھینچ کر الگ الگ خانوں میں بند کرنا ممکن ہے۔ یہ سب تقسیمیں اور خانہ بندیاں علم کے بے قابو اضافے کا نتیجہ ہیں۔ اور ان پر ہم قابو اس لئے نہیں پاسکتے کہ ہمارے ذہن میں علم کا مفہوم خبط ہوگیا ہے۔ اس تقسیم علم کا ضمنی نتیجہ یہ ہے کہ علم کا انسان کی شخصیت کی تشکیل سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔ کیمیا یا طبیعیات یا حیوانیات ان علوم کے دانش جویان و اساتذہ کی شخصیت کی تعمیر میں خود کیا مدد کرسکتی ہیں؟ اسی طرح عمرانی علوم معاشیات، سیاسیات، سماجیات وغیرہ فرد کے نظام اقدار پر کیا اثر ڈال سکتے ہیں اگر ان کا ربط کسی تصور حیات و کائنات اور نظام اقدار سے نہ ہو۔ اسی طرح اگر فلسفے کے ماہرین سائنس کی مبادیات سے بھی ناواقف ہیں تو وہ حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے اور اگر مذہب کے علما جدید طبیعی و عمرانی سائنسوں اور عصری فلسفیانہ میلانات کے نتائج سے آگاہ نہیں تو وہ مذہبی تعلیمات کو ہمارے دور کے معاشرے کے مسائل، افراد کے ردِ عمل و عمل اور تاریخ سے آگہی اور مستقبل کے امکانات کی پیش بینی کے لیے

کس طرح بروئے کار لاسکتے ہیں؟ کچھ فلسفیوں کا خیال ہے کہ سائنسوں کو باہم ربط دیکر اور ان کے نتائج کو یکجا کر کے تمام حیات و کائنات کی تفہیم کا کام فلسفے کو کرنا چاہیے۔ کچھ سائنسوں کے اختصاصی رجحان کی پھیلائی ہوئی عالمگیر جہالت کا مداوا مذہب کے روحانی و عرفانی پہلو میں ڈھونڈتے ہیں ۔ لیکن اب تک کوئی ایسا جامع تصور سامنے نہیں آیا جو ان مختلف سطحوں کے علوم کو باہمدگر ربط دے کر پارہ پارہ حقیقت کی وحدت کو سمجھ سکے، اور خود انسان کو جو اپنے اجزا میں تقسیم ہو کر گم شدۂ گردِ تحقیقات ہو چکا ہے، جوڑ کر اس کی خود بیگانگی (SELF - ALIENATION) سماج بیگانگی (SOCIAL ALIENATIO اور فطرت بیگانگی (NATURE - ALIENATION) کا مداوا کر سکے ۔

خود بیگانگی، سماج بیگانگی اور فطرت بیگانگی کا نتیجہ خدا بیگانگی ہوتا ہے یا اسی کو دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا بیگانگی کے نتائج بیگانگی کی تمام دوسری شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں

میں نے بہت سوچ سمجھ کر ابتدا میں لکھا ہے کہ علم کی کئی سطحیں ہیں۔ میں نے دانستہ قسمیں نہیں لکھا، اس لیے کہ میرا عقیدہ ہے کہ علم وحدت ہے، مختلف علوم اور ان کے مناہج میں جو امتیازات ہیں وہ اصلی نہیں ضمنی اہمیت کے حامل ہیں۔ علم کی ایک سطح مذہبی تجربہ ہے، دوسری سطح فنونِ لطیفہ و شعر کا موضوعی تجربہ، تیسری سطح فلسفے کا عقلی استدلال ہے اور چوتھی سطح سائنسوں کا تجزیاتی طریقۂ کار ہے۔ ایک سطح دوسری کی مانع نہیں بلکہ یہ سطحیں ایک سے دوسرے تک رہنمائی کرتی ہیں اور انکی حدیں باہم ملتی ہیں، ایک سطح دوسری کو کبھی کاٹتی ہے، کبھی اس میں ضم ہو جاتی ہے ان سب سطحوں کا علم مل کر اس علم تک ہماری رہنمائی کرتا ہے جو وحدت ہے اور سب سطحوں کا جامع۔ مصنوعی طور پر تقسیم کئے ہوئے علم کی شاخوں کی درمیانی خلیجوں کو منقسم و ریزہ ریزہ علم نہیں پاٹ سکتا علوم کی وحدت و ارتباط کے لیے ہمیں کسی اور نظام علم کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اسی مقصد کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پیغمبرِ اسلام و خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو نظام حیات و کائنات پیش کیا، اس میں علم کا کیا مقام ہے، انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اس کا کیا حصہ ہے اور مختلف طریقہ ہائے حصولِ علم کو کیوں کر مربوط و منظم کیا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس پر بھی غور کرنا ہے کہ علم کا مقصد شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما ہے کس حد تک رسولِ اکرمؐ کے فلسفۂ تعلیم و تربیت سے پورا ہوتا ہے۔

رسولِ اسلامؐ کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات شروع ہی میں کہہ دی جائے کہ اسلام

جس علم کا مدعی و مبلغ ہے وہ نہ محض حضوری عرفانی علم ہے، نہ محض داخلی تجربے کا اظہار ہے۔ "خود گرفتار" ہو، نہ محض عقلی استدلال ہے اور نہ محض تجزیۂ و تحلیل بلکہ ان سب کا جامع ہے اور مذکورۂ بالا ہر سطح و طریقۂ علم کو مناسب اہمیت دیتا ہے کہ اسی طرح انسانی شخصیت کی صحیح معنی میں نشوونما ممکن ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نظامِ علم و تعلم نے اخلاقی تربیت اور معاشرتی شعور کی تہذیب کو بھی علم کے جامع تر تصور میں بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس طرح علم، پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقطۂ نظر سے ایک سطح پر ایمان کا جزو ہے، دوسری سطح پر معلومات اور ان سے عملی فوائد حاصل کرنے کا نام ہے۔ علم کے اسی وسیع تصور کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں میں اسلام نے جاہلیت کے زائیدہ و پروردہ افراد میں علم کا وہ ذوق پیدا کیا کہ انھوں نے استدلالی تجربی، اشراقی، مشائی نقاطِ نظر سے صرف الٰہیات ہی میں نہیں بلکہ فلسفہ کی دوسری شاخوں میں بھی نمایاں کارنامے سرانجام دیے، اطلاقی سائنسوں جیسے طب اور انجینئرنگ میں بھی زبردست اکتشافات کیے اور بعض عمرانی علوم مثلاً فلسفۂ عمران و فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالنے کا بھی معجزنما کام کیا۔ علم کی مختلف سطحوں پر خود کو یوں نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے اخلاقی و معاشرتی تربیت کے ثمرات سے بھی اپنی ملت اور سارے عالمِ انسانیت کو مفتخر و مشرف کیا۔ رسولِ مقبولؐ کا اعجاز قرآن کو مانا جاتا ہے لیکن قرآن کے توسط سے اور خود سیرتِ رسولؐ و آلِ رسولؐ کے بابرکت علم پرور و علم فشاں وجود سے علم و تعلم کی جو شعاعیں پھیلیں، ان کی لافانی تابناکی رحمتہ عالمیان کا دوسرا بڑا اعجاز ہے۔

اسلام میں عقل کا مقام

علم و عقل ایک دوسرے کا لازمہ ہیں۔ "علم عقل سے ہے اور عقل علم سے نمو پاتی ہے۔" اصولِ کافی "جو احادیثِ رسولؐ و ائمۂ معصومینؑ کا ایک اہم مجموعہ ہے، کتاب "العقل والجہل سے آغاز ہوتا ہے۔ اس کی دوسری کتاب" کتاب فضلِ علم" ہے۔ اسلام میں بالعموم اور فرقۂ امامیہ میں بالخصوص عقل و علم کی اہمیت کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ ان ابواب کو دوسرے ابواب مثلاً توحید، حجت رسالت وغیرہ پر ترتیب میں فوقیت دی گئی ہے۔ عقل و علم کی اصولِ دین کے مقابل اولیت اس لحاظ سے غیر منطقی نہیں کہ بغیرِ عقل و علم نہ اصولِ دین کو سمجھا جاسکتا ہے، نہ فروعِ دین کو، نہ اخلاق کو

اور نہ معاملاتِ معاشرت کو۔ رسولِ اکرمؐ نے خود عقل کو اتنی اہمیت دی ہے کہ فرمایا "جب تم تک کسی شخص کی خوبیاں پہنچیں تو اس کی خوبیٔ عقل پر نگاہ کرو کیونکہ پاداشِ عمل کی میزان عقل ہے"۔

یہ حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام کی سند سے نقل ہوئی ہے[۱]۔ اس کی مزید تشریح صادقِ آلِ محمدؑ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو سلیمان دیلمی سے مروی ہے۔ عرض کیا کہ فلاں شخص عبادت و دیانت و فضیلت میں ایسا ہے اور ویسا ہے۔ دریافت فرمایا "اس کی عقل کیسی ہے؟" کہا "میں نہیں جانتا"۔ ارشاد ہوا "پاداش (ثواب و جزا) عقل کے اندازے سے ہوتی ہے[۲]"۔

اصبغ بن نباتہ نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ:

جبرئیل نے آدمؑ پر نزول کیا اور کہا "اے آدم مجھے اس پر مامور کیا گیا ہے کہ تو تین چیزوں میں سے جو ایک چیز مانگے، وہ تجھے دوں، دو کو چھوڑ کر ایک کو منتخب کرلے۔ آدم نے پوچھا کہ وہ تین چیزیں کیا ہیں؟ جواب ملا، عقل، حیا اور دین۔ آدم نے عقل کو چن لیا۔ جبرئیل نے حیا و دین سے کہا کہ آدم نے عقل کو رکھ لیا اور تم دونوں کو واپس کردیا۔ وہ دونوں گویا ہوئے کہ "اے جبرئیل ہمیں حکم ہے کہ جہاں عقل ہو، وہیں ہم رہیں"۔ جبرئیل نے کہا کہ "اب تم جانو" اور عالمِ بالا کو رخصت ہوئے[۳]۔

اس حدیثِ امیر المومنینؑ کی استعاراتی معنویت یہ ہے کہ جہاں عقل ہو وہاں حیا و دین کا ہونا لازم ہے کیونکہ عقل کے بغیر ان کا ہونا ممکن نہیں۔ اسی لیے امام رضاؑ نے فرمایا ہے کہ "ہر انسان کی دوست اسکی عقل ہے اور جہل اس کا دشمن[۴]"۔

وارثانِ علمِ نبوی سے عقل کی دین و حیا پر افضلیت کا بیان سننے کے بعد ایک بار پھر حکمِ وحی کے بغیر کلام نہ کرنے والے پیامبرِ امیؐ سے رجوع کیجئے۔ فرمایا:

خدا نے اپنے بندوں کو عقل سے بہتر کوئی شے نہیں بخشی، اس لیے کہ عاقل کا سونا جاہل کی شب بیداری سے بہتر ہے۔ عاقل کا منزل پر قیام جاہل کے سفر (برائے حج و جہاد) سے افضل ہے۔ خدا نے پیغمبر اور رسول مبعوث نہیں کیے مگر اس لیے کہ وہ عقل کی تکمیل کریں اور ان کی عقل تمام امت کی عقلوں سے برتر ہوتی ہے۔ (۔۔۔ ولا بعث اللّٰہ نبیاً ولا رسولاً حتّٰی یستکمل العقلَ ویکون عقلہ افضل من جمیع عقول

امتہ....) اور جو کچھ پیغمبر کو منظورِ خاطر ہو مجتہدین کے اجتہاد سے بالاتر ہے۔ جب تک کہ بندہ واجبات کو اپنی عقل سے نہیں پہچانتا ان کو انجام نہیں دیتا۔ تمام عابدین اپنی عبادتوں کی فضیلت میں عاقل کے پاؤں دکی گرد) تک نہیں پہنچتے....؎

اس ایک حدیث سے مندرجۂ ذیل امور واضح ہوتے ہیں؛

۱۔ عبادت کے اجر کی میزان عقل ہے۔

۲۔ پیغمبر کو امت پر فضیلت عقل کی بنا پر حاصل ہے۔

۳۔ بعثتِ انبیا کا مقصد عقل کی تکمیل ہے، اسی لیے ان کی عقل کمال یافتہ ہوتی ہے۔

ایک مشہور حدیثِ رسولؐ ہے: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ـــ میری بعثت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ ان دو حدیثوں میں تضاد و تباینِ معنوی نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کی تکمیل اور اخلاق کی تکمیل مترادف ہیں۔ اس لیے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے تو منطق کے مطابق بالکل درست ہو گا کہ عقل و اخلاق ایک ہیں۔ یا بہ الفاظِ دیگر عقل کے بغیر اخلاق کا امکان نہیں۔ تصوف کی اخلاقیات کا اصول ہے "تخلقوا باخلاق اللّٰہ" اخلاقِ خداوندی میں بھی عقل کی کارفرمائی ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ میں اہم ترین صفات میں سے ہے۔ ان تمام احادیث کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ رسولِ اکرمؐ کے نزدیک عقل، جو جہل کی ضد ہے، علم ہی کا مبداء نہیں بلکہ اخلاق و دین کا بھی مصدر ہے۔ عقل کی فضیلت پر اسلام اور رسولِ اسلامؐ کے اسی اصرار نے اسلامی فلسفۂ علم میں وہ گہرائی پیدا کی جو دوسرے فلسفوں کو حاصل نہ ہو سکی، اور اسی بنا پر پیغمبرِ عقل و اخلاق نے اپنے فلسفۂ تعلیم کو صرف معلومات کی فراہمی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اخلاق و دین کا بھی احصا کر لیا۔ صاحبِؐ خلقِ عظیم صاحبِ عقلِ کامل بھی ہے۔

صاحبِ اصولِ کافی، ابی جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق الکلینی الرازی (المتوفی ۳۲۸/۳۲۹ھ) نے لکھا ہے کہ ان احادیث سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عقل، حیا (اخلاق) اور دین لازم و ملزوم ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

امام جعفر صادقؑ ہی سے یہ حدیث بھی ہے کہ:

پوچھا گیا عقل کیا ہے؟ فرمایا وہ چیز جس کے وسیلے سے خدا کی پرستش کی جاتی ہے اور جنت حاصل

؎ توحید۔ ۱۳۰

آتی ہے ۔۔۔ " جو عاقل ہے وہ دیندار ہے" [۳]

کسی اور مذہب نے عقل و دین کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم نہیں جانا تھا۔ اسلام واحد مذہب ہے جو عقل کو دین و اخلاق دونوں کا مصدر مانتا ہے۔ عقل پر اتنا زور ہمیں تاریخ مذاہب عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ عقل کی فضیلت کے ساتھ ہی اس کی ضد جہل کی برائیوں پر بھی زور ہے۔ احادیث بہت ہیں ہشام بن حکم سے روایت کی ہوئی حدیث حضرت موسیٰ کاظم ابن جعفر صادق کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"اے ہشام خدائے تبارک و تعالیٰ نے صاحب عقل و فہم کو اپنی کتاب میں مژدہ دیا ہے کہ وہ بندے جو ہر بات کو سنتے اور نیکو ترکی پیروی کرتے ہیں، وہی ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے۔ اور وہی صاحبانِ عقل ہیں۔ اے ہشام! انہی لوگوں کو خدا نے ان کی عقل کے واسطے سے تمام لوگوں کے لیے حجت قرار دیا ہے اور پیغمبروں کی قدرت بیان کے وسیلے سے مدد کی اور اپنی ربوبیت کی دلیلوں سے انہیں مستحکم (مسلح) کیا۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (سورۃ البقرہ: ۱۶۴)

تمہارا معبود خدائے یگانہ ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں، وہ رحمان و رحیم ہے۔ بےشک آسمانوں اور زمینوں کی آفرینش میں اور اختلاف لیل و نہار میں، اور کشتیوں میں کہ سمندر میں نفع رسانیِ مردم کے لیے رواں ہیں۔ اور پانی میں کہ اسے خدا نے آسمان سے زمین پر برسایا کہ زمین مرنے کے بعد پھر سے زندہ ہو اٹھے، اور اس میں ہر قسم کے جانور پیدا کیے جو حرکت کرتے ہیں اور ہواؤں میں کہ چلتی ہیں، اور بادل میں کہ درمیانِ زمین و آسمان (خدا کے حکم سے) ٹھہرے ہوئے ہیں، بہت نشانیاں (آیات) ہیں ہماری ربوبیت کی ان کے لیے جو تعقل کرتے ہیں۔"

اس ایک حدیث میں وارثِ نطقِ وحی نے کئی جگہ قرآن کا حوالہ دیا ہے جو اس پر مصر ہے کہ خدا کی آیات پر غور و فکر عقل کا منصب ہے۔ اس حدیث میں انسان و حیوان کا مابہ الامتیاز وصف عقل

ہی کو مانا گیا ہے اور ان افرادِ انسان کی تنقید کی گئی ہے جو عقل کا گمراہانہ مصرف کرتے ہیں۔ ایک جگہ یہ بھی ملتا ہے کہ خدا نے انسانوں کے لیے دو حجّتیں فراہم کی ہیں، ایک آشکار، ایک پنہاں، آشکار حجّت انبیا ہیں، اور حجّتِ مخفی عقل ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث (اصول کافی: ۱۴) کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں عقل اور اس کے تلازمات و اوصاف کے ساتھ جہل کے تلازمات و معایب کا تفصیلی ذکر ہے سماء بن مہران نے روایت کی ہے کہ امامؑ نے ایک بزم میں فرمایا:

"عقل اور اس کے لشکر، اور جہل اور اس کے لشکر کو پہچانو!

عرض کیا، آپ پر قربان، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو آپ نے سمجھایا ہے، فرمایا:

خدائے عزّوجل نے عقل کو اپنے نور سے عرش کی سیدھی جانب خلق کیا، اور وہ تمام روحانی مخلوقات میں اوّل ہے، پھر اس سے کہا پیچھے جا، وہ چلی گئی۔ دوبارہ حکم ہوا، سامنے آ، سامنے آئی تو ارشاد باری ہوا کہ تجھے میں نے عظمت عطا کر کے پیدا کیا اور تمام مخلوقات پر شرف بخشا۔ بعد اس کے جہل کو ظلمت سے اور دریائے شور و تلخ سے پیدا کیا، اور اس سے فرمایا پیچھے ہٹ، وہ پیچھے ہٹ گیا۔ پھر حکم دیا، سامنے آ، وہ سامنے نہیں آیا۔ فرمایا سرکشی کرتا ہے؟ اور اپنی رحمت سے اسے دور کیا۔ بعد اس کے عقل کے لیے ۷۵ سپاہیوں کا لشکر فراہم کیا، جب جہل نے عقل پر اللہ جل شانہٗ کا کرم دیکھا تو دل سے اس کا دشمن ہو گیا اور پروردگار سے عرض کیا کہ یہ بھی مخلوق میں سے ہے میری ہی طرح۔ تو نے اسے پیدا کیا۔ گرامی قدر بنایا، اسے قوت عطا کی۔ میں اس کی ضد ہوں مگر اس پر مجھے قدرت حاصل نہیں۔ اس لیے جو کچھ تو نے اسے لشکر کی صورت میں دیا ہے، مجھے بھی عنایت فرما۔ خدا نے فرمایا 'اچھا عطا کرتا ہوں۔ مگر اس کے بعد بھی تو نے نافرمانی کی تو تجھے اور تیرے لشکر کو اپنی رحمت کے قریب نہ آنے دوں گا، (جہل نے) عرض کیا، میں راضی ہوا پس ۷۵ کا لشکر اسے بھی عطا ہوا۔ عقل کے ۷۵ لشکری (اور جہل کے ۷۵ لشکری) اس طور پر ہیں:

۱۔ خیر کہ وزیر ہے عقل کا۔ اور اس کی ضد شر جو وزیر ہے جہل کا۔ ۲۔ ایمان (عقل

کے ساتھ ہے)، اور اس کی ضد کفر (جہل کے ساتھ)۔ ۳۔ تصدیق، اس کی ضد ہے انکار
۴۔ رجا، اس کی ضد ہے قنوط (مایوسی)۔ ۵۔ عدل، اس کی ضد ہے ظلم۔ ۶۔ رضا (سپردگی)
اس کی ضد ہے ناراضی۔ ۷۔ شکر، اس کی ضد ہے کفران۔ ۸۔ طمع (رحمتِ حق کی)۔ ضد ہے
اس کی یاس (رحمت سے)، ۹۔ توکل، ضد ہے اس کی حرص (دنیا کی)۔ ۱۰۔ رافت (نرم دلی)
ضد ہے اس کی قساوت (سخت دلی)۔ ۱۱۔ مہربانی، ضد ہے اس کی غضب (کینہ)۔ ۱۲۔ علم، ضد
ہے اس کی جہل۔ ۱۳۔ فہم، ضد ہے اس کی حماقت۔ ۱۴۔ عفّت (پاکدامنی)، ضد ہے اس کی
عفت باختگی (بے شرمی)۔ ۱۵۔ زہد، ضد ہے اس کی رغبت (دنیا کی)۔ ۱۶۔ خوش رفتاری
ضد ہے اس کی بدروی۔ ۱۷۔ لحاظ (ادب)، ضد ہے اس کی گستاخی (بے ادبی)، ۱۸۔ انکسار،
ضد ہے اس کی غرور ۱۹۔ ٹھیراؤ، ضد ہے اس کی جلد بازی۔ ۲۰۔ حلم، ضد ہے اس کی سفاہت
(کم ظرفی)۔ ۲۱۔ خاموشی، ضد ہے اس کی زبان درازی۔ ۲۲۔ فرماں برداری، ضد ہے اسکی
سرکشی۔ ۲۳۔ تسلیم (اقرارِ حق)، ضد ہے اس کی تشکیک ۲۴۔ صبر، ضد ہے اس کی بے تابی
۲۵۔ عفو، ضد ہے اس کی انتقام جوئی۔ ۲۶۔ بے نیازی (فقر)، ضد ہے اس کی نیازمندی
۲۷۔ یادداشت، ضد ہے اس کی سہو۔ ۲۸۔ نگہداری، ضد ہے اس کی نسیان ۲۹،
ہمدردی، ضد ہے اس کی بے تعلقی۔ ۳۰۔ قناعت، ضد ہے اس کی ہوَس کا۔ ۳۱۔ بھائی چارگی
یا تعاون، ضد ہے اس کی علیحدگی پسندی۔ ۳۲۔ موّدت (دوستی)، ضد ہے اس کی عداوت
۳۳۔ وفا، ضد ہے اس کی پیماں شکنی ۳۴۔ اطاعت، ضد ہے اس کی معصیت۔ ۳۵۔ خاکساری،
ضد ہے اس کی سرتابی۔ ۳۶۔ سلامتی، ضد ہے اس کی ابتلا۔ ۳۷۔ حُب (محبّت)، ضد ہے
اس کی بغض۔ ۳۸۔ صدق، ضد ہے اس کی کذب۔ ۳۹۔ حق، ضد ہے اس کی باطل۔ ۴۰۔ امانت
ضد ہے اس کی خیانت۔ ۴۱۔ اخلاص (بے لوثی) ضد ہے اس کی غرض (لوث)۔ ۴۲۔ سمجھداری،
ضد ہے اس کی ناسمجھی [زیرکی، ضد ہے اس کی غباوت (کودنی)، معرفت، ضد ہے اس کی
ناشناسائی]۔ ۴۳۔ رازداری، ضد ہے اس کی افشائے راز۔ ۴۴۔ راست بازی، ضد ہے
اس کی دغابازی۔ ۴۵۔ پردہ پوشی، ضد ہے اس کی پردہ دری۔ ۴۶۔ نماز گذاری، ضد ہے اس کی
نماز دشمنی۔ ۴۷۔ روزہ رکھنا، ضد ہے اس کی روزہ توڑنا۔ ۴۸۔ جہاد، ضد ہے اس کی فرار

۴۹۔ حج گذاری، ضد ہے اس کی حج شکنی۔ ۵۰۔ غور سے سننا، ضد ہے اس کی نکتہ چینی یا حرف
رکھنا۔ ۵۱۔ اطاعتِ والدین، ضد ہے اس کی نافرمانیِ والدین۔ ۵۲۔ سچائی (حقیقت نمائی)
ضد ہے اس کی ریاکاری (حقیقت پوشی) ۵۳۔ معروف (نیکی)، ضد ہے اس کی منکر (بدی)
۵۴۔ خود پوشی، ضد ہے اس کی خودنمائشی۔ ۵۵۔ تقیہ (مصلحت بینی)، ضد ہے اس کی تشہیر و
اشاعت (غیر ضروری)۔ ۵۶۔ انصاف، ضد ہے اس کی جانب داری۔ ۵۷۔ آرائش (برائے
شوہر)، ضد ہے اس کی زنا (آبرو باختگی)۔ ۵۸۔ صفائی ضد ہے اس کی گندگی۔ ۵۹۔ حیا،
ضد ہے اس کی بے حیائی ۶۰۔ میانہ روی، ضد ہے اس کی انتہاپسندی یا حد سے تجاوز۔ ۶۱۔ راحت
و آرام، ضد ہے اس کی ناراحتی و تعب۔ ۶۲۔ سہولت (آسانی)، ضد ہے اس کی صعوبت (سختی)
۶۳۔ برکت، ضد ہے اس کی بے برکتی [عافیت، ضد ہے اس کی بلا]۔ ۶۴۔ اعتدال، ضد ہے اس کی
زیادہ طلبی۔ ۶۵۔ حکمت (حق دوستی)، ضد ہے اس کی ہوا و ہوس۔ ۶۶۔ وقار (متانت) ضد ہے
اس کی خفت یا اوچھا پن۔ ۶۷۔ سعادت، ضد ہے اس کی شقاوت۔ ۶۸۔ توبہ، ضد ہے اس کی
اصرارِ گناہ۔ ۶۹۔ استغفار، ضد ہے اس کی نامناسب و بے جا امید ۷۰۔ دقت پسندی،
ضد ہے اس کی سہل پندی۔ ۷۱۔ دعا، ضد ہے اس کی استنکاف (دعا سے بے پرواہی)
۷۲۔ نشاط، ضد ہے اس کی کسالت۔ ۷۳۔ فرحت، ضد ہے اس کی حزن (رنج)، ۷۴۔ الفت،
ضد ہے اس کی فرقت (دوری)۔ ۷۵۔ سخاوت، ضد ہے اس کی بخل۔

[قوسین میں لکھے ہوئے تین فضائل اور ان کے اضداد کے جوڑے دراصل اپنے سے ماقبل
نفیلت اور اس کی ضد ہی کے شعوب ہیں][۱]

اس حدیث میں عقل کو نہ صرف علم کا مبدا مانا گیا ہے بلکہ سارے فضائلِ اخلاقی اور معاشرت کا مکمل خاکہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح عقل اخلاق و معاشرت ہی نہیں سیاست و حکومت کی بھی اساس بن جاتی ہے۔ افلاطون نے فلسفی یعنی محبِ دانش کو ہی سزاوارِ حکومت قرار دیا تھا، سمجھا جاتا ہے کہ اسی کی تقلید میں مسلمان فلاسفہ جیسے الفارابی نے حکومت کا حق فلسفی ہی کو دیا۔ لیکن الفارابی کی "المدینۃ الفاضلہ" کا حکمران وحی کا ہدایت یافتہ عاقل دانشور ہے اور یہ تصور خود رسولِ اکرمؐ کے تصورِ عقل سے ماخوذ ہے۔ افلاطون کے خیالات نے اس کی تائید کی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ افلاطون کے

یہاں عقل صرف ذریعہ و مبداءِ علم ہے۔ رسولِ اسلام کی تعلیم میں عقل مصدرِ ہمہ کمالات اور قدر الاقدار ہے۔ عقل نور ہے جس سے تاریکی چھٹتی ہے اور ہر شے منور ہو جاتی ہے۔ اوّل ما خلق اللہ نوری کہنے والا ہی عقلِ اوّل ہے۔ فلاسفہ و صوفیا دونوں نے خداوند تعالیٰ کے اشراقِ اوّل کو عقلِ اوّل کہا ہے۔ اسی لیے محولہ بالا احادیث میں عقل کو روحانی موجودات میں سب سے اوّل مانا گیا ہے۔ یہ عقلِ اوّل فلکِ اوّل کی خالق ہے، اسی کے توسط سے روحِ اوّل (افلاک) پیدا ہوئی اور پھر ایک سلسلۂ تنزلات کے مطابق تمام عوالم و مخلوقات ــ وحدت الوجود (ابن عربی) کی اصطلاح میں عقلِ اوّل حقیقتِ محمدیہ ہے جو حق و خلق کے مابین واسطہ ہے۔ تخلیق، عرفان، ہدایت اور نجات کا وسیلہ تنہا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت ہے جو ذریعہ ہے تکمیلِ عقولِ انسانی کا اور اس تکمیل کے وسیلے سے تکمیلِ مکارمِ اخلاق کا باعث ہے۔ عقل کو صرف رسالت و ہدایت ہی کا نہیں، بلکہ تخلیق کا بھی منصب اس نظامِ حیات و کائنات نے عطا کیا جس کے حامل و شارح پیغمبرِ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

عقل کے بارے میں چند اور احادیث پیش کرنے سے پہلے یہ دیکھتے چلیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب میں عقل کی کیا اہمیت ہے۔ قرآنِ مجید میں ۴۸ آیات میں عقل اور اس سے مشتق یا متعلق الفاظ آئے ہیں۔ عقلوہ ـ ۱، تعقلون ـ ۲۴، نعقل ـ ۱، یعقلون ـ ۲۲ مقامات۔ پر تعقل پر اتنا اصرار کسی اور صحیفۂ آسمانی میں نہیں ملتا۔ عام مذاہب کے لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ عقل سے ہتھیار ڈال کر تسلیم خم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایمان کی اساس بلاچون و چرا احکامِ آسمانی کو تسلیم کرنے پر ہے۔ مگر قرآن حکیم تعقل کی دعوت دیتا ہے اور آیاتِ خدا کے مشاہدے اور اس مشاہدے سے منطقی استخراج و استقرا کا راستہ دکھاتا ہے۔ قرآن کو منطق سے کوئی خطرہ ہے نہ سائنسی طرزِ تحقیق سے بلکہ اقبال کے لفظوں میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ اسلام نے استقرائی منطق کے اصول دریافت و منضبط ہونے سے کئی صدیوں قبل اُن کی بنا ڈال دی تھی۔[۱۳] اسی لیے اسلام میں قرنِ اوّل ہی سے عقلیت کو فروغ حاصل ہو گیا تھا۔ جبریہ کے مقابلے میں قدریہ کی بحثیں، اور ان کے بعد متکلمین میں معتزلہ کا اصرار کہ قانونِ قدرت بھی عقل پر مبنی ہے۔ اخلاق کے اصول بھی عقل سے ماخوذ

ہیں، عدل بھی عقل کا تقاضا ہے، معیارِ خیر و شر اور میزانِ جزا و سزا بھی عقل ہے، اسلام اور رسولِ اسلام و ائمہ برگزیدگانِ اسلام ہی کا فیضان ہے۔

[عقلیت کی اصطلاح دو معنوں میں رائج ہے۔ ایک تو افلاطونی عقلیت (RATIONALISM) ہے جس کے مطابق عقل تمام تصورات کی ہمیشہ سے حامل ہوتی ہے۔ دوسرے عقلیت بہ معنی عام یعنی عقل کو نہ صرف تصورات کی صداقت و کذب کا، بلکہ اعمال کے صواب و خطا کا بھی معیار سمجھ کر اس کی روشنی میں عمل کرنا چاہیے، اسلام میں اگرچہ افلاطونی عقلیت کا بھی کچھ اثر ابتدا میں نظر آتا ہے، مگر دراصل اسلام نے جس عقلیت کو فروغ دیا وہ عام معنی میں عقل کی برتری و ہدایت تسلیم کرنے کا رجحان ہے۔ جس نے بالآخر ملا صدرا اور سبزواری کے فلسفے میں مابعد الطبیعاتی عقلیت (افلاطونیت) کو رد کر کے حقیقیت (REALISM) کے فلسفے کو اپنایا۔ اس موضوع پر عہدِ حاضر میں علامہ سید محمد حسین طباطبائی نے ایران میں اصولِ فلسفہ و روشِ ریالیسم لکھ کر اسلامی نقطۂ نظر کی بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے۔

اوپر کا یہ پیراگراف محض ایک غلط فہمی کے ازالے کے لیے لکھا گیا ہے تاکہ عقلیت کی اصطلاح سے فلسفے کے کسی طالب علم کو غلط فہمی نہ ہو۔ افلاطونی عقلیت جس تصوریت (IDEALISM) کی طرف لے جاتی ہے وہ اسلام کے حقیقت پسندانہ (REALISTIC) نظریۂ کائنات و اشیائے مادی کے مغایر ہے]

"عقلِ اوّل" پیغمبرِ دینِ عقل سے امام صادقؑ نے نقل کیا ہے کہ فرمایا "اے علی! کوئی مفلسی بے عقلی سے سخت تر اور کوئی دولت عقل سے مفید تر نہیں ہے"[13]۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ "جب کسی شخص کو نماز و روزے کا پابند دیکھو، اس پر فخر نہ کرو جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ اس کی عقل کتنی ہے"[14]۔ اسحاق بن عمار نے امام صادقؑ سے ایک ہمسائے کی عبادات اور نیکیوں کی تفصیل بیان کی۔ آپ نے پوچھا "عقل کا کیا حال ہے؟" کہا "درست نہیں"، فرمایا، "اسی لیے اس کے اعمال بلندی تک نہیں پہونچتے"[15]۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا کہ "اگر کسی شخص میں کوئی صفت اعلیٰ درجے کی دیکھتا ہوں، خوش ہو جاتا ہوں، اور اس کے دوسری صفات سے متصف نہ ہونے کی فکر نہیں کرتا۔ لیکن کسی شخص کے عقل و دین سے

عاری ہونے پر چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ دین سے جدائی امنیت سے جدائی ہے .... اور عقل کا فقدان زندگی کا فقدان ہے اس لیے کہ اس پر موت کا قیاس کیا جا سکتا ہے[۱۴]

فضیلتِ علم اور لوازمِ تعلیم

علم عقل کا روشن ترین ثمرہ ہے کہ یہ ایسا نور ہے جو ہر شے کو خواہ عالِم کی ذات ہو یا اشیائے معلومہ منور کر دیتا ہے

قرآن حکیم میں علم کا لفظ ۱۴۰ مقامات پر آیا ہے، العلیم ۱۴۰ مقامات پر، أعلَمُ ۴۹ مقامات پر، علیماً ۲۲ مقامات پر، عالم ۱۳ مقامات پر، علماً ۱۳ مقامات پر، اعلموا ۲۷ مقامات پر، معلوم و معلومات ۱۳ مقامات پر، یعلمون ۸۵ مقامات پر، یعلمُ ۹۳ مقامات پر، تعلمون ۵۶ مقامات پر۔ علم سے متعلق الفاظ جن آیات میں آئے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۷۰۴ ہے[۱۵]۔ علم کی بنیاد قلم اور کتاب ہے۔ 'قلم' کا لفظ ۲ جگہ آیا ہے۔ پہلی بار سورۂ علق میں: اقرأ وربك الاكرم الذى علم بالقلم (سورۂ ۹۶ آیہ ۴)۔ دوسری جگہ نٓ والقلم وما یسطرون ٥ ما انت بنعمة ربك بمجنون ٥ (سورۃ القلم ۱، ۲)

نزولِ وحی کا آغاز ہی قلم کے ذکر سے ہوتا ہے اور خدا اپنے کو قلم سے سکھانے والا معلم قرار دیتا ہے۔ پوری کتابِ مبین اسی 'علم بالقلم' کی معجزہ کاری ہے۔ علم کا دوسرا لازمہ کتاب ہے۔ قرآن مجید میں 'الکتاب' کا لفظ ۲۳۰ آیات میں ملتا ہے، جن میں سے ۸۱ آیات وہ ہیں جن میں کتاب کا لفظ خود قرآن کے لیے آیا ہے[۱۶]۔ کَتَبَ، کتابھا، کتابھم، کتابی، کُتُبُ، کتبه اور کتاب یا کتابت سے متعلق الفاظ کی حامل آیات کی کل تعداد ۳۱۹ ہے[۱۷]۔

قرآن کے دوسرے سورۃ البقرہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

الٓمٓ ٥ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ، آیت ۲)

الٓمٓ۔ یہ وہی کتاب ہے، بلا شک و شبہ (جو) ہدایت کرتی ہے متقین کی۔

کتاب، جو علم کا استعارہ ہے، ان ہی کی ہادی ہے جو تقویٰ کی شرط پر پورے اترتے ہیں۔ قرآن کتاب ہے۔ لیکن یہ کتاب علم کے لیے اخلاقِ حسنہ کو شرط قرار دیتی ہے۔ اس طرح آغاز ہی سے کتابِ خدا نے علم و تقویٰ کو لازم و ملزوم مانا ہے۔ ان کے لیے یہ ہدایت نہیں جو انکار کرتے ہیں۔ ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور ان کی

آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے .... " (البقرہ ، آیت ۷)، آنکھیں اور کان حصولِ موادِ علم کے وسائل ہیں۔
موادِ علم کائنات کے سارے مظاہر اور تمام اشیا ہیں جو آنکھوں کے لیے کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں اور کانوں کے لیے لامتناہی سلسلۂ تدریس و موعظت دل ، عرفان و تصوف میں علم کا مخزن ہے۔ حقیقتِ معلومہ سے اگر تعلق محض دماغ کی سطح پر ہو تو اس علم کو صوفیا نے خبر کہا ہے ، جب علم دل پر ثبت ہو جائے تو پھر اعمال و افکار ہمہ وقت ہمہ تن علم کے سانچے میں ڈھلے رہتے ہیں ۔ اسی کو نظر کہا جاتا ہے۔ اس نظر کے بغیر ، جو ابراہیمؑ کا جذبۂ قربانی ہے ، موسیٰؑ کا عصا ہے اور عیسیٰ کی مسیحائی ہے ، علم معجزے سے عاری رہتا ہے ۔ قرآن اور احادیث میں علم کے ساتھ عمل پر بھی زور ہے۔ عالمِ بے عمل کے گناہ اور بے عملی کی پاداش جاہل کے گناہ و سزا یابی سے کہیں زیادہ ہے ۔ علم کا تقاضا ہے عمل ، اور عمل کے معنی ہیں خود کو علم کے قانون کا پابند رکھنا ۔ یہاں علم محض معلومات کا نام نہیں جمعِ معلومات سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہے ۔

تعلیم کی ابتدا درسگاہِ حقیقت میں عملِ تخلیق کے ساتھ ہوتی ہے ۔

وعلم آدم الاسماء کلھا .... اور آدمؑ کو تمام اسما تعلیم کر دیے گئے (البقرہ - آیت ۳۱)
اسمائے کل حقیقتِ اشیائے کائنات کا بھی استعارہ ہو سکتا ہے ۔ اصولِ ہدایت کا بھی اور برگزیدگانِ خدا (یعنی رسولؐ اور اہلبیتؑ رسولؐ) کے ناموں کا بھی ۔ تفسیر میں کسی بھی تاویل کو قبول کیا جائے ، ماننا پڑے گا کہ ہر حال میں آدمؑ کو کل کا علم دیا گیا یا کم از کم آدمؑ کو کل اشیا کے علم کے حصول کا ملکۂ عنایت ہوا ۔ یہ علم اور ملکہ ملائک کو نہیں ملا تھا۔

قال انی اعلم ما لا تعلمون .... فرمایا (فرشتوں سے) جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (البقرہ ، آیت ۳۰)
امتحان کی اس منزل میں ملائک کو اپنے علم کی کوتاہ دامنی کا اعتراف کرنا پڑا ۔

قالو سبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم ۔

(فرشتوں نے) عرض کیا ، پاک و پاکیزہ ہے تو ، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہمیں سکھایا ۔ تو ہی بڑا علیم و حکیم ہے ۔ (بقرہ ، آیت ۳۲)
ملائک کو اپنی تسبیح و تقدیس پر ناز تھا ، انھیں آدم میں فساد کا عنصر نظر آیا کہ وہ معیارِ عبادت پر ملائک کے مقابلے میں کم تر اترتا تھا ، خدا نے معیارِ برتری تسبیح و تقدیس کو نہیں مانا ، بلکہ علم کو بزرگی

و حکومت، نیابتِ الٰہی و خلافتِ ارض کی میزان قرار دیا۔ یعنی قرآن حکیم نے اشرفیت کا معیار علم کو مان کر ہی بنی آدم کو اشرف المخلوقات گردانا۔ جس مذہب نے اس کتابِ حکیم سے ہدایت حاصل کی جو علم کو امّ الفضائل مانتی ہے وہ اس وقت تک خلافتِ ارض کے منصب پر مامور رہا جب تک اس کے پیروؤں نے اپنے کو علم میں دوسری تمام قوموں اور امتوں سے برتر ثابت کیا۔ جب اس کا رشتہ علم سے کمزور ہونے لگا تو دنیا کی حکومت بھی اس کے ہاتھ سے نکلنے لگی، اور مبداءِ ہدایت سے بھی اس کا تعلق کمزور ہونے لگا۔ کسی مذہب نے علم کو افضلیت میں عبادت و ریاضت سے برتر نہیں مانا۔ اسلام نے تعلیم و تعلّم کو خود عبادت کا درجہ دیا ہے۔ وہ مدعیانِ اسلام و مبلغین کرام جو سچا مسلمان ہونے کے لیے علم کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، روحِ اسلام اور تعلیمِ رسولِ اسلام سے نابلد ہیں۔ سچا مسلمان وہی ہے جو عقل سے بہرہ ور ہو اور ساری تہذیبوں کے علوم کا وارث ہو۔ اس لیے کہ علم، خواہ کسی خطّے، کسی قوم، کسی زمانے کا ہو، مومن کی میراث ہے۔ حصولِ علم کے لیے سفر بھی عبادت ہے، شب بیداری میں بھی طالب علم کو عابدِ شب زندہ دار پر فوقیت حاصل ہے، اور علم کی اشاعت و تدریس بھی افضل ترین طاعاتِ الٰہی میں سے ہے۔ عرب ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود آج بے وقعت و کمزور اسی لیے ہیں کہ وہ علم سے بے بہرہ ہی نہیں، علم دشمن بھی بن گئے ہیں۔ جہاں عقل پر پابندی ہو وہاں علم پروان نہیں چڑھ سکتا اور جہاں عقل و علم دونوں پر دولت گزراں کی حکمرانی ہو، وہاں کسی قسم کی اجتماعی، ملّی یا انفرادی آزادی پنپ نہیں سکتی۔ علم ہی میں ترقی کا بھی راز مضمر ہے، سیاسی و معاشی غلبے کا بھی، اور علم ہی آزادی ہے۔ علم و عقل پر قدغن لگانے والے رسولِ اسلام کے سچے پیرو نہیں کہلا سکتے۔ ارشادِ رسولؐ ہے:

طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم ألا إن اللّٰه یحب بغاة العلم [۲۰]

طلبِ علم ہر مسلمان کا فریضہ (واجب) ہے، اس لیے کہ خدا طالبانِ علم کو دوست رکھتا ہے۔ اسی قولِ رسولؐ کی تشریح بابُ العلم نے یوں کی: ”اے لوگو! جان لو کہ دین کا کمال طلبِ علم اور اس پر عمل میں ہے۔ تم پر طلبِ علم طلبِ مال سے کہیں زیادہ واجب ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے مال مقسوم ہو چکا ہے، طے شدہ ہے۔ خدائے عادل نے مال کو تم میں تقسیم و متعین کر دیا

اور وہی اسے تم تک پہنچاتا ہے۔ لیکن علم کا خزینہ صرف اُن کے پاس ہے جو اس کے اہل ہیں تمہیں حکم دیا گیا ہے کہ تم اہلِ علم سے علم طلب کرو۔ پس (علم) مانگو۔"[۱۲]

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"تمہیں چاہیے کہ دینِ خدا میں تفقہ کرو (عالِم بنو) اور صحرا پیمائی نہ کرو (آوارہ نہ بھٹکو) کیونکہ جو دینِ خدا میں تفقہ نہیں کرتا، خدا روزِ قیامت اس کی طرف توجہ نہ کرے گا اور اس کے کردار کو پاکیزہ نہ جانے گا۔"[۱۳]

دینِ خدا میں تفقہ کا مطلب محض حصولِ علم نہیں بلکہ انسانوں سے تعلق رکھ کر ان کی رہنمائی کرنا بھی ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے کسی نے کہا کہ ایک شخص امرِ امامت کو جانتا ہے لیکن خانہ نشین ہے اور برادرانِ دین میں کسی سے نہیں ملتا۔ فرمایا، "پھر یہ شخص ان کے دین کو کس طرح سمجھتا ہے؟"

اسی لیے رسولؐ نے علم اور علم میں فرق فرمایا ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت ہے کہ ایک دن رسولِ خدا مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ گھیرے ہوئے ہیں۔ پوچھا، کیا بات ہے؟ کہا گیا کہ یہ شخص علامہ ہے۔ استفسار فرمایا 'یعنی کیا ہے؟ جواب ملا کہ عربوں کے خاندانوں سے، ان کی تاریخ سے اور زمانۂ جاہلیت اور اشعارِ عربی سے آشنا کوئی اور واقف نہیں؛" فرمایا، "یہ وہ علم ہے جس کے نہ جاننے سے نقصان نہیں ہوتا، اور جاننے والے کو فایدہ نہیں پہنچتا۔" اس کے بعد ارشاد ہوا، علم تین طرح کا ہے ۱۔ آیۂ محکمہ ۲۔ فریضۂ عادلہ اور ۳۔ سنتِ قائمہ۔

اصولِ کافی کے مترجم نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ علم تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو ظنی علم جس پر یقین نہ ہو۔ دوسرے معلومات کے معنی میں (لاعلمی کی ضد) تیسرے کسی بھی پہلوئے حقیقت کے قوانین و کلیات سے آگاہی کے مفہوم میں۔ حدیثِ شریف میں علم کا لفظ دوسرے اور تیسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ علم کی ایک اور تقسیم نفع و نقصان کے لحاظ سے کی جاتی ہے لاخیر فی علم لاینفع۔ جو علم نافع نہیں، اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ اس حدیث میں اسی لحاظ علم کی تقسیم کی گئی ہے۔ آیۂ محکمہ کا علم اصولِ عقاید سے متعلق ہے جس کے لیے براہین قرآنِ کریم اور خود کتابِ کائنات میں موجود ہیں۔ فریضۂ عادلہ اخلاقیات کا نام ہے جس کے ذریعے ہم عقل

اور جہل کے لشکریوں کو پہچانتے ہیں۔ اور اسی علم کے مطابق عمل کرنے کے لیے مکلف ہیں۔ سنتِ قائمہ احکامِ شریعت سے بحث کا نام ہے[۲۳]۔

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ دورِ جدید میں عملیت یا تائجیت (PRAGMATISM) کے بانی چارلس سینڈرس پرس (C. S. PEARCE) نے کہا ہے کہ علم اگر ظن و قیاس ہے تو ناقابلِ عمل ہے۔ اس نے تصور اور عقیدے میں امتیاز اسی طرح کیا ہے کہ تصور (IDEA) پر کوئی عمل نہیں کرتا جبکہ عقیدہ قابلِ عمل ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے حدیث نے بھی پہلے قسم کے علم کو بیکار قرار دیا ہے علم کی دوسری تقسیم نفع بخشی یا نفع نابخشی کے لحاظ سے بھی اسلام کے عملیتی (PRAGMATIC) تصورِ علم کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ سمجھنا کہ علم، عقاید اور تصورات کی نفع بخشی کا تصور سب سے پہلے انیسویں صدی کے اواخر میں چند امریکی فلسفیوں، پرس، ولیم جیمس اور جان ڈیوی ہی نے پیش کیا، صحیح نہیں۔ یہ تصور ہمیشہ سے موجود رہا ہے، اس کا محدود اطلاق عملیت نے اس طرح کیا کہ سارے کے سارے علم کو نفع و نقصان کا پابند بنا کر علم کی نقد قیمت یا تجارتی قدر ہی کو سب کچھ جانا۔ اسلام آج کے نقد پر اصرار نہیں کرتا! اسلام میں نفع کا تصور دنیا سازی سے مختلف ہے۔ امام جعفر صادق نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ "علما وارثانِ پیغمبر ہیں"۔ وہیں یہ بھی فرمایا کہ "ائمہ اہلبیت اس علمِ پیغمبری کو اُن سے بچاتے ہیں جو دین کو اپنے نفع کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور قرآن و حدیث کو توڑ موڑ کر اس طرح مسخ کرتے ہیں کہ اسے دنیا سازی، مصلحت اندیشی اور خوشنودیِ حکام کے لیے کار آمد بنا لیں۔[۲۴] یہ لوگ نہیں جانتے کہ اپنی چند روزہ دنیا سنوارنے کے لیے کس قدر گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں۔ اقبال نے ایسے ہی دین فروشوں کے لیے کہا ہے ؎

دین را فروختند و چہ ارزان فروختند

وارثانِ علمِ نبوی نے دین اور علم کو ایسے دین فروشوں کی تاویلات سے بچایا نہ ہوتا تو علم کے ساتھ دین بھی مسلمانوں سے رخصت ہو چکا ہوتا۔

اس جملۂ معترضہ سے قطع نظر اسلام کے عملیتی تصورِ علم کے متعلق ایک بات اور واضح کردوں کہ سود و زیاں سے مراد فوری فائدہ نہیں۔ اسلیے کہ بہت سے علوم ایسے ہیں جن کی تحقیقات کا بظاہر محقق و عالم یا انسانی معاشرے کو فوری فائدہ حاصل نہیں ہوتا جیسے

بنیادی سائینسوں کی نظریاتی تحقیقات۔ لیکن آگے چل کر ان کے اطلاق سے غیر معمولی فائد
بنی نوع انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس طرح کی علمی کاوش کو بے سود نہیں ٹھہرایا۔ اسی طر
مندرجہ بالا حدیث کی بنا پر قیاس کرنا کہ واقعاتِ گذشتہ کا علم لاحاصل ہے، صحیح نہیں۔ رسولؐ ا
تھے زمانۂ جاہلیت کے واقعات کے علم کو غیر مفید بتایا اس لیے کہ وہ قصے کہانیوں پر مشتمل تھ
ورنہ حق تو یہ ہے کہ خود قرآن نے اقوامِ گذشتہ اور شاہان و انبیائے سلف کے تاریخی ا
کو حال و مستقبل کے شعور کے لیے بڑی دقت نظر سے استعمال کیا ہے۔ قرآن نے تاریخ کے
سے مسلمانوں کو جو تاریخی شعور عطا کیا اسی کا ثمرہ ہے کہ مسلمانوں نے مطالعۂ تاریخ و فلسفۂ تا
میں بنیادی اہمیت کے کارنامے چھوڑے ہیں۔ اگر مسلمان تاریخ سے یہ شغف باقی رکھتے
بہت سے اختلافات اور فرقہ واری تعصبات جو بے تحقیق افواہوں پر مبنی ہیں ان میں راہ نہ پا
آج بھی تاریخ کا تحقیقی مطالعہ ہمیں افتراق سے نکال کر صحیح راستے تک پہنچانے میں معاو
ہوسکتا ہے۔ تاریخ بہترین معلموں میں سے ایک ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ پیغمبر اسلامؐ اور قرآن نے دین کو عقل و دانش
کہیں بھی جدا نہیں کیا اور نہ ہی علم کو حق العباد سے الگ مانا ہے۔ امام جعفر صادق ہی س
پوچھا گیا کہ "انسانوں پر خدا کا حق کیا ہے؟ فرمایا" یہ کہ جو وہ جانتے ہیں، کہتے ہیں (دوسر
تک پہنچائیں) اور جو نہیں جانتے اس سے باز رہیں۔"[26] یہاں ایک بات اور خود بخود ع
ہوجاتی ہے وہ یہ کہ علم کے حصول میں اس کا ابلاغ یعنی دوسروں کو مستفید کرنا بھی شا
ہے۔ یعنی علم اور تعلیم لازم و ملزوم ہیں۔ اب تک قرآن، حدیثِ رسولؐ اور احادیثِ م
علمِ نبوت سے جو باتیں معلوم ہوئیں، یہ ہیں:

۱۔ علم کا حصول مسلمانوں پر واجب ہے۔
۲۔ علم وہی مفید ہے، جس پر عمل کیا جاسکے۔
۳۔ علم کا ہونا خود اس کا متقاضی ہے کہ اس سے معاشرے، ملت اور تمام عالمِ انسا
کو نفع حاصل ہو۔

اگر اس روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج افراطِ علم نے افراطِ زر کی طرح

مسائل انسانوں کے لیے پیدا کر دیے ہیں، وہ مسائل موجودہ نقصان رساں شکل اختیار ہی نہ کر سکتے تھے اگر علم کا وہ تصورِ انسانیت کے پیشِ نظر ہوتا جو اسلام و رسولِ اسلام کا مقصود و مدعا تھا، نہ مسلمان دوسری قوموں سے علمی میدان میں پچھڑتے، نہ علم حق ناشناسوں کے ہاتھ میں تباہی کا آلہ اور خود گم شدگی کا راستہ بنتا، اور نہ علم و عمل، عالم و معاشرت، اور علم و اقدار (اخلاقی) کا تعلق ٹوٹتا۔

علم کے سلسلے میں کتابت پر رسولِ اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ اور ارشاد فرمایا: قیدوا العلم بالکتاب، علم کو قلم بند کرلو[۲۷]۔ قرآنِ حکیم میں کتاب اور کُتُب کے سلسلے میں جتنی آیات ہیں، یہ حدیث ان کا خلاصہ ہے۔ اصولِ کافی میں 'کتاب العلم' میں ایک باب تحریر کی فضیلت کے لیے وقف ہے۔ اس حکمِ رسولؐ کی توضیحات شجرِ نورِ علم کے سلسلہ داروں سے سنیئے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "دل کو نوشتے سے اطمینان ہوتا ہے، اپنے نوشتوں کو محفوظ رکھو تاکہ آئندہ ان سے فایدہ اٹھا سکو۔" آپؑ ہی نے مفضل سے فرمایا "لکھو اور اپنے علم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ اور جب وقتِ مرگ آئے تو انھیں اپنے بیٹوں کو بطور میراث سپرد کرو، کیونکہ جب فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے تو بجز کتاب کوئی اور مونس و دمساز نہیں ہوتا۔"[۲۸]

علم کے قلم بند کرنے پر یہ اصرار ایک اور جہت سے ہے، تمام ائمہؑ نے احادیث کے نقل کرنے پر زور دیا ہے، مصلحت یہ ہے کہ رسولؐ اور ان کے وارثانِ علم کی تحقیقات و نتائجِ فکر آئندہ زمانوں کے لیے محفوظ رہ جائیں، تاکہ حق کا چہرہ جھوٹ کی بُنی ہوئی نقابوں میں چھپ نہ جائے۔ امیرالمومنینؑ کا یہ قول قابلِ فکر ہے:

وہ حدیثیں جو لوگوں کے ہاتھ میں ہیں، ان میں حق و باطل، صدق و کذب . . . حقایق اور اوہام باہم آمیز ہیں۔ حتی کہ خود رسولؐ کی زندگی میں بعض مطالب آپ سے ازراہِ دروغ منسوب کیے گئے، جن سے خود آنحضرت واقف تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے ان پر اعتراض کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی کہ جو شخص مجھ سے کوئی غلط بات منسوب کرتا ہے، اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔"[۲۹]

احادیث وضع کر کے رسولؐ سے انھیں جھوٹی نسبت دینے کی وجہ سے احادیث کی روایت پر پابندی

کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ پابندی اصل مرض کا علاج نہ تھی ضرورت اس کی تھی کہ وہ جو رسولؐ سے قریب تھے اور خود رسولِ اسلام کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، احادیث کو محفوظ کریں۔ اسی لیے سیدۃؑ عالمیان اور باب مدینۃ العلم سے لے کر سلسلۃ الذہب ائمۂ اطہار کے ہر فرد نے احادیث کو جمع اور محفوظ کرنے پر زور بھی دیا، اور خود بھی اس کا اہتمام کیا۔ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد کیا کہ:

میری حدیث میرے پدرِ بزرگوار کی حدیث ہے، ان کی حدیث میرے جدِّ امجد کی حدیث ہے اور حدیثِ جدِ امجد حدیثِ حسینؑ ہے اور حدیثِ حسینؑ، حدیثِ حسنؑ ہے، اور حدیثِ حسنؑ حدیثِ امیرالمومنینؑ ہے، اور حدیثِ امیرالمومنینؑ حدیثِ رسولؐ خدا ہے۔ اور حدیثِ رسولؐ خدا ثمرِ سخنِ خداوندی ہے۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ 'ہماری حدیث کو اعراب (حرکات) کے ساتھ لکھو، اسلیے کہ ہمارا خانوادہ فصحا کا خانوادہ ہے۔'' مصلحت ان احکام میں یہی تھی کہ گفتۂ رسولؐ ان کو خاندانِ رسالت کے ارکانِ عظمیٰ سے مروی احادیث کے معیار پر جانچ کر صحیح سیرت و تعلیمات پیغمبرؐ تک رسائی حاصل ہو سکے۔ مدینۂ علم کے ان ابوابِ صادقہ کی پیش بینی کی داد دینی پڑتی ہے۔ آج مستشرقین رسولِ اسلام کی شخصیت اور تعلیمات کو مسخ کرنے کے لیے ان ہی کتبِ احادیث کا سہارا لیتے ہیں جن میں خاندانِ رسالت سے شاذ و نادر ہی احادیث کی روایت ملتی ہے۔ احادیث اس کثرت سے گھڑی گئی ہیں کہ روایت و درایت کے سخت ترین اصولوں پر جانچنے والوں نے بھی اپنے مجموعوں میں ایسی احادیث نقل کر دی ہیں جنھیں مخالفین اسلام اور اس کے رسولؐ کے خلاف حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے ائمۂ اہلبیتؑ سے منقول احادیث کے مجموعوں میں کوئی ایسی حدیث نہ ملے گی جو احکامِ وحی کے خلاف یا احکامِ عقل کے برعکس ہو۔ اسی لیے یہ کہنا جانب داری نہ ہوگا کہ قول و تعلیمِ رسولؐ و عمل و شخصیتِ پیغمبرؐ تک رسائی کے لیے بابِ علم کو نظر انداز کرنا گمراہی کو کھلی دعوت دینا ہے۔

علم کو لکھ کر محفوظ کرنے کا حکم دو مصلحتوں پر مبنی ہے۔ ایک تو یہ کہ علم سینوں میں مقفل

اپنے خزینہ داروں کے ساتھ سپردِ خاک نہ ہو جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سو سال بھی اشاعتِ اسلام کو نہ گذرے تھے کہ عالمِ اسلام کتب خانوں کی دنیا بن گیا اور مسلمانوں میں علم کا ذوق عام ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ احادیث کے قلم بند ہو جانے سے رسولِ اسلام کی تعلیمات آئندہ نسل کے حق کوش و صداقت پسند طالبانِ علم کے لیے محفوظ ہو گئیں۔

علم کے لیے کہا گیا ہے کہ یہی ایسی واحد دولت ہے جو خرچ کرنے اور بانٹنے سے کم ہونے کے بجائے بڑھتی جاتی ہے۔ اس اصول پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے کہ آج سے چودہ سو سال قبل جبکہ عام تعلیم کا کوئی تصور تک نہ تھا، اسلام نے طالبِ علم اور استاد دونوں کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لی یعنی معاشرے کو دونوں کا کفیل قرار دیا۔ آج سے چند سو برس قبل تک علم خاص طبقے کی جائداد تھا، آج تک دنیا کے اکثر حصوں میں عام تعلیم کے حق کی اشاعت کے باوجود حصولِ علم اس قدر گراں ہے کہ عملی طور پر پسماندہ طبقات کے افراد اس نور سے، جو ہوا اور روشنیٔ مہر و ماہ کی طرح عام فیضانِ خداوندی ہے، محروم رہتے ہیں۔ اسلام نے نہ صرف علم کی فضیلت کا احساس عام کیا، بلکہ ابلاغِ علم کے لیے وسائل بھی فراہم کیے۔

علم کے باب میں صدق و کذب کو پرکھنے کے اصول بھی احادیثِ رسول و ائمہ میں مل جاتے ہیں۔ اصولِ کافی نے جو ابواب قائم کیے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے علم کے بارے میں تعلیمِ رسولؐ کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے: بابِ تقلید — یہ مسئلہ کہ علم میں کس کی تقلید جائز ہے۔ بابِ بدعات و رائے و قیاس — رسولؐ نے فرمایا "جس دور میں میری امت میں بدعتوں کا ظہور ہو، یہ عالم کا فرض ہے کہ وہ اپنے علم کو آشکار کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا اس پر خدا کی لعنت ہو۔" امام جعفر صادقؑ کا قول ہے "علم کے معاملے میں قیاس سے کام لینے والے علم کو قیاس سمجھتے ہیں، قیاس حق سے دوری کے علاوہ کچھ نہیں۔" ان کے علاوہ بابِ رجوع بقرآن و سنت ہے۔ بابِ اختلافِ احادیث ہے، اور آخر میں بابِ اخذ ہے۔ جس میں حدیث اور قرآن کو منابعِ اجتہاد مانا ہے۔ فرمودۂ رسولؐ ہے: "ہر امر کے لیے ایک حقیقت موجود ہے، اور ہر امر پر ایک نور دلالت کرتا ہے۔ اسلیے جو کچھ موافقِ قرآن ہے، اخذ کرو، اور جو مخالفِ قرآن ہے، ترک کرو۔" امام جعفر صادقؑ نے حدیث کا معیار یہ مقرر فرمایا کہ جو حدیث قرآن سے موافقت نہیں کرتی، ایک

خوش نما دروغ ہے [۳۵]

ان تمام احادیث کی روشنی میں یہ تصوّر قایم کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ اسلام کے فلسفۂ علم کے عناصرِ خمسہ یہ ہیں: ۱۔ وحی ۲۔ سنّت ۳۔ تعقل ۴۔ استقرائی طریقِ کار ۵۔ جراَتِ فکر

وحیؔ ہدایتِ ربّانی ہے، کشف والہام، علمِ حضوری، وجدان اور مشاہدۂ حق، روحانی تجربے کے مختلف نام ہیں، انہی کی بنا پر اسلام میں تصوّف و عرفان کے سلسلے اور نظریے قایم ہوئے۔ جو دوسرے مذاہب کے فلسفۂ سرّیت (MYSTICISM) کے مماثل ہیں مگر قرآن و سنّت سے ہدایت پانے کی وجہ سے ان سے مختلف و ممتاز بھی ہیں۔ وحی کی زبان کی تفہیم نے علمِ تفسیر کو فروغ دیا۔

سنّتؔ، اسوۂ رسولؐ کے علم اور اس پر عمل کرنے کا نام ہے، اسلام کی تعلیمات میں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام کے تصوّرِ علم پر عامل ہونے کے لیے سنّت کی کما حقہ معرفت لازمی ہے۔ اس لیے کہ رسولِ اکرمؐ نے خود اپنی حیاتِ طیّبہ و سیرتِ مقدسہ سے انسانی حیات و سیرت کا مثالی نمونہ پیش کیا۔ علمِ حدیث کے ذیل میں اصولِ درایت کے ساتھ روایت اور علم الرّجال کو بھی علیٰحدہ علم کی حیثیت حاصل ہوئی۔

تعقّلؔ تفلسف کی اساس ہے۔ مسلمانوں میں حکمت کے نام سے فلسفے کا فروغ قرآن و رسولؐ کی تاکیدِ تعقل ہی کی وجہ سے ہوا۔ اسلام میں فلسفے کی دو شاخیں علم الکلام اور حکمت تعقل کے ثمرات ہیں۔ ایک حد تک نظریاتی مباحث کی سطح پر تصوّف یا عرفان بھی تعقل ہی کا زائیدہ و پروردہ شریک و حلیف بن جاتا ہے۔ مستشرقین فلسفے کے آغاز کا سراغ لگانے کے لیے غیر اسلامی مذاہب اور مکاتیبِ فلسفہ کے اوراقِ پارینہ کی بادیہ پیمائی کرتے ہیں اور سامنے کے حقایق یعنی قرآن و حدیث کو نظر انداز کر جاتے ہیں، جن میں تعقل و تفلسف کے اصول بھی مل سکتے ہیں، اور ان کے استعمال و اطلاق کے قاعدوں کی نشان دہی بھی۔

استقرائی طریقِ کارؔ۔ قرآن نے مشاہدہ اور اختبار (EXPERIMENT) کو حقیقتِ حیات و کاینات کے سمجھنے کے وسایل قرار دیا ہے۔ رسولِ خداؐ نے اپنی زندگی میں عام مسلمانوں کو انھیں اپنانے کی ترغیب دی۔ اسلام کے علمی عروج کے دور تک سائنس فلسفے سے الگ نہیں ہوئی تھی اس لیے تمام سائنسی تحقیقات بھی فلسفے ہی کے ذیل میں آتی تھیں۔ جہاں اسلام نے نقل کے اصول کو درایت سے آشنا کر کے بعض ایسے علما پیدا کیے جو اسناد کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے، وہیں ابن سینا ایسے ارسطاطالیسی فلسفی کو بھی جنم دیا جو فلسفے میں اشراقیت کا اور سائنس (طب) میں

بڑی حد تک مشاہدہ و اختبار کے اصولوں کا عامل و شارح تھا۔ خالص سائنسی مزاج کا معلم مفکر تلاش کرنا ہو تو ابوریحان البیرونی کی مثال سامنے ہے[۲۵]۔ یعنی تعقل نے اسلامی دنیائے علم میں نقل کے ساتھ استدلال اور تجزئی طریقوں کو بھی پروان چڑھایا۔

جرأتِ فکر، عقل کے تقاضوں کے مطابق احکامِ وحی و اسوۂ رسولؐ کی استدلالی و سائنسی طریقوں سے توجیہہ اور تفسیر۔ احکام و مسائلِ شریعت سے لے کر عام زندگی کے روزمرہ مسائل تک فکر و نظر کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ مسلمانوں نے علم اور عمل، تحقیق اور اکتشاف کے میدانوں میں جب تک اجتہادِ فکر سے کام لیا سرخرو رہے، جب بابِ اجتہاد بند کرکے ذہنوں کو محض نقل و روایت کے حصار میں بند کرلیا ذہنی تاریکی کے ساتھ معاشی و سیاسی غلامی کا شکار ہوگئے۔ ہندوستانی مفکر و مصلح سید احمد خان نے اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں صرف فرقۂ اثنا عشری نے کبھی بابِ اجتہاد بند نہیں کیا۔ ان کا یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ ہر دور کو مجتہد العصر والزمان کی ضرورت ہوتی ہے[۲۶]۔

ان سب کو مجموعی طور پر قرآنِ حکیم نے حکمت کا نام دیا ہے۔ کتابِ خدا میں حکمت سے متعلق ۱۱۷ آیات ہیں، جن میں سے ۲۰ میں حکمت کا لفظ آیا ہے۔ ۸۱ میں حکیم کا لفظ، اور ۱۶ میں حکیماً کا[۲۸]۔ احادیث میں علم کو دانش کا بھی نام دیا گیا ہے اور حکمت کی اصطلاح سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ حکمت کے معنی ہیں دانش یعنی غور و فکر سے صداقت کی جستجو۔ یہی علم کا واحد راستہ ہے جس کے شعوب میں تعقل، استقرا، عرفان، کلام سب شامل ہیں۔

رسولِ اسلام کا طریقۂ تربیت

خدانے پیغمبروں کے انتخاب کا حق اپنی ذات سے مخصوص رکھا ہے۔ وہ اپنے رسولوں کو رشد و کمال کی اس انتہا تک لے جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے نمونہ بن سکیں، اسی لیے وہ خطا و گناہ سے مبرا ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے ہدایت یافتہ ہوتے ہیں اولئك الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (سورۂ انعام: آیت ۹۰)، وہ گمراہ نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے منصبِ ہدایت کے لائق ہوتے ہیں (سورۂ زمر: آیت ۳۷)۔ پیغمبریِ حق کی ان شرائط کی تکمیل اپنی انتہائی صورت میں پیغمبر ختمی مرتبت میں نظر آتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ تخلیقِ رسولِ اکرمؐ ہی تربیتِ انسانی کی تکمیل کے لیے ہوئی

نبی ظاہری نبوت سے قبل ہی آپؐ نے اخلاق کا عظیم ترین درجہ حاصل کرلیا تھا وانک لعلیٰ خلق عظیم (سورۂ قلم، آیت ۴) اسی کا نتیجہ ہے کہ منکرین نبوت بھی رسولؐ کی امانت و صداقت کا اقرار کرنے پر مجبور تھے۔ آپ تمام رجس سے پاکیزہ ۔ یہی نہیں آپؐ کے خانوادے کا ہر رکن طہارتِ قلب و کردار کی اس منزل تک پہنچا کہ اس سے آگے تطہیر کا تصور بھی نہیں جا سکتا انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطہیرا (سورۂ احزاب، آیت ۳۳) خلقِ عظیم کی شان یہ تھی کہ قرآن کی زبان نے اعلان کیا کہ تمہاری طرف وہ پیمبر آرہا ہے کہ تمہاری تکلیف خود اس پر گراں ہے وہ تمہاری فلاح کے لیے بے چین ہے، اور مومنوں کے لیے وہ مہربان وشفیق ہے۔ (سورہ توبہ، آیت ۱۲۸) خلقِ عظیم کے لیے خالقِ اخلاق کا یہ بھی ارشاد ہے کہ وہ اپنے مخاطبوں سے نرمی و لطف فرماتے ہیں (سورۂ آل عمران: آیت ۱۵۹)

ارسالِ وحیِ الٰہی کے تین طریقے ہیں: الہام (دل پر نزولِ حق)، گفتگو (پسِ پردہ آواز) آمدِ فرشتہ (سورۂ شوریٰ: آیت ۵۱) قرآنِ مجید اس کا بھی گواہ ہے کہ رسولؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کا نزول ہوتا رہتا تھا (سورہ انفال کی آیات ۵ تا ۸ کی تفسیریں طبری، بغوی، مجمع البیان، ابن کثیر اور خازن کی تفسیروں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے)[۳۹]۔ رسولؐ کا ہر لفظ وحیِ الٰہی ہے (وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ (سورۂ نجم: آیت ۴ - ۳) اسی لیے قرآن کریم کی طرح سنتِ رسولؐ، جو آپؐ کے قول و فعل دونوں پر محیط ہے، ایک ابدی معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ مجلسی نے لکھا ہے کہ قرآن کو دیگر انبیا کے معجزات پر، بحیثیت معجزہ یہ فوقیت حاصل ہے کہ تمام انبیا کے معجزے ان کے ساتھ ختم و بے اثر ہوگئے۔ اور آج ان کا ذکر قصۂ پارینہ ہے لیکن قرآن کتاب کی صورت میں ابد تک انسانوں کی رہ نمائی کا لائحہ عمل پیش کرتا رہے گا۔ اس کا اثر کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

امام رضاؑ سے منقول ہے کہ کسی نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ کیا سبب ہے کہ قرآن کو جتنا زیادہ پڑھو اسی قدر نیا معلوم ہوتا ہے اور بار بار پڑھنے پر بھی کبھی تکرار کا گمان نہیں ہوتا فرمایا کہ خدا نے قرآن کو کسی زمانے سے مخصوص نہیں کیا، اور اس کے معانی کسی خاص گروہ کے لیے معین نہیں کیے بلکہ یہ تمام انسانوں کے لیے تا روزِ قیامت ہدایت ہے۔

اسی لیے اسے کتنی ہی بار پڑھو ہمیشہ تازہ (معانی سے لبریز) پاؤ گے۔[۱۴]

قرآنِ مکتوب کی طرح صاحبِ کتاب کا اسوہ بھی وہ سراجِ منیر ہے جو ہر زمانے، ہر قوم اور ہر طبع کے انسانوں کو ظلمتِ جہل و کفر سے نکال کر نور کے جادے پر لاتا رہے گا۔ قرآن کی تعلیمات کا مبلغ بھی تمام صفاتِ قرآنی سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کا ہر قول وحی کی بازگشت اور ہر فعل قرآن کی تفسیر و تعبیر ہے۔ جب صاحبِ کتاب خود سراپا سوتے جاگتے ہر حال میں مجسّم کتاب بن جائے تب ہی وہ کتاب کی تدریس کے منصب کا اہل ہو سکتا ہے۔ قرآن کا یہ معیارِ معلمی اتنا سخت ہے کہ اس پر خدا کا حبیبِ خاص پورا اتر سکتا ہے، یا پھر وہ جن کی صورت و سیرت، رفتار و گفتار بالکل ویسی ہی ہو جیسی محمد مصطفیٰ کی تھی۔ ان میں اوّل بھی محمدؐ ہو گا، اوسط بھی اور آخر بھی یہی وہ ہیں جو تعلیماتِ قرآنی کے سچے معلم ہو سکتے ہیں۔

پیامبرِ امیؐ، جنھوں نے بجز زبانِ وحی، نہ کسی سے درس لیا، نہ کسی مکتب کی صورت دیکھی،[۱۵] ایسے مکتبِ تعلیم و تربیت کی بنیاد ڈال گئے جس کا فیضانِ ہدایت آج تک جاری ہے۔ ابتدا میں اس نکتے پر زور دیا گیا ہے کہ قرآن و سیرتِ رسولؐ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ عقل جو مبداءِ علم ہے، اخلاق کے بغیر آمادۂ تحصیلِ دانش نہیں ہو سکتی۔ رسولِ اسلام کے منہاجِ تعلیم میں اخلاقی تربیت لازمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کل تعلیمی دنیا میں جو بحران و انتشار ہے، اس کا بنیادی سبب نہ تو معاشی عدمِ تحفظ کے احساس میں مل سکتا ہے، نہ سیاسی گروہوں کی دخل اندازی میں اور نہ سماجی حالات میں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نظامِ تعلیم اخلاقی اقدار سے جدا ہو کر خود ہی اپنی خرابی کا ذمہ دار ہے۔ اساتذہ سے جن اقدار کی حرمت کا تقاضا منصبِ تدریس کرتا ہے، وہ اکثر اس پر پورے نہیں اترتے، اور اسی لیے طلبہ کے سامنے کوئی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ نظامِ تعلیم خود شکستِ اقدار کے بحران میں مبتلا ہے۔ آج کی تعلیم معلومات فراہم کرتی ہے، اختصاصی تحقیق کے طریقے سکھاتی ہے، پیشہ ورانہ مہارت (جیسے طب، انجینئرنگ وغیرہ) سے نوازتی ہے لیکن طلبا میں اقدار کا کوئی احساس پیدا نہیں کرتی۔ اس کے دو بنیادی اسباب ہیں: ایک تو یہ کہ اقدار کو انسانی علوم میں کوئی مقام حاصل نہیں، ان کے طلاب و متخصصین وحدتِ علم کے تصور سے عموماً بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس طرح علم پارہ پارہ ہو کر دانش جو کے ہاتھ آتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ تصورِ حیات و کائنات کے فقدان کی وجہ سے آج کے معلمین و متعلمین علم کو زندگی کے روزمرہ مسائل اور بڑے مقاصد سے مربوط نہیں کر سکتے۔ رسولِ اسلام کی تعلیم میں نہ صرف علم کی وحدت کا تصور ملتا ہے، بلکہ آپ نے جو طریقۂ تعلیم اختیار فرمایا وہ شخصیت کے ہر پہلو کی نشوونما پر زور دیتا ہے، اور علم و دانش کو زندگی کے تمام پہلوؤں سے مربوط کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے عالم و دانشور پر تربیت و اصلاحِ عوام کی زبردست ذمہ داری بھی ڈالی۔ اور ان سب کی مثال اپنے اسوۂ مبارکہ سے پیش کی۔

مرتضیٰ مطہری نے سیرتِ نبوی سے بحث کرتے ہوئے رسولؐ کی دعوت کے طریقے کو خصوصی اہمیت

دی ہے۔ انھوں نے قرآن کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دعوت و تربیت کی شرطِ اول "شرحِ صدر" ہے۔ دل کی وسعت، دماغ کی کشادگی معلمِ و مبلغ کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تربیت گاہ کے ہر فرد کو سمجھ سکے اور اس کی افتادِ طبع کے لحاظ سے نسخہ وعلاج تجویز کرے۔ رسولؐ نے ابلاغِ حق کے لئے اس علم وابلاغ سے کام نہیں لیا، جو محض حواس یا ذہن کو چھوتا ہے، ان میں اترتا نہیں، ابلاغ مکمل اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب حواس کے ساتھ حاستہ باطنی بھی کام کرنے لگے۔ حواس کا ادراک مشاہدہ باطن بن جائے، اور دماغ کی روشنی سے دل منور ہو تو دل کے ساتھ دماغ بھی دھڑکنے لگتا ہے۔ یہی البلاغ المبین ہے، اور اس کا بنیادی اصول ہے: ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة (سورۂ نحل، آیت ۱۲۵) حکمت نظر نہیں خبر ہے اور موعظہ حسنہ اخلاقی تربیت ہے جس کے بغیر علم کے لیے آمادگی پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی علم لائحہ عمل بنتا ہے۔ یاایھا النبی انا ارسلناک شاھداً ومبشراً ونذیرا۔ رسول امت پر گواہ ہیں، یعنی اس کے ہر قول وفعل کے ذمہ دار ہیں، وہ تعلیم دیتے ہیں بشارت کے ساتھ، یعنی تشویق و ترغیب دلاتے ہیں، علم و اخلاق کے فوائد سے آگاہ کر کے جستجوئے صداقت اور تکمیلِ مکارمِ اخلاق پر آمادہ کرتے ہیں۔ ڈراتے ہیں، یعنی امت کو متنبہ کرتے ہیں حق گریزی واخلاق سوزی کے نتائج سے۔ یہ تنبیہ صرف ڈرانا دھمکانا نہیں عاقبت اندیشی کی تعلیم ہے، خطراتِ آئندہ سے مطلع کرنے کا نام ہے۔ رسولؐ نے اپنی امت کے ساتھ ہر حال میں رہ کر، سفر میں حضر میں امورِ انتظامی و مالی کے دوران میں، جنگ میں، عبادت میں، مجلس میں، مسجد میں، بازار میں، گھر میں میزبانی کر کے اور دوسروں کے گھر مہمان بن کر اس اصولِ تعلیم کو برتا اور اپنی تعلیم کے نقوش روحوں اور دلوں پر مرتسم کیے۔ بلاغِ مبین کا امتیازی وصف یہ ہے کہ جو بات فلاسفہ سیکڑوں ادق اصطلاحات کے لفافے میں بند کر کے پیش کرتے ہیں پیغمبر انھیں چند مختصر کلمات میں کھول کر اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ وہ دل و دماغ دونوں پر ثبت ہو جاتی ہے اور شخصیت کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ خود قرآن نے بلاغ مبین کا کلمہ بتکرار برتا ہے۔ بلاغ کے ساتھ "نصح" کا کلمہ بھی اکثر آیا ہے۔ نصح کا لفظی ترجمہ نصیحت ہے مگر اس کا مفہوم نصیحت سے وسیع تر ہے نصح میں خیر خواہی و خلوص بھی شامل ہے۔ یہ بھی معلم کے لیے شرط لازمی ہے۔

تبلیغ یا ابلاغ کی دوسری شرط، تکلف سے پرہیز ہے۔ قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلفین (سورۂ ص، آیت ۸۶) تکلف کے لغوی معنی ہیں تکلیف کے ساتھ کام کرنا۔ ابنِ مسعود اور کئی مفسرین نے اس آیت میں تکلف کے معنی 'قولِ بغیر علم' متعین کیے ہیں۔ ابنِ مسعود ہی کا کہنا ہے کہ حدیث میں قل ما تعلم ولا تقل مالا تعلم کے بعد ہی اس آیت کا حوالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابلاغ کے کام میں کسی تکلف یا بناوٹ یا زبردستی دلاعلمی کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ سچا معلم وہ ہے جو طلبا کے ہر سوال کا جواب بلاتکلف دے سکے اور ان کی پوری تشفی کر سکے۔ ایسے ہی معلمین قرآن کے

معیارِ تعلیم اور رسولِ اسلام کے طریقۂ علم کا مکمل نمونہ بن سکتے ہیں۔

معلم اور صاحب البلاغ المبین کے فرق کو سمجھنے کے لیے ابن سینا سے منسوب یہ حکایت بے محل نہ ہوگی۔ ابن سینا عالمِ اسلام کے ذہین ترین عالموں اور مفکروں میں بھی اپنی جدت و تحقیق پسندی و تعقل کے لیے ممتاز ہے۔ ایک بار اس کے ایک شاگرد بہمن یار نے کہا کہ تم ایسے فرد ہو کہ اگر نبوت کا دعویٰ کرو تو لوگ قبول کریں گے اور خلوصِ دل سے ایمان لے آئیں گے۔ ابن سینا نے اس خیالِ خام کی ہر طرح تردید کی، مگر شاگرد نہ مانا۔ ایک بار سخت سردی کے موسم میں جبکہ برف بھی گر رہی تھی اور ابن سینا بہمن یار کے ساتھ سفر میں تھا۔ اس نے اذانِ صبح کے ساتھ شاگرد کو بیدار کیا اور کہا، میں بہت پیاسا ہوں، یہ پیالہ لو اور اسے پانی سے بھر کر مجھے دے دو۔ بہمن یار نے پہلے تو سویرے خالی پیٹ پانی پینے کے طبی نقصانات گنوائے، جب ابن سینا نے اس سے اٹھ کر پانی دینے پر پھر اصرار کیا تو اس نے دوسری طرح بحث شروع کر دی۔ جب بحث طول پکڑ گئی تب ابن سینا نے کہا کہ میں تیرا امتحان لے رہا تھا۔ یاد ہے تو نے کہا تھا کہ آپ دعویٰ پیغمبری کیوں نہیں کرتے، تو کئی سال میرا شاگرد رہا، مجھ سے درس لیا، مگر جب میں نے خواہش کی کہ لحاف سے نکل کر مجھے پانی کا ایک پیالہ دے تو بحث اور نصیحت کر کے تو اپنی نافرمانی کو چھپاتا رہا اور میری ذرا سی بات پر عمل نہ کیا۔ دیکھ پیمبر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی وفات کو سینکڑوں سال گذر گئے مگر لاکھوں آدمی ان کے حکم کی تعمیل میں اپنے گرم بستر چھوڑ کر کڑکڑاتے جاڑے میں وضو کرتے اور اعلان کرتے ہیں اشہد ان محمداً رسول اللہ۔

اس حکایت سے واضح ہو جاتا ہے کہ فلسفی، عالم، محقق ماہرِ خصوصی بننا آسان ہے، اور ہزاروں کو اپنے علم سے مستفید کرنا بھی سہل ہے، لیکن اس طرح تعلیم دینا کہ نیازمند تعلیمات کے سانچے میں سرتاپا ڈھل جائیں اور معلم کی وفات کے بعد بھی اس کی تعلیمات سے منحرف نہ ہو سکیں، صرف پیغمبروں کا کام ہے۔ پیغمبروں میں بھی رسولِ اکرم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے طریقۂ تعلیم نے ایک قوم کی حالت چند برسوں میں ایسی بدلی کہ اس کے افراد نہ صرف انتظامی، سیاسی، معاشی معاملات میں دنیا کی دوسری قوموں سے آگے نکل گئے، بلکہ وہ جن جن قوموں کے رابطے میں آئے، ان کا دل و دماغ بھی بدل دیا۔ علم کے ساتھ اخلاق میں بھی ان کا کوئی نظیر و مثیل نہ تھا۔ جب مسلمانوں نے اپنے محسن و معلم کی تعلیم و تربیت کو فراموش کرنا شروع کر دیا تو ہر طرح کے رذائل اور پستی میں گرنے لگے لیکن رسول کے تصورِ علم و دانش اور طریقۂ تعلیم کا فیضان آج بھی جاری ہے۔ سچا پیروِ رسول آج بھی کہتا ہے "تعلیم و تعلم عبادت ہیں" (امام خمینی)

کسی مذہب یا فلسفے نے علم کا اتنا وسیع تصور پیش نہیں کیا، اور نہ ایسا طریقۂ تعلیم جو ذہن کے ساتھ دل کی، عقل کے ساتھ جذبات کی اور دنیوی امور کے ساتھ اخلاق کی بھی مکمل نشو و نما کر سکے۔ یہ ہماری رسول فراموشی ہے کہ آج ہم علم میں دوسری قوموں سے پسماندہ ہیں، اور عمل کے میدان میں سست گام۔ جنہوں نے رسول کے دامنِ علم و محبت میں تربیت پائی ان سے رسول کی تعلیم زندہ رہی۔ رسولِ اکرم اور ان کے اوصیا کی تعلیمات آج بھی مینارۂ ہدایت ہیں۔ اگر طلب

صادق اور تشنگی واقعی تقاضی آب ہے تو جہل و ظلم نے رسولؐ کی جن درسگاہوں کے در آج بند کر رکھے ہیں، پھر کھل سکتے ہیں۔ ایسے شوق پر آج بھی صلائے عام ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق علم

عقل مکمل وہی ہے جو عشق بن جائے، اور علم سچا وہی ہے جو شخصیتوں کو اپنے اور تعلم کے سانچے میں ڈھال دے، یہی قرآن کا تصوّرِ علم ہے، اور پیغمبرِ قرآن کا مقصودِ تعلیم۔

اقرأ کا کلمہ اب بھی شش جہات میں گونج رہا ہے۔ پڑھو! ہدایت کرنی والی کتاب تمہارے سامنے ہے جو صحیفۂ فطرت و حیات کے اوراق کے مطالعے کی متقاضی و منتظر ہے۔ امت کے لیے پیغمبرِ عقل و علم نے ورثے میں قلم اور کتاب چھوڑی ہے۔ سلسلۂ وحی ختم ہوا مگر خامہ و قرطاس کا رشتہ کبھی منقطع نہ ہوگا کہ خود خالقِ حقیقی و علیمِ مطلق نے قلم کی قسم کھائی ہے جہل کفر دانش گاہوں، حوزوں کے دروازے بند کرتا رہے گا، "باب العلم" کے ہدایت یافتہ علم کے نئے در وا کرتے رہیں گے۔

حوالے اور حواشی

۱ الکلینی، ابی جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق الرازی، اصولِ کافی با ترجمہ و شرحِ فارسی حاج سید جواد مصطفوی انتشاراتِ علمیہ اسلامیہ (بازار شیرازی، چاپخانۂ حیدری تہران۔ ایران) الجزء الاول، ص ۱۳ ۲ ایضاً ص ۱۲ ۳ ایضاً ص ۱۲ ۴ ایضاً ص ۱۱ ۵ ایضاً ص ۱۳-۱۱ ۶ ایضاً ص ۱۴ ۷ ایضاً ص ۱۱ ۸ ایضاً ص ۱۱ ۹ ایضاً ص ۱۲ ۱۰ ایضاً ص ۱۵-۱۴ ۱۱ ایضاً ص ۲۶-۲۳ ۱۲ عبدالباقی، محمد فواد، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، انتشارات اسماعیلیان، تہران / القاہرہ، مطبعۃ دار الکتب المصریہ ۱۳ اقبال، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ تفصیل کے لیے متعلقہ ابواب اور ان میں درج کی ہوئی آیات اور ان کی اقبالی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔ ۱۴ اصولِ کافی، ج ۱، ص ۳۰ ۱۵ ایضاً، ص ۳۱ ۱۶ ایضاً ص ۲۸-۲۷ ۱۷ ایضاً ص ۳۲-۳۱ ۱۸ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ۱۹ تفصیل کے لیے دیکھیے التوحید (اردو) جلد ۱، شمارہ ۳ میں حاج محمد باقر انصاری کا مضمون ۲۰ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ۲۱ اصولِ کافی ج ۱، ص ۳۵ ۲۲ ایضاً ص ۳۵ ۲۳ ایضاً ص ۳۶ ۲۴ ایضاً ص ۳۸-۳۷ ۲۵ ایضاً ص ۳۹ ۲۶ ایضاً ص ۶۴-۶۳ ۲۷ ایضاً ص ۶۴ ۲۸ الحرانی، ابی محمد الحسن بن الحسین بن شعبہ، تحف العقول، ترجمۂ فارسی علی اکبر غفاری، انتشاراتِ کتاب فروشی اسلامیہ تہران ۱۳۵۴ھ ق۔ ص ۳۵ ۲۹ اصولِ کافی ج ۱، ص ۶۷-۶۶ ۳۰ نجفی، محمد صادق، سیری در صحیحین، جلد اول و دوم چاپ چہارم ۱۳۶۱، شرکت افست، سہامی عام، آغاز جلد دوم ۳۱ اصولِ کافی ج ۱، ص ۶۸ ۳۲ ایضاً، ص ۶۷ ۳۳ ایضاً ص ۶۶ ۳۴ ایضاً ص ۲، ۳۵، ۳۶۔ ایضاً ۸۸-۸۹ ۳۷ مطہری، شہید مرتضیٰ، سیرۂ نبوی، انتشاراتِ صدرا، تہران، ۱۳۶۱، ص ۱۳-۱۲ ۳۸ سید احمد خان، مقالاتِ سرسید، مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مجلسِ ترقی ادب، لاہور ج اول، ص ۷۳-۲۷۲ ۳۹ المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم ۴۰ نجفی محمد صادق، سیری در صحیحین، ص ۱۹۶ ۴۱ مجلسی، حیوٰۃ القلوب، سازمانِ چاپ و انتشارات جاویدان، تہران جلد دوم ص ۱۶۱ ۴۲ مطہری، استاد شہید مرتضیٰ، پیامبر امی، انتشاراتِ صدرا، تہران۔ اسی کتاب میں مرتضیٰ مطہری نے ان قیاسات کی تردید کی ہے جن کی بنا پر ڈاکٹر عبداللطیف (حیدرآبادی) نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ رسولِ اکرم ناخواندہ و تحریر ناشناس کے مفہوم میں امی نہ تھے۔ امی کے معانی میں جتنی تشخیص ہوئی ہیں ان کے بنا پر کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا تو کیا ضروری ہے کہ ہم امی کی طرح طرح سے تاویل کر کے رسولِ اسلام کو تلمیذ الرحمٰن ماننے کے ساتھ کسی مکتب یا معلم کا تربیت یافتہ بھی سمجھیں ۴۳ مطہری، استاد شہید مرتضیٰ۔ سیرۂ نبوی، ص ۹۵-۹۲، ۱۰۱-۹۹ ۴۴ ایضاً ص ۹۷-۹۶

جناب منتظر عباس نقوی
(پاکستان)

اخلاقی معیار کا مسئلہ اور نہج البلاغہ

مسئلہ کی نوعیت

زیر نظر مقالہ اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے نہج البلاغہ کے ایک مطالعہ پر مشتمل ہے۔ نہج البلاغہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے خطبات، احکام، خطوط، اقوال اور وصیتوں پر مشتمل ہے[1]۔ نہج البلاغہ کے نام سے ان خطبات کی تدوین کا کام سید محمد (۹۶۹ء تا ۱۰۱۵ء) ابن طاہر بن حسین بن موسیٰ بن ابراہیم مرتضیٰ بن امام موسیٰ کاظمؑ المعروف بہ سید رضی نے کی[2]۔ صاحب خطبات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت تاریخ اسلام کی نمایاں ترین شخصیتوں میں سے ہے۔ اسلام کے نظریات کی نشر و اشاعت اور تشریح و توضیح کے سلسلہ میں ان کی خدمات مسلم ہیں۔ نہج البلاغہ میں ان کے جو خطبات احکام اور خطوط درج ہیں وہ اکثر و بیشتر دور خلافت میں کہے اور لکھے گئے۔ ان مندرجات میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پوری کتاب کا موضوع مذہب کے اصولوں کے عملی زندگی پر اطلاق کی مختلف صورتوں کا بیان ہے۔ زندگی کے افعال و اعمال کو اصولوں کے تابع کرنا اخلاقیات کا اہم ترین پہلو ہے۔ چنانچہ ہم بہ آسانی یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ نہج البلاغہ ایک بہت نمایاں موضوع اخلاقیات ہے۔

علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اخلاقی نظریات کا مطالعہ بعض اعتبار سے کافی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ان نظریات پر حقیقی معنوں میں "اسلامی فلسفہ" کی اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے۔ عباسی عہد حکومت کے مسلمان مفکرین جن فکری کاوشوں کو ہمارے مطالعہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں ان میں سے بیشتر یونانی اور عجمی تصورات سے متاثر ہوئی ہیں۔ چنانچہ پیشہ ور فلسفیوں کی وہ جماعت جو "حکما" کے نام سے موسوم ہوئی عام طور پر یونانی افکار کی عربی شارح تھی۔ چنانچہ غزالی جیسی ایک دو مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر ان فلسفیوں میں بہت کم اشخاص کو تخلیقی فلسفے کا مفکر و فلسفی کہا جاسکتا ہے۔ جبکہ دور رسالت اور اس کے فوراً بعد کے عہد کے افکار اس قسم کے اثرات سے بالکل پاک تھے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اسی دور کے سب سے بڑے حکیم و مفکر ہیں۔ اور ان کے فکر کا ماخذ اسلام کے علاوہ کوئی اور فلسفہ نہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ دنیا کو کن نئی اقدار سے روشناس کرایا ہمارے لیے مطالعۂ نہج البلاغہ قرآن اور احادیث نبوی کے بعد سب سے زیادہ مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی شخصیت کے بعد علی ابن ابی طالب علیہ السلام عرب کے سب سے پہلے مفکر ہیں۔ درحقیقت عرب قوم مقامی آب و ہوا اور دیگر جغرافیائی حالات کے زیر اثر بنیادی طور پر ایک عملی قوم تھی جو زندگی کو ایک ٹھوس حقیقت سمجھتی تھی ان کے نزدیک کسی بھی علم و فن کی تمام تر قدر و قیمت کا انحصار اسکی افادی اہمیت پر ہوتا تھا۔ چنانچہ اسلام سے پہلے عربوں کی شاعری اور خطابت جو ان کے نمایاں ترین فنون تھے۔ اسی نقطۂ نظر سے تخلیق کئے جاتے رہے۔ انکی تمام سماجی اقدار کا محور نسل اور دولت جیسے مادی عناصر تھے۔ حیات کے مادی تقاضوں کی تکمیل کے دشوار مرحلے انھیں اس بات کا موقع ہی نہ دیتے تھے کہ وہ الٰہیات اور کائنات کے مسائل پر غور کریں ان حالات میں عرب میں اسلام پہلی فکری تحریک کی صورت میں منظر عام پر آیا جس نے پہلی مرتبہ کچھ ایسے مابعد الطبیعیاتی اصول پیش کیے جو عربوں کے لئے نہ صرف عمل کا معیار بن سکتے تھے بلکہ ان کی تائید میں عقلی، علمی اور فلسفیانہ افکار کو بھی پروان چڑھنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔

اسلام کا تقاضہ ایک فکری انقلاب تھا، لیکن چونکہ یہ خود کو ایک درسی اور کتابی فلسفہ کے بجائے ایک لائحہ عمل بھی بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے مخاطبوں کے ذہنی مرتبہ کے پیش نظر اسے اصولی بحثوں

کی سطح سے نیچے آکر عملی اخلاق کا سہارا لینا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اسلام کے اخلاقی اصول اس انداز میں نہیں ملتے جو یورپ کے فلسفۂ اخلاق کا طرۂ امتیاز ہے۔ "قرآن حکیم اخلاقی اقدار کو فلسفۂ اخلاق کی زبان میں پیش نہیں کرتا بلکہ حکایات تمثیل تشبیہ و استعارہ تعریف و تحسین زجر و توبیخ اور وعدہ وعید کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ اس طرز بیان سے انسان کا نفس بھی متأثر ہوتا ہے اور ذہنیت بھی بنتی ہے۔" کیونکہ اسلام کا مقصد ذہن کے ساتھ ساتھ عمل کو بھی متاثر کرنا تھا۔ گویا دوسرے الفاظ میں اسلام نے فلسفہ کو "فکر برائے فکر" بنا کر نہیں پیش کیا بلکہ وہ اسے "فکر برائے عمل" بنانا چاہتا ہے۔

لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے عرب بنیادی طور پر ایک عملی قوم تھے۔ اس لیے انھیں فطرتاً اسلام کے فکری اصولوں کے مقابلے میں عملی طریقے (فقہ) زیادہ مرغوب تھے۔ اگر اس رجحان کو آزادی سے پروان چڑھنے دیا جاتا تو اسلام کا یہ مقصد ہی فوت ہو جاتا کہ زندگی کو رسمی تقلید کے بجائے فکری اصولوں کا تابع ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل جن شخصیتوں کے ہاتھوں ہوئی ان میں حضرت علی علیہ السلام سرفہرست ہیں۔" جس زمانہ میں اسلام دور دراز ممالک میں پھیل رہا تھا۔ علیؑ مدینہ میں عربوں کی ابھرتی ہوئی قوم کی دماغی قوت کو بڑھا رہے تھے۔ مدینہ کی جامع مسجد میں علیؑ اور ان کے چچازاد بھائی اور شاگرد عبداللہ ابن عباسؓ ہفتہ وار فلسفہ، منطق، فصاحت و بلاغت، حدیث و فقہ پر لکچر دیا کرتے تھے۔ یہ ابتدا تھی اس تحریک کی جس نے بعد میں بہت زور و شور کے ساتھ بغداد میں ظہور کیا۔[۲]" اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو اپنا دارالحکومت بنایا جو اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ایک نیم بین الاقوامی شہر تھا اور جہاں مختلف مذاہب کے لوگ مثلاً یہودی، عیسائی، مرقیونی، دیصانی، مانی اور زندیق آباد تھے۔ مختلف افکار کی موجودگی میں ذہنی ارتقا کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کوفہ بھی جلد ہی اسلامی علوم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اور یہاں کتابت، لغت، قرأت، انساب، فنون شاعری، روایات و حدیث اور فلسفہ کی نشوونما ہوئی۔ اور کوفہ کی یہی علمی تحریک بعد سے ہوتی ہوئی بغداد پہنچی اور مختلف شکلیں اختیار کرتی ہوئی یورپ میں فکری عروج کا ذریعہ بنی اس طرح حضرت علی علیہ السلام نہ صرف یہ کہ عرب کے پہلے مفکر ہیں بلکہ اپنے بعد آنے والے اسلامی

مفکرین اور فکری تحریکوں (خصوصاً معتزلہ و شیعہ) کے امام بھی ہیں۔ اس کے اثرات کے اس دور میں نتیجہ کے پیش نظر بھی نہج البلاغہ کا مطالعہ مسلمانوں کے فکری ارتقا کو سمجھنے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ نہج البلاغہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ مختلف اوقات و مختلف پس منظروں میں دیے گئے خطبات جن میں میدان جنگ سے لے کر مسجد میں کی گئی جمعہ کی تقریر تک سب ہی کچھ شامل ہے۔ احکام جن میں عمومی حکمت عملی سے لیکر، سلطنت اسلامیہ کے عمال کو مخصوص معاملات میں بتائے گئے طریق کار درج ہیں۔ خطوط جو اعزا و احباب اور سیاسی حریفوں کے نام لکھے گئے ان میں وہ وصیتیں بھی ہیں جو عام انسانوں یا مخصوص افراد سے کی گئیں۔ اقوال جو گاہے گاہے کہے گئے اور حکیمانہ تعلیمات کے حامل ہیں جن کا کوئی مستقل عنوان نہیں ہے۔ یہ ہے نہج البلاغہ کا مواد۔ ظاہر ہے کہ یہ مواد اس ترتیب و تنظیم کا حامل نہیں ہے جو عام طور پر فلسفے کے طالب علم کسی فلسفیانہ تصنیف میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ کچھ اس قدر پریشان کن بات بھی نہیں ہے۔ پیشہ ور فلسفیوں کی تخلیقات سے قطع نظر تقریباً تمام مذہبی فلسفے یا فلسفیانہ تحریکیں روایتی فلسفیانہ طرز بیان سے احتراز کرتی رہی ہیں اس قسم کے فلسفوں میں عام طور پر نتائج پہلے سے اخذ شدہ نہیں ہوتے بلکہ حقائق اور متفرق کوائف اس انداز سے پیش کئے جاتے ہیں کہ استقرا کے ذریعہ ان سے نتائج مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ نہج البلاغہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں ہمیں اس قسم کا طریق کار اختیار کرنا پڑتا ہے۔

بکھرے ہوئے مواد سے زیادہ اہم مسئلہ انداز بیان کا مسئلہ ہے۔ ایک فلسفی سے عام طور پر یہ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس کا انداز بیان ٹھوس خشک اور تجریدی تصورات کی زیادہ سے زیادہ ممکن تجریدی پیشکش پر مشتمل ہوگا۔ علاوہ ازیں فلسفیانہ طرز تحریر میں الفاظ کے معنی مستقل طور پر مخصوص اور متعین ہوتے ہیں۔ لیکن زیر نظر تصنیف میں حقائق کو پیش کرنے کے لیے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ ادیبانہ حسن اور خوبیوں کا حامل ہے۔ خشک اور تجریدی مسائل کو پیش کرتے وقت اکثر و بیشتر تشبیہ و استعارہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ بعض الفاظ جو ایک جگہ ایک مفہوم کو پیش کرتے ہیں کسی دوسری جگہ مختلف معنی کے حامل ہیں۔ شاید یہ تمام باتیں ایک فلسفیانہ طرز تحریر کی خامی متصور ہوں۔ لیکن ہمیں کسی ملے

پھر بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ نہج البلاغہ کا مقرر فلسفے کی کوئی درسی کتاب تصنیف نہیں کررہا ہے نہ وہ صرف اس بات کا خواہشمند ہے کہ لوگ اس کے نقطہ نظر سے باخبر ہو جائیں یا اس کے قائل ہو جائیں بلکہ اس کا مقصد لوگوں کو متاثر کرنا ہے۔ منطقی انداز بیان کسی کو قائل تو کر سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ متاثر کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے۔ فلسفہ کو کتابوں اور ذہن سے نکال کر اعمال اور کردار کی صورت میں دینے کے لیے ضروری ہے کہ فلسفہ کو ایک تحریک اور قوت بنا کر پیش کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ فلسفہ صرف عقل تک محدود نہ رہے بلکہ وہ ایک جذباتی حقیقت بھی بن سکے وہ محض مجرد تصور نہ ہو۔ بلکہ ٹھوس حسی اور مشاہداتی حقائق اس کی تائید کر سکتے ہوں ان مقاصد کے لیے نہج البلاغہ کا انداز بیان ہی حصول کا ایک کامیاب ذریعہ بن سکتا تھا۔

"ایسا ذہن جو ادنیٰ سطح پر ہو اور حس کی گرفت میں محبوس ہو تو اس کو محسوسات ہی کی زبان میں مخاطب کرنا پڑتا ہے لیکن جیسے جیسے ہم رفعت و بلندی حاصل کرتے ہیں ہمارا نیکی و بدی اور اس سے پیدا ہونے والی جزا و سزا کا تصور زیادہ تعقلی رنگ اختیار کرتا جاتا ہے۔" چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے فکری اور ذہنی حقائق کو مشاہداتی حقیقت اور نفسیاتی قوت بنا کر پیش کیا۔ اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کو ایک عام آدمی اپنی زندگی کے تمام واقعات میں دیکھ سکتا ہے جنہیں ایک مسلمان اپنی رہبری و رہنمائی کا اصول قرار دے سکتا ہے اور جن کی روشنی میں ایک فلسفی حقیقت کے مجرد تصور تک پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ نہج البلاغہ کا مذکورہ انداز بیان خامی کی بجائے بڑی خوبی بن جاتا ہے۔ جو مختلف ذہنی سطح رکھنے والوں کے لیے یکساں طور پر کارآمد اور قابل فہم ہے۔

اب تک کی گفتگو، نہج البلاغہ اور اس کے مندرجات کے تعارف پر مشتمل تھی۔ اب ہمیں اس سوال کی ماہیت کا جائزہ لینا ہے جس کا جواب اس کتاب میں تلاش کرنا ہمارا مقصود ہے یعنی اخلاقی معیار کا مسئلہ کیا ہے؟

معیار نام ہے کسی ایسے اصول کا جس کی حیثیت کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت متعین ہو اور کسی دوسری شے کے ساتھ اسکا رشتہ اسی مخصوص نقطۂ نظر سے اس شے کی حیثیت کا تعین کرے یہ ذرا پیچیدہ سی تعریف اس مثال سے واضح ہو سکتی ہے کہ سیر کا باٹ کشش ثقل کے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت اپنی مقررہ اور متعینہ حیثیت رکھتا ہے۔ جب اس باٹ کی نسبت یا رشتہ کسی دوسری شے

سے قائم کیا جاتا ہے تو کشش ثقل کے نقطۂ نظر سے اس شے کی حیثیت بھی متعین ہو جاتی ہے اور ہم آسانی یہ سمجھ جاتے ہیں کہ مذکورہ شے کوئی وزن رکھتی ہے یا نہیں اور اگر رکھتی ہے تو یہ وزن کتنا ہے اس طرح سیر کا باٹ ایک معیار ہے۔

تعریف کے باب میں روایتی بحثوں سے احتراز کرتے ہوئے اخلاقیات خیر کا علم ہے اور یہ علم بنیادی طور پر چار سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

"۱۔ انسانی رویہ یا اعمال میں خیر اعلیٰ کیا ہے۔

۲۔ صائب اور غیر صائب کا علم کن ذرائع سے ہوتا ہے۔

۳۔ فرد کو اعمال خیر انجام دینے پر آمادہ کرنے کے لیے کون سے عناصر محرک کا کام کرتے ہیں۔

۴۔ اخلاقی رویّہ کا اطلاق کن اعمال پر ہوتا ہے۔"

گویا خیر کا علم خیر اعلیٰ کے علم اس کے ذریعہ علم اس کے محرکات عمل اور اس کے اطلاقات پر مبنی ہے۔ چنانچہ فلسفۂ اخلاق ان چار سوالات کا جواب دیئے بغیر مکمل نظام اخلاق نہیں بن سکتا۔

اب اگر ان سوالات کا جائزہ لیجئے تو اخلاقیات کے موضوع کے تحت ہم درحقیقت یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ خیر و شر کے مخصوص نقطۂ نظر سے کس عمل یا قدر کی حیثیت متعین ہے۔ ہم یہ تعین کس طرح کرتے ہیں؟ یہ متعینہ حیثیت مسلم اور قابل قبول قوت کیسے بن جاتی ہے؟ اور اس متعین شدہ حیثیت کی دوسرے اعمال اور اقدار سے کیا نسبت ہے؟ پہلے تین سوالات کا تعلق معیار اور اس کی تلاش سے ہے اور چوتھا سوال معیار کے عملی اطلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ جب ہم "اخلاقی معیار کا مسئلہ" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ جاننا ہوتا ہے کہ خیر و شر کے نقطۂ نظر سے خیر اعلیٰ یا صائب ترین کیا ہے اس کا ادراک کس طرح ممکن ہے اور اسے کس قوت کے تحت قابل قبول قرار دیا جا سکتا ہے۔

روایتی فلسفہ نے ان تین سوالات کا جواب کس طرح دیا اور ان کے جوابات کس حد تک قابل قبول ہیں یہ ایک تفصیلی بحث ہے۔ جس کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا جائے گا۔ یہاں پر صرف اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

خیر اعلیٰ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے بعض کے نزدیک خیر اعلیٰ کوئی غایت یا مقصد ہے اور بعض کے نزدیک یہ کوئی قانون ہے۔ اول الذکر نظریہ کے علمبردار غائتی اخلاقیین اور دوسرے قانونی فلسفی کہلاتے ہیں۔ خیر کو مقصد قرار دینے والے عام طور پر لذت (جو نفسیاتی یا اخلاقی اور انفرادی یا اجتماعی ہو سکتی ہے) یا پھر افادیت (انفرادی اور اجتماعی یا مثالی) یا علم یا قوت کو خیر اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ قانونی اخلاقیات کے علمبرداروں نے سماجی قوانین سیاسی قوانین، قوانین فطرت، احکام خداوندی، حاسۂ اخلاق کے احکام، ضمیر کے قوانین اور عقل کے قوانین کو صائب ترین قرار دیا ہے۔

خیر کا علم کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں بعض مفکرین نے انسانی تجربہ کو علم کی بنیاد قرار دیا۔ بعض کے نزدیک قوانین حیات اور حالات وجود ذریعۂ علم بنتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک عقل خیر تک رہنمائی کر سکتی ہے اور بعض فلسفیوں کے خیال میں یہ علم صرف وجدان سے حاصل ہو سکتا ہے۔

عمل خیر کا محرک کیا ہے؟ یہ سوال بہت سے متنازع فیہ جوابات پر مشتمل ہے بعض کے خیال میں لذت اور کمال خود محرک ہیں۔ اور یہ انسان کو خود بخود عمل خیر کی طرف راغب کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اخلاقی عمل فرد کے خود عائد کردہ قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ اس لئے اسے کسی خارجی محرک کی ضرورت نہیں۔ بعض کے خیال میں سیاسی اقتدار کے تحت حاصل ہونے والا غلبہ عمل خیر کا محرک بنتا ہے۔ عمل خیر کے محرک کا سوال درحقیقت اس سوال پر مشتمل ہے کہ عمل خیر انجام دینے کے لیے کون سی نفسیاتی قوت محرک کا کام سرانجام دیتی ہے۔ چنانچہ لذتی فلسفیوں کے نزدیک خوشی یا لذت کی تمنا اور الم و کرب کا خوف نفسیاتی محرک ہے۔ ارتقائی مکتبۂ فکر کے نزدیک کمال کی خواہش اور نقص سے اجتناب اخلاقی عمل کی نفسیاتی بنیاد ہے۔ قانونی مفکرین کے نزدیک انسان میں قانون کے احترام کا جذبہ فطری ہے اور یہی جذبہ اخلاقی عمل کا محرک ہے۔ اسی قسم کے نظریات میں ریاست یا جماعت کی طرف سے اجر و سزا کے وجود کو محرک قرار دینے کا نظریہ بھی شامل ہے۔

اسلام کا نظریۂ اخلاق

اسلام کا اخلاقی فلسفہ بنیادی طور پر مذہبی ہے۔ مذہبی فلسفہ کی نمایاں ترین خصوصیت ایک ایسی مابعد الطبیعاتی حقیقت

کے وجود کا اعتراف ہے جو شعوری طور پر ایک فاعل مختار وجود ہے، جو تمام موجودات اور ممکنات کی حقیقی علت ہے اور جو کائنات کے پورے نظام میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ فلسفہ کے بیشتر نظام کسی نہ کسی مابعد الطبیعاتی وجودِ مطلق کے قائل ہیں لیکن مذہبی فلسفہ اور غیر مذہبی فلسفہ کے تصورِ حقیقت کا بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب کا "مطلق حقیقت" یا خدا ایک ایسا عامل ہے جو ارادہ اور شعور کا حامل ہے۔ اس کے برخلاف غیر مذہبی فلسفہ میں یہ مطلق ایک فعال لیکن خود آگاہی اور خود شعوری سے عاری قوت ہے، جو بغیر کسی ذہن یا شعور کے وجود رکھتی ہے اور اپنی داخلی قوت کے تحت خود کار طریقہ پر اضافی حقیقتیں پیش کرتی رہتی ہے۔ یعنی مذہب کی حقیقت مطلقہ یا خدا کا عمل شعوری ہے اور غیر مذہبی فلسفے کی حقیقت مطلقہ یا مطلق کا عمل میکانکی۔

حقیقت کے متعلق شعوری اور میکانکی کی یہ تفریق وہ خطِ امتیاز ہے جو مذہبی اور غیر مذہبی فلسفہ کے درمیان حد فاصل بنتا ہے۔ اس فرق کے علاوہ ہمیں مذہبی اور غیر مذہبی فلسفہ میں کوئی اور ایسا امتیاز نظر نہیں آتا جس کا اطلاق عمومی اور کلی طور پر محض مذہبی یا غیر مذہبی فلسفہ پر ہی ہو سکے چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا فکری نظام مذہبی ہے، تو ہم سب سے پہلے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک حقیقتِ مطلقہ خدا کی ذات ہے جو شعور اور ارادے کے ساتھ کائنات کے پورے نظام پر اختیار اور قدرت رکھتی ہے۔

پھر صرف یہی نہیں کہ اسلام خدا کے مابعد الطبیعاتی وجود پر یقین رکھتا ہے بلکہ خدا کا وجود اسلامی فکر کا محور بھی ہے۔ یعنی جس طرح اکثر مکاتیب فکر کسی طبیعاتی یا مابعد الطبیعاتی وجود کو حقیقت قرار دے کر باقی تمام کائنات کی توجیہ و تشریح اس حقیقت کی نسبت سے کرتے ہیں اسی طرح اسلامی فکر میں خدا حقیقتِ واحدہ ہے اور باقی تمام کائنات کا وجود صرف اس کی نسبت سے ہے۔ یعنی خدا واحد معروض ہے، باقی تمام اشیاء دہ موضوع ہیں جن کا وجود خدا کے وجود کا نتیجہ ہے اور جن کی حقیقت خدا کے مقابلہ میں اضافی ہے۔ اس طرح اسلام کے نزدیک اخلاقیات کے لیے جس اصول کو بنیادی طور پر مابعد الطبیعاتی مسلّم قرار دیا جانا چاہیے، وہ خدا ہے۔

خدا کا یہ تصور خود بخود اخلاقیات کے تمام مسائل کا حل بن جاتا ہے۔ خدا نے ارادہ، شعور اور مقصد کے تحت کائنات کی تخلیق کی ہے۔ انسان بھی خدا کا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے اس کا نصب العین

خود اپنے مقصدِ تخلیق کی تکمیل ہونا چاہیے چنانچہ حقیقی سوال یہ نہیں کہ خیر کیا ہے؟ بلکہ اخلاقیات کا مسئلہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ بقول مودودی صاحب "فلسفہ جس مقام سے اپنی اخلاقی بحث شروع کرتا ہے درحقیقت وہ اخلاق کے مسئلہ کا سرا نہیں بلکہ بیچ کے چند نقطے ہیں۔ .... یہ سوال کہ انسان کے لیے کردار کی صحت و غلطی کا معیار کیا ہے؟ اور وہ کون سی بھلائی ہے جس کو پہنچنے کی سعی انسان کے لیے مقصود بالذات ہونی چاہیے؟ دراصل یہ بعد کا سوال ہے۔ اس سے پہلے جو سوال حل ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ سوال اس لیے تمام سوالات پر مقدم ہے کہ حیثیت کے تعین کے بغیر اخلاق کا سوال محض بے معنی ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس میں بیشتر امکان اس امر کا ہوتا ہے کہ اس طرح جو اخلاقیات متعین کیے جائیں گے وہ بنیادی طور پر غلط ہوں گے۔"

چنانچہ انسانی حیثیت کے سلسلہ میں اسلام کا جواب بہت واضح ہے — انسان بہترین تخلیق ہے۔ وہ صاحب شعور ہے اور خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے۔ شب و روز ماہ و انجم یعنی کائنات کی دوسری اشیاء اس کی تابع ہیں اور وہ ان سب کو بالقوۃ مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے چونکہ شعور فیصلہ اور اختیار کی قوتوں کے ساتھ اسے کائنات میں خلیفۃ اللہ یا نائبِ الٰہی کی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کا نصب العین خدا کے مقاصد کی تکمیل کرنا ہے۔

اسلامی اخلاقیات کے یہ دونوں بنیادی اور اساسی اصول کہ خدا ایک قادرِ مطلق ہر شے پر محیط اور صاحب ارادہ ہے اور انسان ایک اختیار کے حامل کی حیثیت سے نائب الٰہی ہے ایسے اصول ہیں جو اپنے منطقی نتائج کے اعتبار سے اخلاقیات کے متعدد مسائل حل کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ زندگی کا نصب العین منتخب کرنے کا حق انسان کو حاصل نہیں ہے۔ یہ نصب العین ایک معروضی وجود رکھتا ہے۔ اور خدا کا وجود اس نصب العین کی معروضیت قطعیت اور حیثیت کی علت ہے۔ اخلاقیات کی اس معروضی حیثیت کا یہ پہلو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ خدا کے تصور کی وجہ سے اخلاقیات محض ایک معاشرتی عمل ہی نہیں رہتے بلکہ انفرادی عمل بھی بن جاتا ہے یعنی کسی فرد کے اعمال کو اخلاقی یا غیر اخلاقی قرار دینے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اسے معاشرہ کی نسبت اور رشتہ سے دیکھیں بلکہ کوئی فرد معاشرہ یا جماعت سے بالکل الگ رہتے ہوئے بھی اخلاقی احکام کا پابند ہوتا ہے۔ اس طرح اسلامی اخلاقیات انسانی زندگی کے ہر گوشے اور

ہر صورت پر محیط ہو جاتے ہیں۔

پھر چونکہ یہ اخلاقی نظام کسی فرد کی ذاتی خواہش یا فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ عقل کل کا معین کردہ راستہ ہے اس لیے اس میں ردّ و بدل ترمیم و تحریف کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ خدا نے جس نصب العین کے حصول کے لیے انسان کو خلق کیا ہے انسان اس نصب العین کی بلندترین حیثیت سے انکار نہیں کر سکتا یا اس نصب العین سے بلندتر نصب العین پیش نہیں کر سکتا کیونکہ منطقی طور پر کوئی بھی با مقصد تخلیق کی وجہ تخلیق کا تعین کرنے کا حق مخلوق کے مقابلہ میں خالق کو حاصل ہے اور خالق کا ہر اقدام قطعی ماننا چاہیئے۔ چنانچہ اسلام جس اخلاقی نظام کو پیش کرتا ہے۔ وہ قطعی اصولوں پر استوار ہے۔

اسی طرح تصور خدا کے نتیجہ میں اخلاقی نظام حتمی بھی ہو جاتا ہے۔ کانٹ اخلاقیات کے لیے جن حتمی اصولوں کی تلاش میں ہے وہ صرف مذہبی نظام اخلاق ہی میں مل سکتے ہیں کیونکہ بغیر کسی معروض اور بالاتر بنیاد کے استوار ہونے والے مفروضات ہمیشہ اپنی حتمیت کے ثبوت کے محتاج رہیں گے لیکن اسلام کے اخلاقی اصولوں کی بنیاد خدا کی ذات ہے اور اس طرح "قانون اخلاق کے واجب الاطاعت ہونے کی اصل بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ خدا کا ٹھہرایا ہوا قانون ہے"۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلام کے تصور خدا کے منطقی نتیجہ کے طور پر اخلاقیات اپنی ضرورت، اہمیت، معروضیت، قطعیت اور حتمیت ثابت کر دیتے ہیں۔ اب اخلاقیات کی صورت کیا ہونی چاہیئے؟ اس سوال کا جواب اسلام کے دوسرے اخلاقی مسلّمہ نیابت انسانی سے ملتا ہے۔

چونکہ انسان کرۂ ارض پر خدا کا نائب ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ ان مقاصد کی تکمیل کرے جو خدا نے معین کیے ہیں انھیں مقاصد کا حصول یا تکمیل عملی اخلاقیات ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا کے مقاصد کیا ہیں؟ اسلام ان مقاصد کو سنت الٰہی اور فطرت الٰہی کی اصطلاح میں بیان کرتا ہے۔ خدا کے مقاصد اس کے عمل سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہے اس لئے اس کا عمل (سنت)، اور اس کی حقیقت (فطرت)، دونوں ایک ہی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں خدا کی ذات اور صفات دونوں ایک ہیں۔ عرفان ذات سے خدا کی صفات تک پہنچا جا سکتا ہے اور مشاہدۂ ذات سے عرفانِ ذات ہو سکتا ہے اس لیے خدا کا مقصود اس کی اپنی ہی ذات ہے۔ اسکی سنت خیر ہے کیونکہ اس کی فطرت خیر ہے۔ اس کی سنت حسن ہے کیونکہ اس کی فطرت بھی حسن ہے

علیٰ ہذا القیاس ۔

چنانچہ انسان کا نصب العین یا اخلاقی مقصود اپنے آپ میں صفات الٰہی پیدا کرنا ہے۔ جس کو حکمت اخلاق خیر اعلیٰ کی تلاش نصب العینی مقصد یا مقصد اولیٰ کہتی ہے مذہب اسکو تلاش حق سے تعبیر کرتا ہے یہ صرف اصطلاحات کا فرق ہے۔ افلاطون اسے خیر کہتا ہے اور اسلام اسے خدا کہتا ہے "گویا اسلامی اخلاقیات کا مقصود سنتِ الٰہی اور فطرتِ الٰہی کی پیروی اور حصول ہے۔

یہ طے ہونے کے بعد صرف فطرتِ الٰہی، خیر ہے ہم خیر کی ماہیت کو نسبتاً واضح تر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ خدا کامل ہے اور اس کی تمام صفات کمال کی حامل ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیر اپنی ماہیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر کمال کی خصوصیت رکھتا ہے کمال کی صفت ایک تعمیری اور تخلیقی صفت ہے۔ اس لیے خیر تعمیر اور تخلیق ہے اور شر جو خیر کی ضد ہے۔ تخریب اور جمود ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ " یاد رکھو جو کوئی (اللہ کے حضور) نیکی لائے گا اس کے لیے اس کے عمل نیک سے دس گنا زیادہ ثواب ہے اور جو کوئی برائی لائے گا اس کا کوئی بدلہ نہیں سوائے اس کے کہ اسے اسی قسم کی برائی دی جائے اور ایسا نہ ہوگا کہ لوگوں کے ساتھ ناانصافی کی جائے " یعنی خیر خود قائم اور باقی ہے اور اپنے آپ میں اضافہ اور فروغ کا ذریعہ ہے جب کہ شر خود اپنی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ خیر کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا ایجابی، تعمیری اور تخلیقی ہونا ہے۔

خیر کے مزید عناصر وہ اقدار ہیں جنہیں اسلام صفات الٰہی کے نام سے تعبیر کرتا ہے ان میں سے کچھ صفات حیات، ابدیت، وحدت، قوت، صداقت، حسن، عدل، محبت اور خیر ہیں یہ تمام کی تمام ایجابی یا مثبت اقدار ہیں ان کے مقابلے میں وہ قدریں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے سلبی ہیں۔ مثلاً زیانِ حیات اشیاء عارضی، فقدان اتحاد، جمود، غلطی، ناانصافی اور بے اعتدالی نفرت اور فقدان ہمدردی اور برائی وغیرہ شر ہیں۔

اسلام کا اخلاقی نظام مجموعی طور پر فروغِ حیات اور بقائے حیات کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ خدا خود حی و قیوم ہے اس لئے صفت حیات کا حصول انسان کا بھی نصب العین ہے چنانچہ وہ اعمال و افعال جو فروغ حیات کا سبب بنتے ہیں خیر ہیں۔ یہاں اسلام کا اخلاقی نظام بظاہر ارتقائی اخلاقیات کے نظریہ کے قریب نظر آتا ہے لیکن ارتقائی اخلاقیات کا نصب العین صرف

حیات مادی کا فروغ ہے جب کہ اسلام کے نزدیک مادی حیات محدود و مختصر ہے اور اس کے فروغ کی انتہائی کوشش کے باوجود اس زندگی کا خاتمہ ناگزیر ہے اس لئے انسان کا حقیقی مطمح نظر حیات بعد الممات کا فروغ ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں مقصود حیات کا حصول ان اقدار کی وساطت سے ہوتا ہے جو خود ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں۔ انسان ابدی زندگی رکھنے والے عناصر کے سہارے خود بھی ابدی ہو سکتا ہے۔ یہ ابدیت خدا کی طرح کی ابدیت تو نہ ہوگی لیکن اضافی طور پر انسان ہمیشہ کی زندگی پا جائے گا۔ ابدی اقدار کے ذریعہ حیات ابدی کے حصول سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام فرد کی انفرادیت کا دشمن ہے یا انسانی خودی کا فنا کرنا ہی اسلام کا نصب العین ہے۔ اسلام کے نزدیک خدا کے مقاصد یا ابدی اقدار کی راہ میں اپنی ذات کی قربانی دینے والا ایک بلند تر انفرادی مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ زیادہ مختار اور زیادہ آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ اختیار و آزادی خدا کے اختیار و آزادی سے قریب تر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ "تم میں سے کون ہے جو خدا کی راہ میں اپنے نفس کو فروخت کر کے بدلے میں خدا کی مرضی حاصل کر لے"۔ خدا کی مرضی کے حصول کا مقصد یہ ہے کہ انسان اخلاقی کمال کے نقطہ پر پہنچ کر دنیائے مقاصد کا اہم رکن بن جاتا ہے اس کی خودی کائنات کی تسخیر کر لیتی ہے اور اس کا مقصد پورے نظام کائنات کا مقصد ہو جاتا ہے۔

اس مقام بلند کا انعام حیات ابدی ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ "جو لوگ خدا کے مقصد میں قتل ہوئے انہیں مردہ نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں البتہ تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔" ان کی حیات ایسی حیات ابدی ہے جو زمان و مکان کے امتیازات سے ماوراء ہے۔ اسی لئے زمانی اور مکانی شعور انکا ادراک نہیں کر سکتا۔ شاید یہاں ہم برگساں کے ہم زبان ہو کر یہ کہہ سکیں کہ یہ غیر زمانی اور غیر مکانی حیات عقل کے دائرۂ ادراک میں نہیں آتی البتہ وجدان کے ذریعہ اس تک رسائی ہو سکتی ہے۔ یہ حیات اس زمان خالص سے تعلق رکھتی ہے جو اقبال کے نزدیک خودی کا نقطہ کمال ہے۔ پھر خدا ایک وحدت ہے ایسی وحدت جو اجزاء سے نہیں بنی اور نہ اجزاء میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انسان کے اخلاقی نصب العین میں وحدت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ وحدت سب سے پہلے فرد کی انفرادی وحدت ہے۔ یعنی اس کی تمام تر فکر ایک مقصد کی تابع ہے۔ اور اس کا تمام عمل اس کی فکر کا۔ اور اس کی پوری حیات مقصد فکر اور عمل کی وحدت کے تحت پروان چڑھے

اس انفرادی وحدت کا دوسرا قدم اجتماعی وحدت ہے۔ جہاں فرد، خدا، کائنات اور جماعت کے مقاصد ایک ہو جائیں۔ " اسلام محض انسان کی (انفرادی) اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں ہے بلکہ عام بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کر سکے۔"[۲۲]

خدا کی ایک اور صفت اقتدار اور غلبہ ہے۔ چنانچہ خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے انسان کا فرض ہے کہ وہ قوت حاصل کرے۔ لیکن یہ قوت شئے کی بے لگام قوت نہیں بلکہ اس کا مفہوم ایک طرف تو وہ تسخیر ہے جو انسان دوسرے مظاہر فطرت پر حاصل کرتا ہے دوسری طرف اس قوت کے ضمن میں فرد کی تسخیر ذات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ تسخیر ذات کا مطلب ان خواہشات پر قابو پانا ہے جو بطور ذریعہ خدا کے مقاصد کی تکمیل کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن اگر انہیں مقصد بنالیا جائے تو یہ انسان کو زیر کرلیتی ہیں۔ یہاں خصوصیت سے لذتیت کے اس نقطۂ نظر کی نفی کرنا ہے کہ انسان کا مقصود حقیقی لذت کا حصول ہے۔ لذت انسانی محسوسات کا جزو ہے اور اگر اس جزو کو مقصد حیات قرار دے دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان اپنے ایک جزو کا تابع ہے۔ اس طرح وہ اس قوت سے محروم ہو جاتا ہے جس کا حاصل کرنا اس کا مقصود ہے۔ چنانچہ لذت اخلاقی نصب العین کے حصول کا ایک ذریعہ تو بن سکتی ہے لیکن خود مقصود نہیں قرار دی جا سکتی۔

خدا علیم کلی ہے اور اسکا کوئی عمل مقصد سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ علم اور حکمت یعنی آگاہی اور مقصدیت انسان کے اخلاقی نصب العین میں شامل ہیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر کے تحت تمام عظیم اخلاقی شخصیتیں اس خصوصیت کی حامل رہی ہیں۔ بغیر علم کے انسان حقیقت کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور بغیر مقصد کے اس کے اعمال غیر مربوط اور غیر منظم ہو کر اسکی شخصیت کی وحدت کو ختم کر دیتے ہیں۔ اسلئے ان دونوں عناصر کا وجود اخلاقی نقطۂ نظر سے ضروری ہے یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اسلام کے نزدیک علم کے معنی صرف اشیا کی حقیقت سے آگاہی نہیں بلکہ علم کے مفہوم میں کسی شے کی وہ حیثیت بھی شامل ہے جو اسے دنیائے مقاصد میں حاصل ہے۔ اسلامی نظریۂ علم کے تحت یہ جاننا اتنا اہم نہیں ہے کہ کوئی شے کیا ہے بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ کوئی شے کس لئے ہے کیونکہ کسی شے کا مقصد وجود ہی اس امر کا تعین کرتا ہے کہ اسے خدا کے مقاصد کی تکمیل میں کس انداز سے اور کس حد

تک استعمال ہونا چاہئے۔

اس طرح عدل، محبت اور خیر بھی صفات الٰہی میں شامل ہونے کی وجہ سے انسانی نصب العین ہیں۔ عدل سے مراد کسی عمل کا اس حد کے اندر ہونا ہے جس حد تک اسے ہونا چاہیئے۔ اس لئے جزوی مفہوم میں انصاف کا تصور شامل ہے جس کے تحت مساوات، غیر جانبداری، حق پرستی، معاہدوں کی پابندی اور وعدوں کا احترام جیسی اقدار آتی ہیں۔ محبت کی خصوصیت کے تحت فرد کے لئے اولاً اپنی ذات سے پھر اعزا، احباب، اقارب، مسافر، اجنبی، معاشرہ کے ستم رسیدہ افراد اور انجام کار پوری نوع انسانی سے محبت شامل ہے لیکن یہ خصوصیت عدل کی تابع ہے جہاں کسی فرد یا جماعت کی محبت مقاصد اخلاق سے متصادم ہو وہاں مقصد کو فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ اچھائی یا خیر کو پسند کرنا، اس سے محبت کرنا، اس کے فروغ کی کوشش کرنا۔ اور اس کے خلاف عناصر سے جنگ کرنا بھی اخلاقی زندگی کا ایک اہم مقصد ہے۔ اچھائی سے اس وابستگی کے نتیجہ میں فرد وہ قوت بن جاتا ہے جو کانٹ کے الفاظ میں اس طرح عمل کرتا ہے گویا اس کا عمل ہی عالمگیر قانون بنے گا۔ حسن کی قدر کا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنی ذات اور کائنات میں نظم و تربیت تناسب اور توازن پیدا کرے۔ یہ تنظیم وہ تخلیقی صلاحیت ہے جس کے تحت بقول اقبال انسان فطرت کی تسخیر کرتا ہے اور اس کی بدنظمی کو دور کرکے اسے ترتیب و توازن کا تابع کرتا ہے۔

یہاں دو غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے جو مندرجہ بالا سطور سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ اولاً اقدار کی اس فہرست سے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے گویا اسلام میں اخلاقی نصب العین بہت سی مختلف النوع اقدار کا مجموعہ ہے۔ جو ایک دوسرے سے مختلف اور قائم بالذات ہیں۔ اس طرح فرد کے اخلاقی عمل میں وحدت باقی نہیں رہتی۔ دوسری غلط فہمی یہ ہو سکتی ہے کہ اسلام کا اخلاقی نظام انسان کی ذاتی خواہشات اغراض اور محرکات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور کانٹ کے نظریۂ اخلاق کی طرح اسلام کا نظام اخلاق بھی خارج کی طرف سے عائد کئے گئے قوانین کا مجموعہ ہے۔ اس طرح یہ نظام خدا کی طرف سے ایک تشدد آمیز رویہ ہے جو انسان کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ لیکن یہ دونوں اعتراضات محض غلط فہمی ہیں۔

پہلی غلط فہمی کا ازالہ اس نکتہ کو سمجھنے سے ہو سکتا ہے کہ اسلام کا اخلاقی نظام اقدار کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک نامیاتی کل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں تمام اقدار اپنے وجود اور بقا کے لیے دوسری

اقدار سے وابستہ ہیں اور یہ تمام اقدار بحیثیت مجموعی ایک کل کی تخلیق کرتی ہیں۔ جو فطرۃ اللہ کہلاتا ہے اس کل میں تمام اقدار ایک دوسرے سے منسلک اور ایک دوسرے کی مد ہیں۔ اور بنیادی طور پر اقدار بھی چونکہ مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ تمام کی تمام رضائے الٰہی یا منشائے الٰہی کے واحد نصب العین کے حصول کا ذریعہ ہیں اس لئے کسی ایک قدر کو محض اس قدر کی عظمت کے پیش نظر دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے عام فلسفیانہ اخلاقی نظاموں میں مختلف اقدار مثلاً جمال لذت، مسرت اور حسن الگ الگ مقصود قرار دی گئی ہیں۔ لیکن اسلامی نظام فکر ان تمام اقدار کو ایک نقطہ پر جمع کر لیتا ہے۔ اس نظام کے اندر نہایت متوازن اور متناسب طریقے سے وہ تمام اخلاقی سسٹم اپنی اپنی موزوں جگہ پالیتے ہیں جو فلسفۂ اخلاق کے مفکرین نے تجویز کئے ہیں . . . . اسلام پوری صداقت پیش کرتا ہے اور اس کل میں وہ تمام جزئی صداقتیں جذب ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے پاس الگ الگ اور ناقص تھیں[۱۳]۔

دوسرا اعتراض نسبتاً زیادہ اہم ہے لیکن قرآن اس مسئلہ کو اس طرح حل کرتا ہے کہ وہ الٰہی فطرت اور انسانی فطرت کو ایک ہی جانب رواں قرار دیتا ہے قرآن کے الفاظ میں خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے چنانچہ خدا کی فطرت کے تقاضے اور انسانی فطرت کے تقاضے مختلف نہیں ہوسکتے اور نہ ان کے حقیقی مقاصد مختلف ہوسکتے ہیں۔ یہودیت اور عیسائیت کے برخلاف اسلام بنیادی طور پر انسان کو خیر کی تخلیق قرار دیتا ہے۔ انسان کی اصل شر نہیں ہے اور نہ اس کا موجودہ مقام کسی بدی یا غلطی کا نتیجہ ہے بلکہ انسان اصلاً خیر ہے اس کی فطرت اور خیر کی فطرت ہم آہنگ ہے چنانچہ انسان کا کوئی جذبہ کوئی قانون اور کوئی قوت اپنے اصل کے اعتبار سے شر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ جب انسان خدا کے مقاصد کی تکمیل کر رہا ہوتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے مقاصد کو حاصل کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف جب وہ اپنی ذات کی معرفت حاصل کرتا ہے تو درحقیقت خدا کی معرفت حاصل کر رہا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر میں اس مقولہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے کہ "جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا"۔ مقاصد اور فطرت کی یہ یکجہتی اخلاقیات کو خارج کی بجائے انسان کے باطن سے تخلیق کرتی ہے۔ خدا کے تمام صفات جو اخلاق کا نصب العین ہیں انسانی زندگی میں معاشرے کے عوامل بن جاتے ہیں جن کا وجود

معاشرے اور فرد کی بقا کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اصولاً انسان کا ہر عمل اصلاً خیر ہے۔ شر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کی خواہشات جذبات اور عقل میں توازن نہیں رہتا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلام کا نظام اخلاق ایک نامیاتی وحدت ہے اور اس نظام میں کسی پہلو کو بلا وجہ دوسرے پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ محض خواہشات یا محض عقل کی بنیاد پر استوار ہونے والے اخلاقی نظام مکمل نہیں ہو سکتے۔ اسلام کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ خواہشات کی تربیت و اصلاح کی جائے اور عقل ان سے مناسب اور موزوں کام لے یعنی اسلام کا اخلاقی نظام ان خواہشات پر مبنی ہے جو عقل کے تابع ہیں یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف بشپ بٹلر نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ انسانی ذہن کا کوئی عمل بذاتہ شر نہیں بلکہ کسی ایک پہلو کے حد سے بڑھ جانے اور کسی دوسرے کے نظر انداز ہو جانے کا نام شر ہے جس چیز کو اسلام انسانی فطرت قرار دیتا ہے تقریباً اسی چیز کو بٹلر مثالی ضمیر کا نام دیتا ہے۔

خدا اور انسان کے مقاصد میں ہم آہنگی یا نظام اخلاق کے خارجی یا معروضی وجود کے ساتھ ساتھ اسے انسان کے باطن سے وابستہ کرنے کی ایک وجہ اسلام کا یہ نقطۂ نظر بھی ہے کہ خدا "احسن الخالقین" ہے۔ بہترین خالق کی تخلیق کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ان مقاصد کی تکمیل کرے جن کی خاطر اسے تخلیق کیا گیا ہے یعنی ضروری نہیں کہ انسان کو خدا کے مقاصد سے آگاہ کیا جائے بلکہ انسان کی تشکیل ہی اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ذات ہی میں ان مقاصد کا ادراک کر سکے جن کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور اس میں داخلی طور پر ایسے عناصر موجود ہونے چاہییں جو مقصد تخلیق کی نشاندہی کرتے ہوں چنانچہ اسلام کا اخلاقی نظام معروضی اقدار پر قائم ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی ذات باطن اور داخل سے بھی پوری طرح وابستہ ہے اور اس کا اخلاقی عمل صرف خارجی احکام کی اطاعت پر ہی مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ارتکاب کے لیے خود اس کی ذات میں مضبوط بنیادیں موجود ہوتی ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں اسلام کے نظریۂ اخلاق کے تحت ہم نے جن نکات کی نشاندہی کی ہے ان کے تحت اسلام کا اخلاقی فلسفہ بنیادی طور پر مذہبی ہے کیونکہ اس کا محور اور مرکز ایک قادر کل خالق اور عادل خدا کا تصور ہے جس نے کائنات کو بامقصد طور پر پیدا کیا ہے اور ایک بامقصد کائنات میں انسان کی حیثیت اور مقام کا تعین ہی اس کے اخلاقی کل کا تعین کر سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کو کائنات میں خدا کا نائب قرار دیا ہے جہاں تک اسلام کے عقیدۂ الوہیت کا تعلق ہے یہ تصور اسلام کے اخلاقی نظام کو معروضیت قطعیت اور حتمیت دیتا ہے اور تصور نیابت انسان کے فرائض کا تعین کرتا

ہے۔ اس عقیدے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان کا اخلاقی نصب العین خدا کے مقاصد کی تکمیل یا فطرت اللہ کا حصول ہے۔ فطرت اللہ کی بنیادی خصوصیت اس کا تعمیری تخلیقی اور ایجابی ہونا ہے چنانچہ خیر کے لیے ان خصوصیات کا وجود ناگزیر ہے اس کے مقابلہ میں شر تخریبی جامد اور سلبی ہوتا ہے جو اقدار اس واحد نصب العین کے حصول کا ذریعہ بنتی ہیں وہ صفات الٰہی کے نام سے موسوم ہیں ان اقدار میں حیات، ابدیت، وحدت، قوت، علم و حکمت، عدل، محبت اور حسن وغیرہ سر فہرست ہیں لیکن یہ تمام اقدار ایک دوسرے سے مختلف یا متصادم نہیں بلکہ مل کر ایک عضویاتی یا نامیاتی کل کی تشکیل کرتی ہیں جو ایک وحدت ہے علاوہ ازیں یہ اقدار صرف خدا کی طرف سے عائد کردہ خارجی احکام نہیں بلکہ انسان کے اپنے باطن میں بھی موجود ہیں۔ خدا کی فطرت اور انسان کی حقیقی فطرت باہم ہم آہنگ ہے۔ بشر صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنی فطرت کے کسی پہلو میں حد اعتدال سے تجاوز کرتا ہے۔ چنانچہ اسلامی اخلاقیات معروضی بنیادوں پر استوار ہونے کے باوجود داخلی اساس بھی رکھتی ہے اور ایک اخلاقی عمل کے ارتکاب کے وقت خدا اور فرد کے مقاصد ایک ہی سمت میں گامزن ہوتے ہیں۔

یہ وہ اساس ہے جس پر حضرت علی علیہ السلام کا نظریۂ اخلاق استوار ہوا ہے۔ ان کا فلسفۂ اخلاق بنیادی طور پر تشریحی و عارضی ہے۔ یعنی انھوں نے اپنے الفاظ میں اسلام کے اخلاقی نقطۂ نظر ہی کی تشریح کی ہے۔ ان کی پیش کردہ تشریحات کا تفصیلی جائزہ آئندہ صفحات میں لیا جائے گا۔

اشارات

۱۔ نہج البلاغہ کے مندرجات کو تقریباً تمام مسلمان مؤرخین، محدثین اور مستشرقین حضرت علی علیہ السلام کے کلام پر مشتمل قرار دیتے ہیں کیونکہ سید رضی سے پہلے کم از کم بائیس علما حضرت علی علیہ السلام کے خطبات کو جمع کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ ان کاوشوں، داخلی شواہد اور روایت و درایت کے قدیم اور جدید اصولوں کے تحت نہج البلاغہ کا مجموعی طور پر تمام خطبات کا بھی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ البتہ ابن خلکان (وفیات الاعیان جلد دوم ص ۳۳۶ طبع مصر) نے دبے الفاظ میں اور جدید نقادوں میں ڈاکٹر زبید احمد پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی (ادب العربی

اور ڈاکٹر این۔ اے خلوصی عراقی، لیکچرر لندن یونیورسٹی (اسلامک ریویو ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء) نے واضح انداز میں نہج البلاغہ کے بعض مندرجات کو موضوعی قرار دیا ہے۔ لیکن جدید تحقیق نے ان حضرات کے شکوک و شبہات کا مکمل طور پر ازالہ کر دیا۔ تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل کتب اور مضامین دیکھے جا سکتے ہیں:

(ا) منہاج نہج البلاغہ از سید سبط الحسن ضنوی (ب) نہج البلاغہ کا استناد از علامہ امتیاز علی خان عرشی (درضمن مقدمہ ترجمہ نہج البلاغہ سید رئیس احمد جعفری۔ طبع لاہور ص ۱۵ تا ۶۸) (ج) مقدمہ نہج البلاغہ از سید علی نقی النقوی (مشمولہ ترجمہ نہج البلاغہ از مفتی جعفر حسین۔ طبع لاہور، ص ۹ تا ۴۹) (د) سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل (نہج البلاغہ کا ادبی مطالعہ۔ طبع کراچی)

۲۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ــــ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ــ ص ۲۷ ــ ۲۸

۳۔ القرآن ــ پارہ ۱۷ آیت ۷۰

۴۔ القرآن ــ پارہ آیت

۵۔ القرآن ــ پارہ ۱۶ آیت ۱۲
پارہ ۱۶ آیت ۱۴
پارہ ۲۲ آیت ۶۵
پارہ ۲۲ آیت ۳۶

۶۔ القرآن ــ پارہ ۱ آیت

۷۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ــ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ــ ص ۳۱

۸۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ــ اسلام کا نظریہ حیات ــ ص ۳۰۱

۹۔ بشیر احمد ڈار ــ ہسٹری آف مسلم فلاسفی (تدوین میاں محمد شریف ص ۱۵۵)

۱۰۔ القرآن پارہ آیت

۱۱۔ القرآن پارہ آیت

۱۲۔ ڈاکٹر محمد اقبال ــــ حرف اقبال ص ۲۵۱

۱۳۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ــــ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر ــ ص ۳۱ ۔

مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

نعت

حق جلوه گر ز طرزِ بیانِ محمد است　　آری کلام حق، به زبانِ محمد است
آئینه دارِ پرتوِ مهر است آفتاب　　شانِ حق آشکار ز شانِ محمد است
تیرِ قضا هر آئینه در ترکشِ حق است　　اما کشادِ آن ز کمانِ محمد است
دانی اگر به معنیِ "لولاک" وارسی　　خود هر چه از حق است آنِ محمد است
هر کس قسم بدانچه عزیز است میخورد　　سوگندِ کردگار به جانِ محمد است
واعظ! حدیثِ سایهٔ طوبیٰ فرو گذار　　کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمد است
بنگر دو نیمه گشتنِ ماهِ تمام را　　کان نیمه جنبشی ز بنانِ محمد است
ور خود ز نقشِ مهرِ نبوت سخن رود　　آن نیز نامور ز نشانِ محمد است

غالب ثنای خواجه به یزداں گذاشتیم
کان ذاتِ پاک مرتبه دانِ محمد است

ضمیمہ

سازمان تبلیغات اسلامی

کی

ایک سالہ کارکردگی پر طائرانہ نظر

الّذین یبلّغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الّا اللہ وکفیٰ باللہ حسیبًا (قرآن کریم)

ہمارے لالہ گوں اسلامی ملک میں انقلاب کی عزت آفریں فتحمندی کے فوراً بعد ایک ایسے ثقافتی وتبلیغی ادارے کی کمی کا شدت سے احساس ہوا۔ جو عوام کو اس انقلاب کے مقاصد واقدامات سے آگاہ کرے، ایسا ادارہ جو ذمہ دارانہ طور پر محنتی اور مجاہد علما کو اسلامی انقلاب کی خدمت کے لیے ابھارے اور ان میں اتحاد وہم آہنگی کو فروغ دے۔

بہمن ۱۳۵۹ ہجری شمسی/۱۹۸۰ء میں امام امت حضرت آیت اللہ العظمیٰ خمینی مدظلہ العالی نے "شورائے عالی تبلیغات اسلامی" تشکیل دینے کی تجویز سے اتفاق رائے فرمایا:

"اسلامی تبلیغات کو تمام ابعاد وجہات کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر انداز میں وسعت دی جائے۔"

سازمان تبلیغات اسلامی نے وسیع پیمانے پر اسلامی حقائق ومعارف کی نشر واشاعت، اندرون وبیرون ملک اسلامی انقلاب کے اہداف ومقاصد کی وضاحت،

حقیقی اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے اسلامی انجمنوں کی اصلاح و رہنمائی، اسلام و انقلاب دشمن پروپیگنڈوں کا مقابلہ اور ہر قسم کی اخلاقی و ثقافتی برائیوں کے اسباب و علل کی بیخ کنی کے لئے سعی و کوشش کو اپنا نصب العین بنایا اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ سازمان اپنی تشکیل کی ابتدا سے مالی و وسائل کی کمی سے دوچار ہے۔ لیکن یہ خداوند عالم کا فضل و کرم اور اس کے مؤسسین کی بے لوث خدمات کا نتیجہ ہے کہ اتنے کم عرصہ میں صحیح منصوبہ بندی کے ذریعہ مختلف وزارت خانوں، صوبوں اور شہروں میں ۱۲۸ مرکز و شعبہ قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ یہ نکتہ بھی مدنظر رہے کہ اسلامی تبلیغات کو صرف اپنے اسلامی ملک اور محاذ جنگ ہی میں محدود نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ برصغیر جنوب مشرقی ایشیا، یورپ اور افریقہ بھی اس ادارہ کی خدمت سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔ ان ممالک میں مبلغ بھیج کر وہاں کے باشندوں کو اسلامی حقائق و معارف سے روشناس کرایا گیا، یورپ و ایشیا میں طلبہ کی اسلامی تنظیموں سے رابطہ قائم کر کے تبلیغی امور میں انھیں مدد پہنچائی گئی۔ سازمان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں اسلامی موضوعات پر کتابیں اور رسالے تصنیف یا ترجمہ کر کے بین الاقوامی سطح پر شائع کیے اور لوگوں تک پہنچائے۔

خداوند عالم کے لطف و کرم، ذمہ داروں کے روزافزوں تعاون اور تبلیغی کارکنوں کے بے لوث خدمات سے امید ہے کہ اسلامی تبلیغات کی کمیت و کیفیت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔

سر دست ۱۳۶۲ ہجری شمسی میں سازمان تبلیغات اسلامی کی کارکردگی کا خلاصہ اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

شعبہ مبلغین و مدرسین اور سماجی امور :

اعتقادی و سیاسی افکار کی ترقی اور مذہبی و تبلیغی مراسم کی انجام دہی، دینی شعائر کی تعظیم اور اسلامی حقائق و معارف کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں سازمان کے اس شعبہ کے اہم اقدامات کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ دور دراز دیہاتوں، کارخانوں، اسکولوں اور دفتروں میں ۲۷۸۴۳ مبلغ بھیجے۔
۲۔ ۱۲۰۰۰ ہزار علماء کو محاذ جنگ پر بھیجا گیا جنھوں نے کم از کم بیس دن اسلامی تبلیغات کے فرائض انجام دیئے۔
۳۔ پورے ملک میں خطبۂ نماز جمعہ سے پہلے تقریر کے لیے بارہ سو مقرر بھیجے۔
۴۔ کارخانوں اور دفتروں میں اسلامی علوم و معارف کی ۳۳۰۳۵ کلاسیں قائم کی گئیں۔
۵۔ مختلف شہروں میں ۵۵۳۸۵ کلاسیں کھولی گئیں۔
۶۔ عوام کے علمی و فکری معیار کو بلند کرنے کے لیے سینکڑوں کتب خانے اور کیسٹ بنک قائم کیے گئے۔
۷۔ آفسوں، کارخانوں اور اسکولوں میں ۹۳۲۱ اسلامی انجمنیں قائم کی گئیں جن کی سرپرستی سازمان کے ہاتھ میں ہے۔
۸۔ اکثر شہروں میں ہر ہفتہ دعائے کمیل کا سلسلہ شروع کیا گیا۔
۹۔ سیاسی، سماجی شخصیتوں، نماز جمعہ کے خطبوں اور ذمہ داران مملکت کے پیغامات، اسلامی انقلاب ایران اور دیگر ممالک کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات، وزارت خانوں اور اسلامی انقلابی نو بنیاد اداروں کی کارکردگی کے متعلق تحقیق اور اعداد و شمار و معلومات کی فراہمی۔
۱۰۔ وزارت صحت، تعمیرات و شہر سازی، محنت و سماجی امور، دھات اور معادن، زراعت، ایرپورٹ اور ریلوے وغیرہ میں اس سازمان کے شعبوں نے حسب ذیل خدمات انجام دیئے ہیں:

- اعتقادی، سیاسی اور قرآن مجید کی ۱۵۰۰ کلاسیں قائم کی گئیں۔
- ۱۱۰۰۰ تقریریں ہوئیں۔
- اسلامی مسائل اور ایام اللہ سے متعلق ۲ لاکھ کی تعداد میں کتابیں اور ہینڈبل نشر کیے گئے۔

- ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ ۳۳۲۰ فلم اور تھیٹر دکھائے گئے۔
- اسلامی انجمنوں میں زیادہ سے زیادہ اتحاد نیز انجمنوں اور ڈائریکٹروں کے درمیان اختلافات کو رفع دفع کرنے کے لئے دوستانہ میٹنگوں کا انعقاد
- مختلف تقریبوں کے موقع پر جلسوں کا انعقاد اور اس میں دینی وسیاسی شخصیتوں کو دعوت، نیز نمائشوں کا اہتمام و انصرام۔
- روزانہ نماز ظہرین کا انعقاد۔
- آفسوں، بس اسٹاپوں اور تہران ایرپورٹ پر غیر ملکی مسافروں کے لیے بک اسٹالوں کا انتظام کیا۔
- آفسوں میں انتظامی مشکلات کو دور کرنے کے لئے سیمناروں کی تشکیل۔
- تبلیغات کو منظم رکھنے کے لئے نگرانی اور دیکھ بھال اور دورے۔

شعبۂ ثقافت

۱۔ اسلامی وسیاسی موضوعات سے متعلق حسب ذیل مسائل پر مشتمل مضامین مقالوں اور کتابچوں کی تصنیف و تدوین:

- امت وسط کے عنوان سے امت اسلامی کا تعارف۔
- سیاست و انتظام۔ حضرت علیؑ کے نقطۂ نظر سے۔
- ایمان و کفر۔
- بہائیت اور سامراجی سیاستیں۔
- ۲۸، مرداد وغیرہ کے حوادث کا وسیع تجزیہ

۲۔ فقہی، سماجی اور معاشی مسائل کے بارے میں سوالات کے تحریری وتقریری جوابات۔

۳۔ اسلامی انجمنوں کے ترجمان ماہنامہ اعتصام کا اجرا۔

۴۔ پورے ملک میں تعلیم قرآن کے لیے "ٹیچرس ٹریننگ سنٹر" کا قیام، ہر

سنٹر میں چار سو معلمین قرآن کو تربیت دی گئی۔

۵۔ ماہ رمضان میں تعلیم قرآن کے دو سو مراکز کی تشکیل جن میں آٹھ ہزار طالب علموں نے حصہ لیا۔

۶۔ قاریان قرآن کریم کے عمومی اجلاسوں کا انعقاد، پہلا اجلاس ۱۳۶۱ھ ش میں منعقد ہوا تھا، اس اجلاس کا مقصد جس میں ۵۰۰ قاریوں نے حصہ لیا، قاریوں کی بہتر تربیت اور انھیں منظم کرنا تھا۔

۷۔ تعلیم قرآن کے متعلق بحث و گفتگو اور بہتر و مناسب تر تدریس کے انتخاب کے لئے معلمین قرآن کے تعاون سے دو سمیناروں کا انعقاد۔

۸۔ تجوید و قرآن خوانی کے متعلق تعلیمی مقالات کی تیاری اور تہران کے ۲۵ محلوں میں تجوید قرآن سکھانے کے لئے تعلیمی کلاسوں کا اجرا۔

۹۔ محاذ جنگ پر قاریان قرآن بھیجنا۔

۱۰۔ اسلامی علوم کے متعلق متعدد کتابوں کی تصنیف و اشاعت۔

شعبۂ فنون لطیفہ

دنیا کو اسلامی آرٹ اور اسلامی اقدار و معیار سے متعارف کرانے، نیز اسلامی حدود میں رہتے ہوئے فن کاری کے طریقوں سے باخبر رکھنے کے واسطے سازمان تبلیغات اسلامی کے شعبۂ فن نے اسلامی مصادر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حسب ذیل خدمات انجام دیئے ہیں۔

۱۔ کتاب و سنت میں فنون لطیفہ کے معیاروں اور بنیادوں کی جستجو اور اس سلسلہ میں وسیع تحقیق۔

۲۔ مذکورۂ بالا مقاصد کی تکمیل کے لئے ماہر فن کاروں پر مشتمل، مشورتی کمیٹیوں کی تشکیل۔

۳۔ مومن و با استعداد افراد کی ٹریننگ اور آرٹ کے پیچ و خم سکھانے کے لئے

...یتی کلاسوں کی تشکیل۔

...سلم یونٹ

حسب ذیل فلمیں بنائی گئیں، کچھ فلمیں مکمل ہوچکی ہیں اور کچھ تکمیل مراحل سے گذر
...ی ہیں۔

۱۔	استعاذہ	۱۱۰ منٹ	مکمل ہوچکی ہے
۲۔	دو چشم بی سو	۱۲۰ ″	″
۳۔	وارث	۴۵ ″	″
۴۔	ہودج	۶۵ ″	″
۵۔	گورکن	۱۰۰ ″	زیر تکمیل
۶۔	سرباز کوچک		″
۷۔	مرگِ دیگری	۷۰ ″	″
۸۔	سال یہ از ایں	۴۰ ″	″
۹۔	عقود	۱۰۰ ″	″
۱۰۔	کردی زبان میں "مرگِ دیگری" کی ڈبنگ	۷۰ ″	مکمل ہوچکی ہے۔

۱۱۔ متعدد فلموں کے لیے کہانیاں لکھی جاچکی ہیں۔

۱۲۔ ۱۷ گھنٹوں کی "شیخ شہید فضل اللہ نوری" نامی ٹی وی سیریز فلم کی کہانی لکھی جاچکی ہے۔

۱۳۔ پورے ملک میں بارہ ہزار مقامات پر "توبۂ نصوح" "مرگِ دیگری" "سقای تشنہ" نامی فلموں کی ریلیز کا انتظام۔

فلم "توبۂ نصوح" دیکھنے والوں کے نظریات:

۱	کیفیت فلم	خراب ہے ۰/۹ فی صد	اچھی ہے ۱۳/۴۵ فی صد	متوسط ۴۰/۳۶ فی صد	بہت عمدہ ۳۸/۵۷ فی صد	جواب نہیں دیا ۶/۴۳ فی صد
۲	پیام فلم	منفی ۱/۷۹ فی صد		مثبت ۹۳/۷۲ فی صد		جواب نہیں دیا ۴/۴۸ فی صد
۳	منافی اسلام	ہے ۷/۱۷ فی صد		نہیں ۸۶/۵۵ فی صد		جواب نہیں دیا ۶/۲۸ فی صد

۱۴۔ ملک بھر کے سینما ہالوں میں "توبۂ نصوح" اور "توجیہ" کی ریلیز۔

۱۵۔ اندرون و بیرون ملک کے لئے سازمان کی بنائی ہوئی مختلف فلموں کی ۳۹۰ کاپیاں بنائی گئیں۔

تجسیمی یونٹ

۱۔ ایک ہزار کی تعداد میں "جہاد و انقلاب" اور "انقلاب و بسیج" کے عنوان سے مناسب عبارتوں کے ہمراہ فوٹو تہیہ اور منتشر کئے گئے۔

۲۔ ۲۰ قسم کے پورٹریٹ کی نشر و اشاعت جس میں جنگ اور اسلامی انقلاب کے مختلف مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

۳۔ اسپین میں تجسیمی فن کی نمائش۔

۴۔ مختلف اقسام کے بیس پورٹریٹوں کی تیاری جن میں جہاد، ایثار، شہادت

جیسے اسلامی اقدار کو نمایاں کیا گیا ہے۔

۵۔ فکری وثقافتی کلاسوں کی ویڈیو فلم سازی ہوئی۔

۶۔ اندرون و بیرون ملک میں تبلیغ اسلام کی غرض سے تین گھنٹوں کی آٹھ سو مفید ویڈیو فلم تیار ہوئی۔

۷۔ نوری آرٹ (ملٹی ویژن۔ اسلائیڈ وغیرہ) سے متعلق مختلف پروگراموں کی کہانی اور مکالمے لکھے گئے، " انقلاب دریک نگاہ" نامی پروگرام ملٹی ویژن طریقہ سے تیار کیا گیا، یہ نوری صنعت پہلی مرتبہ سازمان نے پیش کی ہے۔

۸۔ مظاہروں، کانفرنسوں اور اسلامی انقلاب کے تمام پروگراموں کی فوٹوگرافی

۹۔ شہدائے انقلاب اسلامی کے پورٹریٹ کی تیاری۔

۱۰۔ اہم واقعات وحادثات کی سلائیڈ فلم سازی۔

تھیٹر یونٹ

۱۔ "صابرین" نامی تھیٹر کی تیاری، مشق اور تیس دن تک اس کی نمائش۔

۲۔ چالیس تھیٹروں کی کہانیوں اور مکالموں کی اصلاح۔

۳۔ ملک کے تھیٹر گروپوں کے لیے " طالوت وجالوت" "مسلم ابن عقیل" "فدوہا" "قلعہ" وغیرہ جیسے تھیٹروں کی کہانیاں اور مکالمے لکھے گئے۔

۴۔ "حضرت ایوب" اور "بند" نامی تھیٹر کی تیاری۔

ادب یونٹ

۱۔ اسلامی فن وادب سے متعلق دس کتابوں کی اشاعت۔

۲۔ تہران کے معاصر شعرا کے لئے ہر ہفتہ بزم شعرا کا انعقاد۔

۳۔ مختلف شہروں میں شب شعر کا انعقاد۔

۴۔ بااستعداد افراد کی تربیت کے لئے افسانہ نویسی کی کلاسوں کی تشکیل۔

بین الاقوامی شعبہ

سازمان تبلیغات اسلامی کے اس شعبہ نے دنیا کے گوشے گوشے میں تبلیغ و ترویج سلام اور بڑی طاقتوں کے گمراہ کن پروپیگنڈوں کا مقابلہ کرنے کے لیے حسب ذیل خدمات نجام دی ہیں:

۱۔ "معارف قرآن کریم" کے عنوان سے دوسری "فکر اسلامی کانفرنس" کا انعقاد جس میں دنیا کے چار سو سے زائد دانشوروں، محققوں اور مذہبی سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔

۲۔ نائجیریا، سیرالیون، بنگلادیش، برطانیہ، الجزائر، جدہ، اسلام آباد، مکہ معظمہ میں منعقد ہونے والے سرکاری و غیر سرکاری بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں وغیرہ میں سرگرم و فعال شرکت۔

۳۔ ایران میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں سے تعاون۔

۴۔ ایک سو سے زائد غیر ملکی وفود اور شخصیتوں سے ملاقات۔

۵۔ مغربی جرمنی، ہندوستان، ارجنٹائن، سوئڈن، تھائی لینڈ، ترکیہ، فلپائن، پاکستان، اسٹریا، اٹلی، چکوسلواکیہ، مڈگاسکر وغیرہ تبلیغ و ترویج اسلام کے لیے اٹھائیس مبلغ بھیجے، جنھوں نے کم از کم ۴۵ دن تبلیغی خدمات انجام دیئے۔ اس طرح وقتی طور پر مزید ۲۲ مبلغ بھیجے۔

۶۔ موجودہ تبلیغی صورت حال کے متعلق غور و فکر کے لئے ۳۹ میٹنگیں بلائی گئیں جن میں حوزۂ علمیہ اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے حصہ لیا۔

۷۔ اس شعبہ کے "بین الاقوامی تعلقات" یونٹ نے بیرون ملک سے آنے والے ... خطوط وصول کئے، ان خطوط کے دینی و سیاسی سوالات کے جوابات دینے کے علاوہ حسب ذیل خدمات بھی انجام دیئے۔

• تفسیر، حدیث اور دیگر مذہبی موضوعات پر مشتمل تین لاکھ سے زائد اہم کتابیں

بھیجی گئیں۔

•۔ روزانہ ۸۰۰۰ اخبار و رسائل بھیجے جاتے رہے، اسی کے ساتھ فنی شہ پاروں اور امام خمینی کے مطبوعہ پیغامات بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

•۔ ۱۷۵۰ ویڈیو فلمیں بھیجی گئی۔

•۔ ۱۶ ملی میٹر کی ۹۰ فلمیں بھیجی گئیں۔

•۔ ۲۰۰۰ کیسٹ بھیجی گئیں۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ بیرون ملک تنظیموں، اداروں اور افراد کی مانگ کا یہ صرف ایک گوشہ ہے۔

۸۔ سازمان کی بنائی ہوئی دس فلموں اور تھیٹروں کا غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ۔

۹۔ کردی و ترکی زبانوں میں دو فلم اور ایک ملٹی ویژن پروگرام (انقلاب دریک نگاہ) کی ڈبنگ۔

۱۰۔ اسلامی جمہوریہ ریڈیو ٹیلی ویژن کے غیر ملکی پروگرام کے لئے عربی زبان میں مختلف پروگراموں کی تیاری۔

۱۱۔ دوسرے ممالک میں ۱۴۰ اسلامی انجمنوں کی سرپرستی اور حتی الامکان ان کی فکری و مالی مدد۔

۱۲۔ حسب ذیل اخبار اور رسالوں کی نشر و اشاعت۔

•۔ اسلامی مضامین، سیاسی تبصروں اور ملکی و غیر ملکی خبروں پر مشتمل انگریزی زبان میں "تہران ٹائمز" نامی روزنامہ کا اجرا اور اشاعت۔

•۔ فکری، اعتقادی انقلابی مطالب پر مشتمل اردو زبان میں توحید نامی سہ ماہی رسالہ کی اشاعت۔

•۔ فکری، اعتقادی، انقلابی مطالب پر مشتمل عربی زبان میں التوحید نامی دوماہی رسالہ۔

•۔ فکری، اعتقادی، انقلابی مطالب پر مشتمل انگریزی میں التوحید نامی سہ ماہی رسالہ۔

•۔ بچوں کے لئے خوبصورت تصویروں سے مزین، چار رنگوں کی طباعت اسلامی

انقلابی مسائل پر مشتمل عربی میں دو ماہی "الھدیٰ" نامی رسالہ۔

۰۔ توحید اردو، التوحید عربی، التوحید انگریزی، تہران ٹائمز کی مختلف ممالک میں تقسیم۔ ان علمی مجلّوں کو مختلف ممالک کے علماء اور دانشوروں نے تحسین و پسند کی نظر سے دیکھا اور تعریف و تہنیت پر مشتمل خطوط کا سلسلہ جاری ہے۔

۱۳۔ ستاد دہۂ فجر کے شعبہ نشر و اشاعت کی ذمہ داری اور اس سے مربوط کتابوں کی اشاعت۔

۱۴۔ عربی، انگلش، فرانسیسی، اسپینی، سواحلی، اردو اور کردی زبانوں میں "شورائے کتاب" کی زیر نگرانی مختلف موضوعات پر متعدد کتابوں کی تحقیق تالیف اور ترجمہ۔

شمارہ	نام کتاب	زبان	کیفیت
۱	الحج	عربی	
۲	التکامل الاجتماعی	عربی	
۳	شھر اللہ	عربی	
۴	الاسلام و ایران (۱)	عربی	
۵	الاسلام و ایران (۲)	عربی	
۶	مع المؤتمرات الدولیة	عربی	
۷	فی الطریق الی اللہ	عربی	
۸	حول صلاة الجمعہ	عربی	
۹	المکاسب الاجتماعیہ	عربی	
۱۰	الھدف السامی للحیاة الانسانیة	عربی	

شماره	نام کتاب	زبان	کیفیت
۱۱	المثل العلیا فی الاسلام	عربی	
۱۲	الحج علی مختلف المذاهب	عربی	
۱۳	السنه والشیعه	عربی	
۱۴	الاخلاق عند الامام الصادق	عربی	
۱۵	دروس فی الاقتصاد	عربی	
۱۶	البنع والسکه	عربی	
۱۷	پیامهای امام به پاپ	انگریزی	
۱۸	تعالیم اسلام	انگریزی	
۱۹	انسان درقرآن	〃	
۲۰	السنه والشیعه	〃	
۲۱	نگرشی بر زندگی پیامبر	〃	
۲۲	انقلاب و ترور یسم	〃	
۲۳	کتاب سوزی در ایران ومصر	〃	
۲۴	مهاجر حبشه	〃	
۲۵	خلیفه دراسلام	فرانسیسی	
۲۶	اسلام اور علم	اردو	
۲۷	بعثت سے ہجرت تک	〃	
۲۸	شہید	〃	
۲۹	رسالۂ امام	〃	
۳۰	گفتاری درباره جمهوری اسلامی	سواحلی	
۳۱	پیامهای امام به پاپ	〃	

شمارہ	نام کتاب	زبان	کیفیت
۳۲	نگرشی بر تعبد معنوی انقلاب	فارسی	
۳۳	حق تلاوت	〃	
۳۴	بلاغ سخنان آیت اللہ العظمی منتظری	〃	
۳۵	مارکسیسم بدست امپریالیسم	〃	
۳۶	بلاغ سخنان امام (در سال ۵۸)	〃	
۳۷	استکبار و استضعاف	〃	
۳۸	ساعتی در ساحت قدس	〃	
۳۹	پیام وحدت	〃	
۴۰	نمایشنامہ عبداللہ عفیف	کردی	
۴۱	خواہرم حجاب سعادت است	〃	
۴۲	حج	〃	
۴۳	قرآن در اسلام	〃	
۴۴	بچہ ہای مسجد جلد ۸	فارسی	زیر طبع
۴۵	بچہ ہای مسجد جلد ۹ و ۱۰	〃	
۴۶	جنگ ۵	〃	زیر طبع
۴۷	جنگ ٦	〃	
۴۸	فنون قصہ نویسی جلد ۸	〃	
۴۹	سہ ماہ تعطیلی	〃	
۵۰	مجموعہ داستان	〃	زیر طبع
۵۱	گرافیک انقلاب	〃	〃
۵۲	کتاب آموزش گرافیک	〃	〃

شمارہ	نام کتاب	زبان	کیفیت
۵۴	مجموعۂ شعر	فارسی	

دہۂ فجر سے متعلق

۱	تقلید کیا ہے ؟	اردو	
۲	ختم نبوّت	〃	
۳	اقتصادیات	〃	
۴	اسلامی جمہوریہ مصادر قوت	〃	
۵	اسلامی انقلاب کا خونین آغاز	〃	
۶	درسہائی از نہج البلاغہ	انگریزی	
۷	طرح کلی اندیشہ ہای اسلامی	〃	
۸	انقلاب اسلامی راہ آئندہ ملتہا	〃	
۹	زمینہ ہای وحدت اسلامی	〃	
۱۰	آشنائی با مجلس	〃	
۱۱	شناخت بزبان فطرت	عربی	
۱۲	بعد معنوی انقلاب	〃	
۱۳	شیخ شہید	〃	
۱۴	امام در برابر صہیونزم	〃	
۱۵	انقلاب اسلامی (الثورۃ الاسلامیہ)	〃	
۱۶	انقلاب اسلامی ضد فساد اخلاقی	〃	
۱۷	زمینہ ہای وحدت اسلامی	〃	

شمارہ	نام کتاب	زبان	کیفیت
۱۸	قرآن در اسلام	عربی	
۱۹	انقلاب اسلامی راہ آئندہ ملتہا	〃	
۲۰	انسان و قدر	〃	
۲۱	پیامہای امام	فرانسیسی	
۲۲	خطبہ ہای نماز جمعہ	〃	
۲۳	زمینہ ہای وحدت اسلامی	فارسی	
۲۴	جنگ تحمیلی ارمغان تسوم قدرتہای شیطانی	〃	

زیر طباعت کتب و رسائل

۱۔	داستان راستان جلد ۱، ۲	کردی	
۲۔	خاتمشی محمدؐ	〃	
۳	پروتکل ہای صہیونیسم	انگریزی	
۴	گفتار معنوی	〃	
۵	در پیرامون وحدت اسلامی	عربی	
۶	تاریخچہ و اعترافات حزب خائن تودہ	〃	
۷	تاریخ القرآن	〃	
۸	الجہاد	〃	
۹	جستجوی حقیقت	کردی	
۱۰	زبدۃ الاحکام	عربی	
۱۱	پروتکل ہای صہیونزم	فرانسیسی	

شماره	نام کتاب	زبان	کیفیت
۱۲	خلاصه‌ای از تعالیم اسلامی	فرانسیسی	
۱۳	صحیفهٔ سجادیه	عربی و انگلیزی	
۱۴	جزوه‌ای درباره نماز جمعه	ترکی	
۱۵	حج	ترکی	
۱۶	حصار در حصار	عربی	
۱۷	قصص قرآن	کردی	
۱۸	اسلام و ملی گرائی	عربی	
۱۹	مقاله‌ای دربارهٔ حج و شعری در مدح امام	کردی	
۲۰	خداشناسی	فرانسیسی	
۲۱	خداشناسی	انگریزی	
۲۲	بسوی وحدت اسلامی	ترکی	
۲۳	الاسلام (ینابیعه ـ مناهجه ـ غایاته)	عربی	
۲۴	خدا و معاد	کردی	
۲۵	نظام الاسلام جلد ۱ و ۲	عربی	
۲۶	حول الوحدة الاسلامیه	عربی	
۲۷	روش برداشت از قرآن	انگریزی	
۲۸	مقاله چهل حدیث	کردی	
۲۹	المال والحکم فی الاسلام	عربی	
۳۰	گفتاری درباره جمهوری اسلامی ایران	سواحلی	
۳۱	الطباطبائی ومنهجه فی التفسیر القرآن	عربی	
۳۲	مشعل اتحاد	کردی	

شمارہ	نام کتاب	زبان	کیفیت
۳۳	الی القرآن الکریم	عربی	
۳۴	مرگ دیگری	کردی	
۳۵	انسان در قرآن	آلمانی	
۳۶	انسان در قرآن	کردی	
۳۷	المیراث عند الجعفریہ	عربی	
۳۸	نوح و ہود	کردی	
۳۹	وحی و نبوت	فرانسیسی	
۴۰	سنن النبی	عربی	
۴۱	اسلام و ملی گرائی	کردی	
۴۲	السنۃ والشیعہ	کردی	
۴۳	خورشید دین ہرگز غروب نمی کند	ترکی	
۴۴	گفتاری در بارہ جمہوری اسلامی ایران	انگریزی	
۴۵	مسائل جہانی انقلاب اسلامی	″	
۴۶	انسان و ایمان	آلمانی	
۴۷	مقالات اولین کانفرنس اندیشہ اسلامی	فارسی	
۴۸	المرسل - الرسول - الرسالہ	سویڈی	
۴۹	آدم و حوا	کردی	

بچوں کے لئے کتابیں

شمارہ	نام کتاب	زبان
۱	نگہبان چشمہ	عربی
۲	نگہبان چشمہ	انگریزی

شماره	نام کتاب	زبان	کیفیت
۳	داستان دوستان	انگلیزی	
۴	صدور انقلاب	〃	
۵	جنگ صفین	〃	
۶	گربه و خروسها	〃	
۷	گربه و خروسها	عربی	
۸	دماغ سوخته	〃	
۹	تیشه	〃	
۱۰	کودک مسلمان و تعلیم و تربیت	〃	
۱۱	حجر بن عدی	〃	
۱۲	بشنو از نی	〃	
۱۳	شکوه شهادت	〃	
۱۴	مهاجران حبشه	ترکی	
۱۵	وفای به عهد	〃	
۱۶	از تو حرکت از خدا برکت	〃	
۱۷	تشنه دیدار	〃	
۱۸	شکوه شهادت	〃	
۱۹	حضرت هود	〃	
۲۰	اصحاب فیل	〃	
۲۱	دوران کودکی زندگی پیامبر ۲	〃	
۲۲	میلاد پیامبر زندگی پیامبر ۱	〃	
۲۳	نخستین کسانیکه ایمان آوردند	〃	

شماره	نام کتاب	زبان	کیفیت
۲۴	اتحاد	انگریزی	
۲۵	تیشه	کردی	
۲۶	اتحاد	اردو	
۲۷	پای خون	انگریزی	
۲۸	صدور انقلاب	عربی	
۲۹	مهاجران حبشه	عربی	
۳۰	جنگ صفین	عربی	
۳۱	درختی که پرنده ها را دوست نداشت	انگریزی	
۳۲	آهوی گردن دراز	"	
۳۳	اتحاد	ترکی	
۳۴	بشنو از نی	"	
۳۵	داستان دوستان	انگریزی	
۳۶	اتحاد	فرانسیسی	
۳۷	بازگشت	ترکی	
۳۸	دیدار با فردا	"	
۳۹	تفرقه	کردی	
۴۰	نگهبان چشمه	"	
۴۱	دماغ سوخته	"	
۴۲	هجرت به حبشه	"	
۴۳	دوران شکنجه و رنج	ترکی	
۴۴	دیدار با فردا	انگریزی	
۴۵	بشنو از نی	"	
۴۶	شکوه شهادت	"	
۴۷	اتحاد	کردی	

فہرست مجلد اوّل مجلۂ توحید

حدیث